جلد 45 • شمارہ 09 • ستمبر 2015 • زر سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •
پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

عزیزانِ من... السلامُ علیکم!

دشمن کو معلوم نہیں کہ اس نے کس قوم کو للکارا ہے... یہ ستمبر کا شمارہ ہے اور آج سے 50 برس قبل ہمارے ازلی حریف نے جب ہماری سرحدوں کا رخ کیا تو کلمۂ طیبہ کے سائے میں کہے ہوئے اس ایک جملے نے پوری قوم کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار میں بدل کر رکھ دیا۔ عزم و ہمت کی ایسی داستانوں نے جنم لیا کہ سب حیران رہ گئے... چونڈہ کو دشمن ٹینکوں کا قبرستان بنا دیا گیا۔ لاہور جیم خانہ میں بھارتی جرنیلوں کا جشن منانے کا پروگرام یوں پیوندِ خاک کیا گیا کہ ان کی نسلیں بھی لاہور کے نام سے کانپیں گی۔ دشمن کا جو حشر ہوا، اس کا اعتراف ان کے ایک حالیہ اشتہار میں ہوا۔ اس کھرے سچ کو غلطی کا عنوان دے کر پشیمانی پر پردہ ڈالا گیا مگر حقیقت بہر حال حقیقت ہوتی ہے۔ دشمن آج 2015ء میں بھی اپنے پرانے زخموں کو چاٹ رہا ہے۔ وہ ایک کڑا وقت تھا جو آیا اور گزر گیا مگر آج ہم کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ اس محاسبے کی سخت ضرورت ہے۔ پاکستان اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ایک نعمت اور روشن امکانات کی سرزمین ہے جہاں قدرتی وسائل کی کوئی کمی نہیں۔ تھر کے کوئلے سے سوات کے زمرد تک۔ مسلم باغ کے بوکسائٹ سے کھیوڑا کے نمک تک، ہر طرف معدنیات کے قیمتی خزانے اس ارضِ پاک میں مدفون ہیں۔ سوئی، اُچ، ماری اور ساری وغیرہ سے ملنے والی قدرتی گیس نے نہ صرف ہمارے چولھے روشن رکھے ہوئے ہیں بلکہ صنعتوں، مواصلات اور توانائی کے شعبوں میں بھی جان ڈالی ہوئی ہے۔ موسم کی بات کیجیے تو اس سرزمین پر بیک وقت ہر موسم پایا جاتا ہے۔ سخت گرمی ہو تو مری میں ٹھنڈی ہواؤں کے مزے لیجیے۔ ذرا اور ہمت ہو تو اوپر کاغان اور ناران نکل جائیں جہاں کی ہوائیں گلیشیروں کو چومتی ہوئی، ہر شام کو سرد بنا دیتی ہیں۔ اتنے وسائل اور سازگار ماحول کے باوجود ہم تھائی لینڈ، کوریا، فلپائن اور ملیشیا جیسے ملکوں سے برسوں پیچھے کیوں ہیں... یہ ایک بڑا سوالیہ نشان ہے۔ ہماری قیادت جو اس سوال کا جواب دے سکتی ہے، وہ باہمی آویزش میں الجھی رہتی ہے۔ قیادت وہی نہیں جو حکمرانی کی مسند پر فائز ہے بلکہ ہر وہ جماعت جو لوگوں کی رائے سے اسمبلی میں پہنچتی ہے، عوام کی مثبت قیادت کی ذمے دار ہے۔ المیہ یہ ہے کہ یہ سب ہمہ وقت مناقشوں میں الجھے رہتے ہیں۔ قوم کی ذہنی تربیت اور قیادت کے بنیادی فرض سے غافل ہیں۔ اس قوم کو اگر مخلص، دیانت دار اور محنتی قیادت میسر آجائے تو ہم بھی مذکورہ بالا قوموں کی طرح بلکہ ان سے زیادہ تیزی سے ترقی کی جانب گامزن ہو سکتے ہیں۔ ایسا کب ہوگا... اس کا انتظار پاکستانی قوم کے ہر فرد کو ہے۔

آیئے انتظار کے کچھ لمحات اس محفل میں گزارتے ہیں جہاں آپ سب اپنے دلوں کی بھڑاس نکالتے ہیں۔

جتوئی سے چوہدری محمد سرفراز کی چوہدراہٹ ”جاسوسی ڈائجسٹ اپنی تمام تر حشر سامانیوں اور تابناکیوں کے ساتھ 6 اگست کو موصول ہوا۔ میرے بڑے بھائی جان شمالی علاقہ جات کی سیر پر تھے اور راوی اس ناچیز کی قسمت میں چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ یعنی ڈائجسٹ فل ٹائم اپنے پاس رہا۔ سوچا اس فراغت سے فائدہ نہ اٹھانا دانشمندی نہیں ہوگی۔ لہٰذا عرصہ دراز بعد قلم اٹھایا اور چاند ماری کی ابتدا سرورق سے کرنا چاہی۔ جہاں پر ٹائٹل گرل کا حسنِ بلا خیز ایک طرف تھا تو اس کی زلفِ خم شدہ میں پھنسی گولی کی قیامت خیزی ایک طرف۔ بس تو پھر سرورق کو بھی کیا ایک طرف اور رخ کیا چینی نکتہ چینی کی طرف۔ مجموعی طور پر چینی نکتہ چینی کا ماحول ٹھنڈا تھا۔ نہ تو طنز و تنقید کے نشتر نظر آئے اور نہ ہی صنفِ نازک و کرخت کی پرانی کھٹ پٹ۔ نظر آئے تو گلے شکوے نظر آئے، تجاویز تھوک کے بھاؤ نظر آئیں اور اپنے اعظم خان کی تین پہیوں والی گاڑی نظر آئی۔ پتا نہیں موصوف نے میاں بیوی کے ساتھ تیسرا پہیہ کسے قرار دیا ہے۔ معراج محبوب عباسی صاحب کا گھما پھرا کر کیا جانے والا تبصرہ پڑھا اچھا تھا، مبارک باد ہو جناب۔ زویا اعجاز کا تبصرہ خلافِ توقع ماٹھا ماٹھا رہا۔ کبیر عباسی صاحب کی بہترین تجاویز اور سونے پر سہاگا مدیر اعلیٰ کے تفصیلی جوابات۔ کبیر عباسی آپ کی تو قسمت جاگ اٹھی۔ منظر سلیم نے آوارہ گرد پر ایک لائن میں جامع اور بالکل درست تبصرہ کیا کہ چند تکنیکی خامیوں کے باوجود سرپٹ دوڑ رہی ہے۔ کاشط عبید اور مرحا گل صاحبہ، انعامی شمارہ مع انعامی سرٹیفکیٹ مبارک ہو۔ اب کچھ بات کہانیوں کی ہو جائے۔ انگارے کی ابھی ابتدائی اقساط ہیں اور طاہر جاوید مغل کے مخصوص اندازِ تحریر کے مطابق شاہ زیب کا کردار آہستہ آہستہ کھل کر سامنے آئے گا اور جوں جوں یہ کردار کھلتا جائے گا تحریر کی چاشنی بڑھتی جائے گی۔ تحریر میں مار دھاڑ کا عنصر تو ابتدا سے ہی شامل ہو گیا ہے مگر وہ رومانوی عنصر جس کے ہم سب دیوانے ہیں، اس کا تعلق یقیناً شاہ زیب کے ماضی سے ہوگا۔ ماہ اگست کی مناسبت سے پروین زبیر صاحبہ نے سنگِ گراں کیا خوب تحریر کی۔ جب سے یہ وطنِ عزیز آزاد ہوا ہے اپنوں کی سازشوں اور غیروں کی فتنہ کاریوں کا شکار رہا ہے اور دشمنوں کو بھی اسی وقت وار کرنے کا موقع ملتا ہے جب اپنے ہی میر جعفر اور میر صادق جیسے ننگِ دین لوگوں کے نقشِ قدم پر چل پڑتے ہیں۔ سلطان کا کردار جتنا قابلِ تعریف تھا اتنا ہی صہبا اینڈ کمپنی کا کردار قابلِ مذمت۔ اختتام بالکل بھی غیر متوقع نہیں تھا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی تحریر اشکِ سنگ کی ابتدا اچھی تھی۔ کہانی کے پلاٹ سے لے کر سسپنس تک سب اعلیٰ معیار کا تھا مگر اختتام پر کہانی کو ایک دم سے سمیٹ دیا گیا جس کی وجہ سے تحریر کچھ بے جان سی لگنے لگی۔ سرورق کا دوسرا رنگ پسِ پردہ منفرد تاپک لیے دلچسپ تحریر تھی۔ کہانی میں پل پل بدلتی صورتِ حال نے کہانی کو مزید چار چاند لگا دیے۔ سرورق سے مطابقت اور کمال کی منظر نگاری میں یہ رنگ پہلا نمبر لے گیا۔“

خانیوال سے محترم محمد صفدر معاویہ کی عمدہ تبصرہ نگاری ”اگست کا شمارہ بڑے چکروں کے بعد ملا۔ سرورق کو ایک بہت ہی خوب صورت آنکھوں والی دوشیزہ، ایک پسٹل اور 2 ماسک سے سجایا گیا۔ اداریہ پڑھا۔ آپ سیلاب والوں کے دکھ عیاں کرتے نظر آئے جو حکومت آنکھیں رکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ فوج ہر دکھ، آزمائش اور مصیبت کی گھڑی میں کھڑی نظر آتی ہے۔ اپنی افواج کو ہزاروں سلام۔ اپنی محفل میں پہنچے تو بھائی معراج محبوب عباسی کو بہت عمدہ تبصرہ کرتے دیکھا۔ زویا اعجاز بہنا بھی اچھی تبصرہ نگاری کرتی نظر آئیں۔ شہزادہ کوہساری کی بھی عمدہ واپسی۔ باقی تمام دوستوں کے تبصرے بھی عمدہ رہے۔ کہانیوں میں ابتدا سنگِ گراں سے کی۔ پروین زبیر صاحبہ کے قلم سے بہت ہی عمدہ تحریر۔ سلطان کے ساتھ ظالموں نے بہت برا کیا۔ لالچ میں وطن کی دولت لوٹ کر تین بے گناہ اور پیارے لوگوں کو قتل کرا دیا۔ صہبا غزل نے بے وفا ناگن کا کردار ادا کیا، اگرچہ اسے سلطان سے محبت ہو گئی تھی مگر اس کو دھوکا تو دیتی رہی نا بے وفا۔ انگارے کی اس قسط کی کیا تعریف کریں، بہت عمدہ۔ شاہ زیب ہو گیا اسٹارٹ اب مزہ آئے گا۔ آوارہ گرد کی یہ قسط بھی عمدہ رہی۔ شہزی کا ٹریننگ لے کر دوبارہ مجبوراً بیگم صاحبہ سے ملنا، وزیر جان کی بیوی کی موت، آخر میں ادھوری خبر جو ہم تک نہ پہنچی۔ سب عمدہ رہا، اگلی قسط کا بے صبری سے انتظار رہے گا۔ بھٹی صاحب کی ..... اشکِ سنگ، آذر نقاش جو انسانوں کو مجسمے میں ڈھالتا ہے، پڑھ کر ہی جھرجھری سی آ گئی۔ انسپکٹر خضر نے بھی اپنی ڈیوٹی خوب نبھائی اور مجرم تک جا پہنچا اس کے بعد پسِ چہرہ پڑھی، بہت عمدہ تحریر تھی۔ منظر امام کی وہ ایک رات کیا خوب تحریر تھی۔ ایگی کالون اور راجر کے کارناموں نے خوب مزہ دیا۔ آصف ملک کی بے خطا، بین نے مرنے کے بعد بھی ایڈم کو اوپر پہنچایا۔ وہ واقعی بے خطا رہا۔ سلیم انور کی گھڑی کی گواہی بھی عمدہ رہی۔ باقی تمام کہانیاں چالباز، اختیار، سرخ دھبے، آزادی اور اشارہ بھی عمدہ رہیں۔ کترنیں بھی عمدہ تھیں۔“

ضلع مظفر گڑھ کے بہار حسین کا یقین ”مجھے خط لکھنے کا تجربہ تو نہیں مگر اپنے جذبات آپ تک پہنچانے کا کوئی اور ذریعہ میسر نہ تھا سو کاغذ قلم کا سہارا لینا پڑا۔ جاسوسی ڈائجسٹ سے میرا تعلق بہت پرانا ہے۔ دوستوں کے تبصرے، تجزیے پڑھتے پڑھتے اچانک جی چاہا، میں بھی لکھوں۔ شاید میرے جذبوں کو الفاظ کے روپ میں پڑھ کر آپ اور قارئین خوشی محسوس کریں۔ ویسے تو نفسا نفسی کے اس دور میں خوشی ایک لفظ بے معنی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی مگر مصنوعی خوشیاں اور مصنوعی مسکراہٹیں ہر طرف نظر آتی ہیں۔ اندر سے غمگین و اداس لوگ باہر سے جب مسکراتے ہیں تو دل کٹ جاتا ہے انہیں دیکھ کر۔ جاسوسی ڈائجسٹ کے طویل جدوجہد پر مبنی سلسلے پڑھ کر دل کو تقویت کا احساس ہوتا ہے اور دلچسپ تحریروں میں کھو کر چند گھڑیوں کو اداسی دور ہو جاتی ہے۔ اس بار کا جاسوسی ملا تو بہت خوشی ہوئی۔ سب سے پہلے سنگِ گراں کا مطالعہ کیا۔ کہانی کو ایک ہی نشست میں ختم کر کے دم لیا۔ واہ بہت خوب، کیا منظر نگاری ہے اور جذبۂ حب الوطنی کو ابھارنے کے لیے بہت اچھی کاوش بھی۔ اب جو چند الفاظ میں درج کر رہا ہوں، یہ الفاظ آپ کے پاس میری امانت ہیں یہ ضرور شائع کیجیے گا۔ فیس بک پر جاسوسی کے پرانے تبصرہ نگار جناب محمد قدرت اللہ نیازی صاحب نے اس کہانی کے حوالے سے پوسٹ لگائی ہے اور کہا کہ سنگِ گراں ایک فضول تحریر تھی جسے شائع کر کے ادارے نے 55 صفحات کو ضائع کیا۔ مزید کئی دوستوں نے کمنٹس دیے کہ اس تحریر میں مزہ نہ تھا۔ اب میں ان سے جاسوسی کی وساطت سے پوچھنا چاہوں گا کہ جس کہانی میں محبت، پیار اور سیکس ہو وہ تو آپ کو بہت اچھی لگتی ہے خواہ موضوع پرانا ہو، الفاظ کا استعمال درست نہ ہو مگر جو تحریر وطن کی محبت اور وطن میں موجود کالی بھیڑوں کے کالے چہرے بے نقاب کرے، وہ تحریر فضول ہے آپ کی نظر میں۔ مجھے سو فیصد امید ہے میرا یہ خط آپ ضرور شامل کریں گے۔“

کراچی سے محمد ادریس احمد خان کے خیالات ”ماہ نامہ جاسوسی آن بان شان سے ہر ماہ انفرادی حیثیت سے منظرِ عام پر آتا ہے۔ جس کا انداز جدا ہے۔ اس کا اپنا الگ ایک مزہ ہے۔ اگست کے شمارے میں ذاکر صاحب کی محنت بھی شامل ہوتی ہے۔ اداریے کے بعد معراج محبوب عباسی صاحب سرفہرست نظر آئے، مبارک ہو۔ اداریے میں بھیگے موسم کا ذکر ہوا مگر کراچی میں صرف ماضی کے بھیگے موسموں کا صرف تصور ہی کیا جا سکتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کا احسانِ عظیم ہے کہ وہ حضرتِ انسان کی لاتعداد لغزشوں، گناہوں کی زیادتی کے باوجود اپنی رحمت سے پیاسی دھرتی کو پھر بھی سیراب کر دیتا ہے۔ چینی نکتہ چینی میں بیشتر نئے اور پرانے دوستوں سے ملاقات ہوئی ان کی آرا سے مستفیض ہوئے۔ سنگِ گراں اچھی تحریر تھی۔ سلطان نے حب الوطنی کے جذبے سے سرشار اپنی جان ملک پر قربان کر دی۔ ضمیر فروشوں نے دولت کی چمک دمک سے مغلوب ہو کر ریشہ دوانیوں سے اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ اس منصف قہار کو بھول گئے جو مظلوم کی آہ کبھی خالی نہیں جانے دیتا ہے اور ظالم سے حساب دنیا میں ہی لینا شروع کر دیتا ہے۔ آخرت کا تو مرنے کے بعد ہی حساب لیا جائے گا۔ چالباز میں جاسوس ولی کی کوشش اور محنت سے ہنستا بستا گھر پھر بس گیا۔ اختیار بھی بہتر تحریر تھی۔ دوسری تحریر انگارے تھی جو بڑی دلچسپی سے پڑھی جا رہی ہے اور شاہ زیب دشمنوں سے برسرپیکار ہے۔ وہ ایک رات، منظر امام کی شگفتہ تحریر تھی۔ ان کی تحریر میں مزاح کی چاشنی بھی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ سرخ دھبے بھی اچھی کہانی تھی۔ آزادی نے آزادی کے مفہوم کو اجاگر کیا مگر کیا ہم صحیح طور پر آزادی کے مفہوم سے آگاہ بھی ہیں یا صرف آزادی، آزادی کا ڈھول پیٹتے ہیں۔ (ہر شخص اپنا احتساب کرے اور اس حقیقت کو جانے) اشارہ نے اچھا تاثر دیا۔“

فلک شیر ملک کی شاہ گڑھ سے کھلی باتیں ”ماہ اگست کا جاسوسی میرے ہاتھ میں ہے۔ میں نے لفظ بہ لفظ سارا پڑھ لیا ہے۔ سرورق حسینہ نیلی آنکھوں اور تراشیدہ پلکوں کے ساتھ خوب جچ رہی ہے یا تو پسٹل نقلی ہے یا گولی جو اس کے بالوں کی لٹ میں پھنس گئی ہے۔ پیچھے بے جان مجسمے آخری دونوں تحریروں کے مطابق ہیں۔ چینی نکتہ چینی میں مدیر اعلیٰ نے حکمرانوں کے خلاف دل کھول کر بھڑاس نکالی ہے۔ ایک جملہ بہت زبردست لکھا ہے کہ لیڈر اپنے وعدے اور عوام اپنے دکھ بھول جاتے ہیں۔ خطوں کی محفل میں نادر سیال کندیاں کا دکھ اپنی جگہ بجا ہے۔ یوم آزادی سر پر ہے اور میرا بھائی جیل میں۔ دل میں بڑا کرب محسوس کرتا ہوں۔ نادر سیال صاحب! آپ ربِ کبریا پر بھروسا رکھیں۔ ذکرِ الٰہی کرتے رہیں انشاء اللہ موسم بدلے گا، بہار ضرور آئے گی۔ تحریروں میں تین چار بہت ماتمی قسم کی تھیں۔ پسندیدہ کہانیوں میں منظر امام کی وہ ایک رات، ٹاپ پر ہے۔ سنگِ گراں، اچھے موضوع پر لکھی

گئی۔ منظر جمیل اور انور بیگ جیسے مکروہ انسانوں کا چہرہ بے نقاب کیا گیا۔ انگارے کی دوسری قسط بھی اچھی رہی۔ شاہ زیب، داؤد بھاؤ کے پاس ہی رہ کر دشمنوں سے بدلہ لے تو بہتر ہے۔ قیصر خان لگتا ہے پھر بچ گیا۔ آوارہ گرد کے ساتھ ساتھ بھٹی صاحب کی اشکِ سنگ بھی پسند آئی۔ پسِ چہرہ پڑھ کر مزہ آیا۔ کاشف زبیر نے ایک بڑا نقطہ بیان کیا ہے۔ اکاؤنٹ ونگ کرنے کا عجیب طریقہ ہے۔ اب تو محتاط رہنا پڑے گا۔ تنویر ریاض کی اختیار نے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ یہ احسان کا بدلہ احسان تھا یا قانون سے ناانصافی۔ سیر بنا راض کی چالباز نے کوئی خاص رنگ نہیں جمایا۔ ابراہیم جمالی صاحب آپ آزادی کے موضوع پر مکمل کے لکھیں۔ اب تھوڑا سا کڑوا سچ بیان کرتا ہوں پلیز مائنڈ نہ کیجیے گا۔ نئے لکھنے والے بہت خرچہ کر کے جس میں اسٹیشنری، ڈاک رجسٹری کا خرچہ، وقت کا زیاں کے ساتھ اپنا دماغ کھپا کھپا کر کوئی کہانی بھیجتے ہیں تو جواب میں کہا جاتا ہے کہانی میں بہت سقم ہے یا نا قابلِ اشاعت ہے وغیرہ وغیرہ۔ ہمیں پتا ہے کہ بے شک آپ کے ادارے نے پرانے اور اچھے رائٹرز کے ساتھ شاید لمبے معاہدے کیے ہوئے ہیں جبھی تو ہر رسالے میں ایک رائٹر کی دو دو کہانیاں چھپ رہی ہیں۔ آپ اسی اگست کے شمارے میں دیکھیں چار رائٹرز کی آٹھ تحریریں ہیں پھر ہماری کہاں سنی جائے گی۔ (وہ کون سے رائٹرز ہیں جن کی آٹھ تحریریں ہیں؟) ہمارے ملک میں بڑا ٹیلنٹ ہے۔ آپ پلیز کوشش کریں نئے لکھنے والوں کو شامل کریں۔ بہت اچھے رائٹرز ملیں گے اور رسالے میں ایک وقت میں ایک رائٹر کی ایک ہی تحریر شامل کریں یا پھر ہمیں پکا پکا جواب دے دیں۔‘‘ (آپ کیا جواب سننا چاہتے ہیں؟)

حبیب اللہ اینڈ محمد عثمان کی گزارش جھنگ صدر سے ’’جاسوسی سے کافی پرانا تعلق ہے اور اسی بنا پر کافی مرتبہ محفل میں خط لکھا جو کہ نامعلوم وجوہات کی بنا پر شائع نہ ہو سکا۔ اب بھی اس امید پر خط لکھ رہے ہیں کہ شائع ہوگا۔ سرورق میں چنچل شوخ حسینہ جس کی زلفوں میں پستول کی گولی اٹکی ہوئی تھی، بے فکر کھڑی تھی اور پیچھے وہ موصوف خود کھڑے تھے جنھوں نے گولی چلائی تھی۔ نیچے پڑے ہوئے ماسک بھی عجیب منظر بیان کر رہے تھے۔ اب تھوڑا سا کہانیوں پر تبصرہ۔ سب سے پہلے مغل انکل کی انگارے پڑھی۔ شاہ زیب اس دفعہ ایکشن میں نظر آیا۔ سنگِ گراں میں سلطان حب الوطنی کے جذبے میں آ کر مفاد پرست لوگوں کی وجہ سے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ چالباز میں ولی نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ فرنانڈو کے ماضی کو بے داغ ثابت کیا۔ اختیار میں ڈیلن لا کروز نے اپنے محسن کے احسان کا بدلہ چکا دیا گو کہ وہ مر بھی چکا تھا۔ وہ ایک رات میں، راجا اور اس کے ساتھی اپنے دوست کو خون دینے گئے لیکن اپنے جھمیلوں میں پھنس گئے اور بیلی ٹھیک ہو کر بھی واپس آ گیا۔ باقی رسالہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔‘‘

اسلام آباد سے سید شکیل حسین کاظمی کی تبصرہ نگاری ’’جاسوسی کا ملنا اتنا اہم ہوتا ہے کہ سب اس کے بارے میں ضرور لکھتے ہیں کہ فلاں تاریخ کو ملا۔ پڑھا کتنی تاریخ تک یہ کوئی نہیں بتاتا۔ یہ بھی میری طرح کے لوگ ہوتے ہیں جو روزمرہ کے امور اور ذاتی زندگی سے خصوصی وقت نکال کر ویلے رہتے ہیں۔ تھوڑا گلہ ادارے سے ہے کہ جب معلوم ہے یہ اگست یعنی آزادی کا مہینا ہے تو سرورق میں ایک آدھ برش سبز رنگ کا بھی چلا دیتے تو کون سا زیادہ خرچہ آ جاتا تھا۔ اداریے میں سیلاب کی ہلاکت خیزیوں کا احوال لکھا ہوا تھا اور ساتھ ہی غیر جمہوری باتیں بھی، میری مراد سچ سے جو کہ غیر جمہوری ہی تصور کیا جاتا ہے آج کل۔ ابتدائی تبصرہ معراج محبوب عباسی صاحب کا تھا۔ محفل پر محتاط اور کہانیوں پر بے تحاشا تبصرہ اچھا لگا اور سالگرہ کی مبارک کے لیے شکریہ جناب۔ زویا اعجاز آپ نے راز پوچھا ہے تو کامیابی کے دو اصول بتا دیتا ہوں۔ پہلا یہ کہ کبھی کامیابی کے تمام راز آشکارا نہ کرے۔۔۔ اور۔۔۔ سمجھ آ گئی؟ محمد کبیر عباسی، آپ کی معصومیت پر تو بے اختیار پیار آ رہا تھا جب آپ کا تبصرہ پڑھ رہا تھا۔ قسیم آرا بھی یقیناً محوِ حیرت ہوں گی کہ ایسا شکوہ اور درد بھرا خط۔ خیر ہونا تو کچھ دوستی اس لیے ’’اچھا تبصرہ ہے‘‘ یہی کہنا کافی ہے۔ کھیوڑا سے شفقت محمود صاحب اور رحیم یار خان سے فلک شیر ملک صاحب کو محفل میں شامل ہونے پر خوش آمدید کہتا ہوں۔ اس کے علاوہ عذرا ہاشمی اور عروج ناز کی دوبارہ شمولیت خوشگوار اضافہ ثابت ہوئیں۔ عبادت کاظمی، احسان سحر اور محمد صفدر معاویہ کے تبصرے بھی بہت اچھے لگے۔ کہانیوں کے سلسلے میں بہت کم لوگ ہوں گے جنھوں نے انگارے سے شروع نہ کیا ہو۔ اس لیے مجھے بھی انگارے سے ہی ابتدا کرنی پڑی۔ پہلی قسط کی نسبت یہ بہت جاندار قسط تھی۔ ورنہ لگ رہا تھا شاہ زیب بھی جہانی استاد کی طرح کوئی نیلی آگ دبائے بیٹھا ہے جو عنقریب جلنے والی تھی چونکہ مغل صاحب کا اندازِ تحریر کافی حد تک سمجھ چکے ہیں اس لیے امید ہے لودھی صاحب کوئی گل ضرور کھلائیں گے مخبری یا کوئی اور گھٹیا حرکت کر کے۔ اس کے بعد آوارہ گرد کا مطالعہ کیا، بہت اچھی جا رہی ہے۔ ریاض احمد باجوہ صاحب کی خیریت مشکوک لگ رہی ہے اس قسط کے اختتام کے مطابق۔ اس کے علاوہ ایک اور بھی اندیشہ سر ابھار رہا ہے کہ عارفہ بھی اسپیکٹرم کے زیرِ سایہ ہے یعنی وہ لولووش اور اس تنظیم کے مقاصد کے لیے کام کرتی ہے۔ عابدہ حقیقت میں بالکل غیر محفوظ ہے۔ ابتدائی صفحات پر پروین زبیر صاحبہ کی سنگِ گراں کا مطالعہ کیا۔ بہت نارمل اور سادہ سی کہانی تھی۔ صہبا غزل کا کردار زیادہ محتاط رہنے کا درس دے گیا خواتین سے۔ سلطان جیسے محبِ وطن اور جذباتی لوگ ہی پاکستان کا اصل چہرہ ہیں مگر یہ حالات اور وقت کی گرد میں چھپے رہتے ہیں۔ سرورق کے رنگوں کی بات کریں تو پہلا رنگ بھٹی صاحب کا اشکِ سنگ بس گزارے لائق رہا اس دفعہ۔ ہم ڈاکٹر صاحب سے اس سے بہتر کی توقع رکھتے ہیں۔ جبکہ دوسرا رنگ کاشف زبیر صاحب کا پسِ چہرہ بہت اچھا لکھا ہوا تھا۔ سعد حسن اور جیا کے کردار عمدہ تھے۔ ویسے سعد نے جیا کے

اِنتقالِ پُرملال

ادارے کے شعبۂ سرکولیشن سے طویل ترین وابستگی رکھنے والے مخلص اور محنتی رکن حاجی بدرالدین احمد 89 سال کی عمر میں 12 اگست کو خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ قارئین سے مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔ ادارہ مرحوم کے پس ماندگان کے اس غم میں برابر کا شریک ہے۔

ٹیپ پر کون سا کام کیا تھا یہ نہیں بتایا گیا۔ بہرحال عہدِ حاضر کی کہانی اور ایک سبق ان بچوں کے لیے جو سمجھتے ہیں دو چار شعبدے دکھانے سے وہ استاد بن گئے۔ بڑے بڑے استاد بیٹھے ہیں صرف ان کو چھیڑنے کی دیر ہے۔ ٹیکنالوجی کو مثبت اور نیک مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔''

سینٹرل جیل میانوالی سے سجاد خان آف موچھ کی دل آزاری ''اس بار تو حد ہی ہوگئی 11 اگست کو جاسوسی ڈائجسٹ ملا جو کہ سراسر زیادتی ہے۔ کیوں بار بار ہمیں نظرانداز کیا جاتا ہے نہ تو محفل میں ہمیں اپنا خط نظر آتا ہے جو کہ ہر ماہ لکھتا ہوں خدا جانے کہاں چلا جاتا ہے، دوسرے محبوب ڈائجسٹ بہت زیادہ انتظار کرواتا ہے، کریں تو کیا کریں، خیر جب آزاد لوگ انصاف کے لیے دربدر بھٹک رہے ہیں تو ہم قیدی کیا امید رکھیں کسی سے۔ اس بار ٹائٹل گرل اچھی تھی لیکن بھتا مافیا کی ڈان لگ رہی تھی۔ خیر خوب صورت لوگوں سے اللہ بچائے۔ چینی نکتہ چینی میں مدیرِ اعلیٰ نے سیلاب کی تباہ کاریوں پر خوب صورت تبصرہ کیا۔ بے چاری فوج کس کس کو سنبھالے، ابھی سیلاب کا پانی اترا نہیں کہ واقعہ قصور نے دل دہلا دیا۔ کریں تو کیا کریں لوگ۔ ان حکمرانوں نے تو لوگوں کو خودکشیوں پر مجبور کردیا ہے۔ دنیا کے کسی کونے پر بھی اس طرح کے بے حس حکمران نہیں پائے جاتے ہوں گے۔ پتا نہیں کب پاکستان خوش حال ہوگا۔ اب محفلِ یاراں میں چلتے ہیں۔ سب سے پہلے ہمارے پیارے دوست عید کی نماز پڑھ کر گھر جارہے تھے کہ راستے میں دشمنوں نے قتل کردیا۔ میری سب قارئین سے گزارش ہے کہ مرحوم کے لیے مغفرت کی دعا کریں اور خدا پاک لواحقین کو صبر عطا کرے۔ باقی سب دوستوں کے تبصرے اچھے تھے۔ معراج محبوب عباسی مبارکاں۔ زویا اعجاز صاحبہ، محمد کبیر، نادر سیال، عبادت کاظمی بھائی اور محمد صفدر معاویہ بھائی کیسے ہو آپ سب۔ وقت کی کمی کی وجہ سے کہانیوں پر تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں۔''

اسلام آباد سے انور یوسف زئی کی رائے ''جاسوسی اس بار سیلاب اور ہڑتالوں کی وجہ سے 6 تاریخ کو ملا۔ سرورق اس بار بھی جاندار اور کہانیوں کے عین مطابق تھا۔ تبصروں میں پہلا نمبر ہری پور کے معراج عباسی صاحب کا رہا۔ اس ماہ وڈے شاہ جی اور بھائی ہمایوں سعید پھر غائب تھے۔ البتہ بی بی طاہرہ گلزار بلیک لسٹ میں نظر آئیں (کیا وجہ رہی؟) بہاولپور کی بی بی بشریٰ افضل کو واپسی پر خوش آمدید۔ میرا تبصرہ تو نہ تین میں نہ تیرہ میں۔ بلیک لسٹ تک میں نام نہ تھا۔ ڈاک خانہ زندہ باد۔ خانیوال کے صفدر معاویہ صاحب کا شکریہ کہ میرا مختصر سا تبصرہ انہیں پسند آیا۔ سرورق کی پہلی کہانی اشکِ سنگ ایک روایتی جاسوسی کہانی تھی جس میں انسپکٹر خضر خان کے کارنامے بیان کیے گئے ہیں مگر بات کچھ بنی نہیں۔ دوسری کہانی کاشف زبیر کی لیپ چہرہ ایک اچھی کہانی تھی جس میں کمپیوٹر کی مشکل جزئیات تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔ کاشف زبیر کی کارکردگی قابلِ ستائش تھی۔ اس ماہ کی بہترین کہانی پروین زبیر کی سنگِ گراں رہی جو کہ غالباً کسی مغربی کہانی سے ماخوذ لگتی ہے۔ سلطان نے بڑی ہی جدوجہد سے قیمتی خزانہ اٹھلے سے واپس کرایا مگر آخر میں اپنوں ہی کی سازش سے جان ہار بیٹھا۔ قسط وار کہانی آوارہ گرد کا ہیرو شہزی تو اب سپرمین بنتا جارہا ہے۔ کوہ مری کے محمد کبیر صاحب کی رائے سے سو فیصد متفق ہوں کہ مغل صاحب کی قسط وار کہانی انگارے مایوس کن رہی۔ پاکستان کا جاگیردارانہ ماحول اور پولیس کے مظالم کوئی نئی بات نہیں۔ اس ماہ زیادہ تر مغربی کہانیوں کے تراجم نظر آئے۔ البتہ کارٹون کافی اور شاندار تھے۔''

جہلم سے توال اور مشال کی وجوہات ''اس بار اتنے دن بعد حاضری دی ہے اس کے لیے بہت بہت معذرت۔ بات یہ ہے کہ آپی کی طبیعت خراب تھی اور ہمارا راستہ بھی بارشوں کی وجہ سے خراب ہوجاتا ہے اس لیے شہر جا نہیں سکے۔ سو جاسوسی اس بار 10 اگست کو ملا اور ساتھ ہی جولائی کا شمارہ بھی۔ آپی تو گھر آتے ہی جاسوسی لے کر بیٹھ گئی اور انگارے پڑھ کر دم لیا۔ اب آتی ہوں تبصرے کی طرف جو کے آپی کی زبانی۔ سرورق دیکھ کے سب سے پہلے چینی نکتہ چینی میں قدم رکھا۔ سرورق بہت زبردست تھا جو لڑکی تھی وہ ہماری مشال کے جیسی تھی اور وہ ماسک اور گولی کچھ سمجھ نہیں آئی سو اپنی محفل میں آپہنچے۔ سب سے پہلے تو معراج محبوب عباسی موجود تھے۔ بہت اچھا تبصرہ کیا۔ زویا اعجاز آپ نے تو محفل لوٹ لی۔ محمد کبیر عرف شہزادہ کو ہماری ویری ویلڈن، بہت ٹائم بعد حاضری دی آپ نے۔ ہماری امی کو آپ کا تبصرہ اچھا لگا اور ہم اتنے وقت حاضر نہیں ہو سکے تو کسی نے ہمیں یاد نہیں کیا ہمارا سب سے گلہ ہے اور یہ بتائیں کہ فیس بک پر آپ سب سے رابطہ کیسے کریں۔ فاروق انجم، اعظم خان، کاشف عبید، مظہر سلیم، احسان سحر، سب کے تبصرے اچھے لگے۔ باقی سب کے تبصرے بھی اچھے تھے، کھیوڑا کے شفقت محمود، آپ کا پہلا تبصرہ اچھا لگا۔ نادر سیال، محمد صفدر معاویہ آپ کے تبصرے جان دار تھے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے انگارے پڑھی۔ واہ طاہر جاوید مغل آپ کمال کا لکھتے ہیں۔ میری درخواست ہے کہ اگر طاہر صاحب کا فون نمبر مل جائے یا آپ ان کو ہمارا نمبر دے دیں، ہمیں بہت شوق ہے ان سے بات کرنے کا۔ اس کے بعد سرورق کے دونوں رنگ بہت اچھے تھے۔ دونوں کا اختتام اچھا ہوا۔ چھوٹی کہانیوں میں چالباز، اشارہ اور آزادی پڑھ چکی باقی کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔''

لاہور سے عبدالجبار رومی انصاری کی کاوش ''خوب صورت دوشیزہ کی بالوں سے بندھی گوری حسن سے جرم کی چھیڑ چھاڑ کو ظاہر کررہی تھی۔ پستل کی لبلبی پر انگلی رکھے آدمی بھی خطرناک لگ رہا تھا۔ بے جان ماسک سے بہتا خون بھی مجبور و بے کس انسانوں سے کھیلنے کی دلگداز تصویر پیش کررہا تھا۔ فہرست پہ نظر ڈالتے اداریے میں پہنچا تو یہ وطنِ عزیز کی زبوں حالی پر نوحہ کناں تھا۔ معراج محبوب عباسی جانے کیسے گھما پھرا کے مسند پر براجمان تھے۔ زویا اعجاز کی میٹھی یادیں بھی وقفے کے بعد دلکشی و نزاکت کا باعث بنی ہیں، اسی طرح محمد کبیر عباسی بھی آخری پیپر دے کر محفل میں پہنچ گئے ہیں، اچھی بات ہے۔ کاشف عبید چکر لگانے کا صلہ مل گیا۔ انعامی شمارے کی مبارک ہو۔ بے نام صاحب تحریر سے تو نامور لگتے ہیں پھر اپنا نام لکھنا کیسے بھول گئے؟ عذرا ہاشمی کی تبصرہ نگاری بھی زبردست رہی۔ نادر سیال اب تو ہر طرف ہی موسم خوشگوار ہے۔ عروج ناز رونقِ محفل تو عروج پر ہی اچھی لگتی ہے۔ مختصر مگر اچھا لکھا آپ نے بھی۔ انگارے میں شاہ زیب کے لیے نئے نئے در کھل رہے ہیں اور اس کی بار بار

کے وعدوں کی پابندیوں تلے دبی ہوئی طاقت اپنے جائز حقوق کے لیے لڑنے پر سامنے آرہی ہے۔ آخر میں عاشرہ کی ہونے والی زورازوری کی شادی میں رنگ میں بھنگ ڈالنے کے لیے شاہ زیب کو دعوت دی جارہی ہے۔ دوسری طرف فل ایکشن آوارہ گرد بھی جنگی جنون لیے شہزی اور بیگم صاحب کے لیے دھماکاخیز خبروں کے ساتھ دشمن کی نئی چالیں سامنے آرہی ہیں۔ آصف ملک کی بے خطا میں حیران کن طور پر بین کی لاش نے گرتے پڑتے بھی اپنا کام کر دکھایا۔ محمد ابراہیم جمالی کی آزادی بھی پُراثر تحریر تھی۔ جاسوسی میں ایسی شاہکار تحریریں دل موہ لیتی ہیں جن میں باریک بینی سے سراغ رسانی کی ہوئی ہو۔ دنیا میں عجیب وغریب طریقے سے وارداتیں کی جاتی ہیں۔ سرورق کی پہلی کہانی اشکِ سنگ میں فن کی آڑ میں زندہ انسانوں کے مجسمے تیار کرنا، اف اس قدر گھناؤنا کام لیکن اس طرح کا جرم بھی آخر اپنے انجام کو پہنچ ہی جاتا ہے۔ فوزیہ کی ہمت نے بھی کام دکھایا اور وہ بچنے میں کامیاب رہی۔ سرورق کی دوسری کہانی بھی زبردست رہی۔ آخر میں جیا کی عقل نے کام کیا۔ پسِ چہرہ بہترین کہانی تھی۔ سنگِ گراں میں محبِ وطن سلطان کی کوششیں رنگ لائیں۔ لیکن اینڈ پہ آ کے دوغلی پالیسی رکھنے والوں نے سلطان اور اس کے والد کو منظر سے ہی غائب کر دیا اور بے حیت وخود غرض صیبی اینڈ کمپنی مگرمچھ کے آنسو بہاتے ہوئے قیمتی جو ہلو کو ہڑپ کرنے میں کامیاب رہے لیکن کہیں نہ کہیں ان سب کو اپنے کیے کی سزا ضرور ملی ہوگی کیونکہ جرم کا ایک نہ ایک دن انجام برا ہی ہوتا ہے۔''

عرفان راجہ، گوجر خان سے لکھتے ہیں''سرورق پر یومِ آزادی مبارک کے الفاظ دور دور تک نظر نہیں آئے۔ معراج محبوب عباسی نے گھما پھرا کر رکھ دیا۔ زویا اعجاز کی آمد بھی خوب رہی۔ کبیر عباسی کی بھی وہی روایتی شکایتیں اور آپ کا وہی روایتی جواب۔ (نہ جی نہ ہمارے بارے میں ایسا مت کہیں) اعظم خان! عورت، ماں، بہن اور بیٹی وغیرہ کے قابلِ احترام روپ میں موجود ہے لیکن اس کے باوجود لڑائی جھگڑوں کی بنیادی تکون میں اس کی حیثیت بھی اہم ہے۔ پتا نہیں کیوں؟ احسان سحر آپ بھی اس پر رائے دیں۔ ہم شہر مرحا گل اور عبادت کا ظمی محفل میں بھی آگے پیچھے جگہ حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ بشریٰ افضل کی اختصار نویسی بھی اچھی رہی۔ صفدر معاویہ بھی تعریفی ٹوکروں کے ساتھ شامل تھے۔ انگارے کی پہلی اور دوسری قسط پڑھ کر اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ کہانی بھی بقیہ کہانیوں کی طرح مغل صاحب کی تاوان سے اخذ شدہ ہوگی۔ یعنی پلاٹ کے لحاظ سے۔ بہرحال مغل صاحب کی جذبات نگاری اور منظر نگاری خاصے کی چیز ہوتی ہے۔ آوارہ گرد کی یہ قسط پڑھ کر محسوس ہوا کہ شاید یہ اختتام کی طرف جارہی ہے۔ اس قسط میں بھی تیز رفتاری عروج پر رہی۔ دوسرا رنگ پسِ چہرہ میں کاشف صاحب نے موضوع اچھا منتخب کیا لیکن صحیح انصاف نہ کر سکے۔ اشکِ سنگ کا موضوع حقیقت سے کافی پرے تھا۔ انسان کو مارنے کے بعد مجسمے کی شکل دینا، کچھ ہضم نہیں ہوا۔ بہرحال کہانی میں ڈاکٹر صاحب نے پولیس کے روایتی کارناموں سے ہٹ کر کارنامہ بتایا۔ ابتدائی کہانی سنگِ گراں کی صورت میں پروین زبیر حاضر تھیں۔ کہانی کی ابتدا اچھی تھی لیکن اختتام غیر متاثر کن تھا۔ اختتام میں برائی اور جرم کو غالب دکھایا گیا ہے۔ بے خطا میں بین اور گھڑی کی گواہی میں بھی شکاری خود شکار ہو گئے۔ منظر امام کی کہانی وہ ایک رات میں کالون اور ایکی راجر کی بری صحبت کی وجہ سے مصیبت میں پھنسے۔ سرخ دھبے میں قتل کے حیاتیاتی طریقے کو اپنایا گیا مگر جرم بھی چھپتا نہیں۔ آزادی مختصر ترین تحریر تھی لیکن ہماری ذہنی غلامی کی عکاس ثابت ہوئی۔''

کراچی سے حسن افضال کا انتباہ''4 جولائی کو جاسوسی ڈائجسٹ کا دیدار نصیب ہوا۔ فوراً خریدا اور گھر پر آ کر قارئین کی محفل میں اپنا نام دیکھا تو بے حد خوشی ہوئی۔ اگست کا شمارہ بھی 4 تاریخ کو ہی دستیاب ہو سکا۔ قارئین کے تبصرے بڑے دلچسپ اور رنگا رنگ پائے۔ اللہ ان سب کو شاد و آباد رکھے، آمین۔ میرے بلکہ ہم سب کے پسندیدہ لکھاری اور الفاظ کے سحر میں ہمیں جکڑنے کے ماہر جناب طاہر جاوید مغل کی انگارے بڑی دلچسپ اور جاندار کہانی ہے۔ گو کہانی کا پلاٹ پرانا ہے لیکن مغل صاحب نے الفاظ کی کاریگری سے کام لے کر ہمارے معاشرے کی جو تصویر کشی کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی آوارہ گرد بڑی دھواں دھار کہانی ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار شہزاد احمد خان عرف شہزی ایک زندہ کردار معلوم ہوتا ہے، پہلی قسط سے ہی یہ کہانی قارئین کے دلوں کی دھڑکن بنی ہوئی ہے۔ اشکِ سنگ میں بھٹی صاحب نے جو سنسنی پھیلائی ہے، اس کا مزہ ابھی تک برقرار ہے۔ سلیم انور صاحب کی گھڑی کی گواہی، آصف ملک صاحب کی بے خطا، پرویز زبیر صاحبہ کی سنگِ گراں اور منظر امام صاحب کی وہ ایک رات بھی دلچسپ اور مؤثر کہانیاں ثابت ہوئیں۔ برائے کرم پروف ریڈنگ پر بھی توجہ دیں۔''

ہری پوری ہزارہ سے معراج محبوب عباسی کی محبوبیت''جاسوسی کا ماہ آزادی کا پرچہ 6 اگست کو عین طلوعِ چاند کے اوقات میں یعنی سات بج کر 30 منٹ پر دستیاب ہوا۔ اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں ایک اچٹتی نگاہ ٹائٹل پر ڈالی اور تفصیلی پوسٹ مارٹم گھر آ کر کیا۔ ٹائٹل گرل کا گولی کا وار بالوں کی لٹ سے روکنا کسی شعبدے سے کم نہیں تھا جبکہ ایک خوفناک صورت آدمی پستول کے فائر سے عید سعید کی مبارک باد دے رہا تھا۔ مدیر صاحب حسبِ سابق حکمرانوں کی بے حسی اور عوام کی بے بسی کا رونا روتے نظر آئے۔ یہاں کے عوام پر آنے والی ہر مصیبت کو ہمارے اربابِ اختیار سیاست چمکانے کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ اگر ڈیم بنا دیے جائیں تو سیلاب نہ آئے۔ لوڈشیڈنگ ختم ہو جائے، لیکن پھر یہی ضمیر فروش ووٹ کس طرح لیں؟ اگر عوام پُرامن، خوش حال، پُرسکون ہوں گے تو ان میں شعور آئے گا جو نصف صدی سے گدی نشین حکمراں طبقہ کبھی نہیں چاہے گا۔ ان کی سیاست صرف لانگ شوز پہن کے فوٹو سیشن تک محدود ہے۔ محفل میں ہمارے تبصرے کو فرسٹ پوزیشن ملی، خود کو کرسیِ صدارت پہ دیکھ کر بے خودی میں گنگنا اٹھا۔''دینے والا جب بھی دیتا ہے چھپر پھاڑ کے۔'' لہٰذا اس بار مجھے ہی مبارک باد... ہاہاہا... شہزادہ کو ہسار آپ تو آگئے پہلے تبصرے میرا مطلب ہے 2015ء کے پہلے تبصرے کے ساتھ مگر انکل سیانے کو کہاں پھینک کر آ گئے؟ احسان سحر اگر آپ کو ہمارا خبرنامہ سیاست اور سیاست دانوں کے بنا بھی پسند آیا شکریہ، حالانکہ آج کل تو اسی چینل کی ریٹنگ اوپر ہوتی ہے جہاں دو سیاست داں بیٹھے ایک دوسرے کو تاڑ رہے ہوں۔ اس کے علاوہ زویا اعجاز، محمد کبیر، احسان سحر، ساگر لکوکر، عذرا ہاشمی، محمد صفدر معاویہ کا شکریہ، نیوز بلیٹن کو پسند کرنے کا۔ مرحا گل کو

انعامی ڈائجسٹ ملنے پر مبارک باد۔ جبکہ پچھلی بار کے چیمپئن قاسم رحمان کو بلیک لسٹ کر کے زیادتی کی گئی۔ جاسوسی میں مغلیہ دور کی نشانی، طاہر صاحب قدم رنجہ فرمائیں اور ان کو اول پہ نہ رکھیں، ناممکن ہے بھائیو! اس لیے پہلے انگارے پڑھی جہاں شاہ زیب صاحب مسلسل انگاروں پر لوٹ رہا ہے۔ اس قسط میں ہمارے ملک کے دگرگوں حالات کی بھرپور عکاسی کی گئی۔ وہ جو اسلامی جمہوریہ پاکستان تھا اس کو ہم نے پولیس اسٹیٹ آف پاکستان بنا کے رکھ دیا ہے مگر کہانی میں ایک حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ تابی (شاہ زیب) کو بھی شاید عمران (داؤد) مل گیا۔ یعنی ''رب نے بنادی جوڑی''۔ اس کے بعد کاشف زبیر کی پس چہرہ پڑھی۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دھوکا دیتے ہیں یہ بازی گر کھلا

اس ایک شعر کے گرد گھومتی رہی کہانی، بہرحال زبردست رہی۔ آئی ٹی کی دنیا کے اسرار و رموز سے کافی حد تک آگاہی ملی ہے۔ اب باری تھی عبدالرب بھٹی کی جو ڈبل کراس کرنے آئے۔ ارے میرا مطلب ہے ڈبل دھماکا کرنے آئے۔ پہلے سوچا کہ احمد شہزاد کے کارنامے دیکھ لیں کہ کس ایورج سے کھیل رہا ہے۔ اسپیکٹرم شہزی سے اتنی چوٹیں کھا چکی ہے کہ کسی بھی وقت اپنی تمام تر توانائی کے ساتھ اس کا گھیراؤ کر سکتی ہے۔ آخر میں ملنے والی خبر عین ممکن ہے کہ عابدہ بھابی کی جانب سے ہو۔ چلو اگلی قسط میں پتا چل جائے گا کہ کس میں کتنا ہے دم اور کون کتنے پانی میں ہے۔ بھٹی صاحب کی ہی دوسری تحریر اشکِ سنگ بھی سسپنس سے بھرپور تھی۔ آخر تک کہانی کے تانے بانوں میں الجھے رہے۔ منظر امام کی وہ ایک رات، میں تینوں دوست اپنے دوست کو بچانے روانہ ہوئے تو خود ہی گم ہو گئے۔ راجر نے سب کو اپنے رنگ میں رنگ دیا اور ان کا انجام بھی اپنے جیسا بنا دیا، ایس انور کی اشارہ میں پولیس اور سراغ رساں نے بڑی مہارت سے ڈینی کی قاتلہ جو اس کی ایکس محبوبہ بھی تھی، کو سلاخوں کے پیچھے دھکیلا۔ ایک ناخن نے ڈھول کا پول کھول دیا۔ چپ رہے گی گر زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا۔ چالباز میں ولی نے بڑی چالاکی کے ساتھ سوزان اور فرنانڈو کے طلن کا سامان کیا اور مونیکا کی خاطر خاصی تگ و دو بھی کی۔ بے خطا میں اجرتی قاتل کا آخری نشانہ بھی آن دی ٹارگٹ لگا۔ آزادی، محمد ابراہیم جمالی کی تحریر کردہ ایک حساس اور اچھوتی تحریر تھی۔ اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ ہم نصف صدی سے زیادہ گزرنے کے بعد بھی آزاد نہیں ہوئے بلکہ یہ غلامی اور بھی خطرناک ہے کیونکہ اس بار ہم یہ طوق بہ خوشی اپنے گلے میں پہننے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔''

عذرا ہاشمی کا گڑھ موڑ سے اظہارِ خیال ''4 تاریخ سے ہی بک اسٹال کے چکر لگانے شروع کر دیے۔ 5 کی صبح کو جواب ملا کہ جاسوسی جھنگ پہنچ چکا ہے اور وہاں سے ہمارے شہر کے مطلوبہ پرچوں کا بنڈل ویگن پر رکھوا دیا گیا ہے ایک گھنٹے بعد ملے گا۔ ایک گھنٹے بعد گئے تو رسالہ ندارد، استفسار پر جواب ملا کہ تریموں ہیڈ پر سیلابی پانی کو بڑھتا دیکھ کر ہچکولے لے کر مطلوبہ ویگن کوما میں چلی گئی ہے، مسافروں نے ویگن بدل لی مگر جاسوسی ڈائجسٹ کے بنڈل کے لیے بے پائیگی کی بنا پر ایسا ممکن نہ ہو سکا اور وہ ویگن کی تیمارداری میں معروف ہے۔ جاسوسی کے نہ ملنے سے دکھ سے دل بھر گیا۔ ہماری حالت دیکھ کر دکاندار بھائی بھی افسردہ ہو گئے اور ہماری زندگی کی بہترین آفر کر دی کہ جیسے ہی پرچہ آتا ہے بچے کے ہاتھ گھر بھجوا دیں گے۔ طویل عرصے سے جس کی خاطر ہم آبلہ پا ہو رہے ہیں، تھا جس کا انتظار جاسوسی کا شاہکار شام 6 بجے بنفس نفیس آ گیا۔ سرورق منفرد سا لگا۔ ٹائٹل گرل کے ہونٹ بہت پیارے لگے اور سونے پہ سہاگا لپ اسٹک کا شیڈ اور بھی پیارا۔ بالوں کی لٹ میں گولی کو لپیٹنے کی وجہ انکل آپ ہی بتا دیں؟ مونچھوں والے صاحب کے پاس عجیب پستول دیکھا جو گولیوں کے بجائے عید مبارک کی بیلیں فائر کر رہا ہے۔ پلیز انکل جی ہمیں بھی بتا دیں ایسا پستول کہاں سے ملتا ہے ہمیں خریدنا ہے۔ ہر عید پر جب اپنے میاں کے کان پر رکھ کر فائر کریں گے تو ان کی حالت اور وہ سماں دیدنی ہوگا۔ عباسی صاحب گھما پھرا کے آپ کا تبصرہ اچھا لگا۔ محمد کبیر، عبادت کاظمی، منظہر سلیم ہاشمی، احسان سحر اور زویا اعجاز کے تبصرے جاندار اور زبردست تھے۔ بشریٰ افضل صاحبہ آپ ٹھیک کہتی ہیں یہ ''محبّا'' منہ دیکھی محبت کی قائل ہے۔ فلک شیر ملک صاحب ہم آپ کے موقف کی تائید کرتے ہیں۔ صفدر معاویہ، شکیل کاظمی کے آگے اپنے غلط موقف کو سچ ثابت کرنے کے لیے طاہر جاوید مغل صاحب پر تنقید کر کے ہم سب کو دکھی کر دیا ہے آپ نے اور آخر میں انگارے کی تعریف کر کے پھر اپنے آپ کو غلط ثابت کر دیا آپ نے۔ کیا یہ کھلا تضاد نہیں ہے؟ سید محی الدین اشفاق صاحب کا نام بلیک لسٹ میں دیکھ کر دکھ ہوا۔ ایک تو ان کا شہر سیلاب میں ڈوبا ہوا ہے اوپر سے ان کا خط بھی شاملِ اشاعت نہ ہو سکا اللہ ان کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، آمین۔ اشفاق صاحب اگر ممکن ہو سکے تو اپنی خیریت سے مطلع فرمائیں۔ سب سے پہلے انگارے پڑھی۔ شاہ زیب کے متعلق ہمارا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ مغل صاحب نے ہمارے موجودہ ملکی حالات کو بہت خوب صورتی سے کہانی کے قالب میں ڈھالا۔ انھی فرعون نما انسانوں کی چیرہ دستیاں ہمارے وطنِ عزیز کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہیں۔ آوارہ گرد بھی زبردست جا رہی ہے۔ اس کہانی کے متعلق ہمارا اندازہ سچ ثابت ہونے والا ہے کہ عابدہ ضرور اغوا ہو گی۔ نیلی کا باب اختتام پذیر ہوا اور شہریار کی ٹریننگ بھی مکمل ہو گئی، بھٹی صاحب زبردست۔ باقی کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔

کراچی سے عامر انجم عراقی کی صحیح واپسی ''اگست کا شمارہ پہلے روز ہی حاصل کرنے کے لیے کئی چکر لگانے پڑے اور پڑھا بھی تمام وقت کو فارغ کرتے ہوئے۔ اس سے پہلے فروری میں میرا خط ان قارئین کی لسٹ میں آیا جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے تھے لیکن یہ کیا لکھا گیا ابنِ ساغر بے قرار عرف بے قراری (نامعلوم) ایک طرف تو خط پر کراچی کا پتا تھا تو نامعلوم کیونکر ٹھہرا۔ ویسے بندۂ ناچیز کو ایک زمانہ جانتا ہے۔ خیر پھر ایک خط پاکیزہ کے لیے اپنے قلمی نام سے نہیں اصل نام سے لکھا جو دراصل ایک کہانی کی صورت تھا۔ لیکن جاسوسی کے لیے خط مع کہانی ''ضد'' اور پاکیزہ کے لیے ''دو رنگی'' جو شائع اب تک نہ کی گئی۔ حالانکہ تکنیکی لحاظ سے میری شاندار تخلیق ہے۔ اگر ادارہ اس کی اشاعت میں دلچسپی نہیں رکھتا تو واضح لکھ دیا جائے، میں کسی ٹی وی ڈرامے یا فلم کے پروڈیوسر سے رابطہ کر لیتا ہوں۔ اصل میں مقصد قلم کار ہو کر پیسے کمانا نہیں کیونکہ خدا کا دیا بہت سے بہت ہی زیادہ ہے۔ بس

گزرے کچھ اداس دنوں میں جاسوسی ساتھی بنا اور ایسا کہ 2010ء سے اب تک کے رسالے خرید کر پڑھ ڈالے اور اب مہینا وار رسالے پڑھ رہا ہوں۔ جاسوسی رسالے سے ایک محبت ہوگئی ہے۔ خیر کچھ تبصرہ اس ماہ کے رسالے کا تو سرورق پر دو تربوز نما چہرے کا نقاب اترا تو کیا خوب صورت، دلفریب اور معصوم حسن ابھر تا نکھرتا نظر آتا ہے لیکن یہ کیا؟ پستول کا ظلم کیسا؟ چلیں دنیا میں چلتا ہے سب سے پہلے آوارہ گرد پڑھی، شاندار کہانی کا شاندار سلسلہ۔ لیکن ایسا محسوس اس قسط سے ہوا کہ کہانی کو جلد ختم کرنے کا ارادہ ہے۔ انگارے کی دوسری قسط اچھی رہی۔ انگارے کی کہانی واقعی طاہر جاوید مغل صاحب نے زبردست انداز میں شروع کی ہے۔ واقعی جس کا اتنا انتظار میسجا کے بعد تھا پورا ہوا۔ سرورق کی پہلی کہانی اشک سنگ، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کا اس رسالے میں ایک اور اچھا اضافہ۔ کہانی پسند آئی بلکہ سب کو پسند آجانی چاہیے۔ سرورق کی دوسری کہانی پس چہرہ، کاشف زبیر صاحب کی کہانی جتنی بھی اچھی ہو ہمارے دماغ میں ان سے بہتر سے بہتر کی امید رہتی ہے۔ ویسے جیا بچے شاباش۔ باقی رسالہ زیر مطالعہ رہے گا۔ مزے لے لے کر پڑھیں گے جناب۔ پہلے تبصرے پر خوش آمدید! جہاں معراج محبوب عباسی موجود رہے۔ اب نئے لوگ آتے جاتے ہیں اور پرانے دنیا کے بکھیڑوں میں گم ہو جاتے ہیں جیسے ہماری ڈیئر بہن ماہا ایمان جو شاید بلکہ یقیناً زندگی کی دوسری لازمی وابستگیوں کی ہو کر رہ گئی ہیں۔ خیر سب دوستو اور جاسوسی کے متوالو، جاسوسی پڑھنے کے تعلق کو کبھی ختم نہ کرنا، چند سکے ہر ماہ جاسوسی کے نام کر دو گے تب ہی بڑھتے قارئین کے ساتھ اس کا اعلیٰ معیار برقرار رہے گا۔'' (یہ بھی واضح کر دیتے کہ اصل نام سے خط شائع کیا جائے یا قلمی نام سے)

محمد اقبال کی آمد کراچی سے ''حسبِ معمول اگست کا شمارہ حاصل کرنے کے لیے کوئی خاص تگ و دو نہیں کی کیونکہ بک اسٹال گھر کے قریب ہے اور جیسے ہی رسالہ بک اسٹال پر آتا ہے تو ایس ایم ایس کے ذریعے اطلاع مل جاتی ہے کہ بھائی جان آپ کا پسندیدہ رسالہ آگیا ہے، اس ایس ایم ایس سروس کو حاصل کرنے کے لیے اسٹال والے بھائی سے دوستی بنانی پڑی کیونکہ ہمارے من پسند رائٹر طاہر جاوید مغل صاحب ہر ماہ باقاعدگی سے جلوہ افروز ہوں گے انگارے کی صورت۔ ادارے کا بہت شکریہ کہ طاہر جاوید مغل صاحب کو واپس لائے جاسوسی میں۔ سرورق پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے فہرست دیکھی اس کے بعد اداریہ پڑھا جس میں سیلاب متاثرین کے دکھ نظر آئے اور حکومتِ وقت آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھی بنی ہوئی ہے اور خاطر خواہ انتظامات کرنے کے بجائے ہر مرض کی دوا فوج کو آزمائش اور مصیبت کی ہر گھڑی میں آگے کھڑا کر دیتی ہے اسی لیے پاکستانی عوام افواجِ پاکستان کو ڈھیروں پیار کرتی ہے، ان کی کامیابیوں کے لیے دعا گو رہتی ہے اور ساتھ ہی میں یہ دعا بھی کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ افواجِ پاکستان جیسی بے لوث سیاسی قیادت پاکستان کو میسر کرے، آمین۔ اپنی محفل میں پہنچے تو بھائی معراج محبوب عباسی کو بہت عمدہ تبصرہ کے ساتھ پہلے نمبر پر پایا، مبارک باد قبول کیجیے۔ باقی ساتھیوں کے تبصروں میں کچھ پسند آئے اور کچھ...... اس کے بعد انگارے شروع کی تو ختم ہونے تک کوئی ہوش نہ رہا، شاہ زیب کی صلاحیتیں اس کے نہ چاہنے کے باوجود خود بخود کھلتی جا رہی ہیں، قدرت کی طرف سے پریشانیاں آتی ہیں تو مدد بھی وہیں سے آتی ہے شاہ زیب کو قدرت نے داؤد بھاؤ سے ملا دیا جس نے شاہ زیب کی ہر موقع پر مدد کی اور اپنے ایک ساتھی انیق کو مسلسل اس کے ساتھ کر دیا جو شاہ زیب کا بھرپور طریقے سے ساتھ دے رہا ہے، ٹیپو بہت اچھا جا رہا ہے، اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ اس کے بعد پروین زبیر صاحبہ کے قلم سے لکھی گئی تحریر سنگِ گراں کا مطالعہ کیا۔ اس کہانی کو ایک ہی نشست میں ختم کر کے دم لیا۔ واہ کیا منظر نگاری ہے اور جذبۂ حب الوطنی کو خوب صورتی سے ابھارا گیا ہے۔ سلطان کے ساتھ ظالموں نے بہت برا کیا۔ اس کے بعد آوارہ گرد پڑھی، یہ بھی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے، شہزی ایک کمانڈو میں تبدیل ہو چکا ہے جو اپنی صلاحیتیں بہترین طریقے سے آزما رہا ہے۔ لگتا ہے اس کی جدوجہد اسے بہت جلد اس کی منزل تک پہنچا دے گی۔ سرورق کا دوسرا رنگ پس چہرہ، کاشف زبیر کی دلچسپ تحریر تھی۔ کہانی میں صورت حال پل پل بدلتی رہی جس نے کہانی کو چار چاند لگا دیے۔ وہ ایک رات، منظر امام کی مزاح کی چاشنی لیے شگفتہ تحریر تھی۔ آزادی، محمد ابراہیم جمالی کی تحریر کردہ ایک حساس اور اچھوتی تحریر تھی۔ باقی کہانیاں آہستہ آہستہ پڑھیں گے کیونکہ اگلے ماہ تک انتظار جو کرنا ہے۔''

نامعلوم صاحب کی حاضری... نامعلوم مقام سے ''اس بار جاسوسی سخت تپتی دوپہر میں ملا۔ سرورق پر موجود حسینہ یقیناً میری طرف دیکھ رہی تھی لیکن ساتھ میں موجود جلاد صفت آدمی ہاتھ میں پستول لیے تنبیہ کر رہا تھا کہ اپنا کام کرو اور نیچے بنے خول میری بے بسی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ خیر میں نے بھی عافیت اس میں جانی کے فوراً آگے گزر گیا۔ کہانیوں کی فہرست اچھے انداز میں تھی اس کے بعد چینی نکتہ چینی میں پہنچے اور اپنا تبصرہ دیکھنے لگے۔ اس بار تمام بھائیوں اور بہنوں کے تبصرے اچھے لگے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے آوارہ گرد پڑھی، یہ قسط اچھی رہی، جان ورگھما کا انوکھا کردار پسند آیا۔ زبیر خان کے خلاف سازش ظاہر کر کے شہزی نے زبیر خان کا اعتماد جیت لیا ہے لیکن وزیر جان نے اپنی اصلیت دکھا دی ہے۔ لگتا ہے وزیر جان اب عابدہ کو امریکا میں گرفتار کروائے گا۔ شہزی کے والدین کے بارے میں بھی جلد پتا چل جائے گا۔ اس کے بعد انگارے پڑھی۔ دوسری قسط اس قدر ایکشن میں تھی ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں بھی شاہ زیب کے ساتھ ہوں، تصور کی آنکھ میں تمام مناظر فلم کی صورت میں چل رہے تھے داؤد بھائی کا کردار اچھا لگا۔ اس بار کی کترنیں اچھی تھیں دیر تک لوٹ پوٹ ہوتے رہے۔'' (تمام قارئین سے کئی بار درخواست کی جا چکی ہے کہ خط کے آخر میں اپنا نام، شہر کا نام ضرور تحریر کریں... مگر...)

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

حمیرا اقبال، کراچی۔ کاشف عزیز، کوٹری۔ حرا مختار، ٹنڈو آدم۔ فرحان شیخ، کراچی۔ وقار محمود، میرپورخاص۔ شہباز خان، کراچی۔ عذرا ضمیر، کراچی۔ ماہین آفتاب، حیدرآباد۔ لیاقت حسین، راولپنڈی۔ آصف محمود، گوجرانوالہ۔

بیماریاں اور صحت بخش زندگی غرض ہر شے قبضۂ قدرت میں ہے... بیماری ہے تو اس کا توڑ بھی کہیں نہ کہیں موجود ضرور ہوتا ہے... اہمیت اس کی تلاش و کھوج کی جستجو ہے... ڈینگی، کرونا وائرس... کانگو وائرس اور نیگلیریا جیسے نت نئے خوفناک وائرس... جن کے نام بھی کبھی نہ سنے تھے... مگر سب سے خطرناک وائرس خود انسان ہی ہے... جاسوسی کے اولین صفحات پر روبن کک کے بیسٹ سیلرز ناولز میں سے بہترین کا انتخاب... جس کی ہر سطر میں ایکشن... تجسس... جاسوسی... اور سنسنی بھرپور انداز میں رچی بسی ہے... ایک پری وش ڈاکٹر کو پیش آنے والے جان لیوا... پُراسرار اور خوفناک واقعات... ایبولا جیسے خون آشام وائرس کے ساتھ بھیانک تصادم... ایک ایسا ننھا وائرس جسے انسانی آنکھ سے دیکھنا بھی ممکن نہیں، وہ بستیوں کی بستیاں موت کے اندھیرے میں ڈبونے کی طاقت رکھتا تھا... متواتر خون میں لت پت لاشیں گرتی رہیں... مگر وہ وائرس ہاتھ نہ آیا... ڈاکٹر آتے رہے اور جاتے رہے... تحقیق و تلاش کا سفر جاری و ساری تھا.. ایک طرف انسانیت کے رکھوالے تھے تو دوسری طرف وائرس سے بھی خطرناک جان لیوا درندے... جو ایک ایسی جنگ لڑنے میں برسرِپیکار تھے... جس کے نتیجے میں صرف تباہی و بربادی تھی...

ایبولا

امجد رئیس

بے وسیلہ وتنِ تنہا جہان پر
کھیلی جانے والی بازی کے
جاں گسل واقعات...

زائر کے بمبا نامی گاؤں میں سپیدۂ سحر، تیرگیِ شب کو پسپائی پر مجبور کر رہا تھا۔ علمِ حیاتیات (Biology) کا اکیس سالہ طالبِ علم جان نارڈانگ بمبا گاؤں کے شمالی کنارے پر قیام پذیر تھا۔ وہ نائلون کے پہاڑی خیمے کے اندر سلیپنگ بیگ میں پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔

جنگل اور گاؤں شانہ بشانہ بیدار ہونا شروع ہو چلے تھے۔ دونوں کی آوازیں ایک دوسرے میں مل کر ایک نئی آواز پیدا کر رہی تھیں۔ گھنے درختوں کی چھتر سایہ آسمان تک نگاہ کی رسائی میں حائل تھی۔

جان نارڈانگ، صحت مند حالت میں سویا تھا۔ اب وہ اٹھ کر بیٹھا تو اسے کمزوری کا احساس ہوا۔ گزشتہ رات عشائیے کے بعد اسے ایک گھنٹے کے لیے ٹھنڈ اور بخار کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کا خیال ملیریا کی جانب گیا تھا۔ اگرچہ وہ محتاط رہتا تھا اور کلورو فاسفیٹ حفظِ ماتقدم کے تحت زیرِ استعمال رکھتا تھا۔ تاہم مچھروں سے بچنا ایک بڑا مسئلہ تھا۔ جن کے بادل کے بادل شام ہوتے ہی دلدلوں اور پوشیدہ جوہڑوں سے پرواز کرتا

شروع کردیتے۔

لیکن آج صبح بیدار ہوتے ہی جان نے اپنی طبیعت میں کل کی نسبت واضح فرق محسوس کیا۔

وہ تھکی تھکی چال کے ساتھ گاؤں تک پہنچا اور قریبی اسپتال کا پتا دریافت کیا۔ ''یامبوکا'' میں ایک بیلجیئن مشن اسپتال تھا۔ اسے ادراک ہوگیا تھا کہ وہ بیمار ہو چکا ہے۔ جان کو خوف بھی محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے اپنا مختصر سامان سمیٹا اور ''یامبوکا'' کے لیے روانہ ہوگیا۔ اسے چند کلومیٹر کا سفر کرنا تھا۔

جان، یل (Yale) کالج کا طالب علم تھا۔ وہ افریقی جانوروں کی فوٹوگرافی کے لیے چھ ماہ کی چھٹی لے کر آیا تھا۔ اس کی خاص دلچسپی ہائی لینڈ گوریلا میں تھی جس کی نسل معدومی کے خطرے سے دوچار ہو رہی تھی۔

یامبوکا گاؤں نسبتاً بڑا تھا۔ تاہم بیلجیئن مشن اسپتال کو دیکھ کر جان کو مایوسی ہوئی۔ عمارت ادھ جلے کوئلے جیسی اینٹوں کے چند کمروں پر مشتمل تھی۔ جس کی حالتِ زار مکمل مرمت کا تقاضا کر رہی تھی۔ جان کو وہاں الیکٹرک سپلائی کے آثار بھی دکھائی نہ دیے۔ بہرحال نہ ہونے سے کچھ ہونا غنیمت تھا۔ وہ بھی دوسرے مریضوں کے ساتھ شامل ہو گیا۔

نمبر آنے پر ایک بیلجیئن ڈاکٹر نے اسے دیکھا۔ ڈاکٹر کوٹوٹی پھوٹی انگریزی آتی تھی۔ اس نے تیزی سے معائنہ کیا اور ''ملیریا'' کا اعلان کر دیا۔ ملیریا کی توقع جان کو پہلے سے تھی۔ ڈاکٹر نے ایک انجکشن لگا کر اسے رخصت کر دیا۔ ساتھ ہی ہدایت کر دی کہ بہتری نظر نہ آئے تو وہ کل پھر آجائے۔

تشخیص و تجزیے کے بعد اسے ٹریٹمنٹ روم میں بھیج دیا گیا۔

جان خوش تھا کہ اگلے چند روز اس کے بہتر گزرے۔ وہ یامبوکا میں ہی رہا اور بڈزا قبائل کی تصویر کشی میں مگن رہا۔

تیسرے روز جان نے اپنے اصل سفر کی تیاری پھر سے شروع کردی۔ اس کی منزل دریائے زائر کا دہانہ تھا۔

اچانک اس کی طبیعت تیزی سے خراب ہونا شروع ہوئی۔ سب سے پہلے سر درد شروع ہوا۔ درد میں غیر متوقع شدت تھی۔ اس کے بعد سردی لگی۔ پھر بخار، الٹیاں اور ہچکیاں۔ اسے خطرے کا احساس ہوا۔ تاہم جان نے امید کا دامن تھامے رکھا۔ کانپتے ہوئے خیمہ سمیٹا اور گرتا پڑتا مشن اسپتال تک پہنچا۔

اسپتال کے کمپاؤنڈ میں اس نے پھر قے کی۔ اس مرتبہ اسے خون کی الٹی ہوئی اور وہ زمین بوس ہوگیا۔ ایک گھنٹے بعد کسی کمرے میں جان کی آنکھ کھلی۔ وہاں اس جیسے دو مریض اور تھے۔

جائزہ لینے والا وہی ڈاکٹر تھا۔ مرض کی شدت اور نوعیت دیکھ کر وہ بوکھلا گیا تھا۔ اس نے مریض کے اندرونی علامتیں دیکھیں۔ آنکھوں میں جریانِ خون کی جھلک تھی۔ مریض کے سینے پر ایک سرخی مائل لکیر بھی دکھائی دے رہی تھی۔ ڈاکٹر سمجھ گیا کہ اس کا واسطہ کسی اجنبی مرض سے پڑنے والا ہے۔

عالمِ پریشانی میں حفظِ ماتقدم کے طور پر اس نے کلورافینی کول بھی شامل کر دی۔ یہ قدم ڈاکٹر نے ٹائیفائڈ فیور کے لیے اٹھایا تھا۔

☆☆☆

بمباریجن کا ڈسٹرکٹ ہیلتھ کمشنر، ڈاکٹر لوگا سا کھڑکی سے باہر دریائے زائر کی چمکتی آبی لکیر کو گھور رہا تھا جو صبح کی روشنی میں جھلملا رہی تھی۔

گہری سانس لے کر وہ دوبارہ مشن اسپتال سے موصول ہونے والے مراسلے کی جانب متوجہ ہوا۔ جان نارڈانگ نامی امریکی طالب علم ہلاک ہو چکا تھا۔ ساتھ ہی دریائے ایبولا (Ebola) پر کھیتی باڑی کرنے والا ایک کسان بھی، جان کی طرح زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔ کسان کے خاندان کے چار افراد مریض کی دیکھ بھال کے لیے وہاں موجود تھے۔ جبکہ اسی نوعیت کے مرض میں مبتلا دس مریض اور اسپتال میں داخل ہو چکے تھے۔

مشن اسپتال کے ڈاکٹر کی رائے میں وہ کوئی نامعلوم انفیکشن تھا جو نہایت سرعت سے پھیل رہا تھا۔ اجنبی بیماری کی ہلاکت خیزی خوفناک تھی۔

ڈاکٹر لوگا سا کے پاس دو راستے تھے۔ پہلا یہ کہ وہ خاموشی اختیار کرے۔ اس کے نزدیک یہ عقل مندی تھی۔ نیلی چھتری والا ہی بہتر جانتا تھا کہ تاریک جنگلات سے نمودار ہونے والا یہ بیماری نما عفریت کیا تھا۔

دوسرا راستہ ڈاکٹر کے پاس یہ تھا کہ متعدد فارم بھر کے، حادثے کی اطلاع کنشاسا پہنچا دے۔ ممکن ہے کہ بیوروکریسی میں کوئی بااثر شخص، لوگا سا کے مانند خاموشی کا راستہ اختیار کرے۔

اگر تفتیش کا فیصلہ ہوا تو ڈاکٹر لوگا سا کو ٹیم کے ہمراہ یامبوکا تک سفر کرنا پڑے گا۔ ڈاکٹر، کنشاسا کے محدود تفتیشی

اور طبی وسائل سے آگاہ تھا۔

ڈاکٹر لوگا سا نے لمحہ بھر کے لیے احساسِ جرم کی چبھن محسوس کی پھر اس نے یامبوکا سے آنے والا مراسلہ ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیا۔

☆☆☆

ایک ہفتے بعد بمبا ائرپورٹ پر DC-3 لینڈ کر رہا تھا۔ ڈاکٹر لوگا سا گھبراہٹ کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ لوگا سا کا سپیریئر، ڈاکٹر بوچارڈ پہلے طیارے سے نمودار ہوا۔ ڈاکٹر لوگا سا نے کل ہی اسے کنساشا فون کیا تھا۔

یامبوکا میں نامعلوم بیماری کی وبا پھیل چکی تھی۔ حتیٰ کہ علاقائی افراد کے ساتھ اسپتال کا عملہ بھی متاثر ہوا تھا۔

ڈاکٹر لوگا سا نے ایک ہفتے قبل موصول ہونے والے مراسلے کا ذکر کرنے کی حماقت نہیں کی۔

دونوں ڈاکٹر ٹارمک پر ایک دوسرے سے ملے۔ بعد ازاں دونوں ڈاکٹر لوگا سا کی ٹویوٹا کرولا میں بیٹھ گئے۔

ڈاکٹر بوچارڈ نے کسی نئی خبر کے بارے میں استفسار کیا۔ لوگا سا نے کھنکھار کے گلا صاف کیا۔ وہ اندر ہی اندر نروس تھا۔ صبح ہی صبح وائرلیس پر اسے اطلاع ملی تھی کہ اسپتال کے کل سترہ میں سے گیارہ اسٹاف ممبر ہلاک ہو چکے تھے۔ نیز مقامی آبادی کے ایک سو چودہ باسی لقمۂ اجل بن چکے تھے...... اسپتال کو بند کر دیا گیا تھا۔

ڈاکٹر لوگا سا نے یہ اطلاع ڈاکٹر بوچارڈ کے گوش گزار کر دی۔ بوچارڈ کی آنکھوں میں تشویش کے سائے لہرائے۔ اس نے تیزی سے اوپر تلے کنساشا کئی عدد کالز کیں۔ پھر لوگا سا سے کہا کہ کل صبح یامبوکا پہنچنا ضروری ہے۔ وہ ڈاکٹر لوگا سا کی ہچکچاہٹ پر دھیان نہیں دے سکا۔

☆☆☆

یامبوکا مشن اسپتال کے در و دیوار سے ویرانی اور دہشت ٹپک رہی تھی۔ دونوں ڈاکٹرز کا استقبال پُراسرار سکوت نے کیا۔ ماحول میں ناگوار بو بسی ہوئی تھی۔ دونوں نے رومال نکال کر ناک پر رکھ لیے۔

اسپتال میں انہوں نے مختلف حالتوں میں 30 لاشیں دریافت کیں۔ ایک نرس بخار کی حالت میں زندہ تھی۔ چار عدد مریض پیاری زندگی سے لپٹے رہنے کی ناکام کوشش میں نیم جان تھے۔

دونوں ڈاکٹرز خوف زدہ تھے۔ انہوں نے گاؤن، دستانے اور ماسک چڑھائے ہوئے تھے۔ دونوں کو اپنی زندگی خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ ڈاکٹر لوگا سا کے اوسان خطا تھے۔ انہیں نامعلوم لیکن خطرناک متعدی بیماری کا سامنا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ کوئی آدم خور عفریت اچانک وجود پذیر ہو چکا ہے یا پھر پہلے سے موجود کسی پوشیدہ زنداں سے آزاد ہو کر انسانی بستی میں گھس آیا ہے۔

ڈاکٹر بوچارڈ نے بذریعہ ریڈیو کنساشا تک مختصر احوال پہنچایا۔ زائرین ائرفورس سے ایمرجنسی ایڈ طلب کر لی گئی۔ قرنطینہ کے بہترین انتظامات کی ضرورت تھی۔

☆☆☆

بیلجیئن نرس کو ہوائی ذرائع سے اٹھایا گیا۔ تاہم چھ دن بعد باوجود بھرپور تھراپی کے، چار بجے صبح نرس نے آخری سانس لی۔ مرض کی تشخیص میں حوصلہ شکن ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن آٹوپسی کے بعد جگر، تلی، خون اور دماغ کے نمونے بیلجیئم کے انسٹی ٹیوٹ ڈی میڈیسن ٹراپیکل روانہ کر دیے گئے۔ انسٹی ٹیوٹ اینٹورپ میں تھا۔ علاوہ ازیں، اٹلانٹا میں CDC (سینٹرز آف ڈیزیز کنٹرول) کو بھیجنے کے ساتھ پورٹ ڈاؤن لندن بھیجے گئے۔ جہاں مائیکرو بائیولوجسٹ ریسرچ اسٹیبلشمنٹ قائم تھی۔

اس دوران یامبوکا میں مریضوں کی تعداد دو ہزار سے تجاوز کر چکی تھی۔ جبکہ ہلاکت خیزی کا تناسب 94 فیصد تھا۔

نامعلوم یامبوکا وائرس، تین بین الاقوامی لیبارٹریز میں بیک وقت محفوظ اور محدود کیا گیا۔ وائرس کی ساخت ماربرگ (Marburg) وائرس سے مشابہ تھی۔ ماربرگ پہلی بار 1967ء کی خوفناک وبا کے دوران یوگنڈا کے بندروں کے ذریعے سامنے آیا تھا۔ لیکن موجودہ نامعلوم وائرس، ماربرگ سے زیادہ خطرناک تھا۔ اسے دریائے ایبولا کی مناسبت سے ''ایبولا'' کا نام دیا گیا۔

نتیجہ یہ نکالا گیا کہ ایبولا ''بوبنک پلیگ'' (Bubonic plague) کی دریافت سے لے کر اب تک کا سب سے خطرناک وائرس ہے۔

ابتدائی وبا کے پھوٹنے کے دو مہینے بعد یامبوکا میں دو ہفتے تک کوئی نیا کیس سامنے نہ آیا اور یہ سمجھا گیا کہ نامعلوم بیماری کو مقید کر دیا گیا ہے۔

قرنطینہ ہٹا لیا گیا اور ہوائی سروس بحال کر دی گئی۔ محسوس ہوتا تھا کہ اَن دیکھا انتہائی مختصر عفریت واپس اپنی خفیہ پناہ گاہ میں جا چھپا ہے۔ عفریت کی خفیہ پناہ گاہ ابھی تک پردۂ اخفا میں تھی۔

CDC (USA) کی پروفیشنل ٹیم افریقہ پہنچ چکی تھی۔ سی۔ ڈی۔ سی نے قبل ازیں لاسا فیور کو قابو کرنے میں

اہم کردار ادا کیا تھا۔ ٹیم، ایبولا کی پناہ گاہ کی تلاش میں تندہی سے جُت گئی۔ ممالیہ جانداروں کے علاوہ انہوں نے پرندوں اور کیڑے مکوڑوں تک کو نظرانداز نہیں کیا، تاہم وائرولوجسٹس (Virologists) معمولی سا کلیو بھی دریافت کرنے میں ناکام رہے۔

☆☆☆

لاس اینجلس، کیلی فورنیا

موجودہ دن

لاس اینجلس کے رشٹر اسپتال کا کو فاؤنڈر ڈاکٹر ریڈولف رشٹر تھا۔ رشٹر کا تعلق جرمنی سے تھا۔ ولیم، اس کا بھائی اور پارٹنر تھا۔ طبّی کاروبار میں دونوں کا دماغ خوب چلتا تھا۔

ڈاکٹر رشٹر کا آج کا دن بُرا تھا اور خراب انداز میں شروع ہوا تھا۔ پہلے اس کی نئی بی ایم ڈبلیو نے فری وے پر ایک بدنما ڈینٹ کھایا۔ پھر اسپتال پر ایک ایمرجنسی سرجری اور پھر ایڈز کا ایک خاصا بُرا کیس۔ جس میں پُراسرار پیچیدگیاں تھیں۔ مزید برآں، مریض نے غیر متوقع طور پر ڈاکٹر کے منہ پر کھانس دیا۔

سب سے بڑھ کر اس کے خاص ریسرچ پروجیکٹ کے ایک بندر نے اسے کاٹ لیا۔ کیا دن گزرا تھا۔

ولیم اور رشٹر کے علاوہ اسپتال میں ایک مختصر تعداد دیگر ڈاکٹرز کی بھی تھی۔ ان سب کے پاس اسٹاکس کا کچھ نہ کچھ حصہ تھا۔ لہٰذا وہ سب ڈائریکٹرز میں شامل تھے۔

ڈاکٹر رشٹر اور رشٹر اسپتال دونوں مالی اعتبار سے مضبوط پوزیشن میں تھے۔ رشٹر نے چند معمول کے کام اور کالز نمٹائیں۔ سفید کوٹ، نیلے رنگ کے بلیزر سے تبدیل کیا اور بریف کیس تیار کر کے اسی قدر بُرے دن کے اختتام کے لیے اسپتال سے نکل گیا۔ اس وقت رات کے 9 بج چکے تھے۔ رشٹر لاعلم تھا کہ بُرا دن ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ وہ خیالوں میں گم گیراج کی جانب جا رہا تھا جہاں دو اجنبی آڑ میں اس کے منتظر تھے۔ دونوں نے گہرے رنگ کا بزنس سوٹ زیب تن کیے ہوئے تھے۔ دونوں رشٹر کے عقب میں ایک قدم دور تھے اور ڈاکٹر اب بھی بے خبر تھا۔

اپنی کار کے قریب پہنچ کر رشٹر نے دبے قدموں کی آہٹ محسوس کی۔ ساتھ ہی اس کے بدن میں سنسنی کی لہر دوڑی۔ اس نے خود پر قابو پایا اور دروازہ کھول کر کار میں بیٹھ گیا۔ اس نے ایک نگاہ ڈالی۔ دونوں کے مہذب لباس دیکھ کر اس کا ہراس کم ہو گیا۔

دونوں افراد میں دراز قامت کا ایک ہاتھ مستقل غیر فطری انداز میں ایک زاویے پر مڑا ہوا تھا۔ رشٹر نے اندازہ لگایا کہ اس کا ہاتھ کسی بیماری یا حادثے کے باعث ناکارہ ہو چکا ہے۔

رشٹر نے انہیں نظرانداز کرتے ہوئے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی۔ تاہم دوسرے آدمی نے یہ کوشش ناکام بنادی۔ ڈاکٹر چونکا۔

”ڈاکٹر! میں کچھ معلوم کر سکتا ہوں؟“ اس کا لہجہ شائستگی کا حامل تھا۔

”ضرور۔“ ڈاکٹر نے پھر اطمینان محسوس کیا۔ تاہم یہ سکون لمحاتی تھا۔ مزید کچھ بولنے سے پہلے ہی ڈاکٹر کو بے دردی سے باہر گھسیٹ لیا گیا۔ ڈاکٹر رشٹر کی مزاحمت میں جان نہیں تھی۔ مزید یہ کہ اگلے ہی لمحے اسے جبڑے پر ایک زوردار گھونسا کھانا پڑا۔ نتیجتاً وہ زمین بوس ہو گیا۔

ایک اجنبی اٹھائی گیرے کے ہاتھ اس کا پرس تلاش کر رہے تھے۔ دراز قامت نے ڈاکٹر کی قیمتی رِسٹ واچ کھینچ لی۔

”بریف کیس اٹھاؤ۔“ ایک بولا۔

واردات جیسے اچانک شروع ہوئی تھی ویسے ہی دفعتاً محدود وقت میں اختتام پذیر ہو گئی۔ رشٹر پر سکتہ طاری تھا۔ اس نے کار کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنی پھر بھاگتے قدم .... چند ساعت بعد کسی گاڑی کے ٹائر چرچرائے پھر یہ آواز دور ہوتی چلی گئی۔

رشٹر کا سکتہ ٹوٹا تو اسے جان بچنے کا احساس ہوا۔ ٹٹول کر اس نے اپنا چشمہ ڈھونڈا جس کا بایاں شیشہ چٹخ گیا تھا۔

اس نے اٹھ کر اپنی حالت کا جائزہ لیا اور اس دن کو کوستا ہوا واپس آفس کی جانب چل پڑا۔ سیکیورٹی کو بلا کر اس نے تبادلۂ خیال کیا پھر پولیس کو مطلع نہ کرنے کا فیصلہ سنا دیا۔ اس سے رشٹر اسپتال کی منفی تشہیر کا امکان تھا۔ نیز پولیس کیا کر لیتی۔ اس کی کوئی بیش بہا چیز بھی نہیں چھینی گئی۔ میٹنگ برخاست کر کے اس نے گھر فون کر کے صورتِ حال بتائی۔ بیوی کو اطمینان دلایا پھر چہرے کا جائزہ لینے کے لیے لیبارٹری کی جانب چل پڑا۔

شیشے میں اس نے رخسار کی ہڈی پر نمایاں خراش دیکھی۔ اینٹی بائیوٹک کا استعمال کرنے کے بعد اس نے سیکیورٹی آفیسر کو حفاظتی انتظامات بہتر کرنے کے لیے ہدایات جاری کیں اور گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

دوسرے روز ڈاکٹر رشٹر بیدار ہوا تو اسے طبیعت گری

گری لگی۔ اس نے سوچا کہ یہ کل والے حادثے کا آفٹر شاک ہے۔ دوسرے نیند بھی پُرسکون نہیں تھی۔ تاہم شام ساڑھے پانچ بجے اسے یقین ہو چلا کہ وہ بیمار ہو چکا ہے۔ وہ آفس سے جلدی اٹھ گیا۔ گھر پر رات کروٹیں بدلتے گزری۔

صبح تک وہ ٹھیک ٹھاک علیل ہو چکا تھا۔ وہ کوشش کررہا تھا کہ اس روز بندر کے کاٹنے کا خیال اس کے ذہن میں نہ آئے۔ ایڈز کے مریض کی اتفاقی کھانسی کو بھی وہ اہمیت دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ بخوبی آگاہ تھا کہ ایڈز اس انداز میں منتقل نہیں ہوتا۔

رشٹر اسپتال تو پہنچ گیا۔ اسے گھبراہٹ اس بات کی تھی کہ وہ سُپر انفیکشن کا شکار تو نہیں ہوگیا جس کی تشخیص ابھی باقی تھی۔

ساڑھے تین بجے اسے سردی لگی پھر سر میں درد شروع ہوگیا۔ درد کی شدت میگرین کی طرح تھی۔ ڈاکٹر رشٹر نے اسپتال چھوڑ دیا۔ گھر تک پہنچنے میں اسے خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔

اس کی بیوی اس کی ناوقت آمد سے زیادہ اس کی حالت دیکھ کر بوکھلا گئی۔ رشٹر کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ آنکھوں کے کنارے سرخ ہورہے تھے۔ بیوی نے اسے فی الفور بستر تک پہنچایا۔ آٹھ بجے تک سر کا درد ناقابلِ برداشت ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر کو پرکوڈین لینی پڑی۔

نو بجے رات پیٹ میں تشنج کی کیفیت شروع ہوگئی اور پھر ڈائریا اس کی بیوی نے ڈاکٹر نیوری کو فون کرنا چاہا...... ڈاکٹر نیوری، رشٹر اسپتال میں ڈاکٹر آف میڈیسن تھا۔ تاہم رشٹر نے اسے روک دیا۔ نیوری کسی الارم کے مانند تھا۔ رشٹر اسپتال کی ساکھ مشکوک ہوسکتی تھی۔ جسے دونوں بھائیوں نے برسوں کی محنت اور منصوبہ بندی کے بعد یہاں تک پہنچایا تھا۔

ڈاکٹر رشٹر نے ''ڈالمین'' لی اور سو گیا۔ چار بجے اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ خود کو گھسیٹتا ہوا واش روم تک پہنچا اور خون کی الٹی کردی۔

اس کی بیوی حواس باختہ ہو چکی تھی۔ اس نے فوراً ایمبولینس منگوا کر اسے رشٹر اسپتال روانہ کیا۔ اس مرتبہ ڈاکٹر نے کچھ نہیں کہا۔ اس کے بدن میں سکت ہی نہیں تھی۔ وہ جان گیا تھا وہ اپنی زندگی کی بدترین بیماری کا شکار ہو چکا ہے لیکن کب؟ کیسے؟ کیوں؟ اور کون سی بیماری؟

☆☆☆

مریسا بلوم۔ اٹلانٹا کے سی۔ڈی۔سی کی لائبریری میں موجود تھی۔ اس کے ہاتھ میں وائرولوجی (Virology) کی دس پونڈ وزنی ٹیکسٹ بک تھی جبکہ خود اس کا وزن 100 پونڈ اور قد پانچ فٹ تھا۔ ہیل کی وجہ سے قد پانچ فٹ دو انچ محسوس ہوتا تھا۔

مریسا نے گھڑی دیکھی۔ چھ بج رہے تھے۔ سات بجے اسے ڈیٹ پر رالف کے ساتھ ہونا تھا۔ وزنی کتاب اس نے شیلف میں رکھی۔ واپس بیٹھ کر اس نے ٹانگیں سیدھی کر کے ایک بھرپور انگڑائی لی اور جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ آج صبح وہ چار کے بجائے دو میل ہی دوڑ سکی تھی۔ صبح کی چار میل دوڑ اس کا معمول تھا۔

دو منٹ آرام کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ دن کی روشنی باہر کم ہوتی جارہی تھی۔ مریسا کا آفس لائبریری کے اوپر والے فلور پر تھا۔ آفس کیا ڈربا نما کمرا تھا۔ سی۔ڈی۔سی میں جگہ کے لیے مقابلہ سخت تھا۔

تاہم باوجود اس کے مریسا سی۔ڈی۔سی کی اہمیت اور قابلِ رشک کامیابیوں سے آگاہ تھی۔ سی۔ڈی۔سی کی قابلِ قدر خدمات امریکا کے علاوہ بیرونِ ملک بھی معروف ہیں۔

سی۔ڈی۔سی کی تاریخ اور کامیابیاں ہی مریسا کے لیے محرک بنی تھیں اور بوسٹن سے پیڈریاٹریک کے بعد اس نے سی۔ڈی۔سی کے لیے اپلائی کر دیا تھا۔ مریسا کو اپی ڈیمیالوجی انٹیلی جنس سروس (EIS) کے لیے قبول کرلیا گیا۔

ای۔آئی۔ایس طبی سراغ رساں کے مانند تھا۔ کرسمس سے قبل اسے چند ماہ پر مشتمل تعارفی کورس کرایا گیا۔

اگرچہ مریسا بلوم نے ہمیشہ ہی متاثر کن کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ تاہم وہ محسوس کررہی تھی کہ بطور طبی سراغ رساں، کسی حقیقی ایمرجنسی سے نمٹنے کے لیے وہ مکمل طور پر مسلح نہیں ہے۔ یہ ایک کافی بڑی چھلانگ ثابت ہوگی، اگر اسے کلاس روم سے براہِ راست فیلڈ میں کسی اسائنمنٹ پر بھیج دیا جاتا۔ سوال ''اگر'' کا نہیں تھا۔ آج نہیں کل ایسا ہونا تھا۔ سوال تھا ''کب؟''

تربیت کے اختتام پر اس کی درخواست پر وائرولوجی ڈپارٹمنٹ کی اسپیشل پیتھوجنس برانچ (Special Pathogenes Branch) میں بھیج دیا گیا۔ وہ مریسا کی پہلی ترجیح تھی چونکہ وہ کلاس میں اول تھی اس لیے اس کی درخواست کو پذیرائی بخشی گئی۔

وائرولوجی کا پس منظر محدود ہونے کے باعث مریسا

زیادہ وقت لائبریری میں گزارتی تھی۔

☆☆☆

رالف ہمپٹن ایک کامیاب آئی اسپیشلسٹ تھا۔ کئی ماہ گزرنے کے بعد بھی مریسا مکمل طور پر راجر کی بے وفائی کو بھلا نہ پائی تھی۔ رالف کی سنگت اسے سکون بخشتی تھی۔ حالانکہ دونوں کی عمروں میں بائیس سال کا فرق تھا۔ وہ اکتیس برس اور رالف 53 سال کا تھا۔ وہ ڈیٹ پر مریسا کو تھیٹر، کنسرٹ یا ڈنر پر لے جاتا۔ اس سے آگے بڑھنے کی رالف نے کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ مریسا مطمئن تھی اور رالف کی رفاقت میں عجیب لطف محسوس کرتی تھی۔ اگرچہ فریقین میں رومانوی پہلو بظاہر مفقود تھا۔

تاہم آج کی ملاقات مختلف نوعیت کی تھی۔ آج رالف نے پہلی مرتبہ اسے اپنے گھر مدعو کیا تھا اور بتا دیا تھا کہ وہاں وہ دونوں تنہا نہیں ہوں گے۔ وہاں چنیدہ افراد کی ایک پارٹی ہے۔

وہ آفس سے نکل کر گھر پہنچی۔ بیشتر افراد ڈی۔ سی کے آس پاس ہی رہتے تھے۔ تیار ہونے میں اس نے زیادہ وقت نہیں لیا۔ اسے ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ عام لباس میں بھی ہیرے کی طرح دمکنے لگتی تھی۔ تاہم اس روز پارٹی کے باعث مریسا نے قدرے اہتمام کیا تھا۔

رالف کی قیام گاہ تک پہنچنے کے لیے پانچ منٹ کی ڈرائیو کافی تھی۔

رالف ایک شاندار گھر میں مقیم تھا۔ مکان نے خاصا بڑا قطعہ اراضی گھیرا ہوا تھا۔ رالف نے ہی دروازہ کھولا۔ اس نے گرمجوشی سے مریسا کا استقبال کیا اور جلد آنے کا شکریہ ادا کیا۔

اس نے قیمتی ضیافت کا لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔

''کیا میرا لباس مناسب ہے؟'' وہ سوال کر بیٹھی۔

''تم ہمیشہ سے زیادہ حسین نظر آ رہی ہو۔'' رالف نے جواب دیا۔ ''اگر اجازت دو تو ایک فلمی مکالمہ بول دوں؟''

مریسا نے سر کو جنبش دی اور دھیمے سے مسکرائی۔

''تم آج بجلیاں گرا رہی ہو۔'' اس نے مکالمہ ادا کیا۔

''یعنی تمہارا قیمتی گھر خطرے میں ہے۔''

''ارے نہیں، یہ آسمانی بجلیاں نہیں ہیں۔'' رالف بھی مسکرایا۔

مریسا، رالف کے ہمراہ وسیع گھر کا جائزہ لے کر واپس لیونگ روم میں آ گئی۔ جہاں ایک طرف بار کاؤنٹر بنا ہوا تھا۔ کمرے میں ایک بڑی سی ٹیبل موجود تھی۔ جو تقریباً ایک درجن افراد کے لیے کافی تھی۔ بار کاؤنٹر پر ایک ملازم موجود تھا۔ مریسا نے وسیع کچن بھی دیکھ لیا تھا جہاں چند افراد مصروفِ کار تھے۔ تمام آرائش، آسائش اور لگژری اسٹائل کو دیکھ کر مریسا کو کچھ حیرت ہوئی تھی۔

رالف نے مریسا سے میزبان کا رول ادا کرنے کی خواہش کا اظہار کیا جسے قدرے ہچکچاہٹ کے بعد اس نے قبول کر لیا۔ یہاں وہ پہلی مرتبہ آئی تھی۔ اس سے پیشتر وہ محض چار پانچ مرتبہ ہی رالف کے ساتھ باہر گئی تھی۔

اطلاعی گھنٹی گنگنائی۔ مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔

مریسا نے پیش قدمی کی اور اپنا رول ادا کرنا شروع کر دیا۔ تاہم مہمانوں کے قیمتی لباس اور بیگمات کے بیش بہا زیورات نے مریسا کو مرعوب کر دیا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ ڈاکٹر ہیں یا کاروباری لوگ....

تقریباً تمام مہمان گرامی لیونگ روم میں موجود تھے۔ سبھی نے جام تھامے ہوئے تھے۔ کافی دیر سے اطلاعی گھنٹی کی موسیقی نشر نہیں ہوئی تھی۔ مریسا کو خیال آیا کہ شاید تمام مدعوئین آ چکے ہیں۔ عین اسی وقت اطلاعی گھنٹی گنگنا اٹھی۔ مریسا کو رالف کہیں نظر نہیں آیا۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور حیرت زدہ رہ گئی۔ وہ اس کا باس ڈاکٹر نورس تھا۔

''ہیلو ڈاکٹر مریسا۔'' وہ خوش دلی سے بولا اور آگے بڑھ گیا۔ ڈاکٹر نورس نے ظاہر نہیں ہونے دیا لیکن مریسا نے اس کی سیاہ چمکدار آنکھوں میں ہلکا سا استعجاب دیکھا۔ خود مریسا، واضح طور پر نروس تھی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ ڈی۔سی سے بھی کوئی تشریف آوری ہوگی۔ ڈاکٹر نورس وائرولوجی ڈپارٹمنٹ کا ہیڈ تھا۔

☆☆☆

مہمانوں کی آمد کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ مریسا داخلی دروازے کے قریب سے ہٹ کر بار کی سمت چلی گئی۔ وہائٹ وائن کا جام بنوا کر وہ مہمانوں میں گھل مل گئی۔ دیگر خواتین کے میک اپ، لباس اور زیورات میں امارت کی بھرپور نمائش تھی۔ تاہم مریسا کے قدرتی حسن کے سامنے دولت کا مظاہرہ گہنا گیا تھا۔ اس نے کئی خواتین کی آنکھوں میں حسد کی واضح جھلک دیکھی۔

رالف نے ڈنر کا اعلان کیا تو مریسا کی جان چھوٹی۔ ڈائننگ ٹیبل پر پہنچنے سے قبل ہی مریسا کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہاں مدعو ڈاکٹر حضرات اٹلانٹا کے طبی شعبے کے جینئس

ہیں۔ تاہم دولت کی نمائش اسے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ محض تین افراد اس نمائش سے الگ نظر آ رہے تھے۔ ڈاکٹر نورس، ڈاکٹر ٹیڈ اور خود مریسا بلوم.....

گفتگو نے پیشہ ورانہ رخ اختیار کر لیا تھا۔ مریسا کو دفعتاً اپنے شانے پر کسی کا ہاتھ محسوس ہوا۔ مریسا نے گردن گھمائی۔ وہ ایک ویٹرس تھی۔

”کیا بات ہے؟“

”آپ کے لیے کال ہے۔“ ویٹرس نے سرگوشی کی۔

مریسا معذرت طلب کر کے اٹھ گئی۔ اس نے سنسنی محسوس کی۔ رات کو یہاں، اس وقت؟ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ اس کی ڈیوٹی آن کال تھی۔ لہٰذا وہ ذمے داری کے تحت سی۔ڈی۔سی میں رالف کے گھر کا نمبر چھوڑ آئی تھی۔ یعنی کال سی۔ڈی۔سی کی تھی۔ صرف ڈپارٹمنٹ کو ہی پتا تھا کہ مریسا اس وقت کہاں ہے۔

”ڈاکٹر مریسا؟“ سی۔ڈی۔سی آپریٹر نے سوال کیا۔

”یس۔“

کال ڈیوٹی آفیسر کو منتقل کر دی گئی۔

”مبارک ہو، ڈاکٹر۔“ آفیسر کی آواز آئی۔

مریسا کا دل دھڑکا.....

”کیلی فورنیا کے اسٹیٹ ایپی ڈیمیالوجسٹ کی کال موصول ہوئی ہے۔“ ڈیوٹی آفیسر نے بات آگے بڑھائی۔ ”انہیں سی۔ڈی۔سی سینٹر کی مدد درکار ہے۔“

”کس سلسلے میں؟“ مریسا کی دھڑکنیں اب بھی ناہموار تھیں۔

”وہاں رشٹر اسپتال نامی کوئی نجی اسپتال ہے۔ وہاں کوئی وبائی مرض ظاہر ہوا ہے اور یہ خطرناک معلوم ہوتا ہے۔ وبائی صورتِ حال کا خدشہ ہے۔ ہم نے تمہارے لیے ڈیلٹا فلائٹ میں ریزرویشن کرا دی ہے، تمہیں ٹروپک ہوٹل میں قیام کرنا ہے..... فلائٹ، رات ایک بج کر دس منٹ پر روانہ ہوگی۔ گڈ لک۔“ ڈیوٹی آفیسر نے فون رکھ دیا۔

☆☆☆

ٹروپک ہوٹل سے نمٹنے کے بعد وہ پہلی فرصت میں رشٹر اسپتال روانہ ہوگئی۔ اسٹیئرنگ پر اس کے ہاتھ بج رہے تھے۔ رشٹر اسپتال کئی منزلہ ایک ماڈرن اسپتال تھا۔ پارکنگ میں چند گاڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ مریسا اپنا بریف کیس لے کر اتر گئی۔ ایک دن تو اسے میدان میں آنا تھا لیکن اس انداز میں۔ عجیب مضحکہ خیز صورتِ حال تھی۔

غیر متوقع طور پر، بہت مختصر نوٹس پر اسے وہاں آنا پڑا تھا۔

اس کے بریف کیس میں ابتدائی کورس کے کلاس نوٹس تھے، ایک نوٹ پیڈ اور پنسل، وائرولوجی پر ایک چھوٹی ٹیکسٹ بک، لپ اسٹک اور چیونگم پیکٹ۔

بہرحال وہ اسپتال میں داخل ہوگئی۔ انفارمیشن بوتھ خالی تھا۔ تاہم وہ ایمرجنسی روم تک پہنچ گئی جہاں کچھ سرگرمی نظر آ رہی تھی۔

مریسا نے آن کال ڈاکٹر کو اپنے بارے میں بتایا۔

”اوہ گریٹ۔“ ڈاکٹر کے حلق سے پُرجوش آواز برآمد ہوئی۔ ”بہت خوشی ہوئی آپ کے پہنچنے پر، ڈاکٹر نیوری رات گئے سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“

وہ ڈاکٹر نیوری کو بلانے چلا گیا۔

مریسا بے خیالی میں پیپر کلپس گھمانے لگی۔ وہ تھوڑی نروس تھی۔ مزید یہ کہ اس کو پوری نیند لینے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ہوائی سفر کے دوران میں مریسا نے دو گھنٹے کے لیے آنکھ لگائی تھی۔

کچھ فاصلے پر ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر برآمد ہوا۔ وہ سیدھا ڈاکٹر مریسا کی جانب آیا۔

”اوہ، میں بتا نہیں سکتا کہ آپ کو دیکھ کر کس قدر اطمینان اور مسرت کا احساس ہوا ہے۔“ ڈاکٹر نیوری نے مسکراتے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔ سیاہ بال اور سیاہ آنکھوں کا حامل ڈاکٹر ہینڈسم شخصیت کا مالک تھا۔

دونوں نے ہاتھ ملائے۔ نیوری کی آنکھوں میں تحیر کی علامت ظاہر ہو کر معدوم ہوگئی۔ وہ مختصر سے قد کی حسین اور جوان لیڈی ڈاکٹر کو دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے ٹپٹا گیا تھا۔ مریسا ایک ترو تازہ خوش رنگ پھول کے مانند تھی۔

ڈاکٹر نے حیرت پر قابو پاتے ہوئے بطور اظہار شائستگی، ہوائی سفر کا احوال معلوم کیا اور کھانے کے بارے میں سوال کیا۔

”میں سوچ رہی ہوں کہ براہِ راست پہلے مسئلے کا جائزہ لیا جائے۔“ مریسا نے جواب دیا۔

نیوری کی آنکھوں میں ستائش کی لہر ابھری اور ڈوب گئی۔ اس نے فی الفور مریسا کے فیصلے پر صاد کرتے ہوئے کانفرنس روم کا رخ کیا۔ وہ ڈپارٹمنٹ آف میڈیسن کا چیف تھا۔ اس تعارف نے مریسا کے اعتماد میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ مریسا کو اندازہ تھا کہ ڈاکٹر نیوری متعدی امراض کے بارے میں اس کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ علم رکھتا ہوگا۔

دونوں نے کانفرنس روم کی گول میز کے گرد نشست

سنبھالی۔ نیوری نے فون اٹھا کر کسی ڈاکٹر اسپنسر کاکس کو مطلع کیا۔

ڈاکٹر کاکس نے آنے میں دس منٹ لیے اور معذرت کرتے ہوئے اپنا تعارف پیش کیا۔ وہ Epidemiologist تھا یعنی ماہرِ وبائی امراض۔

''کوئی اور آئیڈیا؟'' کاکس کے آتے ہی مریسا نے پوچھا۔

''تقریباً تمام ہی نیگیٹو ہیں۔ ہر قسم کا ٹیسٹ کیا جا چکا ہے.... پہلے ملیریا کی جانب خیال گیا پھر ٹائیفائڈ، سپر انفیکشن وغیرہ .... ہر کوشش اور خیال غلط ثابت ہوا۔ مریضوں کی حالت بگڑتی ہی جا رہی ہے۔'' نیوری نے جواب دیا۔

''ان حالات میں غیر معمولی وجوہات پر توجہ دینی ضروری تھی۔ مثلاً یہ وائرس بھی ہو سکتا ہے۔''

''میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔ اب تمام توجہ وائرس پر مرکوز ہے۔ حالانکہ کوئی معقول شواہد سامنے نہیں آئے۔'' نیوری نے جھکی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''ڈاکر رشٹر کو ہسپلائز ہوئے کتنے دن گزر گئے ہیں؟''

''آج پانچواں دن ہے۔''

''مجھے مریض کو دیکھنا ہے۔'' مریسا کھڑی ہو گئی۔ نوٹ بک بند کر کے بریف کیس میں رکھ لی۔ نیوری فوراً تیار ہو گیا۔ مریسا، اس کی رہنمائی میں آگے بڑھ رہی تھی۔ اسپتال کی شان، قالین، ڈیکوریشن .... متاثر کن تھا۔

وہ ایلیویٹر کے ذریعے پانچویں منزل پر پہنچے۔ مریسا کو اندازہ ہو چلا تھا کہ یہ کوئی خطرناک وائرل مرض ہے اور بغیر حفاظتی انتظام کے کیسے مریض کا سامنا کرے گی؟ دونوں نرسز اسٹیشن پر پہنچ گئے۔

نیوری نے بتایا کہ ساتوں مریض پانچویں منزل پر رکھے گئے ہیں اور ہر ممکن احتیاطی تدابیر اختیار کی گئی ہیں تاکہ مرض کو پھیلنے سے روکا جا سکے۔ ہر مریض کو الگ رکھا گیا ہے۔ اس نے سات عدد چارٹس مریسا کے حوالے کیے۔

مریسا نے سب سے پہلے رشٹر کا چارٹ دیکھا۔ اول مریسا نے وائٹل سائن دیکھے۔ رشٹر کا فشارِ خون گرتا جا رہا تھا اور درجۂ حرارت بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ اچھی علامت نہیں تھی۔

مریسا نے تیزی سے چارٹ کے صفحات پر نظر دوڑائی۔ تفصیل وہ بعد میں ہی دیکھ سکتی تھی۔ اس نے ہسٹری پر نگاہ ماری اور چونک پڑی۔ ڈاکٹر رشٹر، ماہرینِ امراضِ چشم کے کونشن میں نیروبی (کینیا) گیا تھا۔

مریسا نے توجہ سے پڑھنا شروع کیا۔ مرض کی علامتیں ظاہر ہونے سے صرف ایک ہفتے قبل اس نے سان ڈیاگو کی کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ یہ کانفرنس بھی امراضِ چشم سے متعلق تھی۔ اسپتال میں داخل ہونے سے دو دن قبل مخصوص نسل کے ایک بندر نے اسے کاٹا تھا۔ مریض کے سفید خلیوں کی تعداد بہت کم ہو گئی تھی۔ جگر اور گردے بھی درست کام نہیں کر رہے تھے۔ مریسا کو یقین ہو چلا کہ مریض نامعلوم وائرل بیماری کا شکار ہے۔ اس نے چارٹ واپس رکھ دیا۔

''ریڈی؟'' نیوری نے سوالیہ نظر ڈالی۔

مریسا کو علم تھا کہ ایسے مریض کے قریب حفاظتی اقدامات کے بغیر جانا خود کو بھی خطرے میں ڈالنے والی بات تھی۔ اس نے سر ہلا کر آمادگی ظاہر کی۔ مریض کو دیکھنا ناگزیر تھا۔

''تم لوگوں نے ساتوں مریضوں کو الگ الگ رکھا ہے۔ اچھی بات ہے۔ یہ ضروری تھا لیکن مریضوں کے نزدیک جانے والے کیا حفاظتی اقدامات کر رہے ہیں؟ یہ کوئی عام مرض نہیں ہے۔ نہ اتنے بھرپور لیب ورک کے بعد تشخیص ہو سکی ہے؟'' مریسا نے گھما پھرا کر خدشے کا اظہار کر دیا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ہم نے حتی الامکان احتیاطی تدابیر اختیار کی ہیں۔'' نیوری نے کہا اور ایک جگہ رک کر گاؤن، ماسک اور گلوز برآمد کیے۔ مریسا نے سکون کا سانس لیا۔

کچھ دیر بعد دونوں ماسک وغیرہ کے ساتھ رشٹر کے آئسولیٹڈ کمرے میں داخل ہوئے۔

گلوز ربر کے بنے ہوئے تھے۔ دیگر اشیا بھی ساتھ تھیں۔ ''یہ لوگ بلند پایہ پروفیشنل ہیں۔'' مریسا نے سوچا۔ ''انہوں نے بروقت خطرے کا احساس کر لیا تھا۔'' بہرحال اس کا دل اب بھی کہہ رہا تھا کہ خود کو پلاسٹک کے بلبلے میں چھپا لو۔ کوئی نامعلوم چیز اسے ہراساں کر رہی تھی۔

مریض کو مشینوں اور ٹرمینلز نے گھیر رکھا تھا۔ وہ ایک کینوپی کے نیچے لیٹا ہوا تھا۔ ڈرپس لگی ہوئی تھیں۔ کئی قسم کے ٹیوبس اس کے جسم میں داخل تھیں۔

چہرہ سفید راکھ کے مانند ہو گیا تھا۔ آنکھیں حلقوں میں اتر گئی تھیں۔ جلد نے ہڈیوں کو چھوڑ دیا تھا۔ چہرے کے دائیں جانب زخم کا نشان تھا۔ مریسا کا دم گھٹنے لگا۔ وہ ڈاکٹر تو

تھی ہی۔ اسے بہ سرعت ادراک ہوگیا کہ وہ مریض کا نہیں بلکہ موت کا چہرہ دیکھ رہی ہے۔ مریسا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ نیوری، اس کے قریب ہی متجسس انداز میں جھکا ہوا تھا۔

''کیا کینوپی کی موجودگی میں، مریض سے بات ہو سکتی ہے؟'' بالآخر اس نے سوال کیا۔ جواب اثبات میں ملا۔

''تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟'' الفاظ لبوں سے نکلتے ہی مریسا کو احساس ہوگیا کہ وہ ایک احمقانہ سوال کر چکی ہے۔

بہر حال رشٹر کے پپوٹے پھر پھڑائے۔ آنکھوں کی سفیدی میں جریانِ خون کی علامت موجود تھی۔

''ناٹ گڈ۔'' مریض نے جواب دیا۔ جواب بمشکل مریسا کی سماعت تک پہنچا۔

''ایک ماہ قبل تم افریقہ گئے تھے؟'' وہ مزید آگے کی جانب جھک گئی۔

''چھ ہفتے قبل۔'' مریض نے جواب دیا۔

''وہاں تم نے کسی جانور کو ہینڈل کیا تھا؟''

''نہیں۔'' مریض نے رک کر جواب دیا۔

''وہاں تم نے کسی مریض کا علاج کیا تھا؟''

رشٹر نے بولنے کے بجائے نفی میں سر ہلایا۔ یہاں امریکا میں رشٹر اسپتال کی تجربہ گاہ میں جس بندر نے رشٹر کو کاٹا تھا، اس کے بارے میں وہ پہلے ہی نیوری سے معلومات حاصل کر چکی تھی۔

مریسا سیدھی کھڑی ہوگئی۔ نیوری کی جانب دیکھ کر اس نے سوالیہ نظروں سے رشٹر کے چہرے کے زخم کے بارے میں دریافت کیا۔

''مرض کا شکار ہونے سے دو دن قبل وہ پارکنگ میں رہزنی کا شکار ہوا تھا۔'' نیوری نے بتایا۔

مریسا، چند لمحے خاموش رہی۔

''میں دیکھ چکی ہوں، چلنا چاہیے۔'' وہ بولی۔ دونوں باہر آگئے۔

''وہ بندر کہاں ہے؟''

''قرنطینہ میں۔'' نیوری نے کہا۔ ''اس کے تمام ٹیسٹ ہو چکے ہیں۔ وہ قطعی صحت مند ہے۔''

مریسا نے گہری سانس لی اور کہا۔ ''مجھے تمام چارٹس کی اسٹڈی کرنی پڑے گی۔'' اس نے ارادہ ظاہر کیا اور رشٹر کی آنکھوں کے بارے میں سوچنے لگی۔ اگرچہ وائرل ہیمرج فیور عنقا تھا لیکن اس کی ہلاکت خیزی میں کوئی شبہ نہ تھا۔ اس قسم کے بیشتر امراض افریقہ سے ہی آئے تھے، اس کی علامت رشٹر کی آنکھوں میں عیاں تھی۔

مریسا نے نیوری سے VHF کا ذکر کیا۔

''VHF کو ہم کاؤنٹ کر چکے ہیں۔ درحقیقت VHF کی وجہ سے ہی ہم نے سی۔ڈی۔سی سے رابطہ کیا تھا۔''

''فی الحال میری تجویز ہے کہ آپ لوگ آئسولیٹڈ ایریا کو جنرل اسپتال ایریا سے قطعی علیحدہ کر دیں۔'' مریسا نے تجویز دی۔ ''کم سے کم لوگ، انتہائی ضروری تقاضے کے تحت مریضوں سے ملیں۔ جب تک ہمیں یہ نہ معلوم ہو جائے کہ مرض کی حقیقت کیا ہے؟ اور یہ کیونکر ایک سے دوسرے میں منتقل ہو رہا ہے؟ اس وقت تک ہمیں ہر ایک ممکنہ احتیاطی قدم اٹھانا پڑے گا۔ میں آپ کو ہراساں نہیں کر رہی لیکن یہ کچھ بھی ہو سکتا ہے اور مزید پھیل سکتا ہے۔''

نیوری، چند ثانیے مریسا کو دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے۔'' اس کی آواز قدرے بے جان ہو چکی تھی۔

مریسا نے اسے یہ نہیں بتایا کہ رشٹر کے بچنے کا امکان صفر ہے۔

☆☆☆

مریسا، ایک چھوٹے سے کمرے میں تمام چارٹس کا یکسوئی سے مطالعہ کر رہی تھی۔ معمولی اور بظاہر غیر اہم بات کو بھی وہ نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ وہ نوٹس لیتی رہی۔ ڈیٹا مرتب کیا۔

ساتوں مریض کی عمر، جنس، لائف اسٹائل، پیشہ وغیرہ سب مختلف تھے۔ ایک رشٹر کی میڈیکل سیکریٹری تھی، دو خاتون خانہ، ایک پلمبر، ایک انشورنس سیلز مین، اسٹیٹ بروکر اور خود ڈاکٹر رشٹر.... مریسا کو خاصی محنت کرنی پڑی۔

مرض اچانک نمودار ہوا تھا۔ ابتدائی علامتوں میں شدید سر درد، مسل پین، ہائی فیور، بعد ازاں پیٹ کی تکلیف، ڈائریا، الٹیاں بشمول خون کی قے، گلے کی تکلیف، کھانسی اور سینے میں درد۔

مریسا لرز اٹھی۔ کیا مرض اس تک پہنچ سکتا ہے؟ یہ ایک مفلوج کر دینے والا سوال یا خدشہ تھا۔ وہ سونا چاہ رہی تھی لیکن دوسرے مریضوں سے ملنا ضروری تھا۔ وہ جلد از جلد اپنی رپورٹ نورس کو دینا چاہتی تھی۔

وہ تمام مریضوں سے فرداً فرداً ملی۔ مریضوں کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ مریسا نے اپنے طے کردہ سوالات

کے جواب حاصل کیے، کوئی خاص بات معلوم نہ ہو سکی۔ چھ کے چھ مریض ایک دوسرے سے ناواقف تھے۔ ایک ہی نکتہ دریافت ہو سکا کہ ساتوں نہ صرف ڈاکٹر رشٹر کو جانتے تھے بلکہ رشٹر اسپتال ہیلتھ پلان کے ممبران میں شامل تھے۔ مریسا کو حیرت ہوئی کہ کسی نے یہ بات نوٹ نہیں کی۔ کیا رشٹر ہی کے ذریعے باقی چھ مریض متاثر ہوئے تھے۔ لیکن کیسے؟ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ انڈیکس کیس ڈاکٹر رشٹر ہی تھا۔ وہی پہلا مریض تھا۔ اس کے بعد مریضوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور سب رشٹر کو جانتے تھے۔

مریسا نے وارڈ کلرک سے بیرونی مریضوں کا ریکارڈ طلب کیا۔ اسی دوران ڈاکٹر نیوری کی پریشان صورت نظر آئی۔

''مجھے خدیشہ ہے کہ ایک اور مریض کا اضافہ ہو گیا ہے۔ وہ یہیں اسپتال میں لیب ٹیکنیشن ہے۔''

''کیا اسے آئسولیٹ کر دیا گیا ہے؟''

''ہم پانچویں منزل کے اوپر ایک علیحدہ آئسولیشن ونگ آراستہ کر رہے ہیں، سب کو وہیں رکھا جائے گا۔''

''جتنی جلدی ہو سکے، بہتر ہے۔'' مریسا نے کہا۔ ''خیال رکھیں کہ تمام غیر اہم لیب ورک معطل کر دیے جائیں۔''

''ٹھیک ہے.... کیا تم ٹیکنیشن کو دیکھو گی؟''

''ہاں میں دیکھتی ہوں۔''

ٹیکنیشن کو ایک ایمرجنسی کمرے میں رکھا گیا تھا جس کے باہر ''ڈوناٹ اینٹر'' کی تختی لگی ہوئی تھی۔

مریسا ضروری تیاری کے ساتھ مریض سے ملی، اس کا نام ایلن تھا۔ اس وقت اس کی حالت اتنی خراب نہیں تھی۔ لہٰذا مریسا کو بات چیت کرنے میں آسانی رہی۔ تاہم اس ملاقات کا کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا۔ مریسا اسے تسلی دے کر باہر آ گئی۔ اس کی چھٹی حس چلا رہی تھی کہ کسی ہولناک وبا کا آغاز ہونے جا رہا ہے۔

بہتر تھا کہ اب نورس کو رپورٹ کر دی جائے۔ مریسا نے فون پر اس سے رابطہ کیا۔

''تمہارا پہلا فیلڈ اسائنمنٹ کیسا جا رہا ہے؟'' نورس نے استفسار کیا۔

''توقعات سے زیادہ خراب۔'' مریسا نے جواب دیا۔ مریسا نے تمام تفصیلات، جزئیات کے ساتھ گوش گزار کر دیں۔

''پریشان مت ہو۔'' نورس نے بولنا شروع کیا۔

مریسا نے محسوس کیا کہ نورس دو علامتوں میں خاص دلچسپی لے رہا ہے۔ اول، خون کی الٹیاں۔ دوم، خونی ڈائریا۔ آنکھوں میں جریانِ خون کی علامتوں کے بارے میں بھی وہ سوالات کر رہا تھا۔ جب مریسا نے اسے بتایا کہ رشٹر نے امراضِ چشم کی کانفرنس میں شرکت کے لیے افریقہ کا سفر کیا تھا۔

''مائی گاڈ۔'' نورس کی آواز بلند ہو گئی۔ ''تم جانتی ہو کہ کیا کہہ رہی ہو.... اگر یہ افریقہ سے آنے والا ''وائرل ہیمرج فیور'' نہیں ہے۔ تو ''لاسا فیور'' ہے او گاڈ، اس کے علاوہ دو ہی امکانات ہیں۔ ''ماربرگ'' (Marburg) وائرس یا ''ایبولا۔''

مریسا لرز اٹھی۔

''بندر کہاں ہے؟''

''قرنطینہ میں۔'' مریسا نے اپنی آواز میں کپکپاہٹ محسوس کی۔

''بندر کی حفاظت کرنا، خاص طور پر اگر وہ مر جائے... ہمیں اس کا وائرل ٹیسٹ کرنا پڑے گا۔''

نورس نے مریسا کو سمجھایا کہ تمام متاثرہ مریضوں کے خون اور پیشاب کے علاوہ کون کون سے نمونے سی۔ڈی۔سی روانہ کرنے ہیں۔ ''جلدی کرنا اور ڈیلٹا سروس استعمال کرنا۔ خدا کے لیے اپنا بہت خیال رکھنا۔ نمونوں کو خشک برف میں رکھ کر روانہ کرنا۔ بندر کے نمونے بھی روانہ کرو۔ میرے پہنچنے تک لیب ورک رکوا دو۔ مجھے خود آنا پڑے گا۔ ہم کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ یہ نیشنل ایمرجنسی بھی ہو سکتی ہے۔ پریس سے دور رہنا۔ مریضوں کے قریب جانے سے قبل تمام تر حفاظتی اشیا استعمال کرنا۔ ''موبائل لیب'' ریڈی ہوتے ہی میں پہنچ رہا ہوں۔''

☆☆☆

نورس سے بات کر کے مریسا کے ہراس میں اضافہ ہو گیا۔ دورانِ گفتگو اس نے دو فقرے ایسے کہے تھے جن سے صاف عیاں تھا کہ اسے مریسا کی بہت زیادہ فکر ہے۔ نورس سے ملنے پر مریسا کا سازِ دل، ہر مرتبہ عجیب انداز میں نغمہ سرا ہو جاتا تھا لیکن نورس نے اور نہ مریسا نے کبھی کوئی جذباتی اظہار کیا تھا۔ رومانس کا پہلو تھا بھی تو اب تک پردۂ اخفاء میں تھا۔ تاہم آج مریسا نے اس کی فکر کو نمایاں طور پر محسوس کیا تھا۔ کیا یہ محض پیشہ ورانہ تفکر تھا یا کہیں گہرائی میں نازک احساسات بھی پوشیدہ تھے؟ مریسا نے گہری سانس لی اور نورس کی ہدایات پر عمل درآمد کے لیے

متحرک ہوگئی۔

نورس نے جن وائرس کے نام اٹھائے تھے، وہ اب تک دریافت شدہ خوفناک ترین وائرسوں میں شامل تھے اوران کا علاج بھی دریافت نہیں ہوا تھا۔

نیوری، نورس کی آرا سن کر بدحواس دکھائی دے رہا تھا، اگر ایسا ہی ہوا تو رشٹر اسپتال کی بقا خطرے میں تھی۔

نورس کی ہدایت کے مطابق، مریسا نے اپنا کام ختم کیا۔

بعدازاں اس کا زیادہ وقت مریضوں کی کیس اسٹڈی اور لائبریری میں گزرنے لگا۔ اس کی تحقیقات کے مطابق یہ بات شک وشبے سے بالاتر تھی کہ 'انڈیکس کیس' ڈاکٹر رشٹر تھا۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ باقی سات مریضوں نے رشٹر سے کسی نہ کسی حوالے سے رابطہ کیا تھا۔ یہ ابتدائی رابطے تھے۔ سوال یہ تھا کہ وائرس رشٹر تک کیسے پہنچا؟ دوسرا سوال یہ تھا کہ رشٹر جن افراد سے رابطے میں رہا، ان میں سے بعض کو مرض کیوں منتقل نہیں ہوا؟ اور اگر یہ سیکنڈری اسٹیج پر گیا تو کیا ہوگا؟ یہ ایک خوفناک سوال تھا۔

☆☆☆

''کیا ہوا؟''

''رشٹر کی حالت بگڑ رہی ہے۔'' نیوری نے جواب دیا۔ ''ہر جگہ سے خون جاری ہے، حتیٰ کہ مسوڑھوں اور جہاں انجکشن لگائے گئے تھے، وہاں سے بھی خون رس رہا ہے۔ گردے فیل ہونے والے ہیں۔ فشارِ خون گر کر برائے نام رہ گیا ہے۔ کوئی حربہ نہیں بچا ہے، سمجھ نہیں آتا کیا کیا جائے۔'' نیوری کی آواز میں تھکن اور مایوسی تھی۔

اگرچہ مریسا کو اندازہ تھا، پھر بھی اسے رنج ہوا۔ رشٹر کو پہلی بار دیکھتے وقت ہی اسے احساس ہوگیا تھا کہ مریض وادیِ اجل کی سمت گامزن تھا۔

مریسا کے چہرے پر گمبھیرتا تھی۔ ایک منٹ بعد اس نے اٹلانٹا فون کیا۔

نورس کو اس نے صورتِ حال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ یہ VHF (وائرل ہیمرج فیور) ہے اور کسی کے پاس کوئی حل نہیں ہے۔

''سپورٹیو تھراپی کے علاوہ کچھ نہیں کیا جاسکتا، جب تک ہم تشخیص نہ کرلیں۔ ٹیڈ کو تمہارے بھیجے ہوئے نمونے مل گئے ہیں۔ وہ کام کررہا ہے۔ شاید ہم کوئی بہترین مدافعتی ویکسین بنالیں۔''

''کب آرہے ہو؟''

''موبائل آئسولیشن لیب، پوری طرح پیک ہے۔ پہنچنے والا ہوں۔'' نورس نے جواب دیا۔

☆☆☆

مریسا نے ایک گھنٹے سے بھی کم نیند لی اور بیدار ہوگئی، وہ بیٹھے بیٹھے ہی سوگئی تھی۔ اس کے سر میں درد تھا اور حلق میں خراش محسوس ہورہی تھی۔ وہ دعا کررہی تھی کہ یہ مرض کی علامتیں نہ ہوں بلکہ تھکن کی زیادتی کے باعث ایسا ہورہا ہے۔ بہرحال اس کے دل میں خوف تھا۔ نورس کی ہدایت کے مطابق اب مریضوں کے پاس جاتے وقت آنکھوں پر گاگلز بھی چڑھا کر رکھتی تھی۔

تھکن کے باوجود اسے اٹھنا پڑا۔ ابھی تک وہ اسپتال میں ہی تھی۔ مزید چار مریض ایمرجنسی روم میں لائے گئے تھے۔ چاروں کی علامتیں ہیمرج فیور کی نشاندہی کررہی تھیں۔ چاروں مریض، سابقہ مریضوں کے فیملی ممبر تھے۔

نامعلوم جان لیوا وائرس، پہلے ہی تھرڈ جنریشن میں داخل ہوچکا تھا۔

مریسا نے سب سے پہلے نمونے حاصل کرکے اٹلانٹا، ٹیڈ کو روانہ کردیے۔ مریسا کو احساس تھا کہ وہ اپنی توانائی کی آخری حد پر ہے۔ لہٰذا اس نے ہوٹل جانے کا فیصلہ کرلیا۔ ٹرو پک ہوٹل پہنچ کر وہ بستر میں جاگری۔

☆☆☆

دوسری صبح وہ اسپتال پہنچی تو حیران رہ گئی۔ وہاں پولیس کے علاوہ الیکٹرونک میڈیا کی گاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ قرنطینہ کا بندوبست تقریباً مکمل تھا۔ پولیس مین نے مریسا کو روکا تاہم وہ بہ آسانی سی۔ ڈی۔ سی کا کارڈ دکھا کر اندر چلی گئی۔

ڈاکٹر نیوری نے اسے بتایا کہ سی۔ ڈی۔ سی نیوز کانفرنس کی تیاری کررہی ہے۔ نیوری کا چہرہ بجھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ رشٹر کا بھائی بھی تھا جس کے تاثرات بھی اعلان کررہے تھے کہ اسپتال ہاتھ سے نکل رہا ہے۔

میڈیا نے سرخی جمائی تھی۔ ''ایڈز کی نئی وبا۔'' رشٹر کی موت کے بعد مریضوں نے اسپتال چھوڑنا شروع کردیا تھا۔ اسٹیٹ کمشنر آف ہیلتھ نے قرنطینہ کے آرڈر جاری کیے تھے۔ تاکہ جو بلا بھی ہے وہ اسپتال کی حدود سے باہر نہ نکل سکے۔

مریسا کانفرنس روم میں پہنچی تو نورس اپنے مخصوص اور پُرسکون انداز میں میڈیا کا سامنا کررہا تھا۔ اس نے آغاز سی۔ ڈی۔ سی کی ٹیم کے تعارف سے کیا تھا پھر اس نے ایڈز

کی وبا کی تردید کی۔

مریضوں کی تعداد سولہ ہوگئی تھی۔ نورس کی رائے میں صورت حال بدنما ہونے کے باوجود کنٹرول میں تھی۔ ایک صحافی کھڑا ہوگیا۔

"کیا ایک ماہ قبل رشٹر، یہ نامعلوم مرض افریقہ سے لایا تھا؟"

"ہمارے علم میں نہیں۔" نورس نے کہا۔ "ہو بھی سکتا ہے لیکن یہ مشکوک ہے۔ کیونکہ ان کی بیوشن پیریڈ بہت زیادہ ہے۔ تیس دن یہ مرض خفیہ نہیں رہ سکتا۔ ابتدائی علامات ظاہر ہونے کے بعد ڈاکٹر رشٹر کی موت بہت کم وقت میں وقوع پذیر ہوئی۔ یعنی بیماری زیادہ سے زیادہ چند روز بعد علامات کا اظہار شروع کردیتی ہے۔"

دوسرا صحافی کھڑا ہوا۔

"ایڈز کا مرض برسوں خفتہ حالت میں رہتا ہے۔ کیا یہ ایڈز سے زیادہ خطرناک ہے؟"

"ہماری موجودہ پریشانی ایڈز سے قطعی مختلف ہے۔ بظاہر یہ وائرس ہی ہے تاہم ایڈز کے وائرس سے مختلف ہے۔"

"وہ کیسے؟" کسی اور نے مختصر سوال اچھالا۔ مریسا نے محسوس کیا کہ نورس کا ضبط جواب دے رہا ہے۔ تاہم وہ قابو میں رہا اور یکے بعد دیگرے چند چبھتے ہوئے سوالات کے جواب دے کر کانفرنس ختم کردی۔

☆☆☆

ایلیویٹر میں مریسا کی نورس سے مڈبھیڑ ہوئی۔

"کیسی ہو؟" اس کی آواز دوستانہ تھی۔

"اوکے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم پوری ٹیم کے ساتھ آرہے ہو؟"

"ضروری تھا۔" ڈاکٹر لینی نے کہا۔ ڈاکٹر اسپس نے سر ہلا کر تائید کی۔ "پریس کانفرنس سے ہٹ کر صورتِ حال ہولناک ہے۔ یہ ایک بھیانک خواب ہے۔"

"مجھے بندر بُری طرح کھٹک رہا ہے۔"

"میں نے ابھی بندر کے نمونے نہیں بھیجے۔" مریسا نے اعتراف کیا۔ نامعلوم دہشت اس کے بدن میں سرائیت کررہی تھی۔

"کوئی بات نہیں۔ تم پہلے ہی بہت کام کرچکی ہو۔" نورس نے کہا۔ "رات ہم نے بندر کی قربانی دے دی تھی اور نمونے سی۔ڈی۔سی بھیج دیے تھے۔"

نورس کی زبان سے اپنی تعریف سن کر مریسا نے ناقابلِ فہم مسرت محسوس کی۔

"میں تمہارے کام کے بارے میں تفصیل سے سننا چاہتا ہوں۔ تم ڈنر آج میرے ساتھ کرو۔ ہم لوگ جہاں ٹھہرے ہیں وہاں میں نے تمہارے لیے کمرا بک کرا دیا ہے۔ وہ ٹروپک ہوٹل سے بہت بہتر ہے۔"

ٹروپک بھی ٹھیک ہی ہے۔ مریسا نے سوچا۔ نورس کی تجاویز سن کر اس کی چھٹی حس نے ٹھوکے لگانے شروع کردیے تھے۔

☆☆☆

رشٹر نے دو میڈیکل میٹنگ اٹینڈ کی تھیں۔ ایک افریقہ میں، دوسری سان ڈیاگو میں۔ مریسا نے دونوں کی اسپانسر آرگنائزیشنز کو فون کیا۔ وہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ دونوں میٹنگز کے شرکا میں سے رشٹر کے علاوہ کوئی اور مریض سامنے آیا یا نہیں.... بعدازاں اس نے رشٹر کی بیوہ ہیلن کے گھر کا رخ کیا۔ وہ رشٹر کی ذاتی ڈائری کا مطالعہ کرنا چاہتی تھی۔ جس کے لیے استدعا اس نے پہلے ہی ہیلن سے کردی تھی۔

شام کے وقت مریسا نے ٹیڈ کی کال وصول کی۔ وہ نورس کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ "آپریٹر کی اطلاع کے مطابق شاید تمہیں علم ہو؟"

"اسے ہوٹل میں ہونا چاہیے۔" مریسا نے جواب دیا۔

"میں ہوٹل ٹرائی کرتا ہوں، اگر رابطہ نہ ہوا تو کیا تم ایک پیغام پہنچا دوگی؟"

"ہاں، کیوں نہیں۔"

"یہ کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔"

مریسا، سیدھی ہوکر بیٹھ گئی۔ اس کی گرفت ریسیور پر سخت ہوگئی۔ "کیا یہ پرسنل پیغام ہوگا؟"

"نہیں۔" ٹیڈ بے کیفی سے ہنسا۔ "یہ وائرس سے متعلق ہے، جس کے ساتھ تم لوگوں کا واسطہ پڑ گیا ہے۔"

"کیا مطلب؟" مریسا نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

"تم نے جو نمونے بھیجے تھے۔ خاص طور پر رشٹر کے..... اس کے خون میں لاتعداد وائرس ہیں۔ ایک ملی لیٹر میں بلین سے بھی زیادہ....."

مریسا کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

"کیا ہے یہ؟" اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔

"ٹیڈ! کیا ہے یہ؟"

''معلوم نہیں۔'' جواب آیا۔ ''کیا رشتر زندہ ہے؟''
''وہ گزشتہ شب.....'' مریسا جواب مکمل نہ کرسکی۔
''اوہ۔''
''ٹیڈ کیا تمہیں یقین ہے؟''
''کیسی باتیں کر رہی ہو؟'' ٹیڈ نے شکوہ کیا۔
مریسا کو بھی اپنے بے تکے سوال کا احساس ہوا۔
''اس کا مطلب۔'' وہ بولی۔ ''اب تک مہلک ترین وائرس منظرعام پر آگیا ہے۔''
''یقیناً۔'' ٹیڈ نے اتفاق کیا۔ ''مسئلہ یہ ہے کہ ہم اس کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ محض افریقہ میں اس وائرس کی چند وباؤں کا ذکر ملتا ہے۔ یہ قطعی اجنبی ہے۔ خفیہ اور لاعلاج..... آخر یہ لاس اینجلس میں کیونکر نمودار ہوا؟''
''ڈاکٹر ری لینڈ کے نزدیک بندر ذمے دار ہے۔''
''شاید اس کا اندازہ ٹھیک ہو۔ بندر ہی ماضی میں ہیمرجک فیور کے ذمے دار تھے۔ جرمنی میں ماربرگ وائرس بھی بندر کے ذریعے پھیلا تھا۔ ماربرگ، اس سے مشابہت رکھتا ہے۔''
''بندر کے نمونے تم تک پہنچنے والے ہیں۔ رزلٹ کے بارے میں مجھے ضرور بتانا۔'' مریسا نے درخواست کی۔
''ضرور۔'' ٹیڈ نے حامی بھری۔ ''پھر فون کروں گا۔ اپنا بھی خیال رکھنا۔'' ٹیڈ نے رابطہ منقطع کردیا۔
مریسا، نورس کو ڈھونڈنے لگی، اسی اثنا میں ایک ٹیکنیشن سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ جس نے بتایا کہ چند ڈاکٹرز پیتھالوجی میں ہیں۔ دو اموات اور ہوگئی ہیں۔ کچھ ڈاکٹر ایمرجنسی میں ہیں، وہاں نئے مریض آئے ہیں۔ ڈاکٹر نورس ہوٹل روانہ ہوچکے ہیں۔
مریسا نے اسے بتایا کہ انہیں کس عفریت کا سامنا ہے اور ہدایت کی کہ یہ بری خبر دوسروں تک پہنچا دی جائے۔

☆☆☆

بقول نورس، بیورے ہلٹن، ٹروپک ہوٹل کے مقابلے میں بدرجہا بہتر اور پرآسائش تھا اور یہ رشتر اسپتال سے نزدیک تر تھا۔
مریسا، بیل مین کے عقب میں آٹھویں منزل کے کوریڈور میں اپنے کمرے کی طرف جارہی تھی۔ اگرچہ اسے یہ سب غیرضروری لگ رہا تھا۔ اس کے لیے کشش صرف اس بات میں تھی کہ نورس بھی اسی ہوٹل میں تھا۔
مریسا نے کمرے میں پہنچ کر بیل مین کو ڈالر پکڑا کر رخصت کیا اگر نورس دوبارہ نہ کہتا تو شاید وہ ٹروپک میں ہی قیام کرتی لیکن ٹیڈ سے بات کرنے کے چند گھنٹے بعد نورس نے مریسا کو فون کیا تھا۔ مریسا نے اسے وائرس کے بارے میں مطلع کردیا تھا۔ تاہم اسے محسوس ہوا کہ نورس ذہنی طور پر اس خبر کے لیے تیار تھا۔
اب وہ بیورے ہلٹن میں موجود تھی۔
نورس نے ہی بتایا تھا کہ اس کا کمرا 805 ہے۔ نورس کی خواہش تھی کہ ساڑھے سات بجے مریسا اس کے کمرے میں اس کے ساتھ ڈنر کرے۔ اگر اسے زحمت نہ ہو تو۔ نورس کا کمرا بھی آٹھویں منزل پر تھا۔ نورس نے مریسا کے نوٹس اور تحقیقات میں دلچسپی ظاہر کی تھی۔
مریسا نے ضروری تیاری کی۔ نوٹ بک اور کاغذات لے کر وہ نورس کے کمرے تک پہنچ گئی۔ اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوگئی تھیں۔ وہ ایک عجیب ناقابلِ بیان کیفیت کا شکار تھی۔ وہ کھڑی سوچتی رہی۔ بالآخر ایک منٹ بعد اس نے دستک دی۔
نورس شاید انتظار ہی کر رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھول کر خوش آمدید کہا۔ پھر واپس فون کی جانب چلا گیا۔ مریسا نے اندازہ لگایا کہ وہ ٹیڈ سے بات کر رہا تھا۔ بات مکمل کر کے وہ مریسا کے قریب آگیا۔ وہ آج زیادہ ہی وجیہہ نظر آرہا تھا یا غالباً اس نے کچھ اہتمام کیا تھا۔ وہ قریب آکر جھکا اور مریسا کی آنکھوں میں دیکھا۔
''آج کے روز جو سب سے بہترین چیز میں نے دیکھی ہے، وہ تم ہو۔'' نورس نے کہا۔
مریسا کی چھٹی حس پھر ٹھوکے لگانے لگی۔ اسے احساس تھا کہ آج نورس کے ساتھ اسے ایک غیرمتوقع ملاقات کا سامنا ہے۔
''تمہارا دوست ٹیڈ ٹھیک کہہ رہا تھا کہ تمہیں غیرضروری خطرہ نہیں مول لینا چاہیے۔''
مریسا کو کوئی جواب نہیں سوجھا۔ اس نے گفتگو کا رخ موڑنے کے لیے کاغذات اور نوٹ بک نکالی۔ نورس بیٹھ گیا۔ مریسا نے شروع سے تفصیلات بتانا شروع کیں۔ خاص نکات کو اجاگر کیا۔ اس نے پتے اور فون نمبر تک نوٹ کیے ہوئے تھے۔
نورس سر ہلاتے ہوئے بظاہر اس کی بات سن رہا تھا۔ تاہم مریسا نے محسوس کیا کہ اس کا دھیان کہیں اور ہے۔ مریسا بولتے بولتے رک گئی۔ نورس نے ایک گہری سانس لی اور مسکرایا۔ ''گڈ جاب۔'' اس نے سادہ الفاظ استعمال

کیے۔ ''یقین نہیں آتا کہ یہ تمہارا پہلا فیلڈ ورک ہے۔'' اس کی آواز میں ستائش تھی۔

دروازے پر دستک سن کر وہ کھڑا ہوگیا۔ ''شاید ڈنر ہے۔''

ادھر مریسا سوچ رہی تھی کہ ڈنر ڈائننگ ہال میں بھی کیا جاسکتا تھا۔ دورانِ طعام، نورس پیشہ ورانہ امور کے بجائے عام گفتگو کررہا تھا۔

مریسا، شپٹائی ہوئی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ بات کچھ اور ہے۔ کیا بات ہے اور کب شروع ہوتی ہے؟

کھانے کے اختتام پر اچانک نورس نے کہا۔ ''ایک آٹو ایکسیڈنٹ میں، میری بیوی کا انتقال دو سال قبل ہوا تھا....''

''آئی ایم سوری.... مجھے افسوس ہوا'' وہ بولی۔

وہ اپنی حیرت کو چھپا گئی کہ نورس اچانک ذاتی زندگی کی جانب کیوں چلا گیا۔

''میں تمہیں بتانا چاہتا تھا۔'' وہ بولا۔

مریسا سر ہلا کر رہ گئی۔

''تم نے کبھی سوچا مستقبل کے بارے میں؟'' نورس نے سوال کیا۔ ''میرا مطلب ہے، تمہارا کوئی دوست....''

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

مریسا، سمجھ گئی کہ اس کا اشارہ رالف کی جانب ہے۔ ماضی کے تلخ تجربے کے متعلق وہ بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ وہ راجر کو تقریباً بھلا چکی تھی۔ رالف کے ساتھ ڈیٹنگ کوئی خفیہ معاملہ نہیں تھی لیکن یہ مریسا کو ہی علم تھا کہ رالف کے ساتھ اس کا کوئی رومانس نہیں ہے۔ راجر کے بعد صرف نورس نے اسے متاثر کیا تھا۔ تاہم ماضی کی تلخی کے باعث وہ یک دم اظہارِ خیال نہیں کرنا چاہتی تھی جبکہ وہ محسوس کررہی تھی کہ نورس فیصلہ کن گفتگو کے موڈ میں ہے۔ البتہ یہ مریسا کے لیے انکشاف تھا کہ نورس بھی اسے پسند کرتا ہے....

''ہاں میرے کئی دوست ہیں۔'' مریسا نے بھی فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ادھورے فقرے میں اشارہ واضح تھا کہ ''بس دوست ہی ہیں۔''

معاً نورس کھڑا ہوگیا۔ ''کیا خیال ہے؟ اسپتال کا جائزہ لیا جائے؟''

مریسا کو اس اچانک تبدیلی کی توقع نہیں تھی۔ تاہم وہ سکون محسوس کرنے لگی۔ گفتگو جس رخ پر جارہی تھی، اس کے لیے مریسا ذہنی طور پر تیار نہیں تھی۔ وہ مطمئن انداز میں کاغذات سنبھالتی ہوئی کھڑی ہوئی گئی۔ دفعتاً اسے احساس ہوا کہ نورس اس کی پشت پر آگیا ہے۔ قبل اس کے کہ وہ کچھ سمجھ پاتی۔ نورس نے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ کر اس کا رخ اپنی جانب موڑ لیا۔ فاصلہ بہت کم تھا، مریسا منجمد ہو کے رہ گئی۔ نورس کے ہونٹ اس کے لبوں کو چھو گئے۔ یہ ایک نہایت قلیل وقفہ تھا۔ مریسا نے خود کو پیچھے ہٹا لیا۔ کاغذات فرش پر گر گئے۔

''آئی ایم سوری۔'' اس کی آواز میں خجالت تھی۔ ''میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ تاہم میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جب سے تم سی۔ ڈی۔ سی میں آئی ہو.... آگے کیا کہوں.... میں پھر معذرت خواہ ہوں۔ جب سے میری بیوی کا انتقال ہوا ہے۔ ایسا پہلی بار ہوا ہے۔''

مریسا خاموش تھی۔ وہ نورس کی اس اچانک حرکت سے ذہنی خلفشار کا شکار ہوگئی تھی۔

''مریسا۔'' اس نے نرمی سے کہا۔ ''اٹلانٹا واپسی پر میں تمہیں ڈنر پر لے جاؤں گا۔ لیکن اگر تم رالف کے ساتھ کوئی جذباتی تعلق رکھتی ہو تو ایسا نہیں ہوگا۔ میں تمہیں بھول جاؤں گا۔'' اس کی آواز لڑکھڑا گئی۔

مریسا نے جھک کر کاغذات سمیٹے۔

''ہمیں چلنا چاہیے۔'' مریسا کی آواز خشک تھی۔

نورس ایلیویٹر میں خاموش رہا۔ مریسا کی رینٹ اے کار میں بھی سکوت طاری تھا۔ مریسا کو دھیرے دھیرے احساس ہونے لگا کہ وہ نورس کے ساتھ زیادتی کرچکی ہے۔ اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا تھا۔ مریسا کو اتنا خشک رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ نورس نے معذرت بھی کرلی تھی۔ شاید وہ ایبولا میں الجھی ہوئی تھی۔ اس لیے مناسب ردِعمل پیش نہ کرسکی۔ تعلقات بدنما موڑ کاٹ چکے تھے۔ ''کیا کرنا چاہیے؟'' اس نے خود سے سوال کیا۔

☆☆☆

تقریباً پانچ ہفتے بعد مریسا واپس اٹلانٹا پہنچی۔ ائرپورٹ سے کیب ہائر کر کے وہ گھر کی جانب عازمِ سفر ہوئی۔ کیب میں بیٹھی وہ ڈاکٹر نورس کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کیا بحیثیت ڈاکٹر آئندہ وہ دونوں اپنے پیشہ ورانہ تعلقات کو خوشگوار خطوط پر استوار کرسکیں گے؟

ہیوریٹے ہلٹن میں جو غیر متوقع حادثہ پیش آیا تھا، اس کے بعد دونوں کا تعلق سرد مہری کا شکار ہو کے رہ گیا۔ بعدازاں دونوں کی محض چند ملاقاتیں ہوئیں، نورس کے رویے میں واضح لاتعلقی اور بے مہری دکھائی دی۔ اب وہ

دونوں اٹلانٹا واپس آچکے تھے۔ مریسا کو نامعلوم تنہائی کا احساس ہوا۔ کیب، اس کے گھر کے قریب پہنچ گئی تھی۔

مریسا خیالات کی دنیا سے باہر آگئی۔ وہ سیدھی پڑوس میں ہڈسن فیملی کے گھر پہنچی۔ رسمی کلمات کے تبادلے کے بعد اس نے شکریہ ادا کیا اور ٹفی کو لے کر گھر آگئی۔ ٹفی (پالتو کتا) مریسا کو دیکھ کر بے چین ہو گیا۔ وہ دیوانہ وار اس کے گرد گھوم رہا تھا۔ ساتھ ہی عجیب آوازیں نکال رہا تھا۔

مریسا نے الارم آف کیا، گھر کا ٹمپریچر درست کیا پھر فریج میں جھانکا۔ باہر ہی کھانا پڑے گا۔ وہ بڑبڑائی۔ فریج بند کیا۔ فریج کی صفائی اور کچھ تیار کرنے کا قطعی موڈ نہیں تھا۔ وہ فیصلہ کر کے پلٹی۔ تب ہی دفعتاً فون کی گھنٹی نے اسے چونکا دیا۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ ٹیڈ کی آواز سن کر مریسا نے اطمینان محسوس کیا۔

''ویلکم ہوم۔'' ٹیڈ نے کہا۔ ''کیا خیال ہے اگر ڈرنک باہر کی جائے۔ میں تمہیں گھر سے پک کر سکتا ہوں۔''

مریسا یہ کہنے ہی والی تھی کہ وہ بری طرح تھکی ہوئی ہے۔ معاً اسے یاد آیا کہ لاس اینجلس سے آخری فون اس نے ٹیڈ کو کیا تھا۔ جب ٹیڈ نے بتایا تھا کہ ایڈز کے پروجیکٹ پر کام ختم کر کے وہ اس وائرس کے ساتھ کشتی لڑ رہا ہے۔

''تمہاری تحقیق کا کیا حال ہے؟'' مریسا نے سوال کیا۔

''فائن۔'' جواب آیا۔ ''یہ جنگل کی بھڑکتی آگ کی طرح ہے۔ مارفالوجی کی اسٹڈی مکمل کر چکا ہوں۔ اب پروٹین کے تجزیے کا آغاز کیا ہے۔''

''مجھے گہری دلچسپی ہے کہ تم اس وائرس کے ساتھ کون سی کشتی لڑ رہے ہو؟'' مریسا نے کہا۔

''مجھے نہایت خوشی ہوگی، سب کچھ دکھانے میں مگر بدقسمتی سے کام MCL میں ہو رہا ہے۔ نیز یہ ضروری بھی ہے۔''

''میں سمجھ سکتی ہوں۔'' مریسا نے جواب دیا۔ وہ بخوبی آگاہ تھی کہ انتہائی مختصر وائرس موت کا جوالا مکھی ہے۔ اجل کا دیوتا ---- ایبولا کا نام ہی مریض کی سانس روک دینے کے لیے کافی تھا۔ اگرچہ دیگر مہلک وائرسوں کے مانند اسے ننگی آنکھ سے تو کجا عام خوردبین سے دیکھنا بھی ناممکن تھا۔

مریسا کی معلومات کے مطابق اس وقت، عالم تمام میں سی۔ ڈی۔ سی جیسی سہولیات اور مہارت محض گنتی کے مقامات پر تھیں۔ برطانیہ، بیلجیم، سوویت یونین (سابق) ---- پاسچر انسٹی ٹیوٹ آف پیرس کے متعلق وہ وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔

لاس اینجلس میں وہ بذاتِ خود اس کی بھیانک غارت گری، پھرتی اور قوت کا مشاہدہ کر آئی تھی۔ اس نے اجلِ خونبار کا دہشت ناک رقص دیکھا تھا۔ مریسا نے ٹیڈ کو اپنی دلچسپی اور تجسس سے آگاہ کیا۔

''لیکن تمہارے پاس MCL میں جانے کا اجازت نامہ نہیں ہے؟'' ٹیڈ نے مریسا کی بے قراری محسوس کر لی اور قدرے حیرت سے سوال کیا۔

''میں جانتی ہوں۔'' مریسا بولی۔ ''تاہم اس میں کیا مسئلہ ہے اگر میں تمہارے ہمراہ چلی جاؤں اور دیکھوں کہ نادیدہ عفریت کے ساتھ تم کیا کر رہے ہو؟ پھر ہم ڈرنک کے لیے نکل جائیں گے۔''

دوسری جانب چند ثانیے کے لیے خاموشی رہی پھر ٹیڈ کی آواز آئی۔ ''انٹری صرف مخصوص افراد کے لیے ہے۔'' وہ گڑبڑا گیا۔

مریسا کو احساس تھا کہ وہ ٹیڈ کی دوستی کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی ہے۔ ''ٹیڈ، کم آن۔ کس کو پتا چلے گا۔'' مریسا نے اکسایا۔ ''جبکہ میں مذکورہ ٹیم کا حصہ بھی تو تھی۔''

''ہاں ---- ں ---- وہ تو ہے۔'' ٹیڈ کی آواز میں ہچکچاہٹ کا عنصر واضح تھا۔ مریسا نے محسوس کیا کہ وہ نیم رضامند ہے۔

''بس پھر تم آجاؤ، کتنی دیر میں آرہے ہو؟''

''تیس منٹ میں ---- لیکن تم کسی کو ہوا بھی نہ لگنے دینا۔'' اس نے شرط لگائی۔

''منظور ہے۔'' مریسا نے بے ساختہ صاد کیا۔

☆☆☆

سی۔ ڈی۔ سی کے سیکیورٹی گارڈز نے دونوں کو محتاط انداز میں گھورا۔ دونوں نے اپنے کارڈز شو کیے۔ فارم بھرتے وقت مریسا نے ''منزلِ مقصود'' کے خانے میں ''آفس'' لکھ دیا۔ دونوں آگے بڑھ گئے۔

''تم MCL میں داخل ہونے کے لیے کل باقاعدہ ایک درخواست آگے بڑھا دینا۔'' ٹیڈ نے مشورہ دیا۔

مریسا نے اثبات میں سر ہلایا۔ تاہم وہ سوچ رہی تھی کہ اس کی درخواست بالآخر ڈوبس کی میز پر ہی جائے گی اور ڈاکٹر ڈوبس کا ردعمل کیا ہوگا۔ مریسا اندازہ لگا سکتی تھی۔ لاس اینجلس میں جو کچھ ہوا۔ مریسا بے قصور تھی۔ تاہم اپنے ردعمل کے حوالے سے وہ ابھی تک خود کو پوری طرح مطمئن نہ کر پائی تھی۔ کیا حرج تھا اگر وہ اس کے ساتھ ایک شام ڈیٹ پر

چلی جاتی یا کوئی دوسرا بہتر رویہ اختیار کرتی۔ نورس کی حرکت اتنی غیر متوقع تھی کہ مریسا کو سوچنے کا لمحہ تک میسر نہ آیا۔

لیکن اس کے بعد نورس کا رویہ سرد تر ہوتا چلا گیا۔ مریسا کے نزدیک نورس کے پاس اس سرد مہری کی کوئی وزنی دلیل نہیں تھی۔ نورس کی جانب سے یہ خلیج بڑھتی جا رہی تھی۔

ایلیویٹر کے ذریعے دونوں سی۔ ڈی۔ سی کی مرکزی عمارت کے تیسرے فلور پر گئے۔ سی۔ ڈی۔ سی کی تمام عمارتوں کی بیشتر راہداریوں کے ذریعے مرکزی عمارت سے منسلک تھیں۔

مریسا، ٹیڈ کے ہم قدم مختلف لیبارٹریز اور رہ گزر کو ذہن نشین کر رہی تھی۔

''MCL کی سیکیورٹی ازحد سخت ہے۔'' ٹیڈ نے مریسا کو بتایا۔ ''ہم نے اب تک دریافت شدہ ہر وائرس وہاں رکھا ہوا ہے۔''

''ہر وائرس؟'' مریسا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

''ہاں۔'' ٹیڈ نے سینہ پھلایا۔

''ان کو کیسے اسٹور کیا جاتا ہے؟''

''سیال نائٹروجن میں منجمد کر کے۔''

بالآخر ٹیڈ ایک بھاری بھرکم، بلند و بالا فولادی دروازے کے پاس ٹھہر گیا۔ وہ ایک مہیب فولادی دروازہ تھا۔ ناب کے اوپر ایک مستطیل ابھار تھا۔ جس پر کیلکولیٹر کی طرح ہندسے موجود تھے۔ نیچے کی جانب ایک رخنہ تھا۔ ٹیڈ نے گلے میں لٹکا ہوا کارڈ مریسا کو دکھایا اور اسے جھری میں داخل کر دیا۔

''اب کمپیوٹر انٹری ریکارڈ کر رہا ہے۔'' وہ بولا۔ پھر اس نے ہندسوں کو پش بٹن کی طرح دبانا شروع کیا۔ 43،23،39۔

ذرا توقف سے کلک کی آواز آئی اور لاک کھل گیا۔ ٹیڈ نے وزنی دروازہ کھولا اور اندر قدم رکھتے ہوئے اطلاع فراہم کی۔

''وائرولوجی بلڈنگ سے ہمارا رابطہ منقطع ہو گیا ہے۔'' اس نے دروازہ بند کر دیا۔

مریسا کو لگا جیسے اس نے کسی اور ہی اجنبی دنیا میں قدم رکھ دیا ہے۔ اندر نیم تاریکی تھی۔ ٹیڈ نے ایک کیبنٹ کھول کر سرکٹ بریکر کو چھیڑا۔ وہ جگہ روشنی سے بھر گئی۔ وہ مقام کم از کم دو منزلہ اونچا تھا۔ وہاں ہر قسم کے جدید آلات موجود تھے۔ ماحول میں فینولک ڈس انفیکٹ کی مخصوص بو رچی ہوئی تھی۔ مریسا کو میڈیکل اسکول کا آٹوپسی روم یاد آ گیا۔

ٹیڈ نے دوسرا سرکٹ بریکر چھیڑا، جس نے دس فٹ بلند سلنڈر میں پورٹ ہول کے مانند کھڑکیوں کو روشن کر دیا۔ سلنڈر کے سرے پر آبدوز کی طرح ائر ٹائٹ دروازہ تھا۔

ایک اور سرکٹ بریکر کو چھیڑنے پر گونج پیدا ہوئی اور کسی بھاری مشین نے اسٹارٹ لیا۔

''کمپریسر۔'' ٹیڈ نے وضاحت کی۔

''یہ MCL کا کنٹرولنگ اسٹیج ہے جہاں سے تمام فین، فلٹرز اور گاما۔ رے جنریٹرز کو مانیٹر کیا جا سکتا ہے۔ سبز روشن اشاروں کو دیکھو۔ جو اس بات کی علامت ہیں کہ ہر چیز ٹھیک کام کر رہی ہے۔''

ٹیڈ نے ائر ٹائٹ انڈے نما دروازہ کھولا۔ قد پانچ فٹ ہونے کے باوجود مریسا کو سر تھوڑا جھکانا پڑا۔ اس نے خوف محسوس کیا۔ اس کے ذہن نے دو الفاظ چنے۔ ''ایوانِ دہشت'' وہ ایوانِ دہشت میں قدم رکھ چکی تھی۔ سلنڈر اور پورٹ ہول کی طرح کھڑکیاں یہاں بھی موجود تھیں۔ یہاں ائر پریشر بدلا ہوا تھا۔

دونوں طرف، بینچ، لاکرز اور شیلف موجود تھے۔ دوسرے سرے پر ایک انڈے نما ائر ٹائٹ ڈور دکھائی دے رہا تھا۔

''حیران ہو؟'' ٹیڈ نے ایک کاٹن سوٹ اس کی جانب اچھالا۔ ''ذاتی لباس نہیں چلے گا۔'' مریسا ہچکچائی۔ تاہم ٹیڈ رخ بدل کر منہ پھیر چکا تھا۔ مریسا نے تیزی سے کپڑے بدل لیے۔

انہوں نے دوسرا ائر ٹائٹ ڈور کراس کیا۔ یہاں ائر پریشر مزید نیگیٹو ہو گیا تھا۔ مقصد، لیب میں موجود ہوا کو بیرونی ہوا کے ساتھ نہیں ملنا چاہیے تھا۔ اس کمرے میں دس فٹ اوپر کھڑکیاں نہیں تھیں لیکن فینولک ڈس انفیکٹ کی بو نمایاں تر ہو گئی تھی۔

ایک جانب متعدد نیلے رنگ کے پلاسٹک سوٹ ہینگرز میں لٹک رہے تھے۔ مریسا کے لیے ٹیڈ نے ایک چھوٹا سوٹ ڈھونڈا۔ یہ خلائی سوٹ کے مانند تھا۔ سر سے پیر تک اس کی ساخت ایسی تھی کہ وہ تمام جسم کو چھپا سکتا تھا۔ جو حصہ، سر کو کور کرتا تھا، اس کی پلاسٹک شفاف تھی۔ زپ کے ذریعے پلاسٹک سوٹ کو سامنے سے مکمل بند کیا جا سکتا تھا۔

چھ فٹ سے نیچے جا بجا سبز رنگ کے ''ہوز پائپ'' موجود تھے۔ ان میں جگہ جگہ ایڈاپٹر کے ساتھ ''مین فولڈ'' منسلک تھے۔ پائپ، پلاسٹک سوٹ کے بالائی حصے سے

منسلک ہونے کے بعد سانس لینے کے لیے مین فولڈ سے صاف پریشرائز حاصل کرتے تھے جس کے بعد لیب کی فضا میں سانس لینے کی ضرورت نہیں رہ جاتی تھی۔ ٹیڈ نے مریسا کو پائپ ہٹانے اور لگانے کی مشق کرائی۔

''او کے، سوٹ اَپ کا وقت ہو گیا ہے۔'' ٹیڈ نے کہا۔ سوٹ کو پہننے کا طریقہ کار مریسا کو مشکل لگا۔ ٹیڈ عادی تھا۔ خاص طور پر بلبلے نما ہڈ میں سر گھسانے کے لیے مریسا کو کوشش کرنی پڑی۔ سر کے پلاسٹک فیس ماسک پر فوراً ہی دھندسی چھا گئی۔ تاہم ٹیڈ کی ہدایت پر اس نے ہوز پائپ منسلک کیا تو دھند غائب ہو گئی۔

صاف، تازہ ہوا نے اس کا بدن بھی ٹھنڈا کر دیا۔ ٹیڈ نے پائپ کے ذریعے سوٹ میں ہوا بھری۔ سوٹ کا حجم بڑھ گیا پھر اس نے پائپ الگ کر دیا۔ تاہم اسے ہاتھ میں رکھتے ہوئے آگے بڑھنا شروع کیا۔

مریسا نے بھی اس کی نقل کی۔ تاہم مریسا کی چال میں ہیئت کذائی کے باعث روانی نہیں تھی۔

سامنے ایک اور ڈور موجود تھا۔ ڈور کے دائیں جانب ایک پینل تھا۔ ''لیب کی اندرونی روشنیاں۔'' ٹیڈ نے بتایا اور پینل کے سوئچز آن کر دیے۔

مخصوص سوٹس کی موجودگی میں، مریسا کو ٹیڈ کی بات سمجھنے میں توجہ مرکوز کرنی پڑ رہی تھی۔ وہ دونوں آخری ائرٹائٹ ڈور سے بھی گزر گئے تھے۔ ظاہر ہے ائر پائپ چھوڑنے پڑے تھے۔ تاہم انہیں چھوڑتے وقت انہوں نے ایکسٹرا ائر لے لی تھی۔

پچھلے دو کمروں کے مقابلے میں یہ کمرا سائز میں نصف تھا۔ یہاں بھی پائپ موجود تھے۔ دونوں نے کچھ دیر کے لیے ائر پائپ منسلک کر کے ہٹا دیے۔ دونوں نے پائپس کو ہاتھ میں رکھا تھا۔ مریسا، ٹیڈ کو فولو کر رہی تھی۔ جہاں وہ پائپ کو سوٹ سے منسلک کر کے ہٹاتا، وہ بھی ایسا ہی کرتی۔

اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مرکزی لیب میں داخل ہونے والے ہیں۔ بالآخر وہ آخری ڈور پار کر کے پُراسرار MCL میں داخل ہو گئے۔ مریسا کے لیے وہ پُراسرار ہی تھا۔ ''ایوانِ دہشت'' کا سب سے خطرناک کمرا۔ مرکزی لیب ..... یہ ایک بڑا مستطیل کمرا تھا۔ مختلف بینچوں پر حفاظتی ایگزاسٹ ہڈز موجود تھے۔ دیواریں ہر قسم کے ضروری آلات سے مزین تھیں۔ سینٹری فیوج انکیوبیٹر، کمپیوٹر وغیرہ وغیرہ۔ بعض آلات کو مریسا پہچان نہ سکی۔

ٹیڈ، مریسا کو ایک انکیوبیٹر کے پاس لے آیا اور اس کے شیشے کھول دیے۔ اندر ایک ٹرے دھیمی رفتار سے گھوم رہی تھی۔ ٹرے میں ٹشو کلچر کی ٹیوبس فٹ تھیں۔ ٹیڈ نے ایک ٹیوب نکالی اور مریسا کے ہاتھ میں دے دی۔

''یہ رہا تمہارا مطلوبہ وائرس۔'' وہ بولا۔

ٹیوب میں تھوڑا سا محلول تھا۔ مریسا کے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ ٹیوب میں جو کچھ بھی تھا، بظاہر بے ضرر تھا۔ تاہم مریسا جانتی تھی کہ اتنا سا محلول پورے اٹلانٹا کو موت کی نیند سلا سکتا تھا۔ مریسا نے قدرے سختی سے ٹیوب پکڑی ہوئی تھی۔

ٹیڈ نے ٹیوب واپس لے لی اور مائیکرو اسکوپ کی طرف آ گیا۔ مائیکرو اسکوپ کے بغیر مہلک ترین وائرس کے مختصر تر وجود کو دیکھنا ممکن نہیں تھا۔

ٹیڈ نے ٹیوب کو مائیکرو اسکوپ میں ایڈ جسٹ کیا اور مریسا کو دعوتِ نظارہ دی۔

مریسا آگے بڑھ کر مائیکرو اسکوپ پر جھک گئی۔ ٹیڈ بول رہا تھا۔ وہ اس کی کنٹری توجہ سے سن رہی تھی۔ وہ پلکیں جھپکنا بھول گئی تھی۔ یقینی موت کی علامت، نادیدہ، ہلاکت خیز وائرس پہلی مرتبہ اس کی نگاہ کی گرفت میں تھا۔

ٹیڈ کی کنٹری ختم ہونے پر وہ سیدھی ہو گئی۔ ٹیڈ نے ٹیوب واپس انکیوبیٹر میں پہنچا دی۔ اس کی کنٹری جاری تھی، تاہم رخ بدل گیا تھا۔ وہ اپنی ریسرچ پر روشنی ڈال رہا تھا اور بعض اجنبی آلات کی افادیت کے بارے میں بتا رہا تھا۔

باٹم لائن یہ تھی کہ وائرس ناقابلِ یقین حد تک سخت جان تھا۔

آخر میں، ٹیڈ، مریسا کو ایک راہداری کے ذریعے جانوروں کے سیکشن میں لے آیا۔ ان کے پنجرے اس طرح رکھے تھے کہ بھول بھلیاں سی بن گئی تھیں۔ بیشتر پنجرے چھت تک چلے گئے تھے۔

بندر، خرگوش، گنی پگ، چوہے وغیرہ وغیرہ سیکڑوں آنکھیں، مریسا کو گھور رہی تھیں۔ کچھ بے تاثر تھیں۔ کچھ میں نفرت اور غصہ تھا۔

ٹیڈ متواتر اس کی معلومات میں اضافہ کر رہا تھا۔ تاہم متعدد امور مریسا کی سمجھ میں نہیں آئے۔ وہ بتا رہا تھا کہ وائرس ایک ہی ہے، تاہم یہاں نمودار ہونے والا وائرس کس طرح افریقہ کے وائرس سے مختلف ہے، وہ اس کی تشریح کر رہا تھا۔

مریسا کچھ سمجھی، کچھ نہیں سمجھی۔ وہ اب ''ایوانِ

دہشت‘‘ سے باہر جانا چاہ رہی تھی۔

☆☆☆

اگلے چار دن مریسا نے اپنی روزمرہ کی زندگی کو معمول پر لانے میں گزارے۔ بلوں کی ادائیگی، گھر اور فریج کی صفائی، بعدازاں اس نے خود کوسی۔ ڈی۔ سی کی لائبریری میں جھونک دیا۔ تاہم وہ روز صبح معمول کی دوڑ بحال کرنا نہیں بھولی تھی۔

لائبریری میں وہ وائرل ہیمرج فیور اور وائرس کا مطالعہ کرنے میں جت گئی۔ ایبولا بالخصوص مریسا کا مرکزِ نگاہ تھا۔ ماضی میں اس کی وبا کہاں کہاں پھوٹی تھی۔ مریسا نے تمام مواد یکجا کرلیا۔

ہر مرتبہ ہرکارۂ اجل اچانک نامعلوم ٹھکانے سے برآمد ہوا اور موت کا خونی رقص دکھا کر دفعتاً غائب ہوگیا۔ ہر مرتبہ اس کی پناہ گاہ تلاش کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر سرتوڑ کوشش کی گئی۔ حیوانوں کی سیکڑوں اقسام کو کھنگالا گیا۔ حتیٰ کے کیڑے مکوڑوں کے نمونوں کا بھی تجزیہ کیا گیا۔ نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ ماہرین اس کی کھوج میں مکمل طور پر ناکام رہے۔

مریسا کو ایک ہی خفیف سا مثبت اشارہ ملا۔ ایک مقامی چوہے (گنی پگ) میں ’’اینٹی باڈیز‘‘ کی موجودگی۔ مریسا کی جاسوسی جاری رہی۔ آخر کار اس کی توجہ 1976ء والی زائر میں پھوٹنے والی وبا پر جم گئی۔ جہاں یہ ’’یامبوکا مشن اسپتال‘‘ میں نمودار ہوا تھا۔ اس حادثے کو کئی برس بیت گئے تھے۔ تاہم اس کے علم میں تھا کہ اس کی تلاش میں سی۔ ڈی۔ سی کی متعلقہ ٹیم وہاں پہنچی تھی۔

یامبوکا مشن اسپتال اور رشٹر اسپتال کے مابین کتنی کڑیاں ملائی جاسکتی ہیں؟ یا پھر صرف علاقے کو پیش نظر رکھا جائے۔ یعنی ’’یامبوکا‘‘ اور ’’لاس اینجلس‘‘ ڈاکٹر رشٹر اپنی ہلاکت خیز بیماری کے نمودار ہونے سے ایک ہفتے قبل نیروبی (کینیا) گیا تھا۔

مریسا نے گھڑی چیک کی۔ گھنٹے کی سوئی دو سے اوپر جارہی تھی۔ سوا تین بجے اسے نورس کے دفتر میں ہونا چاہیے تھا۔ MCL میں آمدورفت کے اختیار کے لیے مریسا درخواست دے چکی تھی۔ آج اس کا فیصلہ ہونا تھا۔ اسے امید نہیں تھی کہ نورس اس کے حق میں فیصلہ دے گا۔

معاًعقب سے کتاب پر کسی کا سایہ منڈلایا۔

’’ویل...... ویل ویل...... ل...... وہ ابھی تک زندہ ہے۔‘‘

’’رالف۔‘‘ مریسا نے سرگوشی کی۔ اسے جھٹکا لگا۔ رالف کی آمد غیر متوقع تھی۔

’’ہاں، رالف۔ افواہیں گردش کررہی تھیں کہ وہ زندہ واپس آگئی ہے۔‘‘ رالف کی آواز میں مزاح کی آمیزش تھی۔ ’’لیکن میں یہ حقیقت اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔‘‘

مریسا نے کھڑے ہوکر اس کا ہاتھ تھاما اور ہال وے کا رخ کیا۔ ایک مناسب مقام پر رک کر اس نے رالف کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ رالف خوشدلی سے مسکرا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ ’’خوش آمدید‘‘ کہہ رہی تھی۔

مریسا نے اپنائیت محسوس کی۔ اس کا احساسِ جرم کم ہوگیا۔ کیونکہ اٹلانٹا واپس آنے کے بعد اس نے اب تک رالف سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ حالانکہ وہ لاس اینجلس سے ہر ہفتے رالف کو فون کرتی تھی۔

’’تمہیں دیکھ کر خوشی ہوئی۔‘‘ مریسا نے اسے گلے لگایا۔

’’تم نے مجھے اطلاع نہیں دی۔ نورس نے مجھے بتایا کہ تم چار دن قبل واپس آچکی ہو۔‘‘ رالف نے نرمی سے شکایت کی۔

’’آئی ایم ریئلی سوری۔ میں آج تمہیں فون کرنے والی تھی۔‘‘ مریسا نے معذرت کی۔ تاہم وہ کچھ بے کیف سی ہوگئی۔ نورس نے رالف کو کیوں بتایا۔

’’آؤ کیفے ٹیریا میں بیٹھتے ہیں۔‘‘ رالف نے پیش قدمی کی۔

وقت کی مناسبت سے کیفے ٹیریا میں افراد کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ رالف نے کافی کا آرڈر دیا۔

’’آج ڈنر کے بارے میں کیا خیال ہے؟‘‘ رالف نے کافی کی چسکی لیتے ہوئے استفسار کیا۔ کپ رکھ کر وہ ذرا جھکا اور مریسا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ’’دراصل میں لاس اینجلس میں اس وائرس کی فتح کی جزئیات سننے کے لیے مرا جارہا ہوں۔‘‘

’’اکیس اموات ہوگئیں۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ اسے فتح سمجھنا چاہیے۔‘‘ مریسا کے چہرے پر تاسف کا سایہ لہرایا۔ ’’ہم ناکام رہے۔ ہم وائرس کی پناہ گاہ کا سراغ بھی نہ پاسکے۔‘‘

’’میرا خیال ہے کہ تم زیادہ خود احتسابی سے کام لے رہی ہو۔‘‘ رالف نے کہا۔

’’لیکن ہمیں نہیں پتا کہ وائرس اگر دوبارہ نمودار ہوتا

ہے....'' مریسا نے گہری سانس لی۔ ''تو اس مرتبہ وہ کب اور کہاں قیامت برپا کرے گا؟''

''کیا مطلب؟''

''میری نامعلوم حس کہہ رہی ہے کہ یہ فتنہ پھر اٹھے گا۔'' مریسا نے جواب دیا۔

''اوہ..... ہو۔ اس میں تمہارا کیا قصور ہے۔ تم نے اپنی پوری کوشش کی اور بربادی رشٹر اسپتال تک محدود رہی۔'' رالف نے مریسا کا ہاتھ سہلایا۔ ''ورنہ قیامتِ صغریٰ برپا ہو جاتی تھی۔''

مریسا نے اندازہ لگایا کہ رالف اس کے احساسات کو سہارا دینے کی کوشش کر رہا ہے۔

''تھینک یو۔'' وہ مسکرائی۔ ''واقعی بڑی تباہی پھیل سکتی تھی۔ اس کی ہلاکت خیزی 94 فیصد سے اوپر ہے۔ مزید یہ کہ ابھی تک کوئی علاج یا توڑ دریافت نہیں ہوا ہے۔'' مریسا نے گھڑی دیکھی۔ رالف کو میٹنگ کے بارے میں بتایا اور معذرت کی۔

''ڈنر؟''

''ہاں، ڈنر پر ملیں گے۔''

☆☆☆

مریسا نے ایلیویٹر کے بجائے زینے کو ترجیح دی اور تیز قدمی سے تین فلور اوپر پہنچ گئی۔ نورس کا آفس بھی اسی منزل پر تھا۔ MCL تک رسائی کے لیے بھی تیسری منزل پر آنا پڑتا تھا۔ اس نے نورس کے آفس کا رخ کیا۔

سیکریٹری نے مریسا کو انتظار کرنے کے لیے کہا۔ مریسا نے وائرولوجی ٹائمز کی ورق گردانی شروع کر دی۔ جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ نورس عمداً اسے انتظار کروا رہا ہے۔

ایک گھنٹے بعد مریسا، نورس کے چیمبر میں داخل ہو رہی تھی۔ ایک عالمِ تذبذب ہمراہ تھا۔

نورس نے انتظار کے لیے کوئی معذرت نہیں کی۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ مریسا نے بدمزہ کیفیت کو دبایا اور سوال کیا۔ ''مجھے یقین ہے کہ میری درخواست مل گئی ہو گی؟''

''بے شک۔''

''پھر ___؟''

''لیب میں چند روز کا تجربہ MCL میں جانے کے لیے ناکافی ہے۔'' جواب ملا۔

''پھر کوئی مشورہ؟''

''مشورہ یہی ہے کہ جو تم کر رہی ہو، ٹھیک کر رہی ہو۔'' نورس کے لہجے میں خفیف سی نرمی در آئی۔ ''اسے جاری رکھو۔ وائرس جو کم خطرناک ہیں، ان کے ساتھ تجربے میں اضافہ کرو۔ پھر تم اس قابل ہو جاؤ گی کہ MCL میں جانے کا خطرہ مول لے سکو۔''

مریسا نے خفیف سی نرمی کو محسوس کر لیا۔ وہ یہ نکتہ بھی سمجھ گئی کہ نورس اسے خطرناک لیب سے دور رکھنا چاہتا ہے۔ رالف اور ٹیڈ، مریسا کے اچھے دوست تھے۔ رومانس کا پہلو مفقود تھا۔ بلاشبہ نورس کی وجاہت اور کشش رالف سے کہیں زیادہ تھی۔ درحقیقت راجر کے تلخ تجربے کے بعد نورس ہی وہ دوسرا شخص تھا جس نے مریسا کو متاثر کیا تھا۔ اس روز لاس اینجلس میں مریسا بوکھلا گئی تھی۔ یوں رومانوی تعلقات شروع ہونے سے قبل ہی بے یقینی و بے مہری کا شکار ہو گئے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ نورس کی بھی غلطی تھی۔ وہ اچانک بے قابو ہو گیا تھا... غلط مقام، غلط موقع اور غلط انداز میں اظہار کر بیٹھا۔

''یقین رکھو کہ مجھے از خود پتا چل جائے گا کہ اب تم مناسب تجربہ حاصل کر چکی ہو۔'' نورس کی آواز مریسا کو خیالات کی دنیا سے باہر لے آئی۔ ''مجھے نہیں تو ٹیڈ کو علم ہو جائے گا۔''

مریسا نے خوشی محسوس کی۔ اگر یہ ٹیڈ پر منحصر ہے تو پھر وہ جلد ہی کامیاب ہو جائے گی۔

''اس وقت مسئلہ کچھ اور ہی ہے۔'' نورس نے دفعتاً کرسی چھوڑ دی۔ مریسا چونک اٹھی۔ اس نے نورس کی آنکھوں میں کچھ پڑھنے کی ناکام کوشش کی۔

''مسئلہ؟ کیسا مسئلہ؟''

''اس وقت MCL سے کہیں زیادہ اہم مسئلہ درپیش ہے۔'' نورس نے میز کا چکر کاٹا۔ ''اس پر تم سے بات کرنی ہے۔ میں پچھلے ایک گھنٹے سے مختلف افراد سے فون پر بات کرتا رہا ہوں۔ ان میں سوری (امریکا کی ایک ریاست) اسٹیٹ اپی ڈیمیالوجسٹ بھی شامل ہے۔''

مریسا کے کان کھڑے ہوئے۔ اس نے نشست پر بے چینی سے پہلو بدلا۔ اسے یہ ادراک بھی ہوا کہ نورس نے قصداً اسے انتظار نہیں کرایا تھا۔

''سینٹ لوئیس سوری میں وائرل امراض کا ایک بگڑا ہوا کیس سامنے آیا ہے۔''

مریسا کی سانس رک گئی۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم فوراً روانہ ہو جاؤ۔ صورت حال کا جائزہ لو۔ رپورٹ کرو... اور نمونے حاصل کر کے ٹیڈ کو

ارسال کر دو۔ یہ تمہاری فلائٹ ریزرویشن ہے۔'' نورس نے ایک کاغذ آگے بڑھایا۔

مریسا نے شیٹ دیکھی اور بھونچکا رہ گئی۔ وقت بہت کم تھا۔ بطور EIS آفیسر اسے ہمہ وقت اپنا بیگ تیار حالت میں رکھنا چاہیے تھا جبکہ اس کا بیگ تیار نہیں تھا پھر وہی خطرناک وائرس اور فمی کے لیے دوبارہ پڑوسیوں کو زحمت دینی پڑے گی۔ رالف کے ساتھ ڈنر بھی گیا۔

''لیکن ہوسکتا ہے ....'' وہ بمشکل لب کشا ہوئی۔

''ہاں ہوسکتا ہے کہ وہ نہ ہو۔'' نورس نے قطع کلامی کی۔ ''لیکن لاس اینجلس کے ہنگامے کے بعد رسک لینے کی قطعی گنجائش نہیں ہے۔ ہم یہاں موبائل لیب ریڈی کر دیں گے۔ صرف امید کی جاسکتی ہے کہ وہ نہ ہو۔'' نورس نے گڈ لک کا اشارہ دینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔

لیکن مریسا پھر الجھے ہوئے خیالات میں گم ہوچکی تھی .... چند گھنٹے باقی تھے۔ اسے دوبارہ اتنی جلدی خون آشام وائرس کا سامنا کرنا تھا۔ بھڑکتی ہوئی سرخ آگ.... خشک جنگل میں لگی بے قابو آگ کی طرح....

مریسا، نورس کا بڑھا ہوا ہاتھ نہ دیکھ سکی۔ کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈالی اور کھوئی کھوئی، گم صم باہر نکل گئی۔

☆☆☆

ہوائی جہاز رن وے پر ٹیکسی کر رہا تھا۔ مریسا کو موقع ہی نہیں ملا کہ وہ رالف کو اطلاع کر دیتی .... تاہم اپنی دوسری مہم پر وہ پہلے کے مقابلے میں پُراعتماد تھی۔ یہ اور بات تھی کہ پہلی مہم کے دوران اور اس کے بعد بھی وہ خوف پوری طرح مٹا نہ تھا۔ مریسا کو خدشہ رہا کہ کہیں وہ وائرس سے متاثر تو نہیں۔ وہاں سے آنے کے بعد بھی کوئی مشکوک علامت ظاہر ہوتی تو اس کا خیال اسی کی طرف جاتا۔

ائرپورٹ سے نکل کر بذریعہ کیب وہ سیدھی گرینڈ سینٹ لوئیس کمیونٹی ہیلتھ پلان اسپتال وارد ہوئی۔ کثیرالحول عمارت، رشتر اسپتال کی طرح شاندار اور نفیس تھی۔ اندرونی حصے کے چوبی کام میں بھوری شیشم کا استعمال کیا گیا تھا۔ سرخ غالیچے، ماربل کی شفاف چکناہٹ.... وغیرہ وغیرہ۔

مریسا کی پہلی ملاقات ڈاکٹر ہیرالڈ اور ڈاکٹر پیٹر آسٹن سے ہوئی۔ وہ دونوں بے چینی سے اس کے منتظر تھے۔ ڈاکٹر ہیرالڈ، مریسا کے تعارف پر اچھل ہی پڑا۔ دونوں نے خوشی کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر پیٹر نے سی۔ڈی۔سی کے تیز رفتار ردِعمل پر مریسا کا شکریہ ادا کیا۔ مریسا نے کھانے پینے کی آفر مسترد کر دی۔

پیٹر آسٹن نے بولنا شروع کیا۔ ''لاس اینجلس کے معاملات ہمارے علم میں تھے۔ اس لیے حفظِ ماتقدم کے لیے ہم نے فوراً سی۔ڈی۔سی سے رابطہ کیا۔ ہم نے ''مشکوک'' مریض کو کل صبح ایڈمٹ کیا تھا۔ آج دو مریض مزید داخل ہوچکے ہیں۔''

مریسا پیش کردہ آرام دہ کرسی میں دھنس گئی۔ اس کا نچلا ہونٹ دانتوں تلے تھا۔ وہ دورانِ سفر امید کر رہی تھی کہ یہ الارم کی چیخ غلط ثابت ہوگی۔ لیکن مزید دو مریضوں کی اطلاع نے اس کے حسنِ ظن کو خاکستر کر دیا۔

''بہتر ہوگا کہ آپ لوگ اپنی آرا اور اخذ کردہ نتائج سے آگاہ کریں۔'' مریسا نے کہا۔

''ہمارے پاس بتانے کے لیے کچھ زیادہ نہیں ہے۔'' پیٹر آسٹن نے جواب دیا۔ ''میں ڈاکٹر ہیرالڈ کو کریڈٹ دوں گا۔ خطرے کا الارم ہیرالڈ نے ہی بجایا تھا۔ چنانچہ مریض کو فوراً محدود کر دیا گیا۔ مریض کے ساتھ رابطہ رکھنے والوں کی تعداد بھی کم سے کم کر دی گئی۔''

''ویری گڈ۔'' مریسا نے ڈاکٹر ہیرالڈ کو دیکھا۔ ہیرالڈ، پیٹر کے تبصرے پر مریسا کے دیکھنے پر تقریباً شرما سا گیا۔

''لاس اینجلس کی وبا سے کوئی تعلق، کوئی امکان یا کوئی کڑی دریافت ہوئی؟''

''نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔ ہم نے کافی تفتیش کی۔'' ڈاکٹر آسٹن نے جواب دیا۔

مریسا نے لاس اینجلس کے تجربے کی بنیاد پر چند سوالات کیے پھر مریض کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

''حفاظتی انتظامات کا کیا حال ہے؟''

''ہم نے بھرپور کوشش کی ہے۔''

''کیا مریضوں میں سے کوئی ماضی قریب میں افریقہ گیا تھا؟'' مریسا نے سوال کیا۔

دونوں ڈاکٹرز نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''غالب خیال ہے کہ ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔''

مریسا کو اس جواب کی امید نہیں تھی۔

تینوں اسپتال کی لابی سے گزر کر ایلیویٹر میں آگئے۔ مریسا کی نگاہ فلور انڈیکیٹر پر تھی۔ جو بتا رہا تھا کہ وہ آٹھویں منزل پر ایلیویٹر سے باہر آئے ہیں۔ مریسا نے ان کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے نوٹ کیا کہ آٹھویں منزل پوری طرح فرنشڈ نہیں تھی۔

ڈاکٹر ہیر اللہ نے مریسا کے تاثرات پڑھ لیے۔
''سوری۔'' وہ بولا۔ ''آٹھویں منزل نامکمل تھی۔ ایمرجنسی سے نمٹنے کے لیے ہم نے اسے منتخب کیا۔ مریضوں کو آئیسولیٹ کرنے کے لیے یہ بہتر مقام تھا۔''

مریسا نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ تینوں نرسز اسٹیشن پر رک گئے۔ مریسا نے سب سے نیچے موجود پیشنٹ چارٹ نکالا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ سب سے پہلے اس نے مریض کا نام پڑھا۔ زیبر سکی۔ پھر وائٹل سائن چیک کیے۔ تیز بخار اور گرتا ہوا خون کا دباؤ۔ یہ چیز اسے شناسا سی لگی۔ وہ پیشنٹ ہسٹری والے صفحے پر آئی۔ یہاں مریض کا مکمل نام موجود تھا۔ ڈاکٹر کارل۔ ایم۔ زیبر سکی۔ مریسا کے دماغ میں گھنٹی بجی.... اس نے نظر اٹھا کر ڈاکٹر ہیر اللہ کو دیکھا۔ مریسا کی نگاہ میں غیر یقینی کیفیت تھی۔

''کیا یہ مریض فزیشن ہے؟''

''ہاں۔'' ہیر اللہ بولا۔ ''زیبر سکی اسی اسپتال میں ماہر امراضِ چشم ہے۔''

مریسا نے بے چینی محسوس کی اور ڈاکٹر آسٹن کو دیکھا۔
''آپ کو پتا ہے کہ لاس اینجلس کا ''انڈیکس کیس'' (وہ پہلا مریض ہوتا ہے جو دوسروں کو مرض منتقل کرنے کا سبب بنتا ہے) بھی ایک ڈاکٹر تھا؟''

''میں اس ''اتفاق'' سے آگاہ ہوں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیا واقعی یہ محض ایک اتفاق ہے؟'' مریسا نے بایاں ابرو اچکایا۔

وہ دونوں بے بسی سے شانے اچکا کر رہ گئے۔
''کیا ڈاکٹر زیبر سکی، بندروں کے ساتھ کسی تجربے میں مشغول رہے تھے؟''

''نہیں، یقینی طور پر ایسی کوئی بات نہیں تھی۔'' ہیر اللہ نے جواب دیا۔

لاس اینجلس میں صرف ایک ہی ڈاکٹر متاثر ہو کر ہلاک ہوا اور وہی انڈیکس کیس تھا۔ مریسا نے سوچنا شروع کیا۔ بقیہ ہلاکتوں میں 3 لیب ٹیکنیشن اور ایک نرس تھی۔ باقی تمام کا تعلق رشٹر اسپتال کے بیرونی مریضوں سے تھا.... وہ پھر چارٹ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ پیشنٹ ہسٹری اتنی جامع نہیں تھی۔ جتنی اس نے رشٹر اسپتال میں دیکھی تھی لیکن لیب ورک شاندار تھا۔ جگر اور گردے بھی ملوث تھے۔ مریسا کو نتیجہ اخذ کرنے میں دیر نہیں لگی۔ مریسا کو ایک بار پھر خون آشام ایبولا کا سامنا تھا۔

☆☆☆

مریسا نے وائرل سیمپل لینے اور انہیں محفوظ کرنے کا سامان ایک جگہ کیا۔ وہ نیچے ہال میں آ گئی تھی۔ اس نے جنرل لیب کے عملے سے چند باتیں کیں۔ ایک نرس کے ہمراہ وہ واپس آٹھویں منزل کے تحدیدی علاقے میں داخل ہوئی۔

وہاں اب چار افراد تھے۔ مریض اور ڈاکٹر کے علاوہ خود مریسا اور ایک نرس۔ چاروں حفاظتی ساز و سامان سے لیس تھے۔ مریسا بیڈ کے قریب ہو گئی۔ مریض کی حالتِ زار کا اندازہ لگانے میں اسے محض چند سیکنڈ لگے۔ اس کا پہلا شکار، جسے وہ طبی زبان میں ''انڈیکس کیس'' بولتے تھے، ڈوب رہا تھا۔ مریسا نے اس کے بالائی دھڑ پر ایک خونی خراش دیکھی۔ جریانِ خون کی کئی ایک علامتیں موجود تھیں۔ ڈاکٹر زیبر سکی اس وقت خود مریض تھا۔ ایک خوفناک، تقریباً لاعلاج مرض میں مبتلا.... ہر نئی سانس اسے وادیٔ اجل کی جانب کھینچ رہی تھی۔ اس کے بدن میں ناک کے ذریعے جو ٹیوب داخل کی گئی تھی، اس میں خون ہی خون تھا۔ خون میں ایک مخصوص چمک تھی۔ وہ ہوش میں تھا لیکن نیم بے ہوش.... سوال جواب کرنا بے معنی تھا۔

مریسا نے وہاں موجود فزیشن سے مختصر گفتگو کی جس سے پتا چلا کہ مریض کی حالت متواتر بگڑتی رہی اور گزشتہ ایک گھنٹے میں اس کی حالات نہایت تیزی سے خراب ہوئی تھی۔ خون کا دباؤ گرتا ہی جا رہا تھا۔

مریض کی حالت خوفناک حد تک ڈاکٹر رشٹر سے مطابقت رکھتی تھی۔ وہ ایبولا کا شکار ہو کر موت کی شاہراہ پر قدم رکھ چکا تھا۔ محض ایبولا کی موجودگی کا ثبوت درکار تھا۔

نرس کی مدد سے مریسا نے خون اور پیشاب کے علاوہ تمام ضروری نمونے حاصل کیے۔ دہری تہ کے مخصوص بیگ میں رکھنے سے پیشتر نمونوں پر سوڈیم ہائپوکلورائٹ کا اسپرے کیا۔ مریسا بیگ لے کر کمرے سے نکل گئی۔

نرسز اسٹیشن سے مریسا نے ڈاکٹر نورس کو فون کیا۔ نورس نے مختصر، ٹو دی پوائنٹ بات کی۔ مریسا نے اپنی رائے اور تجزیے سے آگاہ کیا۔ ''ہمیں ایبولا کا سامنا ہے اور وبائی صورتِ حال سر پر کھڑی ہے۔''

نورس نے تحدیدی کارروائی کے بارے میں سوال کیا اور بتایا کہ وہ حتی الامکان تیزی سے پہنچ رہا ہے۔ نورس نے چند ہدایات بھی جاری کیں۔
''میں چاہتا ہوں کہ تم تمام لیب ورک رکوا دو۔'' وہ

بولا۔ ''وائرس کش اسپرے کی نگرانی کرو۔ انہیں بتاؤ کہ فوراً قرنطینہ کا بندوبست کریں۔ تم حاصل کردہ نمونے فی الفور ٹیڈ کو روانہ کردو۔''

مریسا جواب دینے والی تھی کہ اسے احساس ہوا، دوسری جانب لائن منقطع ہوچکی ہے۔ وہ چند سیکنڈ ریسیور کو گھورتی رہی۔ پھر ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئی۔

پہلے اس نے نمونے روانہ کرنے کا بندوبست کیا پھر وہ ہیرالڈ اور آسٹن سے ملی۔ انہیں باس کی ہدایات کے بارے میں بتایا۔ ساتھ ہی درخواست کی کہ وہ دونوں ڈائریکٹر کو بھی بتادیں۔

وہ باقی دو مریضوں کی فائل دیکھنا چاہتی تھی۔ تب ہی پیٹی نامی نرس نے اسے مسز زیبرسکی کے بارے میں بتایا۔

''کیا وہ مریض ہے؟'' مریسا نے پہلا سوال کیا۔

''نہیں، وہ اسپتال میں رکنے پر بضد ہے جبکہ ڈاکٹر ہیرالڈ کے خیال میں یہ مناسب نہیں ہے۔''

''مسز زیبرسکی کہاں ہے؟''

''اسے پہلی منزل کے لاؤنج میں روک لیا گیا ہے۔'' نرس پیٹی نے اطلاع فراہم کی۔

مریسا نے ارادہ تبدیل کردیا اور مسز زیبرسکی سے ملنے کا فیصلہ کیا۔

پہلی منزل کے لاؤنج میں وہ اکیلی تھی۔ تاہم پھر بھی مریسا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''مسز زیبرسکی؟'' مریسا کی آواز نرم تھی۔ اس کی عمر چالیس پچاس کے درمیان تھی۔ آنکھیں بتارہی تھیں کہ وہ روتی رہی ہے۔ اس نے اثبات میں سرہلایا۔ مریسا نے اپنا تعارف پیش کیا۔

''مسز زیبرسکی میں معذرت خواہ ہوں۔ تاہم چند سوالات کے جواب اگر آپ دینا پسند کریں؟''

خاتون کی نگاہ دھندلا گئی۔ ''کیا وہ ---'' اس کی آواز بیٹھ گئی۔

''نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ آپ کے شوہر زندہ ہیں۔'' مریسا نے بمشکل تاسف دبانے کی کوشش کی۔ وہ مسز زیبرسکی کے نزدیک بیٹھ گئی۔ ''جو ڈاکٹرز آپ کے شوہر کی دیکھ بھال کررہے ہیں، میں ان میں شامل نہیں ہوں۔ میں مرض کی نوعیت سمجھنے میں ان کی مدد کررہی ہوں۔ آپ حوصلہ رکھیں۔ مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔'' مریسا پیشے کے تقاضے سے مجبور تھی۔ مسز زیبرسکی کو وہ جھوٹی آس دلا رہی تھی۔ وہ خود بے بس تھی۔ نڈھال خاتون نے تعاون کی حامی بھرلی۔

''کیا آپ کے شوہر گزشتہ دو ماہ کے دوران کسی سفر پر گئے تھے؟'' مریسا نے پہلا سوال کیا۔

''ہاں۔'' زیبرسکی کی بیوی نے تھکی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''کہاں گئے تھے؟'' مریسا مثبت جواب پر چونک اٹھی۔ تاہم اس نے اپنے تاثرات نارمل رکھے۔

''سان ڈیاگو۔''

مریسا نے اس بار بدقت تمام خود کو نارمل ظاہر کیا۔ سان ڈیاگو کا نام سن کر وہ تناؤ کا شکار ہوگئی تھی۔

''غالباً وہاں آنکھوں کی سرجری سے متعلق کوئی کانفرنس تھی؟'' مریسا نے تصدیق چاہی۔

''ہاں، شاید ایسا ہی تھا۔ کارل (زیبرسکی) کی سیکریٹری کے پاس یقیناً مصدقہ معلومات ہوں گی۔'' مسز زیبرسکی نے کہا۔

مریسا کے ذہن میں خیالات کی طغیانی تھی۔ ڈاکٹر رشٹر نے بھی سان ڈیاگو کی مذکورہ کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ کیا یہ بھی محض ایک اتفاقیہ امر تھا؟

''کیا ڈاکٹر زیبرسکی کو کہیں پر بندر یا کسی اور جانور نے کاٹا تھا؟''

مسز زیبرسکی نے جواب دینے میں کئی سیکنڈ لیے۔ ''نہیں، ایسا کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔''

مریسا نے مریض کی سیکریٹری کا نام اور فون نمبر لیا۔ پھر مسز زیبرسکی کا شکریہ ادا کرکے اٹھ گئی۔

سیکریٹری کا نام جوڈتھ تھا۔ سیکریٹری سے مریسا کوئی خاص بات معلوم نہ کرسکی۔

اچانک اسے رالف کا خیال آیا۔ مریسا نے فون ملایا۔ رالف سے بات کرکے مریسا نے بالائی منزل کے تحدیدی علاقے (Isolted) میں قدم رکھا۔ وہ باقی دو مریضوں کے چارٹ دیکھنا چاہتی تھی۔ ایک کا نام کیرول منٹگمری تھا۔ دوسرا مریض خود ڈاکٹر تھا۔

ڈاکٹر برائن سیسٹر۔ دونوں کو تیز بخار، شدید سر درد اور پیٹ میں تشنج کی کیفیت کی شکایت تھی۔ اگرچہ تینوں علامتیں کسی مخصوص مرض کی نشاندہی سے قاصر تھیں۔ تاہم ان کی شدت اور تیزی بذات خود خطرے کی گھنٹی بجا رہی تھیں۔

مریسا نے ہسٹری کا بغور جائزہ لیا۔ اسے مطلب کی کوئی چیز نظر نہ آئی۔ بالآخر اس نے دونوں کو دیکھنے اور

مطلوبہ نمونے حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ مریسا نے تمام حفاظتی اشیا سے خود کو لیس کیا اور اندر قدم رکھ دیا۔

کیرول ایک خاتون تھی۔ عمر میں مریسا سے دو سال بڑی تھی۔ پیشے کے اعتبار سے وہ ایک بڑی فرم میں وکیل تھی۔ مریسا نے دیکھا کہ وہ بات چیت کے قابل ہے۔ تاہم خاصی بیمار لگ رہی تھی۔

مریسا نے کیرول سے ماضی قریب میں سفر کے متعلق پوچھا۔ جواب نفی میں تھا۔ مریسا کا دوسرا سوال ڈاکٹر زبیر سکی سے متعلق تھا۔ مریسا کے علم میں یہ بات آئی کہ وہ نہ صرف زبیر سکی کو جانتی ہے بلکہ اس کے زیر علاج رہ چکی ہے۔ مریسا کا تیسرا سوال یہ تھا کہ کیرول نے آخری بار زبیر سکی کو کب دیکھا تھا؟ جواب ملا کہ چار روز قبل۔ مریسا نے خون کے علاوہ مطلوبہ نمونے حاصل کیے اور بوجھل دل کے ساتھ وہاں سے ہٹ گئی۔

وہ ایک ایسے مرض کی تشخیص سے متنفر تھی جس کا توڑ ہی دریافت نہیں ہوا ہو۔ ایک سوال اس کے ذہن میں اٹکا ہوا تھا۔ لاس اینجلس میں ڈاکٹر رشٹر کے کچھ مریض ایبولا سے متاثر ہوئے۔ جبکہ بعض پر کوئی اثر نہیں ہوا؟ وہاں اسپتال کا ڈاکٹر ''انڈیکس کیس'' تھا۔ یہاں سینٹ لوئیس میں بھی میڈیکل سینٹر کا ڈاکٹر ہی ''انڈیکس کیس'' ہے۔ دونوں ڈاکٹرز کا آپس میں کوئی تعلق سامنے نہیں آیا تھا اور دونوں نے سان ڈیاگو کی کانفرنس میں شرکت کی تھی۔

ہوٹل بھی ایک ہی تھا۔ مریسا خیالات میں غلطاں دوسرے مریض ڈاکٹر برائن کی طرف چلی گئی۔ ظاہر ہے اسے بھی آٹھویں منزل کے آئسولیٹڈ علاقے میں رکھا گیا تھا۔ تینوں مریض الگ الگ کمروں میں تھے۔

مریسا نے اس سے بھی وہی سوالات کیے۔ تاہم برائن نے اس بات سے انکار کیا کہ وہ زبیر سکی کا مریض رہ چکا ہے۔

مریسا نے پوچھا۔ ''کیا تم نے ڈاکٹر زبیر سکی کے ساتھ کام کیا ہے؟''

''میں نے بعض اوقات اس کے مریضوں کو اینستھیا دیا تھا۔ اس حد تک کہہ سکتے ہیں کہ میں نے زبیر سکی کے ساتھ کام کیا ہے۔ کام سے زیادہ میں اس کے ساتھ کھیل میں شرکت کرتا رہا ہوں۔'' برائن نے جواب دیا۔

''کیسا کھیل؟''

''میں اکثر اس کے ساتھ ٹینس کھیلتا رہا ہوں۔''

''آخری بار تم اس کے ساتھ کب کھیلے تھے؟''

''چار روز قبل۔''

مریسا کچھ دیر خاموش رہی پھر سر جھٹک کر نمونے اکٹھے کرنا شروع کیے۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ چند کڑیاں وہ حاصل کر چکی ہے۔ اگرچہ وضاحت باقی تھی۔ مرض کی منتقلی کے لیے انڈیکس کیس یا اس سے متاثر مریض کے ساتھ قریبی ربط ضروری تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر نورس، ری لینڈ اور رینی کے ہمراہ پہنچ چکا تھا۔ تینوں سرگرمی سے مصروف کار تھے۔ ڈاکٹر رینی قرنطینہ کی بہتری اور دیکھ بھال کے لیے نیچے چلا گیا تھا۔

تینوں تمام ضروری اور جدید طبی آلات وغیرہ لائے تھے۔ موبائل لیب ساتھ تھی۔ مریسا کو یوں لگا کہ اسے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

''میں کچھ کر سکتی ہوں؟'' مریسا نے نورس سے سوال کیا۔

''نہیں، تمہاری ضرورت نہیں ہے۔ چاہو تو آرام کرلو۔'' نورس کی آواز میں خشکی تھی۔

''چند منٹ مل جائیں تو میں بعض نکات سے باخبر کرنا چاہوں گی۔'' وہ بولی۔ وہ سان ڈیاگو کانفرنس پر بات کرنے کے لیے بے چین تھی۔

''تمہیں انتظار کرنا پڑے گا۔'' نورس نے جواب دیا۔ اس کی توجہ موبائل لیب کے فنکشن کی جانب تھی۔ دو لیب ٹیکنیشن اس کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔

مریسا نرسز اسٹیشن پر جا کر بیٹھ گئی۔ وہ خاصی بے کیفی محسوس کر رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا نورس اسے پانچ دس منٹ دے گا؟ یا وہ جا کر آرام کرے اور اپنی نیند پوری کرلے.... کچھ دیر بعد وہ اٹھی۔ اس نے سونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

مریسا صبح سات بجے بیدار ہوئی تو اس کی بدمزگی ختم ہو چکی تھی۔ اسے احساس ہوا کہ نورس کی بے اعتنائی برمحل تھی۔ اگر ایبولا بے قابو ہو جاتا ہے تو سارا ملبا نورس کو اٹھانا پڑے گا۔ مریسا پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔

وہ آٹھویں منزل کے مخصوص اور علیحدہ مقام تک پہنچی۔ پہلی اطلاع اسے نورس کے بارے میں ملی۔ وہ دو گھنٹے قبل جا چکا تھا۔

نرسز اسٹیشن پر مریسا کو افراتفری کا احساس ہوا۔ رات کسی وقت پانچ اور مریض وہاں پہنچ چکے تھے۔ مریسا نے تمام چارٹ اکٹھے کیے تو اسے پتا چلا کہ زبیر سکی کا چارٹ

غائب ہے۔

استفسار پر اسے معلوم ہوا کہ صبح چار بجے زیبرسکی آخری سانس لے چکا تھا۔ اگرچہ مریسا انجام سے واقف تھی پھر بھی اس نے اذیت محسوس کی۔ شاید وہ لاشعوری طور پر کسی معجزے کی امید میں تھی۔

مریسا کچھ دیر ساکت بیٹھی رہی۔ خود کو مصروف رکھنا بہتر ہے۔ اس نے سوچا پھر وہ دیگر مریضوں کے چارٹ لے کر بیٹھ گئی۔

اچانک اس کی نظر ڈاکٹر لینی پر پڑی۔

''لاس اینجلس جیسی صورتِ حال بنتی جارہی ہے۔'' وہ آہستہ سے بولا۔ ''ایک اور مریض آرہا ہے جبکہ دوسرا ایمرجنسی روم میں ہے۔''

مریسا خاموش رہی۔

''یوں معلوم ہوتا ہے کہ جو نئے مریض آرہے ہیں، ان کو مرض اسی اسپتال سے لگا ہے۔ میرے لیے یہ بڑی عجیب اور پریشان کن بات ہے۔'' لینی نے کہا۔

''کیا وہ سب ماضی قریب میں زیبرسکی کے زیرِعلاج رہے ہیں؟'' مریسا نے سوال کیا۔

''ہاں، وہ سب کسی نہ کسی حوالے سے زیبرسکی سے ملتے رہے ہیں۔''

''نئے مریض، ڈاکٹر برائن کے زیرِعلاج رہے ہیں۔'' لینی نے مزید بتایا۔ ''برائن نے زیبرسکی کے بعض سرجری والے کیسز میں اس کے ہمراہ کام کیا ہے، میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ مرض منتقل کیسے ہورہا ہے۔ ایبولا، ائربورن (air born) نہیں ہے کہ سانس کے راستے جسم میں داخل ہوجائے۔ نہ یہ محض چھونے سے منتقل ہوتا ہے۔''

''ہاں، میں اس نکتے پر غور کرتی رہی ہوں۔ مرض کی منتقلی کے لیے باڈی فلوئیڈ ضروری ہے۔ وہ خون، آنسو، تھوک یا ایسا ہی کچھ بھی ہوسکتا ہے۔'' مریسا نے کہا۔

''برائن، زیبرسکی کے ساتھ ٹینس کھیلتا رہا ہے۔''

''ہاں، میرے علم میں ہے مگر اس قسم کا تعلق یا رابطہ وائرس کی منتقلی کے لیے ناکافی ہے۔''

''تمہاری بات ٹھیک ہے۔ تاہم آخری بار جب دونوں نے ٹینس کھیلی تھی، اس کے اگلے روز زیبرسکی کے مرض کا آغاز ہوگیا تھا۔ زیبرسکی انڈیکس کیس ہے۔ بالکل ڈاکٹر رشٹر کی طرح....''

اسی وقت نورس نمودار ہوا۔ مریسا حیران رہ گئی۔ وہ پانچ بجے چلا گیا تھا۔ یقیناً سونے گیا پھر اتنی جلدی کیونکر واپس آگیا۔ تھکاوٹ اس کے چہرے پر بھی تھی۔ تاہم شیو بنا ہوا تھا اور ہمیشہ کی طرح لباس میں نفاست تھی۔ مریسا نے اندازہ لگایا کہ وہ سویا نہیں تھا۔

پیشتر اس کے کہ وہ لینی سے بات چیت شروع کرتا، مریسا نے تیزی سے سان ڈیاگو کانفرنس والی بات دونوں کے گوش گزار کردی۔

نورس نے اچٹتی نظر مریسا پر ڈالی۔ معمولی سا توقف کیا۔ پھر بولا۔ ''اگر ہم مذکورہ کانفرنس کی تاریخ کو پیشِ نظر رکھیں تو یہ نکتہ غیراہم ہوجاتا ہے۔''

''لیکن یہی ایک مماثلت ہے۔'' مریسا کا لہجہ مستحکم تھا۔ ''میرا خیال ہے کہ مجھے اسی راستے سے آگے بڑھنا چاہیے۔ تاوقتیکہ کوئی دوسرا اہم اشارہ نہیں ملتا۔''

''مرضی ہے تمہاری۔ اگر تم سمجھتی ہو کہ اس نکتے میں جان ہے تو میں نہیں روکوں گا۔'' نورس نے مریسا کو دیکھے بغیر جواب دیا پھر لینی کو مخاطب کیا۔

''ہمیں زیبرسکی کے دماغ، جگر، تلی اور دل کے نمونے درکار ہوں گے۔''

''اور گردہ؟''

''ہاں۔ گردہ بھی۔'' نورس نے اتفاق کیا۔

☆☆☆

مریسا حیران پریشان تھی۔ سوچ رہی تھی کہ پھر بھی نورس کے ساتھ معمول کے تعلقات بحال ہوں گے یا نہیں۔ دل کے نہاں خانوں میں ناقابلِ فہم چبھن اور خلش تھی۔ کبھی وہ ڈپریس ہوجاتی۔ کبھی اس کی سوچ میں اشتعال کی لہر در آتی۔ کبھی سازِ دل کے تار عجیب انداز میں نغمہ سرا ہوتے .... کہیں گہرائی میں کوئی آرزو تھی کہ صلح ہوجائے۔ دماغ ٹوکتا کہ صلح ہو بھی گئی تو کیا ہوگا؟ اس سوال پر مریسا شپٹا جاتی۔ دل و دماغ کے سوال جواب سے تنگ آکر وہ مصروفیت کے بہانے تلاش کرنے لگتی۔

ہدایت کے مطابق اس نے آٹوپسی روم کا رخ کیا۔ جلد ہی وہ اس کمرے تک پہنچ گئی جہاں زیبرسکی کا مردہ جسم ایک بڑے سے پلاسٹک بیگ میں ٹیبل پر پڑا تھا۔ مریسا آنکھوں پر پلاسٹک گاگلز چڑھانا نہیں بھولی تھی۔ وہاں موجود دیگر افراد کے پاس بھی گاگلز موجود تھے۔

کمرے میں فارمولین (farmolin) کی مخصوص بو پھیلی ہوئی تھی۔ کارروائی کا آغاز ہوا۔ بیگ کاٹ کر باڈی نکالی گئی۔ مریسا نے خاموشی اختیار کی ہوئی تھی۔ لاش کے سر کے بال صاف کردیے گئے تھے۔ سر پر چوٹ کا نشان دیکھ

کر وہ چونک اٹھی ... پھر اس کی نگاہ دائیں کہنی پر پڑی۔ کہنی پر کٹ کا نشان تھا۔ وہ ایک قدم آگے چلی گئی۔ اس کی نظر دائیں ران پر پڑی۔ جہاں دائرہ نما خراش جیسا زخم تھا۔ ایسی ہی خراش اس نے رشٹر کے جسم پر دیکھی تھی۔

''کیا وہ تینوں خراشوں کا تعلق موت سے قبل ہے؟'' اس کا اشارہ سر، ران اور کہنی کی طرف تھا۔ جواب مثبت ملا۔

''موت سے کتنے روز قبل؟ کوئی آئیڈیا؟'' اس نے قدم مزید آگے بڑھایا۔

''لگ بھگ ایک ہفتہ۔'' قصائی نما آلات سے لیس ڈاکٹر نے جواب دیا۔

مریسا کو یاد تھا کہ زیبر سکی کے چارٹ میں تینوں خراشوں کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ اس کے دماغ میں ہلچل مچی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ زیبر سکی ٹینس کے کھیل کے دوران گرا ہو جو بات مریسا کو کھٹک رہی تھی، وہ چارٹ تھا۔ چارٹ میں تینوں علامتوں کی نشاندہی کیوں نہیں کی گئی؟

مریسا کی تربیت کے مطابق تینوں علامتوں کا ذکر ریکارڈ پر ہونا چاہیے تھا۔ اس نے تینوں کو کھوجنے کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

زیبر سکی کی سیکریٹری جوڈتھ اپنے آفس میں تھی۔ وہ سخت ہراساں دکھائی دے رہی تھی۔ مریسا نے اس کی آنکھوں سے اندازہ لگایا کہ وہ روتی رہی ہے۔ پہلی مرتبہ مریسا نے اس سے فون پر بات کی تھی۔ لہٰذا اس نے نئے سرے سے تعارف کرایا۔

مریسا نے بمشکل اسے سنبھالا۔ وہ سخت خوف زدہ تھی اور درازوں سے اپنا سامان نکال رہی تھی۔

''مجھے یہاں سے جانا پڑے گا۔'' وہ بولی۔ ''میں تنہا نہیں ہوں۔ کئی لوگ جا چکے ہیں۔ بہت سے جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔''

''میں زیبر سکی کے سر کی چوٹ کے بارے میں معلوم کرنا چاہتی ہوں؟'' مریسا نے سوال کیا۔

''کچھ نہیں ..... کچھ نہیں۔'' جوڈتھ نے ہاتھ لہرایا۔

''وہ شاپنگ سے واپسی پر رہزنوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ انہوں نے ڈاکٹر کو زخمی کر کے لوٹ لیا۔'' جوڈتھ اپنا سامان سمیٹتی رہی۔

مریسا اس کا جواب سُن کر سناٹے میں آ گئی۔ ڈاکٹر رشٹر بھی وائرس کا شکار ہونے سے قبل رہزنی کی زد میں آیا تھا۔ یہ کیا اسرار ہے؟ مریسا کو مزید کوئی سوال نہیں سوجھا۔ وہ شکریہ کہہ کر وہاں سے نکل گئی۔ وہ خیالوں میں لفٹ میں سوار ہوئی۔ منزل آخری فلور کا آئیسولیٹڈ وارڈ تھا۔

وہاں سرگرمی و سراسیمگی دونوں کے آثار نمایاں تھے۔ لینی مختلف چارٹوں میں سر کھپا رہا تھا۔

''آؤ آؤ ..... ایبولا کی سرخ آندھی زوروں پر ہے۔'' لینی نے مریسا کو دیکھ کر تبصرہ کیا۔ ''پانچ مریض اور آ گئے ہیں۔''

''ٹیڈ نے کوئی اطلاع دی ہے؟'' مریسا نے استفسار کیا۔

''ہاں، اس کی کال آئی تھی۔ یہ ایبولا ہی ہے۔''

مریسا کو پہلے ہی یقین تھا۔ اس کے باوجود اس کا پورا وجود لرز اٹھا۔

''اسپتال کو اب بند ہی سمجھو۔ سب بھاگنے کے چکر میں ہیں۔ مسوری کا وزیر صحت پہنچنے والا ہے۔ قرنطینہ کے ذریعے اسپتال کو مکمل آئیسولیٹ کرنا پڑے گا۔'' لینی نے مزید خبریں دیں۔ ''میڈیا میں بات پھیل گئی ہے۔ ایبولا کا نام نہیں آیا۔ تاہم میڈیا اپنے انداز میں اودھم پیٹ رہا ہے۔ ایک اخبار نے سرخی لگائی ہے: ''طاعون کی واپسی۔'' نورس نے پریس سے دور رہنے کے لیے کہا ہے۔ جو سوال اٹھے گا۔ وہ خود جواب دے گا۔''

☆☆☆

مریسا واپس اٹلانٹا پہنچ چکی تھی۔ پانچ ہفتے بعد اسے ٹھیک طرح سونے اور کھانے کا موقع ملا۔ وہ معمول کی زندگی واپس لانے اور آرام کرنے میں لگی رہی۔ پہلی ملاقات رالف سے ہوئی۔ لاس اینجلس کی طرح اس مرتبہ بھی وہ مریسا کی کارگزاریاں جاننے کے لیے بے قرار تھا۔ حالانکہ مریسا فون پر اسے کافی کچھ بتاتی رہی تھی۔

تاہم رالف کی دلچسپی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتا تھا۔ اس مرتبہ 37 اموات ہوئی تھیں۔

ایک شام مریسا نے اسے نورس کی رائے سے آگاہ کیا۔ نورس کے خیال میں وائرس کی پناہ گاہ کا تعلق طب کے شعبے سے وابستہ افراد سے ہوسکتا ہے۔

رالف نے سوال کیا۔ ''تمہارا ذاتی خیال کیا ہے؟''

''میں بھی اسی طرح سوچ رہی ہوں۔'' مریسا ہنس پڑی۔ ''تم ہوشیار ہو جاؤ۔ دونوں وباؤں کے انڈیکس کیس ماہرِ امراضِ چشم تھے۔

رالف بھی ہنس پڑا۔ ’’ڈر رہی ہو مجھ سے؟‘‘

’’خبردار کر رہی ہوں۔ ڈری ہوئی تو میں ہوں۔ تم تو مزے سے یہاں بیٹھے ہو۔‘‘

’’اچھا یہ بتاؤ کہ دونوں کیس سان ڈیاگو کی کانفرنس میں شریک ہوئے تھے۔ تم نے کیا نتیجہ اخذ کیا؟‘‘

’’میں کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے میں ناکام رہی۔‘‘ مریسا نے اعتراف کیا۔ ’’دونوں کیسز میں کچھ تضاد بھی ہے مثلاً ڈاکٹر رشٹر افریقہ گیا تھا اور زیبر سکی نے بھی ایسا سفر کیا۔ رشٹر کو بندر نے کاٹا تھا لیکن زیبر سکی کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔‘‘ مریسا نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

’’ٹھیک کہتی ہو۔‘‘ رالف نے تسلیم کیا۔ ’’تاہم تم بار بار افریقہ بلکہ زائر کی طرف کیوں دیکھتی ہو؟‘‘

’’شاید اس لیے کہ زائر کی 1976ء کی وبا سے ایبولا نے آغاز کیا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس وقت کی سی۔ ڈی۔ سی کی ٹیم وہاں گئی اور وائرس کی پناہ گاہ ڈھونڈنے میں ناکام رہی یا پھر شاید اس لیے کہ مذکورہ وبا کا انڈیکس کیس ایک امریکی طالب علم تھا اور ایبولا نے وہاں ہولناک تباہی مچائی تھی۔ سیکڑوں کی تعداد میں لوگ ہلاک ہوئے تھے۔‘‘ مریسا نے جواب دیا۔

رالف خاموش رہا۔

’’ہاں ایک چیز مجھے بڑی پراسرار لگی۔‘‘ مریسا نے کہنا شروع کیا۔ ’’میں نے کسی کو نہیں بتایا۔ کیونکہ میرا مذاق اڑایا جاتا۔ منطقی اعتبار سے مجھے خود ہضم نہیں ہو رہی لیکن پھر بھی میرے ذہن میں چبھن ہے۔‘‘

’’ایسی کیا بات ہے؟‘‘ رالف نے بغور مریسا کو دیکھا۔

’’رشٹر اور زیبر سکی دونوں کو رہزنوں نے زخمی کر کے لوٹا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ اس کے بعد ہی مرض کا آغاز ہوا۔‘‘

’’تم بہت دور تک سوچتی ہو۔‘‘ رالف مسکرایا۔ ’’یہ کیونکر ممکن ہے؟‘‘

’’ہاں، بات تو احمقانہ لگتی ہے۔‘‘ مریسا نے گہری سانس لی اور خاموش ہوگئی۔

☆☆☆

چند روز میں مریسا نارمل روٹین میں آگئی۔ یہ اور بات تھی کہ جب بھی فون کی گھنٹی بجتی، اس کے تصور میں ان دیکھا وائرس داخل ہو جاتا۔ اسے شک ہوتا کہ شاید پھر کہیں آفت ٹوٹ پڑی ہے اگر ایسا ہوتا تو وہ اس بار بالکل تیار حالت میں تھی۔ ساتھ ہی دعا کرتی کہ ایسا نہ ہو۔

اس کا زیادہ وقت وائرس کی تحقیق میں ہی گزر رہا تھا۔ وہ لیب کی عملی مہارت میں بھی اضافہ کر رہی تھی۔ اس سلسلے میں اسے ٹیڈ کا تعاون حاصل تھا۔

مریسا نے اچھا خاصا تحقیقی مواد جمع کر لیا تھا۔ یہ بات تھی کہ ’’انڈیکس کیس‘‘ کے تمام ابتدائی مریض میں مرض منتقل کیوں نہیں ہوا تھا؟ مریسا کو لگ رہا تھا جیسے ایبولا انسانی ذہن کی طرح کام کر رہا ہے۔ اپنی مرضی سے کہیں بھی بھڑک اٹھتا ہے اور شکار بھی اپنی مرضی سے چنتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ مریسا اس بات پر زیادہ پریشان تھی کہ آخر مرض منتقل کیسے ہوتا ہے؟ اس نے کئی چیزیں نوٹ کی تھیں۔ جن کو اتفاق کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔ مثلاً دونوں مرتبہ انڈیکس کیس ڈاکٹر ہی کیوں تھے۔ دونوں نے سان ڈیاگو کانفرنس میں شرکت کی۔ دونوں رہزنی کا شکار ہوئے... وغیرہ وغیرہ۔

ایبولا انسانی ذہن کی طرح کیونکر کام کر سکتا ہے؟ دفعتاً اس کے ذہن میں جھماکا ہوا... یقیناً ایبولا ایسا نہیں کر سکتا کہ اپنی مرضی سے شکار کا انتخاب کرے... البتہ خود انسان ایسا کر سکتا ہے۔ کیا کوئی ایبولا کو بطور ہتھیار کسی خاص مقصد کے لیے استعمال کر رہا ہے؟ مریسا کا ذہن اس انوکھے سوال پر اٹک گیا۔ وہ سوچ سوچ کر تھک گئی۔

☆☆☆

مریسا، ٹیڈ کے آفس میں کافی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ بات چیت بھی جاری تھی۔

’’ٹیڈ! یاد ہے جب ہم دونوں لیب میں گئے تھے، تم نے بتایا تھا کہ وہاں ایبولا سمیت ہر دریافت شدہ خطرناک وائرس محفوظ ہے اور ایبولا کی ہر ایک وبا کا نمونہ بھی حصار کے اندر ہے۔‘‘

’’ہاں، ایسا ہی ہے۔ آخری نمونہ سینٹ لوئیس کی حالیہ وبا سے متعلق ہے۔‘‘ ٹیڈ نے اثبات میں سر ہلایا۔

’’ٹیڈ، کیا سی۔ ڈی۔ سی کے علاوہ بھی کوئی جگہ ہو سکتی ہے؟ ایسی جگہ جہاں ایسے خطرناک وائرس محفوظ ہوں؟‘‘ ٹیڈ نے سوچنے کے لیے وقفہ لیا۔ ’’میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تمہارا مطلب ہے، یہاں امریکا میں؟‘‘

’’ہاں۔‘‘

’’یقیناً صرف آرمی کے پاس ہو سکتے ہیں۔ فورٹ ڈیٹرک میں حیاتیاتی جنگ کے لیے ایک جگہ ہے۔ اسے سینٹر فار بائیولوجیکل وارفیئر کا نام دیا گیا ہے۔‘‘ ٹیڈ نے بتایا۔

''سینٹر کا نگراں ایک ایسا شخص ہے جو کبھی یہاں سی۔ ڈی۔ سی میں ہوا کرتا تھا۔ وائرل ہیمر جک فیور میں اسے خاص دلچسپی تھی۔''

''کیا آرمی کے پاس MCL جیسی کوئی لیب ہے؟'' ٹیڈ نے سیٹی بجائی۔ ''ڈیئر، آرمی کے پاس کیا نہیں ہے۔''

''اور وہ آدمی؟''

''وہ کئی برس قبل یہاں سے چلا گیا تھا۔'' ٹیڈ نے دلچسپی سے مریسا کو دیکھا۔ ''کیوں اب کیا ارادے ہیں؟''

''ارادے تو نیک ہیں۔ ابھی میں کئی ایک مفروضوں پر کام کر رہی ہوں۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔''

''تمہاری محنت اور جستجو بتا رہی ہے کہ تم ایک مکمل ''جاسوس ڈاکٹر'' بننے جا رہی ہو۔ یہ کسی کارنامے سے کم نہیں ہوگا، اگر تم غارت گر ایبولا کے اسرار کا پردہ چاک کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔'' ٹیڈ کی آواز میں ستائش اور حوصلہ افزائی تھی۔

مریسا مسکرا کے رہ گئی۔ اس کے دماغ میں ایک خیال سرسرانے لگا۔ پُرسوچ انداز میں اس نے کافی کپ اٹھایا۔

ٹیڈ بھی کافی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆☆☆

''ایک منٹ، میم۔'' پہرے دار سپاہی نے مریسا کو اشارہ کیا۔ وہ فورٹ ڈیٹرک کے مرکزی گیٹ پر رک گئی۔

وہ کئی روز تک خود سے آرمی کے متعلق سوال جواب کرتی رہی۔ آرمی نہیں تو وہاں کا کوئی آدمی ملوث ہو۔ اس نے خود کو کسی طرح قائل کر لیا کہ اسے وہاں جانا چاہیے۔ دونوں انڈیکس کیسز پر رہزنوں کے حملے مریسا کے ذہن سے نکلنے میں ناکام رہے تھے۔

وہ ڈیڑھ گھنٹے کے ہوائی سفر کے بعد میری لینڈ پہنچ گئی۔ وہاں سے کار ہائر کر کے وہ فورٹ ڈیٹرک وارد ہوئی۔ وہ ایبولا پر ریسرچ کر رہی تھی اور اس سلسلے میں کسی سے بھی بات کرنے کے لیے تیار تھی۔ اس کی کوشش رنگ لائی اور کرنل وولبرٹ نے پُرجوش انداز میں ملاقات کی حامی بھر لی۔

سپاہی چند منٹ میں واپس آ گیا۔ ایک پاس مریسا کے حوالے کیا گیا۔ جسے اس نے ہار کی طرح گلے میں لٹکا لیا۔ سپاہی نے اسے بلڈنگ نمبر 18 کا حوالہ دیا اور پیشہ ورانہ انداز میں سلیوٹ جھاڑ کے مریسا کو حیران کر دیا۔ گیٹ کھلا اور مریسا نے کار آگے بڑھا دی۔

بلڈنگ نمبر 18 کنکریٹ کی عمارت تھی۔ وہاں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ وہ عمارت سے زیادہ ایک بنکر کا نمونہ پیش کر رہی تھی۔

کرنل وولبرٹ خوش دلی سے ملا۔ وہ آرمی آفیسر سے زیادہ یونیورسٹی کا پروفیسر لگ رہا تھا۔ اس نے بلا تمہید اور بغیر کسی تکلف کے تبصرہ کیا۔ ''میں نے اس سے پہلے اتنی مختصر، اتنی خوب صورت EIS آفیسر نہیں دیکھی۔''

مریسا نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا اور مسکراتے ہوئے بیٹھ گئی۔ چند رسمی کلمات کا تبادلہ ہوا۔ وولبرٹ نے اسے ٹور کی پیشکش کی جو مریسا نے فی الفور قبول کر لی۔

عمارت میں جا بجا پھسلنے والے اسٹیل ڈورز تھے جن کا رابطہ ریموٹ کنٹرول سے تھا۔ ہر دروازے پر ٹی وی کیمرا نصب تھا۔ وولبرٹ مختلف کمرے، ہال اور راہداریوں سے گزرتا رہا۔ وہ کمنٹری بھی کرتا جا رہا تھا۔ بالآخر وہ لیب تک آ گئے۔ وہ جگہ جدید اسپتال کی لیب کی طرح تھی۔ فرق صرف کھڑکیوں کا تھا۔

مختصر ٹور کے بعد وہ ایک کیفے نما جگہ پر بیٹھ گئے۔ اس دوران MCL کا ذکر کہیں نہیں آیا۔

پیپسی اور ڈونٹ منگوا کر وہ ایک میز کے گرد بیٹھ گئے۔

وولبرٹ نے خود ہی بتانا شروع کیا۔ اس نے بطور EIS آفیسر سی۔ ڈی۔ سی سے آغاز کیا تھا۔ اس کی دلچسپی مائیکرو بیالوجی میں بڑھنے لگی پھر وہ وائرولوجی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ بعدازاں سرکاری خرچے پر اس نے پی ایچ ڈی کی۔ فورٹ ڈیٹرک اور سی۔ ڈی۔ سی کے تعلقات کی ایک تاریخ ہے۔ اس نے بتایا۔ آرمی نے اسے بہتر آفر دی جو اس نے قبول کر لی۔ وہ سی۔ ڈی۔ سی چھوڑ کر یہاں آ گیا۔ یہاں لیب اور ایکوپمنٹ نہایت شاندار تھے۔ سب سے اہم چیز فنڈز تھے۔ فنڈز کا یہاں کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔

''بنیادی ٹاسک کیا تھا؟'' مریسا نے سوال کیا۔

''یہاں کام کا تین چوتھائی حصہ حیاتیاتی جنگ سے متعلق ہے۔ جیسا نام سے ظاہر ہے۔ بائیولوجیکل حملے کی صورت میں امریکا کو بچانا ہے۔ میری سرگرمیوں کا محور خطرناک وائرس ہیں۔ مثلاً ایبولا۔ حملے کی صورت میں ایسے وائرس کو ناکارہ کیسے کیا جائے۔''

مریسا نے سر کو جنبش دی۔

''ایک اور اہم بات۔'' کرنل بولا۔ ''یہاں مجھے مکمل آزادی ہے۔ کوئی روک ٹوک نہیں۔ میں اپنی صوابدید پر کام کرتا ہوں۔''

"اس وقت مرکزِ توجہ کس جانب ہے؟" مریسا نے معصومیت سے سوال کیا۔ ایک وقفہ آیا۔ وولبرٹ کی ہلکی نیلی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"میں نہیں سمجھتا کہ بتانے میں کوئی ہرج ہے۔ آرمی کے کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔ کیونکہ میں حاصل کردہ نتائج آرٹیکلز کی شکل میں شائع کرا دیتا ہوں۔ گزشتہ تین برس سے میری توجہ کا مرکز انفلوئنزا وائرس ہے۔"

مریسا کو اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ "اور ایبولا؟"

"نہیں۔"

"یہاں سینٹر میں کوئی اور ایبولا پر کام کر رہا ہے؟"

وولبرٹ خفیف سا ہچکچایا پھر گویا ہوا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ نہ یہاں نہ روس میں .... کیونکہ کوئی ویکسین یا توڑ دریافت نہیں ہوا ہے اور یہ بھڑکی ہوئی خوفناک آگ کے مانند پھیلتا ہے۔ دوست یا دشمن دونوں کے لیے جان لیوا۔ اس لیے بائیولوجیکل وار کی صورت میں اسے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً ایٹم بم ہونے کے باوجود استعمال نہیں ہوتا۔"

"لیکن یہ استعمال ہو رہا ہے اور ہمارے ہی ملک میں ہو رہا ہے۔" مریسا نے بلاجھجک کہا۔

وولبرٹ نے ایک گہری سانس لی۔ "لاس اینجلس اور سینٹ لوئیس کی وبائی صورتِ حال کے بارے میں، میں نے پڑھا تھا۔

" ایبولا استعمال ہو رہا ہے یا نہیں، کیا اسرار ہے؟ فیصلہ مستقبل کرے گا۔ میں تمہاری کوششوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ میں افریقہ میں تھا تو گیدڑ کی طرح خوف زدہ تھا۔"

مریسا کو یہ آدمی قابلِ اعتبار لگا۔ وہ پہلا شخص ملا تھا جس نے بلاتامل خوف کا اظہار کیا تھا۔

"میں بھی خوف سے نبرد آزما ہوں۔" مریسا نے اظہار کیا۔

"اس کی معقول وجہ ہے۔" وولبرٹ نے کہا۔

"کیا آرمی کو تشویش نہیں ہے؟" مریسا نے سوال کیا۔

"میں نہیں سمجھتا کہ ایسا مرحلہ آگیا ہے۔ ویسے بھی آرمی کا طریقۂ کار مختلف ہے۔ میں اپنے طور پر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔ اگرچہ مجھے یہاں ریسرچ کی آزادی ہے۔" وولبرٹ نے جواب دیا۔

گفتگو ایبولا سے متعلق ٹیکنیکل مراحل میں داخل ہو گئی۔ دونوں نے کھل کر اظہارِ خیال کیا۔ اس پر اتفاق تھا کہ وائرس نے افریقہ سے آغاز کیا تھا۔ تاہم یہ کس طرح مریضوں میں منتقل ہوتا؟ امریکا میں دونوں مرتبہ جو کچھ ہوا۔ اس کے بعد یہ خیال مشکوک ہوگیا تھا کہ ایبولا بھی ایڈز کی طرح پھیلتا ہے۔ وولبرٹ کے خیال میں یہ جانوروں کا مرض تھا۔ جو انسانوں میں منتقل ہوا لیکن وہ کون سا جانور ہے، اس کا تعین باقی تھا۔ بالفاظِ دیگر ایبولا کی حقیقی پناہ گاہ کیا ہے، کچھ نہیں معلوم۔

چلتے چلتے مریسا نے آخری سوال کر ڈالا۔ "کیا یہاں ایبولا کا نمونہ محفوظ ہے؟"

"نہیں۔" وولبرٹ نے انکار کیا۔ "لیکن مجھے علم ہے کہ ایبولا کہاں سے حاصل کیا جاسکتا ہے؟"

"وہ تو مجھے بھی معلوم ہے۔" مریسا ذو معنی انداز میں مسکرائی اور شکریہ ادا کر کے کھڑی ہوگئی۔

ٹیڈ نے اسے بتایا تھا، وہ ٹیڈ کے ساتھ وہاں جا بھی چکی تھی بلکہ خونی عفریت کو دیکھ بھی چکی تھی۔

☆☆☆

مریسا کو پتا نہیں چلا کہ فون کب سے بج رہا تھا۔ اس کی آنکھ فون کی گھنٹی پر ہی کھلی۔ کروٹ بدل کر اس نے ریسیور اٹھایا۔ وہ گہری نیند سو چکی تھی۔ دوسری جانب سے سی۔ ڈی۔ سی آپریٹر نے خاصی معذرت کرتے ہوئے اپنی مجبوری ظاہر کی۔ مریسا نے گھڑی میں دیکھا۔ صبح کے چار بج رہے تھے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

کال، فونیکس، ایری زونا سے آئی تھی۔ آپریٹر کال منتقل کرنے کے لیے مریسا سے اجازت مانگ رہا تھا، مریسا نے او کے کہہ کر فون رکھ دیا۔ دھڑکنوں میں اضطراب تھا۔ کیا پھر ایبولا کی آگ بھڑکی ہے؟ وہ پوری طرح بیدار ہو چکی تھی اور بے چینی محسوس کر رہی تھی۔

فون کی گھنٹی پھر بجی۔

"ڈاکٹر مریسا بلوم، ہیئر۔" اس نے ریسیور اٹھایا۔

دوسری جانب کوئی ڈاکٹر گائے ویور بول رہا تھا۔ ایری زونا ریاست کا ایپی ڈیمیالوجسٹ۔

مریسا کے دماغ میں گھنٹیاں بجنے لگیں۔ ریسیور والی ہتھیلی پر پسینا آگیا۔

ڈاکٹر ویور غلط وقت پر فون کرنے کی معذرت طلب کر رہا تھا۔ اس کی آواز بظاہر پرسکون لگ رہی تھی۔ تاہم جو کچھ وہ بتا رہا تھا، اسے سن کر مریسا کی پیشانی پر بھی نمی آگئی۔

ایم ایم میڈیکل گروپ، منافع بخش اسپتالوں کی ایک چین

تھی۔ اس گروپ کا فونیکس، ایری زونا والا اسپتال ایبولا کی زد میں آچکا تھا۔

''سب سے پہلے مریض یا مریضوں کو محدود کر دیں۔'' مریسا نے آواز کو نارمل رکھنے کی بھرپور سعی کی۔ ''مریض کو الگ کرنے کے بعد دوسرا کام ....''

مریسا کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ ڈاکٹر ویور نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''یہاں ایک آدھ مریض نہیں ہے۔ یہاں چوراسی کیسز ہیں۔''

''کیا کہا؟'' مریسا تقریباً چلا اٹھی۔ اسے سماعت کا دھوکا لگا۔

''چوراسی مریض! بیالیس صرف ڈاکٹرز ہیں۔ لیب کے علاوہ ایڈمن بلاک کے بھی چھ مریض ہیں۔ حتیٰ کہ فوڈ سروس کے بھی دو آدمی ہیں۔''

''ایک ہی دن میں؟ ایک ساتھ؟'' مریسا اٹھ کے کھڑی ہوگئی۔

''ہاں، تمام کے تمام گزشتہ شام اوپر تلے آئے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ ایبولا ہے۔''

مریسا کی سانس رک گئی۔

☆☆☆

اس موقع پر اولین ترجیح صرف ایک تھی۔ وہ تھی ڈیلٹا کی ڈائریکٹ فلائٹ۔ مریسا نے پھرتی سے لباس تبدیل کیا۔ سب سے پہلے سی۔ ڈی۔ سی کے ڈیوٹی آفیسر کو حالات سے مطلع کیا اور بتایا کہ وہ روانہ ہو رہی ہے۔ ڈیوٹی آفیسر سے درخواست کی کہ جیسے ہی ڈاکٹر نورس آفس پہنچے، اسے فوراً آگاہ کر دیا جائے۔

جلدی جلدی اس نے دو چار فون اور کیے .... سامان اس کا تیار حالت میں تھا۔ اسے یقین تھا کہ نورس اپنی ٹیم کے ساتھ زیادہ سے زیادہ شام تک پہنچ جائے گا۔

☆☆☆

فونیکس، ایری زونا میں میڈیکل اسپتال کا اسسٹنٹ ڈائریکٹر جسٹن گارڈنر تھا۔ وہ خاصا حواس باختہ نظر آرہا تھا۔

اسٹاف نے اسپتال چھوڑنا شروع کر دیا تھا۔ افراتفری کا سماں تھا۔ اسٹیٹ ہیلتھ کمشنر نے قرنطینہ کا حصار قائم کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ میڈیا پہلے ہی یلغار کر چکا تھا۔ مریسا کا حلق خشک ہوگیا۔

ایبولا، شاندار اور مخصوص اسپتالوں میں کیوں فتنے اٹھا رہا تھا۔ یہ کیا راز ہے؟

وہاں میڈیا کے علاوہ پولیس بھی موجود تھی۔ مریسا، پولیس کی مدد سے رپورٹرز سے کترا کر اندر چلی گئی۔ اندر صورتِ حال ابتر تھی۔ اس کی ملاقات ڈائریکٹر لائڈ ڈیوس سے ہوئی۔ سی۔ ڈی۔ سی کو اطلاع دینے کے بعد سے سولہ مریض اور داخل ہو چکے تھے۔

اگر فونیکس میں وبائی شدت بے قابو ہو جاتی، یہ خیال ہی خون خشک کرنے کے لیے کافی تھا۔

مریسا نے سابقہ تجربے کی روشنی میں اور اپنی تمام تحقیقات اور خدشات کو مدِنظر رکھتے ہوئے کام کا آغاز کر دیا تھا۔ اپنی حفاظت کا اس نے بہت زیادہ خیال رکھا تھا۔

نورس سے اس کی بات ہوئی تو اس نے پہلا سوال ایبولا کے بارے میں کیا۔ مریسا نے اثبات میں جواب دیا۔ ''اس مرتبہ فرق یہ ہے کہ مریضوں کی تعداد بہت کم مدت میں سو سے اوپر چلی گئی ہے۔''

دوسری جانب چند لمحے سکون رہا پھر نورس کی آواز آئی۔ ''بہت احتیاط کرنا..... ان کو بتاؤ کہ آئی سولیشن کے بہترین انتظامات کریں۔ ہم زیادہ سے زیادہ دو گھنٹوں میں پہنچ جائیں گے۔ نمونے اکٹھے کر کے ٹیڈ کو روانہ کر دو۔''

☆☆☆

مریسا کو دگنی محنت کرنی تھی۔ یکدم اتنے مریضوں کی موجودگی اشارہ کر رہی تھی کہ یہ فوڈ بورن یا واٹر بورن مرض ہے۔ مشکل یہ تھی کہ ایبولا، واٹر یا فوڈ بورن وائرس نہیں تھا.... انڈیکس کیس تک پہنچنا بھی محال تھا۔ تاہم مریسا نے آرام تج دیا اور کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا۔ دوپہر تک چودہ مریض مزید ظاہر ہو چکے تھے۔

مریسا نے ڈاکٹرز کی ایک ٹیم تشکیل دی۔ بلیک بورڈ پر اس نے تمام سوالات لکھ دیے۔ وہ تنہا سب کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ مذکورہ ٹیم کی ذمے داری ان سوالات کے جواب حاصل کر کے مریسا تک پہنچانے تھے۔

گزشتہ وباؤں کے مقابلے میں فونیکس میں ایبولا کی خون آشامی جوبن پر تھی۔ مریسا تمام مریضوں کے انٹرویو نہیں کر سکتی تھی۔ نہ ہی تمام کے نمونے ٹیڈ کو روانہ کر سکتی تھی۔ تاہم وہ حتی الوسع دلجمعی سے کام کر رہی تھی۔

نورس اپنی ٹیم کے ساتھ پہنچ چکا تھا، کسی کو سر کھجانے کی فرصت نہیں تھی۔

نورس کو کچھ وقت ملا تو وہ مریسا کے آئیڈیاز سننے کے لیے آمادہ ہوگیا۔ مریسا نے ابتدائی 84 کیسز کو فوکس کیا تھا۔

''84 مریضوں کو گروپ کے طور پر دیکھیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ حیرت انگیز طور پر تمام کے اندر مرض کی

علامات صرف چھ گھنٹے کے اندر ظاہر ہونا شروع ہوگئی تھیں۔'' مریسا نے آغاز کیا۔ نورس ساتھ ساتھ کاغذات اور نوٹس دیکھ رہا تھا۔

''علامات کی شدت اور تیزی سے ظاہر ہوتا ہے کہ سب بیک وقت بُری طرح ایبولا سے متاثر ہوئے تھے۔ عجیب بات ہے مزید یہ کہ سب ہی اسپتال میں کام کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کے ڈیپارٹمنٹ مختلف ہیں۔''

''سینٹرل ائرکنڈیشنگ سسٹم پر شک کیا جاسکتا ہے لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ایسا پانی اور غذا کے باعث ہوا۔ جو ڈیٹا میں نے یکجا کیا ہے، اس کے مطابق 84 متاثرہ مریض حسبِ سہولت کیفے ٹیریا استعمال کرتے ہیں۔''

مریسا نے نورس کو دیکھا جو چھت کی جانب دیکھ رہا تھا۔ ''لاس اینجلس اور سینٹ لوئس کے مریضوں میں سے کبھی کسی کا رابطہ 84 مریضوں میں سے کسی سے ہوا تھا؟'' اس نے سوال کیا۔

''نہیں۔''

''تمہیں اور محنت کرنا ہوگی، کوئی کنکشن ملنا چاہیے۔''

''کیفے ٹیریا؟'' مریسا نے سوال کیا۔

''تمہاری سوچ اور اندازے پر منحصر ہے۔ تاہم ایبولا کبھی فوڈ کے ذریعے متعارف نہیں ہوا۔'' نورس نے اٹھتے اٹھتے مریسا کو دیکھا۔ ''لیکن تم اپنی چھٹی حس، خیال یا سوچ کے مطابق کام کرنے میں آزاد ہو۔ تم فوڈ تھیوری کو آزماسکتی ہو، قطع نظر میرے خیال کے۔'' وہ باہر نکل گیا۔

مریسا کو نورس کے رویے میں لچک کا گمان گزرا تھا۔ اس نے کیفے ٹیریا کے وزٹ کا فیصلہ کرلیا۔

☆☆☆

کیفے ٹیریا میں ڈبل ڈور کے دو سیٹ تھے۔ مریسا کچن میں جانے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ گومگو کی کیفیت خودبخود ختم ہوگئی۔ ایک درمیانی عمر کی عورت نمودار ہوئی اور اطلاع دی کہ کیفے ٹیریا کا وقت ختم ہوگیا۔

مریسا نے اپنا تعارف کرواکر چند سوالات کی استدعا کی۔

''ضرور۔'' عورت نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔

اس کا نام جانا برانسن تھا۔ وہ کیفے میں منیجر تھی۔ وہ مریسا کو آفس میں لے آئی۔ مختصر سی گفتگو کے بعد مریسا نے تین دن قبل کے لنچ مینیو کے بارے میں سوال کیا۔

جانا برانسن نے ایک فائل نکال کر مریسا کے حوالے کی۔ مریسا نے جائزہ لیا۔ مینیو، کیفے کی مطابقت کے مطابق معمول کے مطابق تھا۔ تین ڈشز، سوپ کی ورائٹی اور ڈیزرٹس۔

''کیا یہی سب کچھ تھا؟''

''ہاں ... لیکن ہم سینڈوچز، سلاد اور مشروبات بھی فراہم کرتے ہیں۔''

مریسا نے مینیو کی فوٹو کاپی کی خواہش کی جو جانا برانسن نے بلاہچکچاہٹ پوری کردی۔ مریسا نے نصف گھنٹا مسز برانسن کے ساتھ کیفے ٹیریا کے مکمل ٹور میں گزارا۔

مریسا کا ارادہ تھا کہ تین روز قبل ابتدائی مریضوں سے معلوم کرے کہ انہوں نے مینیو میں سے کون سی اشیا پسند کی تھیں؟ وہ یہ بھی جاننا چاہتی تھی کہ اسی مینیو کی خوراک کھانے والے بعض افراد بیمار کیوں نہیں ہوئے؟

☆☆☆

مریسا، آرام دہ کرسی میں نیم دراز آنکھیں مسل رہی تھی۔ فونیکس میں اس کا دوسرا دن تھا۔ گیارہ بج رہے تھے، رات اس نے محض چار گھنٹے کی نیند لی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے مڑ کر حیرت سے نورس کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں مقامی اخبار تھا۔ اخبار کی سرخی کہہ رہی تھی سی۔ڈی۔سی کے خیال میں ایبولا کی خفیہ پناہ گاہ امریکا میں ہی ہے۔

اس کا موڈ آف تھا۔ ''میں نے کہا تھا کہ پریس سے دور رہنا۔'' نورس کے شکوے میں خفگی تھی۔

''میں نے کسی میڈیا مین سے بات نہیں کی۔'' مریسا نے اخبار لے کر آرٹیکل پڑھنا شروع کیا۔ وہ اپنا نام دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ مضمون میں فوڈ یا واٹر بورن کے مریض کے خدشے کا بھی ذکر تھا۔ یہ امر مزید پُراسرار تھا کہ مریسا کا نام بالواسطہ لکھا گیا تھا۔

''میرا نام ڈاکٹر بل فری مین کے حوالے سے آیا ہے۔ بل فری مین، اسپتال کے ڈائریکٹرز میں سے ہے۔ میں نے اس کے ساتھ موجود مسئلے کے متعلق بات کی تھی۔ اس نے میرا نام کیوں اور کس مقصد کے لیے استعمال کیا، میں نہیں جانتی نہ میں سمجھتی ہوں کہ میں نے اس کے ساتھ فوڈ بورن یا واٹر بورن مرض کے بارے میں کوئی بات کی تھی اور میں کر بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ میں تمہاری اس بات سے اتفاق کرتی ہوں کہ ایبولا، فوڈ بورن یا واٹر بورن نہیں۔ میں صرف اپنے طور پر ہر تھیوری اور امکان پر کام کررہی ہوں۔'' مریسا وضاحت کرکے خاموش ہوگئی اور اخبار واپس کردیا۔

وہ سوچ رہی تھی کہ اگر لاس اینجلس میں وہ نورس کی

جرأتِ اظہار کو مناسب طور سے ہینڈل کرتی تو اسے وقتاً فوقتاً اس کی خفگی اور سرد مہری کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس نے اخبار واپس کرتے ہوئے ایک شیٹ نورس کے حوالے کی۔ ”ذرا اسے دیکھو کیا ہم اسے بالکل نظرانداز کر سکتے ہیں؟ 84 مریضوں میں 82 نے کیفے ٹیریا میں کسٹرڈ ضرور کھایا تھا۔ باقی دو کو یاد نہیں کہ انہوں نے کھایا تھا یا نہیں.... اسی روز 21 افراد کے گروپ نے بھی بعدازاں کسٹرڈ کھایا تھا اور وہ سب تندرست ہیں؟“

”تم نے خاصی ورزش کر ڈالی ہے لیکن ایبولا فوڈ بورن نہیں ہے، یہ کھانے کے ذریعے جسم میں منتقل نہیں ہوتا۔“

”جانتی ہوں لیکن اب تک کوئی اور امکان سامنے نہیں آیا ہے۔“

”سنو۔“ نورس نے گہری سانس لی۔ ”اتفاق سے ڈاکٹر لینی کو ایک مریض کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ اس نے سان ڈیاگو کی امراضِ چشم والی کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ رشٹر اور زیبر سکی کی طرح یہ حقیقت سی۔ڈی۔سی کی آفیشل پوزیشن کے لیے بنیاد فراہم کرتی ہے یعنی رشٹر، وائرس افریقہ سے لایا اور سان ڈیاگو میں ڈاکٹرز میں وائرس کی منتقلی کا باعث بن گیا....“

”لیکن رشٹر بیمار پڑنے سے چھ ہفتے قبل افریقہ گیا تھا ہم ان کی بے ہوشی پیریڈ کی کیا وضاحت کر سکتے ہیں؟ ایبولا چھ ہفتے تک جسم میں خاموش پڑا نہیں رہ سکتا۔“ مریسا نے بغیر کسی لحاظ کے سائنٹیفک نکتہ اٹھایا۔

”ہاں میں اس اعتراض کو تسلیم کرتا ہوں۔“ نورس نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مجھے تمہاری فوڈ بورن تھیوری پر خاص اعتراض نہیں ہے لیکن سی۔ڈی۔سی کے لیے مجھے پریس کا سامنا کرنا ہے۔ مذکورہ پوزیشن لینا ہماری مجبوری ہے۔ بصورتِ دیگر وسیع پیمانے پر ہسٹریائی صورتِ حال بن جائے گی۔ تم جو کچھ کر رہی ہو، خاموشی سے کرو۔“

مریسا نے اثبات میں سر ہلایا اور نورس رخصت ہو گیا۔

مریسا سوچ رہی تھی کہ کینٹین اسٹاف کے خون کے نمونے ٹیڈ کو روانہ کر دے۔ نیز کسٹرڈ کی باقیات مل جائیں تو وہ بھی روانہ کر دے۔ اسے علم تھا کہ وائرس درجۂ حرارت کے معاملے میں بے حد حساس ہے چنانچہ اگر کسی طرح اس کو کسٹرڈ میں منتقل کیا گیا ہے تو پہلے کسٹرڈ کے سرد ہونے کا انتظار کرنا ناگزیر تھا۔ وہ کوئی بھی کلیو کو دریافت کرنے کے لیے ہر آئیڈیے پر کام کرنے کے لیے تیار تھی۔

☆☆☆

فونیکس کی کہانی بھی لاس اینجلس اور سینٹ لوئیس کی طرح ختم ہوئی۔ فونیکس میں اموات زیادہ ہوئی تھیں۔ ایک اور اسپتال بند ہو گیا۔

مریسا کو اٹلانٹا واپس آئے ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ وہ اس مرتبہ ناخوش تھی۔ حوصلہ شکن صورتِ حال تھی۔ اوپر سے نورس نے ایک بار پھر مریسا کی تحریری درخواست مسترد کر دی تھی۔ مریسا MCL میں ایبولا پر کام کرنا چاہتی تھی۔ اس نے آبدیدہ نگاہوں سے نورس کی جوابی تحریر پر ڈالی۔

مریسا اس مرتبہ پُریقین تھی کیونکہ اس نے لیب کی مہارت میں حیران کن اضافہ کیا تھا۔ وہ وائرس اور ٹشو کلچرز کو مہارت سے ہینڈل کرنے لگی تھی۔ اسے امید تھی کہ اس بار MCL میں کام کرنے کا پروانہ اسے مل جائے گا۔ نورس کے منفی جواب نے اسے بددل کر دیا تھا۔

اسے یقین تھا کہ فونیکس کی بدترین وبا کا تعلق کینٹین کی سوئٹ ڈش کسٹرڈ سے تھا۔ وائرس کسی طرح ایک سے دوسرے مریض میں منتقل ہوتا ہے۔ یہ سمجھنے کے لیے وہ پُرامید تھی۔ اگر وہ یہ معما حل کر لیتی تو ایبولا کی خفیہ قیام گاہ تک پہنچنے کا راستہ بھی ہموار ہو جاتا۔ لیکن نورس کے جواب نے اسے بند گلی میں کھڑا کر دیا تھا۔ وائرس کی تاریخ کے مطابق افریقہ میں زائر اور زارا (سوڈان) میں ایبولا کی اصل قیام گاہ خفیہ رہی تھی۔ امریکا میں بھی اب تک ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا تھا۔ مریسا نے پنسل ایک طرف اچھال دی۔ اس کی مہینوں کی محنت، تجزیے، مفروضے، تھیوریز، ڈایاگرامز، نوٹس وغیرہ سب لاحاصل رہے تھے۔

امریکا کی صورتِ حال پُراسرار تھی۔ مریسا کو یقین ہو چلا تھا کہ ایبولا کے پیچھے نادیدہ انسانی ہاتھ ہے۔ ایک ہی قسم کے جدید اور منافع بخش اسپتالوں کو نشانہ بنایا گیا تھا اور تینوں بند ہو چکے تھے۔ سی۔ڈی۔سی نے تیسری مرتبہ بھی سابقہ پوزیشن کا اعادہ کیا تھا۔ آفیشل پوزیشن یہ تھی کہ ڈاکٹر رشٹر کی وجہ سے ایبولا افریقہ سے امریکا پہنچا۔ پھر آنکھوں کی سرجری سے متعلق سان ڈیاگو کانفرنس میں ساتھی ڈاکٹرز کو منتقل ہوا۔ سی۔ڈی۔سی کی ساکھ داؤ پر لگی تھی۔ اگرچہ نورس کے پاس واضح دلائل تھے۔ تاہم اگر مگر کے ساتھ چند امور تشنہ رہ گئے تھے۔ وہ بھی مجبور تھا۔ مذکورہ آفیشل پوزیشن لینے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ فونیکس میں ہونے والی تباہ کاری پر میڈیا نے خوب شور مچایا تھا۔

فورٹ ڈیٹرک میں کرنل وولبرٹ سے مریسا نے ملاقات کی تھی۔ اس وقت فونیکس والا واقعہ ظہور پذیر نہیں ہوا تھا۔ سی۔ڈی۔سی کی آفیشل پوزیشن کے بارے میں مریسا نے سوال کیا تھا۔ وولبرٹ سی۔ڈی۔سی کی پوزیشن سے مطمئن تھا۔

فونیکس کے بعد مریسا کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ ''دی اینڈ'' نہیں ہے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ کسی بھی وقت مزید تباہی پھیلنے والی ہے اور چوتھی مرتبہ یہ گزشتہ تین وباؤں سے بڑھ کر ہوگی...... یہ سوچ ہی اسے خوف زدہ کرنے کے لیے کافی تھی۔ تاہم اسے بہرحال مشن کو منطقی انجام تک پہنچانے کی کوشش کرنا تھی۔ نہ صرف یہ ایک چیلنج بن گیا تھا بلکہ ہم وطن بے گناہ لوگ مارے جارہے تھے۔

مایوسی کو جھٹک کر اس نے ٹیڈ سے ملنے کا فیصلہ کیا۔

☆☆☆

ٹیڈ کو یہ سن کر حیرت ہوئی کہ مریسا کی درخواست پھر مسترد ہو گئی تھی۔ اس نے بذاتِ خود مریسا کی محنت اور مہارت کا مشاہدہ کیا تھا۔ دونوں کیفے ٹیریا میں بیٹھے تھے۔

فونیکس، ایریزونا سے کسٹرڈ کا نمونہ بھی مریسا نے روانہ کیا تھا۔ اس کے بارے میں اس نے ٹیڈ سے سوال کیا۔

''نو ایبولا۔'' ٹیڈ نے جواب دیا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ مرض اشیائے خورونوش سے غیر متعلق ہے۔''

''ٹیڈ، میں جانتی ہوں۔''

''لیکن تم یہ نہیں جانتیں کہ نورس سخت ناراض ہے۔ میڈیا نے سی۔ڈی۔سی کی آفیشل پوزیشن سے ہٹ کر اسٹوری لگائی ہے۔ جس کا لبِ لباب یہ ہے کہ ایبولا کی خفیہ پناہ گاہ یہیں امریکا میں ہے۔''

''اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔'' مریسا نے جواب دیا۔ ''میں اب بھی یہی سمجھتی ہوں کہ فونیکس میں کسٹرڈ کی وجہ سے ہولناک تباہی آئی۔ اگرچہ میرا نظریہ وہاں نورس نے بھی مسترد کر دیا تھا۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ ایبولا پھر سر اٹھائے گا۔''

ٹیڈ نے شانے اچکائے۔

''فوڈ سروس کے عملے کے چند خون کے نمونے میں نے بھیجے تھے؟''

''ان میں بھی کوئی خاص بات نہیں ملی۔'' ٹیڈ نے کہا۔ ''جہاں تک ایبولا کے پھر نمودار ہونے کی بات ہے، تو تمہاری اس بات میں وزن ہے۔ لیکن میں سی۔ڈی۔سی کی آفیشل پوزیشن کے خلاف نہیں جا سکتا۔ میرا کام اور ذمے داری کا تقاضا ہے کہ میں نورس کی پوزیشن کو سہارا دوں۔''

''کیا امریکا میں ایبولا کی تینوں وباؤں کے نمونے یکساں نہیں ہیں؟'' مریسا نے سوال کیا۔

''ہاں، تینوں میں ایبولا کی ساخت ایک جیسی ہے بالفاظِ دیگر ہمیں ایبولا کی تین نہیں، ایک ہی وبا کا سامنا ہے۔

یہ عجیب بات ہے؟ ایبولا دوسری یا تیسری بار ظاہر ہوتا ہے تو اس کی ہیئت میں کچھ نہ کچھ تغیر پایا جاتا ہے۔ افریقہ اور سوڈان میں بھی ایسا ہی تھا۔ دونوں مقامات سے جو نمونے ملے تھے، ان میں ایبولا کی ہیئت یکساں نہیں تھی۔''

''لیکن ان کیوبیشن (انکیوبیشن پیریڈ: وہ مخصوص دورانیہ جس وقت وائرس کی علامتیں جسم میں ظاہر نہیں ہوتیں) کی مدت کا کیا کرو گے؟'' مریسا نے احتجاج کیا۔ ''فونیکس میں ہونے والی بربادی اور سان ڈیاگو کانفرنس کے مابین تین ماہ کا فرق ہے جبکہ امریکا میں تینوں مرتبہ انکیوبیشن کی مدت دو سے چار دن تھی؟''

''اوکے۔'' ٹیڈ نے اعتراف کیا۔ ''لیکن سی۔ڈی۔سی کو پوزیشن لینے میں یہ بڑی رکاوٹ نہیں ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ایبولا کو کسٹرڈ میں کیونکر متعارف کرایا گیا تھا؟''

علاج

سردار بلونت سنگھ اپنی بیمار بیوی کی پٹائی کر رہا تھا۔ مظلوم عورت کی چیخ و پکار سن کر ایک پڑوسی وہاں پہنچا اور چیخا۔ ''اوئے سردارا! اپنی عورت پر اتنا ظلم کیوں کر رہا ہے؟''

''اسے دوا دینی ہے۔'' بلونت سنگھ نے بیوی کو لات رسید کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''حکیم نے کہا تھا کہ دوا خوب کوٹ کے دینی ہے۔ اسے کوٹ لوں تو دوا دوں گا۔''

☆☆☆

☆ شوہر نے کہا کہ میری امی آرہی ہیں، کچھ بنالو! بیوی نے جھٹ برا سا منہ بنالیا۔

☆ بیوی نے کہا کہ میری امی آرہی ہیں، بازار سے کچھ لے آؤ۔ شوہر گیا اور ساس کی واپسی کے لیے رکشا لے آیا۔

رجنی کور کا پشاور سے تعاون

''اسی لیے میں نے کسٹرڈ کے نمونے روانہ کیے تھے۔''

''مریسا! تم سمجھتی ہو کہ ایبولا 60 ڈگری سینٹی گریڈ پر غیر فعال ہو جاتا ہے۔ اگر بچ بھی جائے تو کوکنگ کے دوران اسے ناکارہ ہو جانا چاہیے تھا۔ یہ تھیوری ہضم نہیں ہوتی۔''

''جو خاتون کسٹرڈ سرو کر رہی تھی، اسے مرض لگ چکا تھا۔ ممکن ہے اس کی وجہ سے کسٹرڈ ''متاثر'' ہو گیا ہو۔'' مریسا نے امکان ظاہر کیا۔

''فائن، لیکن وہ خود ایک ایسے وائرس سے کیسے متاثر ہوئی جو صرف تاریک برِاعظم میں پایا جاتا ہے۔'' ٹیڈ نے اعتراض کیا۔

''مجھے نہیں معلوم۔'' مریسا نے کہا۔ ''لیکن مجھے یہ معلوم ہے کہ اس خاتون نے سان ڈیاگو کانفرنس میں شرکت نہیں کی تھی۔ نہ اس کا کوئی تعلق بنتا ہے۔''

ٹیڈ نے سینڈوچ اٹھالیا۔ دونوں کچھ دیر تک خاموشی سے ٹیبل کے لوازمات سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ بالآخر مریسا نے سکوت کا پردہ چاک کیا۔

''امریکا میں صرف ایک ہی جگہ میرے علم میں ہے۔'' اس نے چند سیکنڈ کا وقفہ لیا۔ ''جہاں سے کسٹرڈ سرو کرنے والی متاثر ہو سکتی ہے یا اسے ایبولا منتقل کیا جا سکتا ہے یعنی خاتون کو افریقہ جانے کی ضرورت نہیں تھی۔''

ٹیڈ چونک پڑا۔ ''ایسی کون سی جگہ ہے؟''

''یہاں! سی۔ڈی۔سی میں۔'' مریسا نے دھماکا کیا۔

ٹیڈ کا منہ کھلا رہ گیا۔ منہ کی طرف جانے والا سینڈوچ اس نے واپس رکھ دیا۔

''گڈ گاڈ۔ کیا تمہیں اندازہ ہے کہ تم کیا رائے دے رہی ہو؟'' ٹیڈ کی آنکھیں بھی پھیل گئی تھیں۔

''میں کوئی رائے نہیں دے رہی ہوں۔'' مریسا نے جواب دیا۔ ''میں صرف ایک حقیقت کی نشاندہی کر رہی ہوں۔ یہ ایک فیکٹ ہے کہ امریکا میں سی۔ڈی۔سی ہی وہ واحد مقام ہے... جہاں MCL میں ایبولا محفوظ ہے۔ بالفاظِ دیگر ''ایبولا کی خفیہ پناہ گاہ۔''

ٹیڈ کا سر غیر یقینی انداز میں دائیں بائیں ہل رہا تھا۔

''ٹیڈ۔'' مریسا کی آواز مستحکم تھی۔ ''تمہیں میری مدد کرنی ہو گی۔''

''کیسی مدد؟'' ٹیڈ ابھی تک شاک میں تھا۔

''مجھے ان لوگوں کی لسٹ چاہیے جنہوں نے گزشتہ برس کے دوران میں MCL کا دورہ کیا۔ یہ فہرست بہ آسانی آفس سے مل سکتی ہے۔''

''نہیں یہ ٹھیک نہیں ہے۔'' ٹیڈ نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔

''اوہ کم آن، ٹیڈ۔'' مجھے صرف پرنٹ آؤٹ چاہیے۔ تم بہ آسانی کوئی بھی وجہ بتا کر اسے حاصل کر سکتے ہو۔''

''پرنٹ آؤٹ مسئلہ نہیں ہے۔ میں ماضی میں بھی یہ کام کر چکا ہوں۔ دشواری یہ ہے کہ تم جس راستے پر قدم بڑھا رہی ہو میں اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرنا چاہتا۔ تمہاری تھیوری انوکھی اور تصوراتی ہے۔'' ٹیڈ نے گہری سانس لی۔ ''میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ تمہارے اور ایڈمنسٹریشن کے درمیان آؤں۔''

''تمہارا نام کیسے آئے گا؟ کسی کو پتا نہیں چلے گا جب تک میں یا تم خود نہ بتاؤ۔''

''ہاں، ٹھیک ہے لیکن .....'' وہ ہچکچاہٹ کا شکار ہو گیا۔ ''فہرست تم کسی اور کو نہیں دکھاؤ گی؟''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔'' مریسا کھل اٹھی۔

''اگر کام ہو گیا، تو میں شام کو تمہارے اپارٹمنٹ سے تمہیں پک کر لوں گی، کیسا؟'' مریسا دلکش انداز میں مسکرائی۔

''اوکے۔''

☆☆☆

مریسا رات نو بجے کے لگ بھگ ٹیڈ کے اپارٹمنٹ پر پہنچی۔ وہ پہلی بار اس کی قیام گاہ پر آئی تھی۔ ٹیڈ نے اسے خوش آمدید کہا۔ مریسا فہرست دیکھنے کے لیے بے چین تھی۔ لہٰذا فوری طور پر اس نے دوستانہ تکلفات کو ملتوی کر دیا۔

دونوں نشست گاہ میں آ گئے۔ فہرست مریسا کی توقع کے برخلاف طویل تھی۔ پرنٹ آؤٹ میں ٹیڈ کا نام سب سے زیادہ تھا اور بار بار سامنے آ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ مریسا نے ایک نام پر پنسل الٹی کر کے رکھی۔ ''گسٹن ڈوباس۔''

''گسٹن کا نام ابتدا میں کہیں کہیں ہے پھر غائب ہو جاتا ہے؟'' مریسا کی آنکھوں میں سوال تھا۔

''وہ ڈبلیو۔ ایچ۔ او کا آدمی تھا اور مختصر مدت کے لیے یہاں آیا تھا۔''

''ہیری لانگ فورڈ؟'' مریسا کی پنسل دوسرے نام پر رکی۔

''ہارورڈ کا طالب علم تھا۔ وہ کسی پروجیکٹ پر کام کر رہا تھا۔'' ٹیڈ نے جواب دیا۔

مریسا نے کرنل وولبرٹ کا نام بھی فہرست میں دیکھا۔ پھر اس کی پنسل 'ہمبیر لنگ' کے نام پر رک گئی۔ ہمبیر لنگ نے MCL کے کافی وزٹ کیے تھے۔ تقریباً چھ سات ماہ پہلے اس کا نام اچانک غائب ہو گیا۔ مریسا نے سوالیہ نظروں سے ٹیڈ کو دیکھا۔

'ہمبیر لنگ یہاں کام کرتا رہا تھا پھر بہتر آفر پر کہیں اور چلا گیا۔

''کہاں؟''

''کچھ کہہ نہیں سکتا۔ غالباً ایڈز کا کوئی پروجیکٹ تھا یا پھر فورٹ ڈیٹرک۔ وہ ایک مشکل آدمی تھا۔ یہ افواہ بھی اڑی تھی کہ وہ نورس کی جگہ لینا چاہتا تھا۔ ایسا نہیں ہوا۔ بہتر ہوا ۔۔۔۔ ورنہ میری اس کے ساتھ نبھ نہیں سکتی تھی۔ اس کے جانے پر مجھے خوشی ہوئی تھی۔''

مریسا نے جنوری کا مہینہ دیکھا۔ اس کی پنسل گلوریا فرنچ کے نام پر رک گئی۔ گلوریا نے پندرہ دن کے دوران میں کئی بار MCL کا دورہ کیا تھا۔

''گلوریا کون ہے؟''

''وہ ویکٹر بورن وائرل امراض پر کام کر رہی تھی۔ یہاں زیادہ عرصہ نہیں رکی۔''

مریسا نے پرنٹ آؤٹ لپیٹ دیا۔

''مطمئن ہو؟'' ٹیڈ مسکرایا۔

''ہاں اور تمہاری مشکور بھی۔ تاہم ایک تشنگی ہے۔''

''اوہ، نو۔'' ٹیڈ کراہ اٹھا۔

''ایزی، ایزی مین ۔۔۔ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔'' مریسا نے تسلی دی۔ ''تم نے بتایا کہ لاس اینجلس، سینٹ لوئیس اور فونیکس کے نمونوں کی چھان بین میں ایک بات سامنے آئی۔ وہ یہ کہ تینوں میں ایبولا کی ہیئت یکساں تھی ۔۔۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ تم اس نتیجے پر کیسے پہنچے؟''

''لیکن تمام ڈیٹا MCL میں ہے۔'' ٹیڈ کی آواز لنک گئی۔

''تو کیا ہوا۔'' مریسا مسکرائی۔ ''تم میرے بہترین دوستوں میں سے ہو۔ مجھے اس پر فخر ہے۔ میں نہیں چاہوں گی کہ تم کسی مشکل کا شکار ہو۔ ہمارے درمیان جو ہے، وہ تیسرے تک نہیں پہنچے گا۔''

ٹیڈ سمجھ رہا تھا کہ مریسا کیا کہنا چاہ رہی ہے۔ ''لیکن تمہیں ابھی کلیرنس نہیں ملی ہے۔''

''مجھے ضرورت بھی نہیں ہے۔'' مریسا نے تیوری چڑھائی۔ ''میں تمہارے ساتھ جا سکتی ہوں۔ پہلے بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوا، اس مرتبہ بھی نہیں ہوگا۔'' اس کا لہجہ پُراعتماد تھا۔ وہ ٹیڈ کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

''اچھا تو کب چلنا ہے؟'' ٹیڈ نے استفسار کیا۔

''ابھی، اسی وقت۔'' مریسا نے بلاتامل کیا۔

ٹیڈ نے گھڑی دیکھی اور حامی بھر لی۔

''بعدازاں ہم ڈرنک پر جائیں گے۔ ڈرنک میری طرف سے۔'' مریسا نے پیشکش کی۔

ٹیڈ لباس تبدیل کرنے چلا گیا۔ مریسا نے اطراف میں نگاہ دوڑائی۔ دفعتاً اس کی نگاہ دروازے کے قریب شیلف پر پڑی۔ جہاں MCL تک رسائی کے لیے استعمال ہونے والا مخصوص کارڈ اور چابیاں رکھی تھیں۔

☆☆☆

دونوں بخیر و عافیت تمام مراحل طے کر کے MCL کے وزنی فولادی دروازے تک پہنچ گئے۔ ٹیڈ نے کارڈ مخصوص جھری میں داخل کیا۔ پیشتر اس کے کہ وہ نمبر پنچ کرتا۔ مریسا بول اٹھی۔ 39-23-43۔

ٹیڈ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''واہ، کیا یادداشت ہے۔''

دونوں MCL میں سابقہ تدابیر اختیار کرتے ہوئے جانے پہچانے راستوں پر آگے بڑھتے رہے۔ ٹیڈ اپنی تحقیقات کے بارے میں بتاتا جا رہا تھا۔

مرکزی لیب تک پہنچ کر اس نے ایبولا کے لیے مخصوص کردہ ایک ٹرے نکالی، ٹرے میں جو وائل موجود تھیں، ان میں ایبولا منجمد حالت میں موجود تھا۔

مریسا، ٹیڈ کی باتیں سن رہی تھی۔ ساتھ ہی ماحول کا جائزہ لے رہی تھی۔ ''کیوں ایسا لگتا ہے کہ ہم کسی اجنبی سرزمین پر آگئے ہیں؟''

''یہاں کا خاص ماحول اور خاص جدید آلات جو عام اسپتالوں میں نظر نہیں آتے ۔۔۔۔'' ٹیڈ نے جواب دیا۔

''تمام ایکوپمنٹ تو انوکھے نہیں ہیں، کیا کوئی ایسی چیز ہے جو ملک بھر میں کسی اور لیب میں استعمال نہ ہوئی ہو؟''

''عام لیب، ائرلاک سسٹم اور نیگیٹو پریشر سسٹم کی ضرورت محسوس نہیں کرتیں۔''

''میرا مطلب سائنٹیفک آلات سے تھا۔''

ٹیڈ نے اطراف میں دیکھا۔ ”وہ ایک انفرادی اور عنقا چیز ہے؟“ اس نے ایک جانب اشارہ کیا۔ ”اسے ٹائپ 3 ہیپا فلٹر سسٹم کہتے ہیں۔“

”کیا ہیپا سسٹم صرف MCL میں یا ایسی کسی اور لیب میں استعمال ہوتے ہیں؟“ مریسا نے مہیب ایگزاسٹ فین نما ایکوپمنٹ کو دیکھا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ جہاں اس کی ضرورت ہو، یہ کسٹم بلٹ (Custom built) ہے۔“

”کون فراہم کرتا ہے اسے؟“

”لیب انجینئرنگ، ساؤتھ بینڈ، انڈیانا۔ وہ دیکھو ”لیب انجینئرنگ“ کا لیبل لگا ہوا ہے۔“

مریسا نے لیبل پڑھا۔ ایک انوکھی سوچ اس کے ذہن میں در آئی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کسی لیب نے ”لیب انجینئرنگ“ سے کسٹم بلٹ ہیپا سسٹم بنوایا ہو؟ وہ اس بے تکے خیال پر حیران تھی۔

مریسا سوچ رہی تھی کہ جب وہ کسٹرڈ اور کینٹین کو نظرانداز نہیں کرسکی۔ تو پھر اس خیال پر کیوں نہ کام کر کے دیکھے۔ وہ ایک ”طبی سراغ رساں“ تھی۔ اسے عام ڈاکٹرز کی سوچ سے ہٹ کر امکانات پر غور کرنا ضروری تھا۔ بصورتِ دیگر موجودہ پُراسرار اور خوفناک اسرار کی تہ تک پہنچنا محال نہیں تھا۔

”تم سن رہی ہو۔“ ٹیڈ نے سوال کیا۔

”کیوں نہیں، تم نے متاثر کن ریسرچ کی ہے۔“ مریسا بولی۔ ”چلو اب چلتے ہیں۔ مجھے پیاس لگ رہی ہے۔“

ٹیڈ سے ملاقات کے اختتام پر مریسا نے سب سے پہلے کام یہ کیا لیب انجینئرنگ کو ایک خط روانہ کر دیا۔

☆☆☆

مریسا نے صبح ہی صبح ٹمی کے ہمراہ جاگنگ کی۔ واپس آ کر شاور لیا۔ پھر ٹوڈے شو دیکھا۔ ساڑھے آٹھ بجے وہ سی۔ ڈی۔ سی اپنے آفس کی جانب رواں تھی۔

آفس آنے کے بعد پہلا پیغام اس کا منتظر تھا جو کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر نورس نے یاد کیا ہے فوراً......

مریسا نے ناک بھوں چڑھائی۔ تاہم نورس کے دفتر کی جانب چل دی۔ نورس کی سیکریٹری ابھی نہیں پہنچی تھی۔ لہٰذا مریسا نے براہِ راست دستک دی۔

چند منٹ بعد وہ نورس کے سامنے اس کی ڈیسک کے بالمقابل بیٹھی تھی۔

دونوں جانب خاموشی تھی۔ نورس بغور مریسا کا جائزہ لے رہا تھا۔

”ڈاکٹر مریسا بلوم۔“ بالآخر وہ بولا۔ ”اس کی آواز مدھم تھی اور لہجہ قابو میں۔ ”تم رات MCL میں گئی تھیں۔“ یہ سوال نہیں، اسٹیٹمنٹ تھا۔

مریسا چونکی ضرور۔ تاہم خاموش رہی۔

”میں سمجھا تھا کہ تم کلیئرنس ملے بغیر وہاں نہیں جاؤ گی۔ تم نے براہِ راست میرے احکامات کی خلاف ورزی کی۔ فونیکس سے کسٹرڈ کا نمونہ تم نے بلا اجازت ٹیڈ کے ذریعے تجزیہ کرایا۔ یہ محض چند امور ہیں۔“ اس کا لہجہ اب بھی قابو میں تھا۔

”آئی ایم ڈوئنگ مائی بیسٹ۔“ مریسا نے مختصر جواب دیا۔ اس کا اندرونی اضطراب، غصے کی شکل اختیار کرنے لگا تھا۔

”تم جسے بیسٹ کہہ رہی ہو وہ خاصا بُرا ہے۔“ معاً نورس تڑخ اٹھا۔ ”سی۔ ڈی۔ سی کی عوام کے لیے ذمے داری کو سمجھنے میں تم ناکام رہی ہو۔ بالخصوص اس تناظر میں کہ عوام پہلے ہی سی۔ ڈی۔ سی کی وجہ سے ہسٹریائی کیفیت میں ہے۔“

”تم نے عندیہ دیا تھا کہ میں اپنی تھیوریز پر خاموشی سے کام کرسکتی ہوں۔“ مریسا نے دلیل دی۔

”لیکن تمہیں مجھے مطلع کرنا چاہیے تھا۔“ نورس نے خفگی کا اظہار کیا۔

”او کے، میرا خیال ہے کہ تمہاری سوچ غلط ہے۔“ مریسا نے نورس کی گھورتی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

”عوام کے لیے میں اپنی ذمے داری کو انتہائی حد تک سنجیدہ لے رہی ہوں۔ میرا یقین ہے کہ ایبولا کے خطرے کو کم کر کے دکھانا کوئی اچھی خدمت نہیں ہے۔ ایبولا کا خطرہ نابود ہو چکا ہے۔ یہ سمجھنے کے لیے ہمارے پاس کوئی ٹھوس سائنٹیفک وجہ موجود نہیں ہے۔ عوام کے سر سے خطرہ ٹلا نہیں ہے۔ خطرے کی جڑیں تلاش کرنے کے لیے میں اپنی بہترین کوششوں میں مصروف ہوں۔“

نورس کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔ ”ڈاکٹر مریسا تم یہاں انچارج نہیں ہو۔“

”میں بخوبی آگاہ ہوں۔“ مریسا بولی۔ ”اگر میں انچارج ہوتی تو میڈیا کو سی۔ ڈی۔ سی کی موجودہ پوزیشن کبھی نہ دیتی۔ کیونکہ ہم سب جانتے ہیں کہ ڈاکٹر شٹر، افریقہ سے ایبولا لانے کا سبب نہیں تھا۔ وہ مرض میں گرفتار ہونے سے

چھ ہفتے قبل وہاں گیا تھا۔ جبکہ اتنی مدت ایبولا کا انکیوبیشن پیریڈ نہیں ہے۔ سائنسی اعتبار سے ڈاکٹر رشٹر وائرس افریقہ سے نہیں لایا۔ پھر کون لایا؟ کوئی نہیں۔ کیونکہ ایبولا یہیں امریکا میں موجود تھا۔ اس کی خفیہ پناہ گاہ یہاں امریکا میں ہے .... سی۔ڈی۔سی میں۔'' مریسا خاموش ہوگئی۔

نورس نے کرسی چھوڑ دی۔ ''تمہارا بے تکا قیاس ناقابلِ برداشت ہے۔''

''یہ قیاس نہیں، سائنسی حقیقت ہے۔'' مریسا بھی کھڑی ہوگئی۔ ''حتیٰ کہ فورٹ ڈیٹرک میں بھی ایبولا نہیں ہے۔ وائرس صرف سی۔ڈی۔سی کے پاس ہے اور یہ ہولناک قاتل وائرس یہاں اتنا محفوظ نہیں۔ جتنا سمجھا جاتا ہے۔ یہ میں ثابت کرچکی ہوں۔ اگر یہ حصار یا MCL اتنی ہی قابلِ اعتبار ہوتی تو میں وہاں نہ پہنچ پاتی ....''

قبل اس کے کہ نورس کا ردِعمل سامنے آتا، مریسا اس کے دفتر سے نکل چکی تھی۔ اس کے عقب میں نورس نے بھی گیٹ آؤٹ ہی کہا تھا۔

☆☆☆

مریسا چند گھنٹے بعد کیفے ٹیریا جا رہی تھی۔ اس وقت بھی غصے کے اثرات پوری طرح زائل نہیں ہوئے تھے۔ وہ خود حیران تھی کہ اس میں اتنی ہمت کہاں سے آئی۔ اس سے قبل وہ کسی بھی اتھارٹی کے سامنے اس طرح کھڑی نہیں ہوئی تھی۔ کجا نورس کے دوبدو۔ جس کے ساتھ مریسا کا رشتہ تلخی کا باعث بن کے رہ گیا تھا۔ آج تو بزمِ کائنات درہم برہم ہو گئی تھی۔ غم و غصے میں بھی ناقابلِ فہم کیف تھا۔ لغزش یا نورس سے سرزد ہوئی تھی لیکن تشنگیِ شوق گاہے گاہے کیوں دل کی گہرائی میں ہمکتی تھی؟ رسم و راہ تو آغاز سے قبل ہی بے ربطیِ حالات کی نذر ہوچکے تھے۔ آج تو قصہ ہی تمام ہوا۔ اب تو اندیشۂ فردا ہمرکاب تھا۔

مریسا کو بخوبی ادراک تھا کہ بطور EIS اس کا کیریئر ہی خطرے کی نذر ہوچکا ہے۔ اِدھر اُدھر بھٹکتے قدم کیفے ٹیریا میں جم نہ سکے۔ وہ سی۔ڈی۔سی سے ہی نکل گئی اور بے مقصد اِدھر اُدھر گاڑی دوڑاتی رہی۔ معاً اسے رالف سے مشورے کا خیال آیا۔ مضطرب دل و جان کو قرار سا آگیا۔

☆☆☆

دونوں یونیورسٹی اسپتال کے کیفے ٹیریا میں کارنر ٹیبل پر تھے۔ رالف نے اپنے مخصوص انداز میں کھڑے ہو کر مریسا کے لیے کرسی کھینچی۔ مریسا نے بمشکل آنسو ضبط کیے اور زبردستی مسکراہٹ سجائی۔ وقت نکالنے پر رالف کا شکریہ ادا کیا۔

''کیا بدتمیزی ہے۔ تمہارے لیے میرے پاس ہر وقت، وقت ہی وقت ہے۔ کیا مسئلہ ہے؟ بہت پریشان تھیں فون پر؟''

''پہلے کچھ کھا لیتے ہیں۔'' مریسا نے کہا۔

''جو مرضی جناب کی۔''

کھانے کے وقفے نے مریسا کو سنبھلنے میں مدد دی۔ وہ جذباتی مدوجزر سے باہر آگئی۔ اس نے اختصار سے پہلے پس منظر کا ذکر کیا۔ لیکن لاس اینجلس میں نورس کے ساتھ جو جذباتی حادثہ پیش آیا تھا، اس کا ذکر گول کرگئی۔ نورس کے ساتھ تازہ ترین مڈبھیڑ کا احوال گوش گزار کرکے وہ خاموش ہوگئی۔

دورانِ ساعت رالف وقتاً فوقتاً تسلی تشفی کرتا رہا۔ رالف نے نرمی سے مریسا کو سمجھانے کی کوشش کی کہ سی۔ڈی۔سی ایک سرکاری ایجنسی ہے۔ سی۔ڈی۔سی کا دائرۂ کار، ذمے داریاں، فرائض اور مجبوریاں وغیرہ .... پھر اچانک وہ بولا۔

''مجھے ایک سوال کرنا ہے؟''

''کیوں نہیں۔''

''کیا تم مجھے بہترین دوست سمجھتی ہو؟ جو دل سے تمہاری بھلائی چاہتا ہے؟''

مریسا نے اثبات میں سر ہلایا۔ تاہم وہ حیران بھی ہوئی رالف کیا کہنے جارہا ہے۔

''ٹھیک ہے۔ اب میں بے تکلفی سے بات کرتا ہوں۔'' رالف نے کہا۔ ''دیکھو مریسا، سی۔ڈی۔سی میں کچھ لوگ تم سے خوش نہیں ہیں۔ اس کی وجہ تمہاری سرگرمیاں ہیں۔ جو سی۔ڈی۔سی کی لائن سے متصادم ہیں۔ یہ بیوروکریٹک نظام ہے۔ جہاں ذاتی خیال کو خود تک محدود رکھنا پڑتا ہے۔ جب تک مناسب وقت نہ آجائے .... میں نے کچھ وقت ملٹری میں گزارا ہے۔ زبان بند رکھنا سیکھنا پڑتا ہے۔ دیکھو تم ایک ٹیم کا حصہ ہو۔ تمہیں ٹیم پلیئر کی طرح کام کرنا ہے۔''

مریسا نے اس دوران میں مدافعانہ انداز میں چند اعتراضات کیے۔ تاہم اسے احساس ہوا کہ رالف بہت حد تک ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ دفعتاً مریسا کو خیال آیا کہ وہ ٹیڈ کو تو بھول ہی گئی۔ اسے لگا کہ وہ کئی گھنٹے سے خودغرضی کی مرتکب ہوتی رہی ہے۔ مریسا نے رالف کو بتایا کہ وہ ٹیڈ کا حال احوال معلوم کرنے جارہی ہے۔

رالف نے شرط رکھ دی کہ وہ کل کا ڈنر رالف کے ساتھ کرے گی۔ مریسا نے حامی بھرتے ہوئے رخصتی کا عندیہ دیا۔

ٹیڈ کی تلاش میں نکلتے ہوئے مریسا کا غصہ اور فرسٹریشن معدوم ہو چکی تھی۔ اس کی جگہ خوف اور احساسِ جرم نے لے لی تھی۔ خوف اپنی جاب کا۔ احساس جرمِ اپنے رویے کا....

ٹیڈ اسے وائرولوجی لیب میں ملا۔ ایڈز کا مرض ابھی تک ترجیحات میں سب سے اوپر تھا۔ مریسا کو دیکھ کر وہ گڑبڑا گیا۔ وہ نگاہیں چرا رہا تھا۔

''ایسا کیا برا ہو گیا کہ تم منہ چھپانے لگے؟'' مریسا نے جملہ کسا۔ تاہم اندر سے وہ ہمدردی محسوس کر رہی تھی۔

''بُرا نہیں، بہت بُرا۔'' ٹیڈ نے کہا۔

''میں معذرت خواہ ہوں۔ بات کھلی کیسے؟''

''نورس نے مجھ سے پوچھا تھا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ کسی نے اطلاع فراہم کی ہے۔ جھوٹ بولنا بے معنی تھا۔ میں نے بتا دیا۔ اس میں دو فائدے تھے۔'' ٹیڈ نے کہا۔ ''اول، سچ بولنے کی اپنی اہمیت ہے۔ دوم یہ کہ میں کسی راہ چلتے کو اٹھا کر MCL میں نہیں لے گیا تھا۔''

''تم نے ٹھیک کیا۔'' مریسا نے ایک ہاتھ ٹیڈ کے شانے پر رکھ دیا۔ ''مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں ہے بلکہ میں دل سے معذرت خواہ ہوں۔ میری وجہ سے تمہیں پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ سچ بولنے کا تمہارا فیصلہ درست تھا۔ ورنہ مزید پیچیدگیاں جنم لیتیں۔ اگر تم شام میں میرے گھر پر کافی پیو تو میری تکلیف کم ہو جائے گی۔'' وہ بیٹھ گئی۔ ٹیڈ کے چہرے کا سکون اور اعتماد لوٹ آیا۔

''مریسا! اچھا ہوا کہ معاملات کھل گئے۔''

''میں اتفاق کرتی ہوں تو پھر تم آؤ گے؟''

''ضرور۔''

☆☆☆

چھ بجے مریسا نے سپر مارکیٹ سے ضرورت کی اشیا خریدیں۔ گھر کی جانب جاتے ہوئے وہ راستے میں ایک بیکری پر رکی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگلے روز کیا کرنا ہے؟ پہلا کام وہ یہ کرے گی کہ نورس سے اپنے گستاخانہ رویے کے لیے معذرت کر لے۔

مریسا جذباتی کیفیت سے پوری طرح باہر آ چکی تھی۔ وہ گھر پہنچی تو سورج تقریباً غروب ہو چکا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں اشیا خورونوش کے بڑے خاکی لفافے تھے۔

وزن کے ساتھ فاصلہ کم طے کرنا پڑے۔ لہٰذا وہ کچن ڈور کے ذریعے گھر میں داخل ہونا چاہتی تھی۔ ڈور لاک کھول کر اس نے پہلے کچن کی بتیاں روشن کیں۔ پھر دونوں بیگ نما لفافے کچن ٹیبل پر رکھ دیے۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر الارم سسٹم کو ڈیوائس کے ذریعے غیر فعال کر دیا۔ معاً اسے خیال آیا کہ ٹفی اس کے استقبال کے لیے نہیں آیا۔ نہ اس کے بھونکنے کی آواز آئی۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔

گھر میں چھایا سناٹا مریسا کو غیر فطری سا لگا۔ مختصر ہال سے گزر کر وہ لیونگ روم میں آ گئی اس نے کتے کو نام لے کر پکارا۔ جواب ندارد۔ اس نے بالائی بیڈ رومز کا رخ کیا۔ اوپر دو بیڈ رومز تھے۔ جیسے ہی اس نے پہلے بیڈ روم کا دروازہ کھولا، اس کی نگاہ ٹفی پر پڑی۔ وہ کھڑکی کے قریب فرش پر لیٹا تھا۔ کتے کا سر غیر فطری زاویے پر مڑا ہوا تھا۔

''ٹفی۔'' مریسا بوکھلا کر چلا اٹھی۔ وہ دوڑ کر ٹفی کے پاس پہنچی اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ قبل اس کے وہ ٹفی کو چھو کر دیکھتی، خود اسے عقب سے دبوچ لیا گیا۔

مریسا کو بے رحم جھٹکے کے ساتھ کھینچا گیا تھا، وہ لڑکھڑا کر ایستادہ ہوئی۔ کمرا نگاہوں میں گھوم گیا۔ اس نے اَن دیکھے حملہ آور کا بازو پکڑا۔ اسے احساس ہوا کہ زیرِ پوشاک بازو نہیں شاید لکڑی یا دھات کی کوئی چیز ہے۔ حملہ آور کا ایک ہاتھ اس کی گردن پر تھا۔ مریسا نے گردن آزاد کرانے کے لیے پوری طاقت صرف کر دی لیکن ناکام رہی۔ جیکٹ کے نیچے اسے اپنا گریبان پھٹنے کی آواز آئی.... مریسا نے تڑپ کر حملہ آور کو دیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ جو بھی تھا، مریسا کی قوت اسے سنبھالنے کے لیے قطعی ناکافی تھی۔ مریسا نے اس کی مضبوط گرفت میں پھڑپھڑاتے ہوئے اوسان بحال رکھنے کی کوشش کی اور جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر الارم سسٹم کے ڈیوائس کو ٹٹولا۔ وقت بہت کم تھا۔ اس کی مزاحمت جواب دے رہی تھی۔ ڈیوائس ہاتھ میں آتے ہی وہ نرم پڑ گئی۔ وہ پینک (Panic) بٹن دبا چکی تھی۔ الارم کی انتہائی کرخت بلند چیخ دور تک گونج رہی تھی۔

مریسا کے سر پر زوردار ضرب لگائی گئی۔ نتیجتاً وہ فرش پر جا گری۔ گھر کے اندر الارم کی کریہہ چیخ کان کے پردوں کو مرتعش کیے دے رہی تھی۔

مریسا قدموں پر کھڑے ہونے کی کوشش کر رہی تھی جب اس کی سماعت سے ٹیڈ کی آواز ٹکرائی۔ وہ چکراتے ذہن کے ساتھ گھومی .... ٹیڈ ایک لمبے تڑنگے آدمی کے ساتھ الجھا ہوا تھا۔

مریسا سنبھل کر لپکی اور داخلی دروازہ چوپٹ کھول کر شور مچانا شروع کر دیا۔ وہ لان کراس کر کے باڑ کے دوسری جانب جڈسن فیملی کے گھر سے قریب ہو گئی۔ مسز جڈسن کو دروازہ کھولتے دیکھ کر مریسا نے چیخ کر پولیس بلانے کے لیے کہا اور ردعمل دیکھے بغیر واپس اپنے گھر کی جانب بھاگی.... گھر خالی پڑا تھا۔

''ٹیڈ!'' وہ چلائی۔ اسی اثنا میں جڈسن وہاں پہنچ چکا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کی بیوی پولیس کو فون کر رہی ہے۔ مریسا نے اپنے دوست کی گمشدگی کا اظہار کیا۔

جڈسن نے گھر کے باہر ایک سمت اشارہ کیا۔ مریسا نے ٹیڈ کو پہچان لیا۔ وہ بے اختیار بھاگ کر اس کے گلے میں جھول گئی۔

''کون تھا؟'' مریسا ہانپ رہی تھی۔

''پتا نہیں۔ میں گر گیا تھا۔'' ٹیڈ نے ایک ہاتھ سے اپنا سر سہلایا۔ ''جب تک میں دوبارہ اٹھتا، وہ نکل گیا۔ ایک کار پہلے ہی اس کی منتظر تھی۔''

مریسا، ٹیڈ کو کچن میں لے آئی۔ تولیا گیلا کر کے اس نے ٹیڈ کا مضروب سر صاف کیا۔

''اس کا ایک ہاتھ مصنوعی تھا شاید۔'' ٹیڈ نے بتایا۔

''تمہیں اس کے پیچھے نہیں جانا چاہیے تھا۔ اگر وہ مسلح ہوتا تو....'' مریسا نے تشویش ظاہر کی۔

''میرا ارادہ نہیں تھا۔ بس سب کچھ اچانک اور تیزی سے ہو گیا۔ اس کے پاس ایک بریف کیس تھا، لباس بھی اس کا معقول تھا۔''

''بریف کیس؟ کس قسم کا برگلر تھا؟ بریف کیس کے ساتھ؟'' مریسا نے تعجب سے کہا۔

''کیا تم نے اس کی شکل دیکھی؟'' جڈسن نے سوال کیا۔

''نہیں۔''

دور سے پولیس سائرن کی آواز آنا شروع ہوئی۔ اچانک مریسا کو ممی کا خیال آیا... اور وہ بے اختیار رو پڑی۔ تینوں بالائی بیڈروم میں آئے۔ ٹیڈ نے دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا کہ ممی مر چکا ہے۔ مریسا مچلی، تاہم ٹیڈ نے اسے کتے کے قریب نہیں جانے دیا۔ جڈسن نے بڑھ کر ممی کو دیکھا۔ اس کی گردن ٹوٹ چکی تھی۔ مریسا زاروقطار روئے جا رہی تھی۔ ٹیڈ اسے تسلی دیتا ہوا واپس نیچے لے آیا۔

پولیس پہنچ چکی تھی۔ یونیفارم میں دو آدمی تھے۔ دونوں نے مستعدی سے کارروائی کی۔ بیانات لیے۔ جلد ہی انہوں نے وہ جگہ تلاش کر لی جہاں سے نقب زن گھر میں داخل ہوا تھا۔ وہ لیونگ روم کی کھڑکی کا شیشہ توڑ کر آیا تھا۔ اس نے احتیاط کی تھی کہ کھڑکی کے پینل کو اوپر نہ اٹھانا پڑے۔ شیشہ توڑ کر جگہ بنائی گئی تھی۔ وہ اسی میں سے گزر کر اندر آیا تھا۔ مریسا سمجھ گئی کہ الارم سسٹم نے کیوں اس وقت کام نہیں کیا تھا۔ مریسا اور ٹیڈ پولیس کو نقب زن کا محض حلیہ ہی بتا سکے اور اس کے مصنوعی بازو کا ذکر کیا۔

وہ گھر سے کیا لے کر گیا؟ مریسا نے اس سوال کا جواب دیا کہ وہ دیکھ کر ہی بتا سکے گی۔ پولیس نے اسپتال جانے کے بارے میں پوچھا تو مریسا نے انکار کر دیا۔ پولیس مین نے رخصت ہوتے ہوئے نمبر چھوڑ دیا کہ بوقتِ ضرورت وہ کال کر سکتی ہے۔ جڈسن نے بھی جاتے ہوئے کہا کہ مریسا اسے کسی بھی کام کے لیے کسی وقت بھی بلا سکتی ہے۔ مریسا نے دونوں کا شکریہ ادا کیا۔

☆☆☆

مریسا نے کھانا ٹیڈ کی قیام گاہ پر کھایا اور رات بھی وہیں گزاری۔ ٹیڈ لیونگ روم میں سو گیا تھا۔ اگلے روز وہ اور جڈسن، مریسا کا موڈ بحال کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ مریسا، ممی کی جدائی پر دل گرفتہ تھی۔

ٹیڈ نے اسے چند روز کے لیے چھٹی کی پیشکش بھی کی۔ اس نے عندیہ دیا کہ وہ خود چند روز کے لیے اسے جزائر کیریبین لے جائے گا۔ اس اثنا میں سی۔ ڈی۔ سی کے معاملات بھی ٹھنڈے ہو جائیں گے۔

تاہم مریسا نے اصرار کیا کہ وہ کام کرنا چاہتی ہے۔ ٹیڈ نے مشورہ دیا کہ اس صورت میں اسے چاہیے کہ وہ ایبولا کی جانب سے دھیان ہٹا لے۔ ٹیڈ نے اس رائے کا بھی اظہار کیا کہ مریسا، نورس سے معمول کے تعلقات بحال کرنے کی جانب پیش رفت کرے۔ اس نکتے پر مریسا نے واضح رضامندی ظاہر کی تھی۔

ٹیڈ اسے گھر ڈراپ کر کے آفس چلا گیا۔ مریسا تاخیر سے دفتر پہنچی۔ وہ بہت حد تک سنبھل گئی تھی۔ وہ نورس سے ملنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ وہ اپنے آفس پہنچی تو ایک میمورنڈم وہاں پہلے ہی اس کا منتظر تھا۔ مریسا کو پہلا خیال نورس کا آیا۔ لفافہ چاک کرنے پر اس کا خیال غلط ثابت ہوا۔ وہ رقعہ ڈاکٹر کاربونارا کی طرف سے تھا۔ کاربونارا EIS پروگرام کا ایڈمنسٹریٹر تھا۔ درحقیقت مریسا کا اصل باس وہی تھا۔

مریسا کی دھڑکنیں اضطراب کا شکار ہو گئیں۔

اندیشوں نے یلغار کی۔ ڈاکٹر کاربونارا کا آفس دوسری منزل پر تھا۔ بہرکیف مریسا کو حاضری لگانا تھی۔ وہ خود سے سوال جواب کرتی وہاں پہنچ گئی۔

ڈاکٹر کاربونارا سفید بالوں والا نرم خو شخص تھا۔ وہ فون پر مصروفِ گفتگو تھا۔ اسی دوران اس نے مریسا کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ چند منٹ بعد فون رکھ کر وہ اس کی جانب متوجہ ہوا۔ کاربونارا کی مثبت مسکراہٹ نے مریسا کو قدرے پُرسکون کر دیا۔

مریسا اس وقت حیران رہ گئی۔ جب کاربونارا نے نقب زنی کی واردات سے آغاز کیا۔ مریسا کو توقع نہیں تھی کہ ٹیڈ، رالف اور جڈسن کے علاوہ بھی کوئی اور حادثے کے بارے میں جانتا ہے۔ کاربونارا، ہمدردی اور دکھ کا اظہار کر رہا تھا۔

''میری خواہش ہے کہ تم چھٹی لے لو، گھومو پھرو۔ اس طرح تمہاری طبیعت بحال ہو جائے گی۔ اس افسوس ناک حادثے کے اثرات بھی زائل ہو جائیں گے۔'' وہ بولا۔

''میں آپ کے احساس کی قدر کرتی ہوں۔'' مریسا نے کہا۔ ''تاہم سچ یہ ہے کہ میں مصروف رہوں گی تو میرے لیے بہتر رہے گا۔ مصروفیت کے بغیر ذہن بھٹکتا رہے گا۔''

کاربونارا نے پائپ نکالا اور تمباکو کی ڈبیا کھولنے لگا۔ چند ساعت وہ پائپ کی تیاری میں مشغول رہا۔

''ٹھیک ہے اگر تم مصروفیت کو بہتر سمجھتی ہو تو میں حارج نہیں ہوں گا۔'' اس نے پائپ سلگایا۔ ''بدقسمتی سے ایبولا کے معاملات الجھ گئے ہیں۔ تمہارا ٹرانسفر وائرولوجی سے بیکٹیریالوجی میں کیا جا رہا ہے۔ تمہارا موجودہ آفس برقرار رہے گا۔ مجھے یقین ہے کہ پچھلے کام کی طرح یہ بھی نہ صرف تمہارے لیے چیلنج ہوگا بلکہ تم پسند بھی کرو گی۔'' اس نے منہ سے پائپ ہٹا کر دھوئیں کا بادل اگلا۔

مریسا کو جھٹکا لگا۔ اس نے یہی محسوس کیا کہ اسے فارغ کر دیا گیا ہے۔

''تم کچھ غلط مت سمجھو۔ حقیقت یہ ہے کہ سی۔ڈی۔سی کے ہیڈ ڈاکٹر موریسن نے بذاتِ خود مجھے ہدایت کی ہے۔'' کاربونارا نے کہا۔

''میں نہیں مانتی۔ موریسن نہیں نورس نے کہا ہوگا۔'' مریسا خود کو نہ تھام سکی۔ اس کے چہرے پر سرخی کی لہر نمودار ہوگی۔

''نہیں۔ قطعی ایسا نہیں ہے۔'' کاربونارا نے زور دے کر کہا۔ ''ہاں اتنا ضرور ہے کہ نورس نے اس کی مخالفت نہیں کی۔''

مریسا ہنسنے لگی۔

''میں جانتا ہوں کہ تم دونوں کے درمیان کوئی شخصی تصادم موجود ہے تاہم میں دونوں کے کام سے بھی مطمئن ہوں۔''

''کیا آپ کو علم ہے کہ شخصی تصادم کی نوعیت کیا ہے؟''

''ٹھیک ٹھیک بات تم دونوں کو ہی پتا ہوگی۔ مجھے موقع دو کہ میں کچھ وضاحت کر دوں۔ اس طرح آپس میں بدگمانیوں کا امکان مفقود ہو جائے گا۔ تمہارے علم میں یہ بات نہیں ہے کہ موریسن کے پاس کانگریس مین کی کال آئی تھی۔ اس کا نام کلیون مارکھم ہے۔ وہ ہاؤس کی ایپروپریشن سب کمیٹی کا سینئر ممبر ہے۔ کمیٹی کا راست تعلق ہیلتھ اینڈ ہیومن سروس ڈپارٹمنٹ سے ہے۔ نورس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ مارکھم تھا جس نے موریسن کو مجبور کیا کہ تمہیں ایبولا ٹیم سے علیحدہ کر دیا جائے۔'' کاربونارا خاموش ہو گیا۔

مریسا دنگ رہ گئی۔ ناقابلِ یقین ..... استعجاب در استعجاب۔ کہاں مریسا اور کہاں یو ایس کانگریس؟ کانگریس مین، سی۔ڈی۔سی کے ہیڈ کو فون کرتا ہے.....

''مارکھم نے میرا نام لے کر کہا تھا؟'' وہ بمشکل بول پائی۔

''ہاں، میرا یقین کرو۔ میں خود موریسن سے متعدد سوالات کر چکا ہوں۔''

''لیکن، آخر کیوں؟''

''اس کی وضاحت پردۂ اخفا میں ہے۔ یہ درخواست سے زیادہ ایک حکم تھا۔''

مریسا کا سر متواتر نفی میں جنبش کر رہا تھا۔

''تم سمجھ سکتی ہو۔ ہمارے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ سیاسی معاملات، سیاست داں جانیں۔''

''سی۔ڈی۔سی کا سیاست سے کیا تعلق؟ بہرحال اس انکشاف نے میرا ارادہ بدل دیا ہے۔ مجھے چھٹیوں پر جانا چاہیے۔'' مریسا نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

''شاندار، تم ایک اچھا فیصلہ کر رہی ہو۔'' کاربونارا نے کہا۔ ''اس میں کوئی شک نہیں کہ تم نے ایبولا کے معاملے میں متاثر کن کام کیا۔ تم ٹیم کی ایک قابلِ قدر رکن تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم نئے ڈپارٹمنٹ کے لیے بھی ایک بہترین اضافہ ہوگی۔''

''کوشش کروں گی۔'' مریسا ناقابلِ فہم انداز میں مسکرائی اور کھڑی ہوگئی۔

☆☆☆

گھر کی طرف جاتے ہوئے اس کے ذہن میں خیالات و سوالات کے بھنور بن رہے تھے۔ اس کے گمان میں نہیں تھا کہ بات اتنی دور نکل جائے گی۔ کیا وہ اتنی اہم ہے؟ یا اتنی بُری ہے کہ کانگریس مین کو مداخلت کرنی پڑی یا اس کو مداخلت کے لیے کہا گیا۔ کس نے کہا؟ اور کیوں؟ یہ کیا گھن چکر ہے؟

مریسا چھٹیوں کے بہانے کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ اس کا یقین مزید پختہ ہو گیا تھا کہ ایبولا کے پیچھے کوئی نادیدہ انسانی ہاتھ ہے۔ نقب زنی کی واردات بھی اس کے نزدیک کوئی عمومی قسم کا حادثہ نہیں تھا۔

اگر نورس کے مارکھم سے تعلقات ہیں اور نورس نے اسے کہا تو معاملہ سیدھا تھا۔ اگر ایسا نہیں ہے تو گہری سازش ہے اور سازشی عناصر کے لیے صرف مریسا مسائل کھڑے کر رہی تھی۔ نورس اور کانگریس مین کا جوڑ فٹ نہیں بیٹھ رہا تھا۔ مریسا جتنا سوچتی، الجھتی جاتی۔ اسے تو کسی سازش کا پتا ہی نہیں تھا۔ وہ تو اپنی ڈیوٹی کر رہی تھی۔ اس کی اب تک کی تحقیق و جستجو اسے شک کی طرف لے گئی تھی۔ اسے محض شک تھا کہ ایبولا کی پشت پر معاملہ کچھ اور ہے۔ کل گھر میں اس پر حملہ .... وہ خوش قسمت رہی جو بچ گئی لیکن چوبیس گھنٹے کے اندر مارکھم کے ذریعے حملہ؟ وہ اسے بھی ایک حملہ ہی سمجھ رہی تھی .... مریسا کی اوقات ہی کیا تھی جو کانگریس مین کو اس کا نام لے کر دخل اندازی کرنی پڑی۔ اس کا شک قیاس و گمان سے آگے بڑھ کر یقین کی سرحدوں کو چھو رہا تھا۔ وہ تو وائرس سے خوف زدہ تھی بلکہ عوام سمیت سبھی خوف زدہ تھے لیکن انسان برائی پر اُتر آئے تو وائرس سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتا ہے۔

کیا وہ ان خطرات سے نکل کر بیکٹیریا ڈپارٹمنٹ میں سکون سے بیٹھ جائے؟ نہیں، وہ اب پیچھے نہیں ہٹ سکتی۔ گھر والے حادثے اور کانگریس مین کی مداخلت نے اسے مشتعل کر دیا تھا۔ اس کا عزم پختہ ہو گیا تھا۔ تاہم اسے سر کو ٹھنڈا رکھتے ہوئے احتیاط سے پیش قدمی کرنی تھی۔ وہ اکیلی تھی۔ کمزور تھی۔ اس کا ہتھیار اس کا ذہن تھا۔ اگر یہ کوئی گہری سازش تھی تو یہ امر واضح تھا کہ آگے بڑھنے کی صورت میں اس کی جان کو خطرہ ہے۔ یعنی مریسا کو بدترین حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا تھا۔

اگر اس کا اندازہ غلط تھا تو بھی اسے ایبولا کا سراغ لگانا ہی تھا۔ گھر پہنچ کر اس نے خود کو بستر کے حوالے کر دیا۔

کروٹیں بدلتی رہی۔ خیالات سے الجھتی رہی .... بالآخر اس نے فون اٹھا کر ڈیلٹا کا نمبر ملایا۔ اگلی فلائٹ پر ریزرویشن کرائی۔ مریسا واشنگٹن ڈی سی جانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

☆☆☆

ائرپورٹ سے مریسا نے جارج ٹاؤن کے ہوٹل میں چیک اِن کیا۔ فوراً بعد وہ کینن کانگریشنل آفس بلڈنگ پہنچی۔ اطلاعی بوتھ سے معلومات لے کر اس نے سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھائے۔ کچھ دیر بعد وہ بلڈنگ کے اندر تھی۔

وردی میں ملبوس گارڈ نے اسے میٹل ڈیٹیکٹر سے گزارا۔ اس کا پرس چیک کیا۔ مقصد معلوم کیا۔ مریسا نے مارکھم کا نام لیا.... کانگریس مین کا آفس پانچویں منزل پر تھا۔

وہ بہ آسانی مارکھم کے آفس تک پہنچ گئی۔ دروازہ پوری طرح بند نہیں تھا۔ بغیر اطلاع، بغیر دستک یا بیل کے اس نے اندر قدم رکھ دیا۔ مریسا کے ذہن میں یہ بات تھی کہ اس طرح کا سرپرائز شاید اس کے حق میں چلا جائے۔ شومیٔ قسمت مارکم شہر میں ہی نہیں تھا۔ سرپرائز کے چکر میں وہ غلطی کر بیٹھی تھی۔ مارکھم کی موجودگی کی تصدیق ضروری تھی۔ وہ اس کے بغیر ہی اٹلانٹا سے اڑان بھر کے واشنگٹن وارد ہو گئی۔ بہر حال اب تو کوئی اندھا تیر چلانا ہی تھا۔ مریسا نے مارکھم کے ایڈمن اسسٹنٹ سے ہی بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسسٹنٹ نے ہی بتایا تھا کہ مارکھم ہیوسٹن میں ہے۔ تین دن سے قبل اس کی واپسی ممکن نہیں۔ اسسٹنٹ کا نام ابرام تھا۔ ابرام کی عمر پچیس سال کے لگ بھگ رہی ہو گی۔

''میرے لائق کوئی خدمت؟'' ابرام نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔ مریسا کو اس کی مسکراہٹ مشکوک لگی۔

''کیا ہم پرائیویٹ ٹاک کر سکتے ہیں؟''

''کیوں نہیں۔'' ابرام نے سیکریٹری کی جانب دیکھا اور مریسا کو اندرونی دفتر میں لے آیا۔ جو دراصل مارکھم کا چیمبر تھا۔ مریسا نے سرسری نظر کمرے پر ڈالی۔ مہاگنی کی بڑی سی ڈیسک پر ایک جانب چھوٹا امریکی پرچم موجود تھا۔ ڈیسک کے عقب میں دیوار پر فریم شدہ مختلف تصویریں آویزاں تھیں۔

''میں ڈاکٹر مریسا بلوم ہوں۔'' مریسا نے بیٹھتے ہی سادگی سے کہا۔ ''کیا تم نے پہچانا؟''

''نہیں، کیا ہم پہلے ملے ہیں؟'' ابرام نے دوستانہ

انداز میں سوال کیا۔

''شاید نہیں ملے۔''

''کیا تم ہوسٹن سے آئی ہو؟''

''نہیں، اٹلانٹا سے۔'' مریسا نے بغور اسے دیکھا۔

''میرا مطلب ہے سی۔ڈی۔سی سے۔'' مریسا نے پھر اس کے چہرے پر کوئی ردِعمل کھوجنے کی سعی کی۔

''سی۔ڈی۔سی۔'' ابرام نے حروف دہرائے۔

''کیا تم آفیشل وزٹ پر ہو؟''

''نہیں۔'' مریسا نے تسلیم کیا۔ ''مارکھم کا سی۔ڈی۔سی سے خاص تعلق ہے۔ میں چھٹی پر آئی تھی۔ سوچا کہ نئی معلومات حاصل کروں۔''

''خاص تعلق والی بات عجیب سی ہے۔ کانگریس مین کا ہیلتھ کیئر سے متعلق تقریباً تمام شعبوں سے ہی تعلق ہے۔'' وہ بولا۔ ''ہیلتھ کیئر میں مارکھم نے کسی بھی دوسرے کانگریس مین سے زیادہ کام کیا ہے .... اس شعبے میں مارکھم نے متعدد قوانین منظور کروائے ہیں۔''

ابرام نے بتایا کہ کون سے اور کتنے بل مارکھم نے اسپانسر کیے یا کانگریس میں پیش کیے۔

''بہت خوب۔'' مریسا نے تعریف کی۔ ''مطلب یہ کہ مسٹر مارکھم یقیناً امریکی شعبۂ ادویات میں بھی گہری دلچسپی رکھتے ہوں گے۔''

''ہاں، یہ ایک نمایاں بات ہے۔''

''سی۔ڈی۔سی کے کون سے شعبے میں انہیں خاص دلچسپی ہوسکتی ہے؟''

''میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

مریسا کو کوئی اور سوال نہیں سوجھا۔

''میں مسٹر مارکھم سے ملنے کی کوشش کروں گی۔ اگر وہ جلد آگئے۔'' مریسا نے بات گھمائی اور ابرام کا شکریہ ادا کرکے اٹھ گئی۔

کیب حاصل کرنے کے بجائے وہ پیدل ہی چل پڑی۔ وہ خیالات میں غلطاں، بے مقصد رواں تھی۔ وہ کچھ کرنا چاہتی تھی لیکن اس کی پوزیشن پہلے جیسی نہیں تھی۔ مارکھم کے لیے تین دن رکنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ابرام سے بات چیت کرکے اس نے غلطی تو نہیں کی۔ اس ملاقات سے اسے کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ اب اسے کیا کرنا چاہیے؟ اگلا قدم؟ نئی سمت؟ واشنگٹن کا دورہ ضائع نہیں ہونا چاہیے .... دفعتاً اس کے ذہن میں ایک خیال برق بن کے چمکا۔

مریسا نے قریبی کیب کو اشارہ دیا۔ اندر بیٹھتے ہی وہ گویا ہوئی۔ ''فیڈرل الیکشن کمیشن۔ معلوم ہے کہاں ہے؟''

ڈرائیور ایک نوجوان سیاہ فام تھا۔ اس نے پلٹ کر کہا۔ ''لیڈی، اس شہر میں اگر کوئی ایسی جگہ ہے جو مجھے نہیں معلوم تو وہاں میں آپ کو مفت میں لے جاؤں گا۔''

''ویری گڈ۔'' وہ مسکرائی۔ کیب ڈرائیور کے غیر متوقع فقرے نے اس کا موڈ خاصا بہتر کردیا تھا۔

پندرہ منٹ بعد کیب ایک عمارت کے سامنے رکی ہوئی تھی۔

''شکریہ۔'' مریسا کرایہ ادا کرکے عمارت کی جانب بڑھ گئی۔ وردی پوش گارڈ نے خاص توجہ نہیں دی۔ البتہ مریسا کو ایک رجسٹر پر دستخط کرنے پڑے۔ اندر جانے کے بعد اسے اندازہ نہیں تھا کہ کس ڈپارٹمنٹ کا نام لے۔ تاہم وہ پہلی منزل پر پہنچی۔ جہاں چار عدد خواتین مختلف میزوں پر مصروفِ کار تھیں۔ ایک نے نگاہ اٹھائی اور مدد کی پیشکش کی۔

''کانگریس اراکین کی انتخابی مہم کے لیے فنڈ کے ذرائع پبلک ریکارڈ میں شامل ہیں۔ کیا میں ٹھیک سمجھ رہی ہوں؟'' مریسا دوستانہ انداز میں مسکرائی۔

''یقیناً ایسا ہی ہے۔'' خاتون اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''آپ کو کس میں دلچسپی ہے؟ اخراجات میں یا فنڈ کے ذرائع میں؟''

''ذرائع۔ چندہ وغیرہ۔''

''کانگریس مین کا نام بتایئے۔''

''مارکھم۔ کلیون مارکھم۔'' مریسا پیش کی گئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ خاتون نے ایک طرف گول میز پر ترتیب سے رکھے فولڈرز میں سے ایک فولڈر منتخب کیا۔ پھر وہ ایک بڑے سے مائیکروفلم کیسٹ ریک کے سامنے رکی۔ دو منٹ میں اس نے مطلوبہ فلم حاصل کی اور مائیکروفلم ریڈر کے ساتھ لگادی۔

''الیکشن کا سال بتایئے؟'' اس نے سوال کیا۔

''سابقہ الیکشن۔'' مریسا نے اندازاً پچھلے الیکشن کا حوالہ دیا۔ اسے پورا یقین نہیں تھا کہ اس طرح وہ نورس اور مارکھم کے مابین کوئی کڑی ملالے گی یا پھر مارکھم اور سی۔ڈی۔سی کے مابین کچھ مل جائے گا۔ نورس کا نام ملنے کی اسے امید نہیں تھی۔ کیونکہ نورس کوئی متمول شخص نہیں تھا۔

خاتون نے اسے مائیکروفلم ریڈر کو آپریٹ کرنے کا سادہ سا طریقہ بتایا۔ کاپی حاصل کرنے کے لیے مریسا کو معمولی ادائیگی کرنی ہوگی۔ مریسا نے شکریہ ادا کیا اور اٹھ کر اسکرین کی طرف متوجہ ہوگئی۔

وہ توجہ کے ساتھ اسکرین پر نمودار ہونے والے نام اور پتے پڑھ رہی تھی۔ فلم ریڈر چلنے کی ہلکی سی آواز وہاں گونج رہی تھی۔

مریسا کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ مارکھم کو مالی استحکام دینے والوں کا تعلق صرف ریاست ٹیکساس سے نہیں تھا بلکہ دائرۂ کار وفاقی سطح تک چلا گیا تھا۔ دوسری بات مریسا نے نوٹ کی، چندہ دینے والوں کی کثیر تعداد ڈاکٹرز کی تھی۔ یہ امر اس لیے انوکھا نہیں تھا کہ مارکھم کا بیشتر کام طبی شعبے سے متعلق تھا۔

حسب توقع نورس کا نام اسے نظر نہیں آیا۔ مریسا نے ادائیگی کر کے پوری لسٹ کی نقل حاصل کر لی۔ شکریہ ادا کیا اور واپسی کی راہ پکڑی۔ کیب ہائر کر کے ہوٹل کا پتا بتایا پھر عقبی نشست پر نیم دراز ہو گئی۔

وہ سکون سے لسٹ کا مطالعہ کر رہی تھی۔ انفرادی ناموں کے بعد کارپوریٹ سیکٹرز کے نام تھے۔ ان میں تیل کی کمپنیاں بھی شامل تھیں۔ مریسا نے انفرادی نام چھوڑ کر کارپوریٹ سیکٹر کو دیکھا۔ اس کی نگاہ جس نام پر اٹکی، وہ تھا۔

''فزیشنز کانگریس پولیٹیکل ایکشن کمیٹی۔''

مریسا کو تعجب ہوا۔ PAC نے دیگر کمپنیوں کے علاوہ تیل کی کمپنیوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔

یہ PAC کیا بلا ہے؟ مریسا کے ذہن میں سوال ابھرا۔ اس نے نئے سرے سے لسٹ کا جائزہ لیا۔ انفرادی ناموں کو بغور دیکھنا شروع کیا۔ دفعتاً کاغذ اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے رہ گئے۔ وہ غیر یقینی کیفیت میں ایک نام کو گھور رہی تھی۔ مریسا کی نگاہ اس نام پر جم گئی ڈاکٹر رالف ہمپسٹن۔

رالف، مارکھم پر اثر انداز ہو سکتا ہے لیکن مریسا کے نزدیک اس کا امکان صفر تھا۔ وہ مریسا کا اچھا دوست اور ہمدرد تھا۔ جہاں تک رقم کا سوال تھا۔ رالف اس کی بخوبی استطاعت رکھتا تھا۔ اس کا رہن سہن اور لگژری اسٹائل مریسا دیکھ چکی تھی۔

رالف سی۔ڈی۔سی کے علاوہ اپنا نجی اسپتال بھی چلاتا تھا۔ اگرچہ مریسا کو پھر بھی اس کے ٹھاٹ باٹ کبھی کبھی غیر معمولی محسوس ہوتے۔ مریسا کو وہ دعوت بھی یاد تھی۔ جب وہ پہلی مرتبہ رالف کے شاندار گھر میں گئی تھی اور میزبان کے فرائض انجام دیے تھے۔ وہاں علاقے کے چنیدہ افراد مدعو تھے۔ سب کا تعلق طبی شعبے سے تھا۔ وہ تمام متمول طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ بعض اوقات مریسا کو رالف کی گفتگو میں قدامت پرستی کا عنصر پریشان کرتا۔ کیونکہ یہ انداز اس کے رہن سہن اور اسٹائل سے متصادم تھا۔

وہ ابتدائی شاک سے سنبھل گئی۔ اس کے ذہن نے رالف کو مشکوک افراد میں شامل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بہرکیف کارپوریٹ سیکٹر میں PAC نامی ادارہ مریسا کے ذہن میں چبھ رہا تھا۔ کیب ہوٹل پہنچ کر رکی تو مریسا خیالات کے حصار سے باہر نکل آئی۔

☆☆☆

ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ مریسا کی نگاہ ہوٹل کی لابی سے گزرتے وقت نیوز اسٹینڈ پر پڑی۔ وہ جیسے منجمد رہ گئی۔ اس کی نظر واشنگٹن پوسٹ کی شہ سرخی سے بندھی ہوئی تھی۔

''ایبولا کی واپسی۔''

مریسا نے ذیلی سرخی پڑھی اور پرس کھول کر اسٹینڈ کی طرف لپکی۔ اخبار خرید کر اس نے سیڑھیوں کا رخ کیا۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے تفصیل پڑھنا شروع کی۔

ایپکٹن میں افراتفری پھیل چکی تھی۔ وہ پڑھتی رہی۔ سی۔ڈی۔سی سے رابطہ کیا گیا تھا۔ اخبار میں نورس کے بیان کا حوالہ موجود تھا جس کے مطابق گھبرانے کی بات نہیں تھی۔ نیز گزشتہ تین تجربوں کے بعد سی۔ڈی۔سی وائرس کو قابو کرنے میں طاق ہو چکی تھی۔

کیا وائرس کو قابو کرنا ہی مسئلے کا حل ہے؟ مریسا نے خود سے سوال کیا۔ ایبولا کی خون آشامی کو فنا کرنے والا کوئی نہیں؟ کیا ایبولا کو اسپتال تک محصور کر دینے کے بعد سی۔ڈی۔سی کی ذمے داری ختم ہو جاتی ہے؟ اور یہ سلسلہ کب تک چلے گا؟ اس طرح سی۔ڈی۔سی کب تک اپنی ساکھ بچا سکے گی؟

مریسا نے اندرونی صفحات دیکھے۔ ایک تصویر میں برن اسپتال کے باہر پولیس کی رکاوٹ نظر آرہی تھی۔ اسے فونیکس کی بربادی یاد آگئی۔ مریسا نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ وہ باضابطہ چھٹی پر تھی۔ تاہم وہ بہت پہلے ایبولا کے ساتھ وابستہ ہو چکی تھی۔ اس کے پاس دوسری کوئی چوائس نہیں تھی۔ یہاں سے وہ سی۔ڈی۔سی کی ٹیم سے پہلے جائے واردات پر پہنچ سکتی تھی۔ مریسا نے ضروری اشیا جمع کرنا شروع کر دیں۔

☆☆☆

برن اسپتال کے باہر اس کی مڈبھیڑ حسب توقع پولیس سے ہو گئی۔ مریسا نے سی۔ڈی۔سی کے کارڈ کی

جھلک دکھائی اور بہ آسانی اسپتال میں داخل ہوگئی۔ پچھلے تین اسپتالوں کی طرح برمن اسپتال بھی جدید خطوط پر استوار تھا۔

لابی میں خاصے لوگ جمع تھے۔ تاہم فونیکس کی طرح افراتفری نہیں تھی۔ انفارمیشن بوتھ سے مریسا نے اطلاع حاصل کی۔ آئسولیٹڈ یونٹ چھٹی منزل پر تھا۔ وہ چھٹی منزل پر اُتری تو ایک نرس نے حفاظتی لباس فراہم کردیا۔ نرس نے پوچھنے کی زحمت ہی نہیں کی کہ وہ یہاں کیا کررہی ہے۔ مریسا نے سکون محسوس کیا۔ حفاظتی اشیا اور ماسک کے ساتھ اس کی پہچان مشکل تھی۔

''معاف کرنا۔ سی۔ڈی۔سی کا کوئی ڈاکٹر موجود ہے؟'' مریسا نے اسی نرس سے سوال کیا۔

''وہ لوگ ایک گھنٹا قبل یہاں سے گئے ہیں۔ شاید ایڈمن میں مل جائیں۔'' جواب ملا۔ مریسا کو حیرت ہوئی کہ ٹیم پہلے ہی پہنچ چکی ہے۔

''کوئی بات نہیں۔ تینوں مریضوں کی کیا کیفیت ہے؟''

''تین نہیں۔ اب سات مریض ہیں۔'' نرس نے کہا پھر جھجکتے ہوئے مریسا کی شناخت معلوم کی۔

''میرا تعلق سی۔ڈی۔سی سے ہے۔'' مریسا نے نام ظاہر کرنے سے احتراز کیا اور خوداعتمادی کے ساتھ نرسز اسٹیشن کی جانب چل پڑی۔ نرس بھی اس کے ہمراہ تھی۔

''مریضوں کے چارٹ یہاں ہیں یا کمروں میں؟''

''ہمارے پاس ہیں۔'' ایک عمر رسیدہ نرس نے جواب دیا۔

''کیسا حال ہے، مریضوں کا؟''

''بہت بُرا۔ ہم چوبیس گھنٹے ڈیوٹیاں بدل کر بھرپور کوشش کررہے ہیں۔ ڈاکٹرز بھی انتھک کام کررہے ہیں مگر صورتِ حال بگڑتی ہی جارہی ہے۔ ہماری ہر کوشش ناکام ہے۔'' نرس کے تاثرات مایوسی کے آئینہ دار تھے۔

مریسا ان کی فرسٹریشن کو بخوبی سمجھ سکتی تھی۔

''تم میں سے کسی کو علم ہے؟ پہلا مریض کون تھا؟''

''ڈاکٹر ایلکسی۔'' معمر نرس نے ہی جواب دیا اور ایک چارٹ نکال کر مریسا کو دیا۔

مریسا نے بہ سرعت چارٹ کا جائزہ لیا۔ مطلب کی ایک ہی چیز اسے نظر آگئی۔ پہلا مریض نہ صرف ڈاکٹر تھا بلکہ ماہرِ امراضِ چشم تھا۔ پھر وہی ماہرِ چشم؟

مریسا وہاں کتنی دیر ٹھہرنے کی ہمت کرسکے گی؟ خود اسے اندازہ نہیں تھا۔ کسی بھی وقت سی۔ڈی۔سی کے کسی رکن سے مڈبھیڑ ہوسکتی تھی۔ اس نے آنکھوں پر حفاظتی گاگلز چڑھائے۔ چہرہ تقریباً چھپ گیا تھا۔ بعدازاں وہ نرس کی رہنمائی میں ڈاکٹر ایلکسی کے کمرے میں داخل ہوگئی۔

''کیا ڈاکٹر ایلکسی ہوش میں ہیں؟'' مریسا نے وہاں موجود اسپیشل ڈیوٹی نرس سے سوال کیا۔

''وہ ایک منٹ ہوش میں ہوتے ہیں۔ اگلے منٹ نیم بے ہوش۔'' نرس کی آواز میں بےبسی نمایاں تھی۔

مریسا نے مریض کا جائزہ لیا۔ ڈاکٹر ایلکسی کی تمام ظاہری علامات چیخ رہی تھیں کہ وہ موت کے منہ میں ہے۔

''ڈاکٹر ایلکسی۔'' مریسا نے قریب ہوکر پکارا۔

مریض نے سلوموشن میں سر کا زاویہ تبدیل کیا۔

''آپ میری آواز سُن رہے ہیں؟''

ایلکسی نے اثبات میں سر کو خفیف سی جنبش دی۔

''کیا آپ نے حال ہی میں افریقہ کا سفر کیا تھا؟''

مریض ڈاکٹر نے سر کی جنبش سے نفی میں جواب دیا۔

''آنکھوں کی سرجری سے متعلق چند مہینے پہلے ایک کانفرنس ہوئی تھی۔ اس کا انعقاد سان ڈیاگو کے ایک ہوٹل میں ہوا تھا۔ کیا آپ نے وہاں شرکت کی تھی؟''

''ہاں۔'' جواب ملا۔ تاہم آواز بہت کمزور و نحیف تھی۔ کیا تورس کا خیال ٹھیک تھا؟ مریسا نے پریشانی سے سوچا۔

''ڈاکٹر ایلکسی۔'' مریسا نے احتیاطاً تیسرا سوال کیا۔

''کیا لاس اینجلس، سینٹ لوئیس یا فونیکس میں آپ کا کوئی دوست یا شناسا ہے؟ اگر کوئی ہے تو کیا آپ حال ہی میں اس سے ملے تھے؟''

جواب ندارد۔ ڈاکٹر ایلکسی پر غشی کا حملہ ہوا تھا۔ وہ واپس بے ہوشی کی حالت میں چلا گیا۔ مریسا اس کے زردی مائل چہرے کو تک رہی تھی۔ اس کی بائیں آنکھ کے نیچے زخم نما خراش تھی۔ وہ خراش مریسا نے اولین سوال سے قبل ہی نوٹ کرلی تھی۔

مریسا رک کر دوبارہ اس کے ہوش میں آنے کا انتظار نہیں کرسکتی تھی۔ ایک سوال ضروری تھا۔ وہ سوال مریسا نے نرس سے پوچھ لیا۔ نرس مریض کا بلڈ پریشر چیک کرنے والی تھی۔ وہ جواب دینے کے لیے رُکی۔

''ڈاکٹر ایلکسی نے بتایا تھا کہ ڈاکٹر پر لٹیروں نے حملہ کیا تھا۔'' نرس نے کہا۔ ''یہ زخم اسی حملے کی نشانی ہے۔''

مریسا جواب سُن کر بُری طرح چونک اٹھی۔

قبل اس کے مریسا کچھ اور کہتی، کمرے میں لگا اسپیکر بیدار ہو گیا۔ ''نرس میری، کیا سی۔ڈی۔سی کا کوئی ڈاکٹر وہاں موجود ہے؟'' اسپیکر سے آواز آئی۔

نرس میری نے اسپیکر کو پھر مریسا کو دیکھا اور قدرے بلند آواز میں جواب دیا۔ ''ہاں، ایک ڈاکٹر یہاں ہے۔''

انٹرکام کنکشن پر مریسا نے دوسری جانب کسی عورت کو بولتے سنا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''شی از دیئر۔'' پھر کسی مرد کی آواز آئی۔ ''کچھ مت بولو۔ میں جا کر دیکھتا ہوں۔''

رفتارِ نبض کے ساتھ مریسا کے بدن میں لہو کی گردش تیز ہو گئی۔ اس نے نورس کی آواز پہچان لی تھی۔ مریسا نے اطراف میں نظر دوڑائی۔ جیسے راہِ فرار ڈھونڈ رہی ہو۔ وہ ایک بدنما سچویشن سے دوچار تھی۔ مریسا جانتی تھی کہ اس کے پاس منٹ سے بھی کم وقت ہے۔ اتنی دیر میں تو وہ باہر نکل کر حفاظتی اشیا بھی نہیں اتار سکتی تھی۔ نہ وہ نرس سے باہر نکلنے کا دوسرا راستہ دریافت کر سکتی تھی جو کہ بظاہر اسے دکھائی بھی نہیں دے رہا تھا۔

باہر راہداری میں قدموں کی آہٹ اُبھری۔

''اوکھلی میں سر دیا ہے تو جھگتو۔'' اس نے خود سے کہا۔ ''کیا کرنا چاہیے؟''

ذہن نے فیصلہ صادر کیا۔ ''سامنا کرو۔''

اسی وقت نورس کمرے میں داخل ہوا۔ مریسا اعتماد کے ساتھ پلٹی۔ دونوں ایک بار پھر روبرو تھے۔

مریسا کو احساس تھا کہ اب تک متعدد اصول توڑ چکی ہے۔ نورس کی جانب سے کڑوا ردِعمل متوقع تھا۔ نورس نے آتے ہی اس کا بازو پکڑ لیا۔ وہ خاصا برافروختہ دکھائی دے رہا تھا۔

''تم کیا سمجھتی ہو خود کو؟'' وہ چیخ پڑا۔ ''یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''کسی اور کا نہیں تو مریض کا احترام کرو۔'' وہ بازو چھڑا کر باہر نکل گئی۔ مریسا نے آنکھوں سے گاگلز ہٹا دیے۔ نورس اس کے پیچھے تھا۔ مریسا نے ہڈ، گاؤن اور گلوز بھی اتار دیے۔ اشیا کو نرسز اسٹیشن پر چھوڑ دیا۔ نورس بھی یہی کر رہا تھا۔

مریسا، اسٹیشن سے ذرا آگے چلی گئی۔

''اتھارٹیز کو چیلنج کر کے تم اپنا کیریئر بنا رہی ہو؟'' وہ غصے سے بولا۔ ''تم نے کھیل سمجھا ہوا ہے؟''

''میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔'' وہ دھیمی چال سے سیڑھیوں کی طرف چل دی۔

''تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟'' نورس کی آواز بلند ہو گئی۔ وہ آگے بڑھا۔ مریسا کو بازو سے پکڑ کر گھمایا۔ ''کیا چاہتی ہو تم؟''

دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔

دل کے دور افتادہ گوشے میں کوئی ٹیس اٹھی۔ مریسا چند لمحے خاموش رہی۔

''میرا مطلب تھا، بعد میں بات کریں گے۔ تم اس وقت بہت غصے میں ہو۔''

''کیا مطلب میں پاگل ہو گیا ہوں؟ غور سے سنو۔ صبح میں سب سے پہلے مورسین کو فون کروں گا۔ اس کو کہوں گا کہ چھٹی کے بجائے تمہیں جبری رخصت پر بھیج کر غیر حاضری لگا دی جائے۔ اگر وہ نہ مانا تو میرا مطالبہ ہو گا کہ فریقین کا مؤقف سننے کے لیے کمیٹی بٹھائی جائے۔'' نورس نے سنجیدہ دھمکی دے ڈالی۔

مریسا نے بمشکل خود کو قابو کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے لیے یہ بہت اچھا ہو گا۔ اوپر تلے ہونے والی بربادی اور اموات کی حقیقت کیا ہے؟ کیوں تم اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتے؟ یہ سلسلہ کہاں جا کر ختم ہو گا؟ اس کے لیے کمیٹی کے سامنے ہیئرنگ ہونی چاہیے۔ اس کے بعد حقیقت سامنے آنے کا امکان روشن ہو جائے گا۔''

''نکل جاؤ یہاں سے یا میں تمہیں اٹھا کر پھینکوں۔'' نورس آپے سے باہر ہو گیا۔

''زحمت نہ کرو، میں جا رہی ہوں۔''

☆☆☆

مریسا، اسپتال سے نکل گئی تھی۔ اس کا بدن لرز رہا تھا۔ اس قسم کے تصادم سے اسے نفرت تھی۔ بالخصوص نورس کے ساتھ۔ وہ دو انتہاؤں کے درمیان ٹوٹ رہی تھی۔ ایک انتہا مریسا کا غصہ تھا۔ جسے وہ جائز سمجھتی تھی۔ دوسری انتہا احساسِ جرم کے ساتھ بے عزتی اور بے بسی کی کیفیت .... اسے یقین تھا کہ وہ ایبولا کے پُراسرار حملوں کی حقیقت کے قریب ہے۔ تاہم اسے کوئی ٹھوس ثبوت ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

نورس کے ساتھ حالیہ مڈبھیڑ نے اسے جذباتی طور پر منتشر کر دیا تھا۔ اسے احساس تھا کہ وہ برن اسپتال جا کر اصول شکنی کی مرتکب ہوئی ہے اور زمینی حقائق نورس کے اشتعال کی وضاحت کرتے ہیں۔ نورس کو جائز حق حاصل تھا کہ مریسا کو باہر کر دے۔ مریسا صرف نورس کو بتانا چاہتی تھی کہ انڈیکس کیسز کیوں رہزنی کا شکار ہوتے ہیں۔ جس کے

بعد وہ ایبولا کی گرفت میں آجاتے ہیں۔ وہ تبادلۂ خیال کرنا چاہتی تھی۔ اپنے شبہات اور تجزیے پیش کرنا چاہتی تھی۔ کیوں ملتے جلتے اسپتال میں ہی ایبولا سر اٹھاتا تھا؟ کیوں ہر انڈیکس کیس اسپتال کا ہی ڈاکٹر ہوتا تھا؟ کیوں کانگریس مین نے مریسا کا نام لے کر مداخلت کی؟ وہ PAC کے بارے میں بھی پوچھنا چاہتی تھی لیکن اب اس کشیدہ مڈبھیڑ کے بعد.... مریسا ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئی۔

مریسا نے اٹلانٹا واپس جانے کا فیصلہ کرلیا۔

پہلے پے فون کے ذریعے اس نے رالف سے رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے فوراً جواب آیا۔ یوں لگا جیسے وہ مریسا کا ہی انتظار کررہا تھا۔ رالف نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ ساتھ ہی استفسار کیا کہ وہ کہاں غائب ہے۔ رالف کو اطلاع کیوں نہیں دی۔

''واشنگٹن گئی تھی۔ اب پنسلوینیا میں ہوں۔'' مریسا نے کہا۔ ''واپس اٹلانٹا آرہی ہوں۔''

''کیا تم پنسلوینیا، ایبولا کی وجہ سے گئی تھیں؟''

''ہاں۔'' وہ بولی۔ ''تم سے آخری بار بات کرنے سے اب تک بہت کچھ ہو چکا ہے۔ لمبی کہانی ہے۔ یہاں نورس کے ساتھ جھڑپ ہوگئی۔ میرا خیال ہے کہ میری جاب ختم ہونے والی ہے۔ شاید اب مجھے کوئی اور جاب تلاش کرنی پڑے۔''

''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' رالف نے تسلی دی۔ یونیورسٹی اسپتال میں اپنی جاب پکی سمجھو۔ فلائٹ نمبر بتاؤ۔ میں تمہیں ائرپورٹ سے لے لوں گا۔ میں تمہارے کارنامے سننے کے لیے بے چین ہوں۔''

''شکریہ لیکن میں نے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔''

''جو کچھ بھی ہے۔ میں تمہاری طویل اسٹوری سننے کے لیے تیار ہوں۔''

''میں گھر آنے سے پہلے سی۔ڈی۔سی جاؤں گی۔ نورس کی واپسی سے قبل مجھے کچھ کرنا ہے۔'' مریسا نے کہا۔

''تمہارا ارادہ مجھے کچھ معقول نہیں لگتا۔ آخر تم کس چکر میں ہو؟''

''کچھ خاص نہیں۔ میں ایک بار پھر MCL میں جانا چاہتی ہوں۔''

''لیکن تمہارے پاس اجازت نامہ نہیں ہے۔'' رالف نے اعتراض کیا۔

''کچھ نہ کچھ کرلوں گی۔''

''میرا مشورہ ہے کہ تم سی۔ڈی۔سی سے دور رہو۔ تمہاری مشکلات کا آغاز ہی MCL میں جانے کی وجہ سے ہوا تھا۔''

''ہاں، کسی حد تک یہ بات ٹھیک ہے۔ تاہم میں بہت آگے بڑھ چکی ہوں۔ پُراسرار ایبولا افیئر نے مجھے پاگل کردیا ہے۔ یہ میرے اعصاب پر سوار ہے۔''

''او کے، جو تمہیں ٹھیک لگے۔ وہاں جانے سے پہلے مجھ سے ملتیں تو اچھا ہوتا۔''

''میں کوشش کروں گی۔ تمہارا ایک بار پھر شکریہ۔''

چند ساعت سکوت رہا۔ اس دوران مریسا نے ہمت کر کے سوال کر ہی ڈالا۔

''رالف؟''

''ہاں، کہو۔''

''کیا تم کانگریس مین مارکھم کو جانتے ہو؟''

دوسری جانب معاً چند سیکنڈ کے لیے خاموشی رہی۔

''میں جانتا ہوں۔''

''رالف، تم اس کے سیاسی معاملات میں مالی امداد کرتے رہے ہو؟''

''کتنا عجیب اور غیر متعلقہ سوال کررہی ہو؟''

''پلیز بتاؤ۔ تم نے بھی ایسا کیا ہے؟''

''ہاں۔ میں یہ کام کرتا رہا ہوں۔ طبی معاملات میں اس کی گہری دلچسپی کے باعث میں مارکھم کو پسند کرتا ہوں۔''

''تھینک یو، رالف۔ میں پہنچتی ہوں۔'' مریسا نے بے خیالی میں فون بند کردیا۔

☆☆☆

مریسا نے ائرپورٹ سے کہیں اور جانے کے بجائے، ٹیڈ کی رہائش گاہ کا رخ کیا۔

ٹیڈ نے حیرت آمیز مسرت کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔

''تم یہاں؟''

''اس گھر کے مالک کو دیکھنا تھا۔ اندر بلاؤ گے یا یہیں کھڑی رہوں؟''

''سوری۔'' ٹیڈ نے خجالت سے مسکرا کر قدم پیچھے ہٹایا۔ ''میں نے کتنی بار تمہیں فون کیا۔ تم کہاں چلی گئی تھیں؟''

''باہر۔'' مریسا نے مبہم جواب دیا۔

''میں نے سنا تھا کہ تمہارا ٹرانسفر کردیا گیا ہے... پھر افواہ اڑی کہ تم چھٹی پر ہو۔ آخر معاملہ کیا ہے؟''

''کاش مجھے پتا ہوتا کہ معاملہ کیا ہے۔'' مریسا

صوفے پر ڈھیر ہوگئی۔ ٹیڈ کی پالتو بلی اچھل کر مریسا کی گود میں آگئی۔

"پنسلوینیا میں ایبولا نے حملہ کیا ہے؟" مریسا نے رسان سے پوچھا۔

"ہاں، ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔"

"تمہارے پاس کوئی آئیڈیا ہے کہ میرا ٹرانسفر کیوں کیا گیا؟"

"شاید نورس نے درخواست کی ہو۔" ٹیڈ نے خیال ظاہر کیا۔

"غلط، کانگریس مین مارکھم نے ڈاکٹر موریسن کو براہِ راست فون کیا تھا جو کمیٹی سی۔ ڈی۔ سی کے بجٹ کے بارے میں فیصلہ کرتی ہے۔ مارکھم اس کا اہم رکن ہے۔ لہٰذا موریسن نے اس کی ہدایت یا حکم پر عمل کرنا ہی تھا... لیکن کتنی عجیب اور غیر معمولی بات ہے۔ میں محض ایک EIS آفیسر ہوں۔"

ٹیڈ متعجب دکھائی دیا۔ وہ کچھ نروس بھی ہوگیا تھا۔

"یہ سب میرے لیے پریشان کن ہے۔ تم میری اچھی دوست ہو۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مصیبتیں تمہارے اردگرد بڑھتی جارہی ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں کوئی نقصان ہو۔ نہ میں ملوث ہونا چاہتا ہوں۔" ٹیڈ نے احتیاط سے الفاظ کا انتخاب کیا۔

"میں تمہیں ملوث نہیں کرنا چاہتی۔ بس تھوڑا سا تعاون درکار ہے اسی لیے میں غلط وقت پر یہاں آئی ہوں۔"

ٹیڈ مزید نروس ہوگیا۔ "پلیز مجھے مزید کوئی اصول، کوئی ضابطہ توڑنے کے لیے نہ کہنا۔"

"MCL میں صرف چند منٹ گزاروں گی۔"

"نہیں، اب یہ بہت رسکی معاملہ بن گیا ہے۔"

"نورس اٹلانٹا میں نہیں ہے۔ اس وقت کوئی اور بھی موجود نہیں ہوگا۔" مریسا نے ٹیڈ کو آمادہ کرنے کی کوشش جاری رکھی۔

ٹیڈ نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ مریسا کو ادراک ہوا کہ اس بار ٹیڈ ساتھ نہیں دے گا۔ مریسا نے اصرار ترک کردیا۔

"او کے ٹیڈ۔ میں تمہاری پوزیشن سمجھ سکتی ہوں۔"

"واقعی؟" ٹیڈ نے حیرت کا اظہار کیا۔ اتنی جلدی وہ اپنا ارادہ ترک کردے گی۔ بہرحال ٹیڈ نے سکون کا سانس لیا۔

"ہاں، واقعی۔" وہ خوش دلی سے مسکرائی۔ "چھوڑو اس موضوع کو۔ اگر کچھ پلا دو تو کوئی اصول شکنی نہیں ہوگی۔"

"کیوں نہیں۔" ٹیڈ کھڑا ہوگیا۔ "کیا پسند کرو گی؟ بیئر، وہائٹ وائن یا کچھ اور؟"

"بیئر ٹھیک ہے۔"

ٹیڈ کچن میں غائب ہوگیا۔ ریفریجریٹر کھلنے کی آواز آئی۔ مریسا فوراً اٹھی اور پنجوں کے بل چلتی ہوئی دروازے کے قریب شیلف تک پہنچی۔ وہاں دو عدد پاس رکھے تھے۔ مریسا نے پھرتی سے ایک اٹھا کر اپنی جیکٹ کی جیب میں منتقل کیا۔ ٹیڈ کی واپسی سے قبل وہ صوفے پر براجمان ہوچکی تھی۔

ٹیڈ بیئر کے ساتھ آلو کے چپس بھی لایا تھا۔

مریسا نے ٹیڈ کی تسکین کے لیے اس کی تازہ ریسرچ کے بارے میں گفتگو چھیڑ دی۔ تاہم خود اس کے خیالات کہیں اور بھٹک رہے تھے۔

مریسا نے وقفے وقفے سے جمائیاں لینی شروع کردیں۔

"تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔" ٹیڈ نے کہا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مجھے جا کر سونا چاہیے۔ تمہاری باتیں دلچسپ اور متاثر کن ہیں، کل سنوں گی۔" وہ کھڑی ہوگئی۔ ہاتھ ملا کر مریسا نے دروازے کا رخ کیا۔ دل میں اسے افسوس تھا کہ وہ ٹیڈ کو دھوکا دے رہی ہے۔ دوسری جانب ٹیڈ کو ملال تھا کہ وہ مریسا کی فرمائش پوری نہ کرسکا۔ وہ گلاس ہاتھ میں لیے اسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ دروازہ بند کرنے سے پہلے مریسا نے پلٹ کر ہاتھ ہلایا پھر دروازہ بند ہوگیا۔

ٹیڈ وہیں کھڑا بند دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ مریسا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بیئر ختم کرنے کے لیے اس نے گلاس اوپر کیا، نگاہ دروازے سے پھسل کر شیلف پر پڑی۔ نظر شیلف پر تھی۔ خیال کہیں اور۔ دفعتاً اسے احساس ہوا کہ شیلف پر ایک کارڈ موجود نہیں ہے۔

ٹیڈ نے گلاس ٹیبل پر رکھا۔ پہلے جیبوں کی تلاشی لی پھر آگے بڑھ کر شیلف کو کھنگالا۔ ایکسٹرا پاس غائب تھا۔ ٹیڈ نے کمرے کی تلاشی لینا شروع کی پھر اچانک ٹھٹک گیا۔ "اوہ نو۔" وہ بڑبڑایا۔ اسے خیال آیا کہ مریسا کیوں اتنی آسانی سے MCL کے دورے سے دستبردار ہوگئی تھی۔

وہ دروازے کی طرف لپکا۔ بیرونی دروازہ کھول کر وہ باہر آگیا۔ دیر ہوگئی تھی۔ سڑک دور دور تک سنسان تھی۔ وہ واپس اندر بھاگا۔ گھڑی دیکھی اور فون اٹھا کر نمبر ملانے لگا۔

مریسا کے بڑھتے قدموں کو روکنے کی کوشش کامیاب ہوتی ہے یا نہیں... حیرت انگیز واقعات پر مشتمل ناول کا دوسرا حصہ آئندہ ماہ پڑھیے
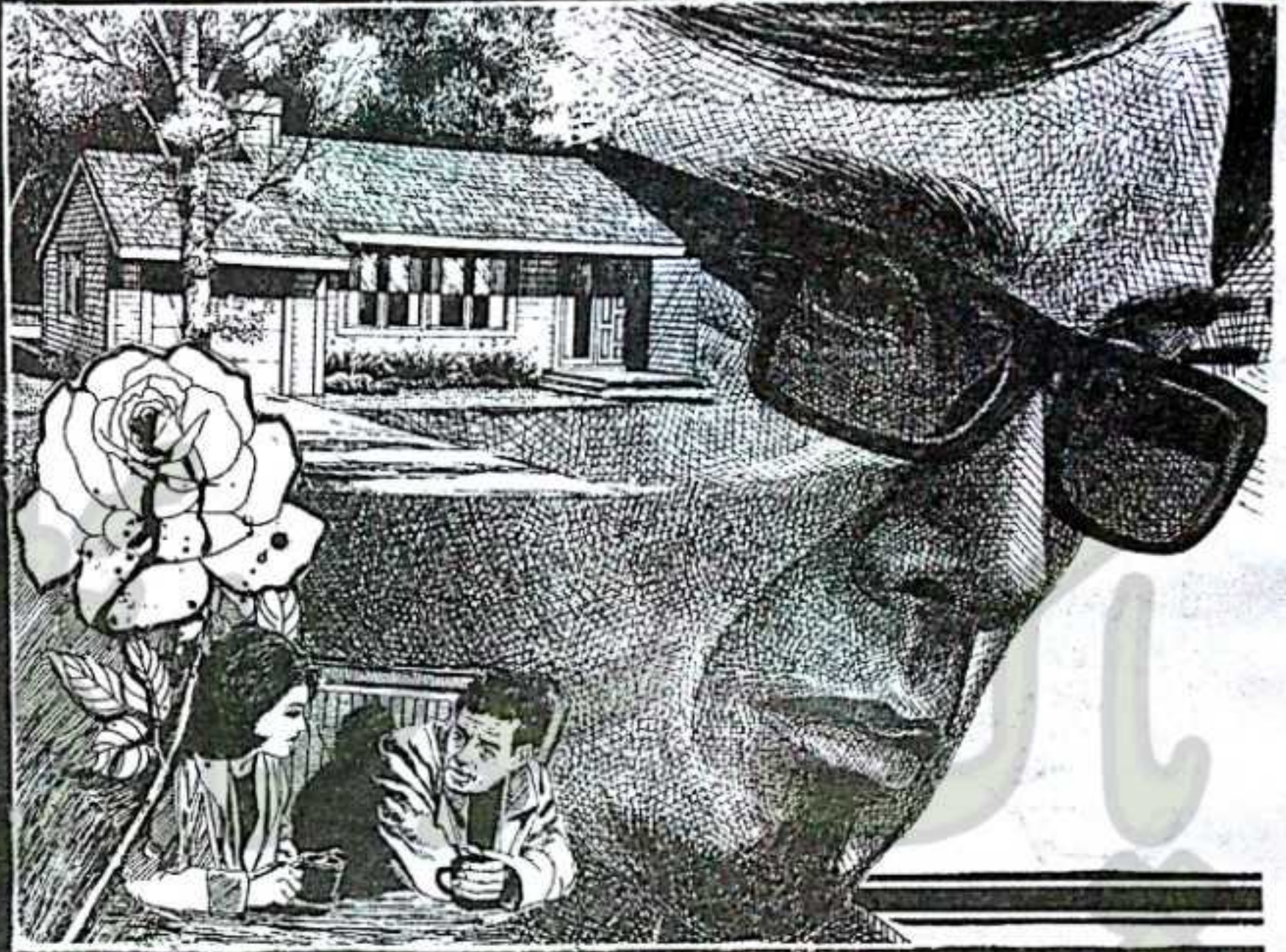
سالگرہ

ماہ نور

جنم دن ہر شخص کے لیے خاص اور یادگار دن کی حیثیت رکھتا ہے... اور ہر شخص کی کوشش ہوتی ہے... کہ اسے پہلے سے زیادہ یادگار اور منفرد بنائے... ایسی ہی ایک آنے والی سالگرہ جس میں چند روز باقی تھے... اس دن قسمت از خود پلٹنے والی تھی... مگر وہ قسمت اپنے ہاتھ میں لینے کی غلطی کر بیٹھی...

ساس سے عقیدت و الفت رکھنے والی بہو کا کارنامہ...

پاؤلا تھارپ معتدل رفتار سے کافی کے تین کپ ختم کر چکی تھی۔ ناشتے کی میز پر اس کے ساتھ دو افراد اور تھے۔ ایک اس کا آٹھ ماہ پرانا خاوند، ہاورڈ تھارپ اور دوسری شخصیت ساس کی تھی۔ یعنی ہاورڈ کی ماں۔ ہاورڈ دھیمے لہجے میں، آرٹ کے حوالے سے قدیم خزانوں اور دفینوں کے بارے میں اظہارِ معلومات میں مگن تھا۔

پاؤلا کی ساس، مادر تھارپ، غیر معمولی تن و توش کی مالک تھی۔ اسے دیکھ کر، پاؤلا کے ذہن میں چربی کی چھوٹی سی پہاڑی کا تصور اُبھر آتا۔ یہ چھوٹی پہاڑی ایک وھیل چیئر میں پھنسی ہوئی تھی۔ مادر تھارپ حسبِ معمول اپنے پسندیدہ مشغلے، یعنی غذا کے تعاقب میں کھوئی ہوئی تھی۔

پاؤلا کے اپنے خیالات کہیں اور بھٹک رہے تھے۔ اس نے تیسری پیالی ختم کر کے طشتری میں پٹخنے کے انداز میں رکھی۔ چھناکے کی آواز سن کر مادر تھارپ نے بھڑکے ہوئے خرگوش کے مانند سر اٹھایا۔ پھر سینڈوچ کے آخری ٹکڑے کو دہن کے حوالے کر کے، سوئٹ ڈش کو تکنا شروع کر دیا۔

ہاورڈ نے محض نشست میں پہلو بدلا اور بولا۔ ''اوہ ڈیئر، ناشتا شاندار ہے۔''

پاؤلا نے گہری سانس لے کر برتن سمیٹے اور کچن کا رخ کیا۔ ذہن ماضی قریب کی جانب چل پڑا۔ اس کو فن اور فنکاروں سے لگاؤ تھا... وہ ہمیشہ آرٹ کی محفلوں میں مسرت اور آرام محسوس کرتی تھی۔ وہ خود کسی نمایاں تخلیقی جوہر سے عاری تھی۔ تاہم ایسی محفلیں اس کے آرٹ کی جانب جھکے ہوئے ذوق کے لیے نہایت پُرکشش ثابت ہوتیں...

ایسی ہی ایک محفل میں، اس کی ملاقات ہاورڈ تھارپ سے ہوگئی۔ وہ ایک خاموش طبع اور پُرکشش مرد تھا... پہلی ملاقات میں ہی پاؤلا کا دل دھڑک اٹھا۔ اور جب اسے علم ہوا کہ ہاورڈ کا تعلق براہِ راست آرٹ کی دنیا سے ہے تو اس آگہی نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ وہ ہاورڈ کی جانب کھنچتی چلی گئی۔

ہاورڈ، نیو انگلینڈ کالج میں آرٹ کا استاد تھا۔ وہاں، ہاورڈ اسسٹنٹ پروفیسر تھا۔ نیویارک میں وہ اپنی ایک کتاب کی اشاعت کے لیے پبلشرز سے ملاقاتیں کررہا تھا۔

پاؤلا کو رومان کے علاوہ ایک اچھا مستقبل نظر آرہا تھا۔ پاؤلا نے رومانی ملاقاتوں پر جلد ہی فل اسٹاپ لگا کر خاموشی اور سادگی سے نیویارک میں ہاورڈ سے شادی رچالی۔ چند روز بعد وہ ہاورڈ کے ساتھ ورمونٹ میں اس کے گھر منتقل ہوگئی۔ ہاورڈ کی تنخواہ ہنی مون منانے کے لیے ناکافی تھی۔ پاؤلا نے بھی اس جانب خاص توجہ نہیں دی۔

پاؤلا خوش اور پُرجوش تھی۔ اس کی ساس، ہاورڈ کے نزدیک نہایت اہمیت رکھتی تھی۔ چنانچہ پاؤلا بھی ہاورڈ کی ماں کا خیال رکھنے لگی۔

ہاورڈ اپنی ماں کی آنے والی سالگرہ کے لیے انہماک کے ساتھ منصوبہ بندی میں لگا ہوا تھا۔ اس موقع کو یادگار بنانے کے لیے پاؤلا بھی ہاورڈ کا خوب ساتھ دے رہی تھی۔

☆☆☆

پاؤلا ہر روز پابندی سے اپنی صحت مند ساس کی وہیل چیئر کو باہر اس کی پسندیدہ جگہ پر لے جاتی۔ یہ جگہ ایک ترچھی پہاڑی نما بلند مقام تھا۔ صبح ہی صبح، وہاں سے سامنے کا وسیع منظر بڑا دلکش اور کیف پرور نظر آتا تھا۔ پاؤلا بھی وہاں لطف محسوس کرتی تھی۔

مادر تھارپ، ناشتے کے بعد بھی وہاں پہنچ کر کچھ نہ کچھ منہ میں ڈالتی رہتی۔ وقفے وقفے سے وہ کچھ نہ کچھ بولتی جاتی۔ تاہم ہر بار محترم ساس کی بے ربط بول چال کا اختتام معذرت خواہانہ انداز میں ہوتا۔ ساتھ ہی وہ اظہارِ ہمدردی کرتی کہ وہ اپنے چہیتے بیٹے ہاورڈ اور اس کی پیاری خدمت گزار بیوی کے لیے کچھ کر نہیں پارہی...

مادر تھارپ کے لہجے میں تاسف در آتا۔ وہ اپنے مرحوم شوہر کی تعریف کرتی۔ سسر جی، خاصے مالدار تھے اور خاصی دولت چھوڑ گئے تھے۔ مادر تھارپ مبہم انداز میں کسی پیچیدہ فنڈ کے بارے میں بتاتی۔ پاؤلا نے اندازہ لگایا کہ سسر جی کی دولت کسی ٹرسٹ نما فنڈ میں پڑی ہے۔ وہ اس فنڈ کی نوعیت سمجھنے سے قاصر تھی۔ نہ مادر تھارپ کھل کر کچھ بیان کر پاتی تھی لیکن آخری جملہ عموماً یکساں نوعیت کا اور حوصلہ افزا ہوتا۔

وہ پاؤلا کے بازو پر اپنا بھاری ہاتھ رکھ کر تسلی آمیز انداز میں بولتی۔ ''ڈیئر، تم فکر مت کرنا۔ ایک دن یہ ساری دولت تم دونوں کے پاس ہوگی اور وہ دن جلد آئے گا۔ میں تم دونوں کو ایک پُرآسائش زندگی دینا چاہتی ہوں۔ تم بہت پیاری بچی ہو۔''

پاؤلا مسکرا کر رہ جاتی۔ اٹھ کر وہیل چیئر کا رخ موڑتی اور واپسی کا سفر شروع ہوجاتا۔

دن گزرتے رہے... ہفتوں میں بدل کر مہینوں میں ڈھل گئے۔ وہ دن نہیں آیا جس کا مادر تھارپ اکثر پاؤلا سے ذکر کرتی رہتی۔

پاؤلا کے تصورات اور خیالات بدلنے لگے۔ اس کی امید۔ اس جی کے آخری جملوں سے منسلک ہو کے رہ گئی۔ جن میں وہ پاؤلا کی خدمت کی تعریف کرتی اور آنے والے دنوں میں دولت و آسائش کی نوید سناتی۔

ہاورڈ کی کتاب کسی پبلشر نے قبول نہیں کی تھی۔ پاؤلا سمجھ گئی تھی کہ وہ کتاب اگر کوئی چھاپ بھی دیتا تو یہ خوش گمانی فضول تھی کہ کتاب بیسٹ سیلرز میں جگہ بنالے گی۔

ایک چھوٹے سے کالج میں ہاورڈ کی جاب، بطور آرٹ ٹیچر، ایک بند گلی کے مانند تھی۔ مختصر یہ کہ وہ ایک آرٹسٹ نہیں بلکہ اسکول ماسٹر تھا۔ پاؤلا کا ابتدائی پُرشور رومانی بخار آہستہ آہستہ اُترنے لگا۔

☆☆☆

''اوہ ڈیئر، کتنا خوب صورت دن ہے۔'' ہاورڈ، کچن کے دروازے میں نظر آیا۔ ''ماں آج پہاڑی پر خوب لطف اندوز ہوں گی۔ تم لے کر جاؤ گی ان کو؟''

''تم جانتے ہو کہ میں تقریباً ہر روز ان کو لے جاتی ہوں۔'' پاؤلا جواب دیتے دیتے رک گئی... کیا فائدہ یہ بولنے کا، اس نے سوچا، ہاورڈ پھر یہی بات کل دہرائے گا۔ لہٰذا پاؤلا نے بے دلی سے سر ہلایا اور برتن صاف کرنے لگی۔

''موسم دیکھ کر میرا بھی دل چاہ رہا تھا کہ ساتھ

چلوں۔ آہ، لیکن میری ڈیوٹی... خیر کوئی بات نہیں۔ آنے والی چھٹی پر ضرور چلوں گا۔ بائے، ہنی۔"

"بائے۔" پاؤلا نے دھیمے سے جواب دیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ کیسا پھیکا شہر ہے۔"

ایک گھنٹے بعد وہ اپنی "عظیم" ساس کی وھیل چیئر کو پہاڑی کی طرف دھکیل رہی تھی۔ اوپر جانے کے لیے پاؤلا کو خاصی طاقت صرف کرنا پڑتی تھی۔ بلندی پر ساس کی پسندیدہ جگہ پر اس نے وھیل چیئر کو مخصوص جگہ پر مضبوطی سے جمایا، اسے چیئر پر بھروسا نہیں تھا۔ آگے ترچھی ڈھلوان تھی۔ پاؤلا ایک پرانے درخت کے نیچے مختصر دراڑ میں ایک وھیل پھنسا کر اطمینان کرلیتی، پھر خود بھی قریب ایک مسطح پتھر پر بیٹھ جاتی۔

مادر تھارپ، اس روز بھی حسبِ معمول شکم خوری میں مگن تھی۔ سامنے کے نظاروں اور موسم سے لطف اٹھانے کے ساتھ ساتھ حسبِ معمولی وقفوں کے ساتھ وہی گھسی پٹی بڑبڑاہٹ بھی جاری تھی۔

پاؤلا کی توجہ، ساس کی بڑبڑاہٹ اور سنہرے دن کی یقین دہانی پر سے کم ہوتے ہوتے تقریباً معدوم ہو چکی تھی۔ اس نے ماضی میں دولت کو اتنی اہمیت نہیں دی تھی۔ لیکن شادی کے بعد آہستہ آہستہ اس کے خیالات بدلنا شروع ہوئے۔ زندگی کی یکسانیت اور ساس کی بے ربط باتوں نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ زندگی ایک ست ڈگر پر چل رہی تھی۔

رقم ہوتی تو وہ ہاورڈ کے ساتھ پیرس جاتی، پھر روم اور پھر شاید سوئٹزرلینڈ اور بھی جوڑے کہاں کہاں گھوم رہے تھے جبکہ وہ ایک دائرے میں سفر کر رہی تھی۔ دولت کے بغیر اس دائرے کو توڑنے کا کوئی امکان اسے نظر نہیں آرہا تھا۔ سوچتے سوچتے پاؤلا تصوراتی دنیا میں کھوئی پیرس پہنچ گئی۔ معاً کھٹکے کی آواز اسے واپس حقیقی دنیا میں لے آئی۔ وہ چونک اٹھی۔ اس نے بے خیالی میں ٹانگ سیدھی کی تھی جو وھیل چیئر سے ٹکرا گئی تھی۔ پہیا اپنی مخصوص جگہ سے نکلا اور چیئر کچھ آگے جا کر پھر رک گئی۔

پاؤلا منہ پھاڑے، سانس روکے دیکھتی رہ گئی۔ وھیل چیئر خطرناک مقام پر تھی۔ مادر تھارپ پتا نہیں کب نیند کی آغوش میں گئی تھی اور اب بھی خراٹے لے رہی تھی۔ پاؤلا نے دھیرے سے رکی ہوئی سانس خارج کی۔ بال بال بچت ہو گئی، اس نے سوچا۔ ذہن خوف کی گرفت سے آزاد ہونا شروع ہوا۔

پاؤلا نے ابتدا میں ہمیشہ اس خطرناک مقام پر رکنے سے اختلاف کیا تھا۔ تاہم ساس کی پسند کے سامنے بے بس رہی تھی... پرانے درخت کے نیچے وہی جگہ ساس جی کے لیے پسندیدہ ترین تھی۔

مادر تھارپ، اشیائے خوردونوش کے ساتھ جتنا انصاف سے کام لیتی تھی، اسی انصاف کا مظاہرہ وہ نیند کے ساتھ کر رہی تھی۔

آہستہ آہستہ پاؤلا کی دھڑکن اعتدال پر آگئی۔ ساس کی سالگرہ سر پر تھی۔ 64 برس گزر چکے تھے۔ تاہم مادر تھارپ کی صحت اور انداز سے یہ بات عیاں تھی کہ ابھی اس نے دس پندرہ مرتبہ مزید سالگرہ کے دنوں سے لطف لینے کا ارادہ کیا ہوا ہے۔ گویا 70 برس تک یا پھر 75 برس۔

پاؤلا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور چیئر کو واپس جگہ پر لانے کا ارادہ کیا۔ دفعتاً اس کے ذہن میں ایک انجانا اور عجیب خیال بجلی کے مانند چمکا۔ وہ سُن ہو کے رہ گئی۔ تاہم وہ خیال اس کے پورے وجود میں سرایت کر گیا۔

کتنا آسان اور بے داغ عمل تھا۔ اگر وہ محض ذرا سی ٹانگ ارادتاً چلا دے۔ تو پھر... تو پھر آنے والی سالگرہ اور آگے مزید سالگرہ کے دن... سب پر ایک منٹ یا دو منٹ میں فل اسٹاپ لگ جائے گا۔ وہاں سناٹا تھا۔ پاؤلا نے چور نظروں سے اطراف کا جائزہ لیا۔ اس کی دھڑکنوں میں پھر اضطراب پیدا ہوا۔ مضبوط ہوتے ہوئے خیال سے ایک اور خیال پھوٹا... "پھر یہ موقع یا ہمت ملے نہ ملے... اور تیرا کیا قصور ہے؟ وہ تو اتفاق ہی تھا کہ چیئر رک گئی تھی۔ اس اتفاق کو "دی اینڈ" میں بدل دے۔" جیسے کسی بھوت نے پاؤلا کے کان میں سرگوشی کی۔

پاؤلا اٹھے بغیر آگے کھسکی اور اٹکے ہوئے پہیے پر ٹانگ رکھ کر زور لگایا۔ پہیے نے جگہ چھوڑ دی۔ وھیل چیئر دھیرے سے آگے بڑھی۔ چند گز دور گہرائی میں پاتال کے سفر کا آغاز تھا۔

گھومتے پہیے نے سرخ لکیر پار کی اور چیئر نے ڈھلوان پر موت کے سفر کا آغاز کیا۔ مادر تھارپ بے خبر تھی۔ چیئر کی رفتار بڑھتی گئی۔ کرسی میں پھنسا ہوا وزنی جثہ، کرسی کی رفتار کے لیے اضافی کردار ادا کر رہا تھا۔ قبل اس کے کہ مادر تھارپ کو بیدار ہونے کا موقع ملتا اور وہ شور مچاتی یا مدد کے لیے پکارتی، ذرا دیر بعد تھڈ (Thud) کی آواز کے ساتھ کرسی کا سفر منطقی نتیجہ حاصل کر چکا تھا۔ 65 ویں سالگرہ میں چند روز باقی تھے۔

☆☆☆

تقریباً تین گھنٹے بعد بالآخر ہاورڈ اپنی ماں کے کمرے

سے برآمد ہوا۔ پاؤلا باہر ہال میں منتظر تھی۔ اس نے ہاورڈ کے تاثرات سے اندازہ لگالیا کہ خبر کیا ہے۔ یکدم اس کا کئی گھنٹے سے جاری ذہنی تناؤ معدوم ہوگیا۔ تناؤ کی جگہ ہسٹریائی آہ و بکا نے لے لی۔

''اوہ ڈیئر۔'' ہاورڈ نے نیم مردہ آواز میں کہا۔ ''مت کرو ایسا۔ خود کو الزام نہ دو۔ یہ ایک خوفناک حادثہ تھا۔ کیا، کیا جا سکتا ہے... پلیز...''

پاؤلا، ہاورڈ کی بانہوں میں سسکیاں لیتی رہی۔ کئی منٹ بعد سنبھل کر اس نے تاسف زدہ، لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔ ''ان کی سالگرہ بھی... اوہ... نو...''

''اوہ پلیز... ڈیئر خود کو سنبھالو۔'' ہاورڈ نے پاؤلا کو سہارا دیا۔ ''تم ایسا کرو، گھر چلی جاؤ۔''

''نہیں، میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' پاؤلا نے انکار کیا۔

''ڈیئر میں بھی تھوڑی دیر بعد پہنچتا ہوں۔ تم جا کر تھوڑا آرام کرلو۔''

☆☆☆

چند روز بعد، چھٹی کے دن پاؤلا، چھوٹی پہاڑی پر متوفی ساس کی پسندیدہ مقام کے پاس تھی۔ ہاورڈ بھی اس کے ہمراہ تھا۔ دونوں پرانے درخت کے قریب افسردہ بیٹھے تھے۔

''ماں کو ایک بات کا دکھ تھا کہ ہم لوگ ایک پُرآسائش زندگی سے کب تک محروم رہیں گے۔'' ہاورڈ نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''ہاں، مجھے احساس تھا۔ وہ اکثر بات کرتی تھیں۔'' پاؤلا نے ہاورڈ کا ہاتھ تھام لیا۔

''وہ دن گنتی تھیں کہ کب وہ دن آئے گا جب وہ تمہارے مرحوم سسر کی چھوڑی ہوئی رقم ہم دونوں کے حوالے کریں گی۔'' ہاورڈ بولا۔ ''وہ ہر سالگرہ پر پوچھتی تھیں کہ کون سی سالگرہ ہے۔''

پاؤلا نے سر اٹھایا۔ ''تمہاری بات کا کیا مطلب ہے؟''

''ڈیڈ کی وصیت کی بات کررہا ہوں۔'' ہاورڈ نے کہا۔

''ماں نے تمہیں تو بتایا ہوگا۔''

''نہیں، کچھ خاص نہیں۔'' پاؤلا نے بمشکل کہا۔ اس کا حلق خشک ہونے لگا۔

''اوہ، اچھا... میں بتاتا ہوں۔'' ہاورڈ نے سامنے کے مناظر دیکھتے ہوئے پہلو بدلا۔ ''ڈیڈ کے اپنے خیالات تھے۔ وہ بدعنوانیوں سے نفرت کرتے تھے اور محنت کی کمائی پر یقین ان کی زندگی کا نمایاں پہلو تھا۔ انہیں فکر رہتی تھی کہ میں بہ آسانی ملنے والی آسائشوں کے باعث اپنی زندگی خراب کرلوں گا۔ شاید وہ ٹھیک تھے۔ عموماً ایسا ہوتا ہے۔'' ہاورڈ نے وقفہ لیا۔

پاؤلا کی بےکلی بڑھنے لگی۔

''ماں کو کچھ اختلاف تھا، تاہم وہ مجبور تھیں۔ ڈیڈ کی وصیت کے مطابق ورثے کی رقم ایک ٹرسٹ میں محفوظ کردی گئی۔ جہاں سے ماں کو ہر مہینے ایک محدود ادائیگی ملتی رہی۔ ماں 65 پینسٹھ برس تک زندہ رہتیں، تب تک ایسا ہونا تھا۔''

''پینسٹھ برس؟'' پاؤلا کا منہ کھل گیا۔

''ہاں پینسٹھ برس۔'' ہاورڈ کی آواز بے تاثر تھی۔ ''پینسٹھویں سالگرہ میں چند ہی روز باقی تھے۔''

''65 برس کیوں؟'' پاؤلا نے خشک گلے کو لعابِ دہن سے تر کرنے کی ناکام کوشش کی۔ ''اور... اور 65 برس کے بعد؟''

''پتا نہیں، 65 برس کا نکتہ کیوں رکھا گیا تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ ڈیڈ کا خیال تھا کہ اتنے عرصے میں، میں چالیس برس کا ہوچکا ہوں گا اور محنت سے کمانے کی عادت کے باعث مناسب حد تک بالغ نظر ہوجاؤں گا۔''

''مگر ان کو کیسے یقین تھا کہ مادر 65 برس تک حیات ہوں گی۔'' پاؤلا نے گویا سرگوشی کی۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہوچکا تھا۔ ہاورڈ، اس کی جانب متوجہ نہیں تھا ورنہ چونک اٹھتا۔

''ہاں، یقیناً ان کے پاس غیب کا علم نہیں تھا۔'' ہاورڈ نے گہری سانس لی۔ ''اسی لیے انہوں نے دوسری شق رکھی تھی۔ اگر ماں 65 برس تک حیات نہ پائیں تو...'' ہاورڈ رک گئی۔ ادھر پاؤلا کی سانس بھی رک سی گئی۔

''تو ایسی صورت میں ٹرسٹ میں محفوظ سرمایہ ازخود کالج کی نذر کردیا جائے گا۔'' اس نے کھوئی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ڈیڈ کی نظر میں اعلیٰ تعلیم کی ازحد اہمیت تھی۔ وہ خود بھی تعلیم یافتہ افراد سے بہت ادب سے پیش آتے تھے۔'' ہاورڈ نے ایک کنکر اٹھا کر ہوا میں اچھالا اور پاؤلا کی جانب نگاہ کی۔

''اوہ، ڈیئر پاؤلا، کیا بات ہے؟'' اس نے بیوی کا ہاتھ دبایا۔ ''تم شاید میری وجہ سے پریشان ہوگئی ہو۔ ایسا نہیں ہے۔ میں اس چیز کے لیے کیوں فکر کروں گا جو میرے پاس تھی ہی نہیں... میرے پاس ملازمت ہے اور ایک اچھی بیوی ہے۔ چھوٹا سا گھر ہے اور کیا چاہیے... ہاں اب ماں نہیں ہے۔''

پاؤلا کو چکر سا آیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے شوہر کو گھور رہی تھی۔

''ارے، کیا ہوا؟ تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟'' وہ گھبرا کر اٹھا۔ ''پاؤلا، پاؤلا... پاؤلا...''

آتشِ انتقام

باہر نعیم

جنگیں کبھی بھلائی کا سندیسہ نہیں لاتیں... ان کے ہمراہ ہمیشہ تادیر ساتھ رہنے جانے والی یادیں... سانحات اور دکھ المیے آتے ہیں... دوسری جنگِ عظیم میں بھی لاتعداد افراد لقمۂ اجل بنے... اور بے شمار گھرانے دربدر کی ٹھوکریں اپنے مقدر میں لکھوا بیٹھے... اپنے آپ کو خوش نصیب تصور کرنے والے ایک گائوں کے مکینوں کی خوش گمانی... ان کا کہنا تھا کہ دورانِ جنگ ان کے گائوں کا کوئی فرد مارا گیا... اور نہ ہی دفن ہوا...

انتقام کی نہ بجھنے والی چنگاری جو وقت کے ساتھ دہکتے شعلوں میں ڈھل چکی تھی...

سال کے یہ دن اسے بہت پسند تھے۔ وہ اس کے ایک ایک لمحے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ درجۂ حرارت میں معمولی کمی بیشی قابلِ برداشت تھی لیکن یہ درجہ حرارت اسے موزوں لگتا تھا گو کہ ہوا بالکل نہیں چل رہی تھی۔ جنگل بالکل پُرسکون تھا اور کسی قسم کی چہل پہل دکھائی نہیں دے رہی تھی، صرف وہی اپنے کتے کے ساتھ ضرور ادھر سے گزرا تھا اور کتے نے ہی وہ لاش دریافت کی۔

وہ آدمی ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا اور اپنی نظریں لاش پر جما دیں۔ وہ کسی ادھیڑ عمر مرد کی لاش تھی جس کے بال اور مونچھیں سفید ہو رہی تھیں۔ سر کا درمیانی حصہ گنجا تھا۔ وہ چھوٹے قد کا آدمی تھا اور شاید اس کا قد پانچ فٹ سے بھی کم ہوگا۔ اس نے معمولی سا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ شاہ بلوط کے درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ رانوں پر رکھے ہوئے تھے اور سر آگے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ اس کے باوجود وہ ایک ایسے شخص کی طرح نظر آرہا تھا جو یوگا میں مصروف ہو۔ اس آدمی نے اپنے کتے کو پچکارا اور اسے مردہ
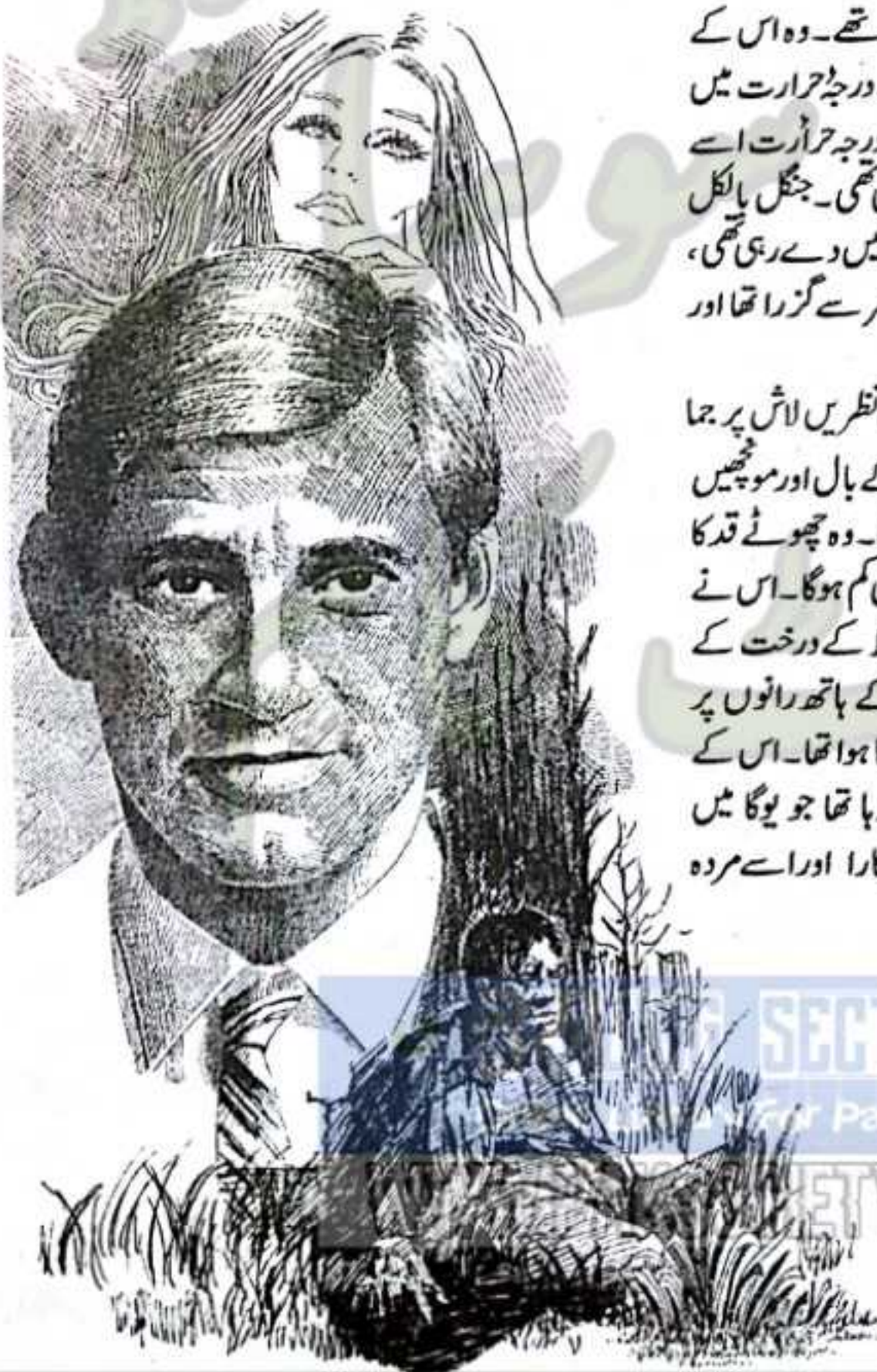
شخص سے دور جنگل سے باہر لے گیا۔ وہ چلتا ہوا اپنی کار تک پہنچا اور کتے کو پسنجر سیٹ پر بٹھانے کے بعد تھوڑے فاصلے پر واقع ٹیلی فون باکس کی طرف چل دیا۔ اس نے دروازہ کھولا اور تین مرتبہ 9 کا ہندسہ ڈائل کر دیا۔

جارج ہنری اپنی میز پر بیٹھا اس رپورٹ کا مطالعہ کر رہا تھا جو شہر میں ہونے والی حالیہ چوریوں سے متعلق تھی۔ پڑھتے پڑھتے اس کی آنکھیں دکھنے لگیں۔ اس نے نظر اٹھا کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی اور سڑک پر خاصی چہل پہل تھی۔ گو کہ سیزن ختم ہو رہا تھا، اس کے باوجود کافی تعداد میں سیاحوں کی ٹولیاں گشت کر رہی تھیں جو اپنے کاندھوں پر کیمرے لٹکائے بے مقصد ہی اِدھر اُدھر پھر رہے تھے البتہ ان کی وجہ سے ان لوگوں کو راستہ چلنے میں دشواری پیش آرہی تھی جو اس شہر کے مستقل باشندے تھے اور ادھر ادھر دیکھنے کے بجائے اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھے وہ دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے لپک کر فون اٹھایا اور بولا۔

”سراغ رساں چیف انسپکٹر جارج ہنری۔“

”میں پولیس کنٹرول سے بول رہا ہوں۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”پولیس سرجن اور سی آئی ڈی کو ہولی برج بنجر ریزرو پر پہنچنا ہے۔ ہمیں دس منٹ پہلے اطلاع موصول ہوئی تھی۔ پولیس پارٹی وہاں بھیج دی گئی ہے اور کانسٹیبل نے ابھی ابھی فون کر کے تصدیق کر دی ہے کہ مرنے والا طبعی موت نہیں مرا بلکہ اس بارے میں شبہات پائے جاتے ہیں۔“

”لاش کے بارے میں کیا معلوم ہوا؟“ ہنری نے پوچھا۔

”وہ ایک درمیانی عمر کے مرد کی لاش ہے۔“

”کیا تم جانتے ہو کہ اس کی موت پر شبہ کیوں ظاہر کیا جا رہا ہے؟“

”انہوں نے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا جناب۔“

”کوئی بات نہیں۔“ ہنری نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ اس نے سوچا کہ لنچ کی تو چھٹی ہو گئی، پتا نہیں وہاں کتنی دیر لگ جائے۔ اس نے کنٹرول روم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”انہیں بتا دو کہ میں پہنچ رہا ہوں۔ کیا تم نے پولیس سرجن کو اطلاع دی؟“

”جی جناب، آپ کو فون کرنے سے پہلے میں انہیں اطلاع دے چکا تھا۔“

”بہت خوب۔“ ہنری نے یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

اس نے کوٹ پہنا اور سر پر ہیٹ رکھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ راہداری عبور کر کے اس نے ایک دروازے پر مخصوص انداز میں دستک دی۔ سارجنٹ اسمتھ نے دروازہ کھولا تو وہ بولا۔ ”تمہاری مہارت آزمانے کا وقت آ گیا ہے سارجنٹ۔ ایک لاش تمہارا انتظار کر رہی ہے جس کے بارے میں شبہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ یہ طبعی موت نہیں ہے۔“

”واقعی۔“ سارجنٹ اسمتھ پُرجوش لہجے میں بولا۔ ”میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ کچھ عرصے سے خاموشی چھائی ہوئی ہے، کوئی کام نہ ہو تو بوریت ہونے لگتی ہے۔“

”کسی کے سامنے یہ بات مت کہنا۔ میں ابھی چوریوں کے بارے میں رپورٹ پڑھ کر آ رہا ہوں۔“

”اوہ ہاں۔“ اسمتھ اس کے پیچھے چلتے ہوئے بولا۔ ”واقعی، میں تو انہیں بھول ہی گیا تھا۔“

یہ کہہ کر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور کار کی چابیاں نکال لیں۔ وہ ہنری کی زندگی میں ہونے والے المیہ اور کاروں سے اس کی ناپسندیدگی سے خوب واقف تھا۔ وہ پولیس اسٹیشن کے عقبی دروازے سے باہر نکلے اور اس جانب روانہ ہو گئے جہاں اسمتھ کی کار کھڑی تھی۔ اسمتھ نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور ہنری اس کے برابر والی نشست پر بیٹھ گیا۔

پورے راستے وہ دونوں خاموش رہے۔ اسمتھ نے گاڑی سڑک سے اتاری اور کار پارکنگ میں لے گیا جہاں اس نے پولیس کار کے علاوہ ایک سیاہ وین بھی دیکھی جس پر سنہرے حروف میں ایچ ایم کورونر لکھا ہوا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر ایک تیسری کار بھی نظر آئی جبکہ چوتھی کار بالکل الگ تھلگ کھڑی تھی ...... اس میں ایک شخص اپنے کتے کے ہمراہ موجود تھا۔ ہنری اور اسمتھ نے پہلی نظر میں ہی بھانپ لیا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے سب سے پہلے لاش دیکھ کر پولیس کو اطلاع دی تھی۔ اسمتھ نے پولیس کار کے ساتھ ہی اپنی گاڑی کھڑی کی اور وہ دونوں کار سے اتر کر جنگل کے داخلی راستے کی جانب روانہ ہو گئے جہاں ایک کانسٹیبل پہرا دے رہا تھا۔

”گڈ مارننگ سر!“ کانسٹیبل نے انہیں دیکھ کر تعظیماً کہا۔ ”اس جانب۔“ پھر وہ مڑا اور جنگل کی جانب چل دیا۔ وہ دونوں بھی اس کے پیچھے ہو لیے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور فضا میں ایک پُرسکون خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ سحر آگیں ماحول سے لطف اندوز ہوتے ہوئے آگے بڑھے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر انہیں بھی لاش نظر آ گئی جس کے

گرد سفید اور نیلا ٹیپ لگا دیا گیا تھا۔ اس حصار کے باہر ڈاکٹر، مَن اور ایک دوسرا کانسٹیبل کھڑا ہوا تھا۔

"کیا یہ مر چکا ہے؟" ہنری نے پولیس سرجن سے پوچھا۔

ڈاکٹر نے اسے حیران ہوتے ہوئے دیکھا۔ شاید اسے ہنری سے اس فضول سوال کی توقع نہیں تھی۔

"ہاں۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "میں یہاں گیارہ بج کر پینتالیس منٹ پر پہنچا تھا اور گیارہ بج کر سینتالیس منٹ پر اس کی موت کا اعلان کر دیا۔"

اسمتھ نے اپنی نوٹ بک نکالی اور لکھنا شروع کر دیا۔

"کیا تمہیں شک ہے کہ یہ فطری موت نہیں ہے؟ کیا تم بھی یہ سمجھتے ہو کہ اسے قتل کیا گیا ہے؟"

"ہاں، بہت زیادہ۔ اس کا پورا جسم کمان کی طرح اکڑا ہوا ہے لیکن گھٹنے نرم ہیں۔"

ہنری نے سوالیہ نگاہوں سے پولیس سرجن کی جانب دیکھا جیسے وہ اس کی بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"اس کا مطلب ہے۔" ڈاکٹر نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "جسم کو پوری طرح اکڑنے میں چوبیس گھنٹے لگتے ہیں جبکہ گھٹنے نرم ہونے کا مطلب ہے کہ اس کی ٹانگوں کو موڑا گیا ہے تاکہ وہ اس پوزیشن میں بیٹھ سکے۔ یہ اکڑاہٹ دوبارہ قائم نہیں ہوئی۔ اس لیے مجھے یہ معاملہ مشکوک بلکہ بہت ہی مشکوک لگ رہا ہے۔"

"اوہ اب میں سمجھا۔" ہنری نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اسمتھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "کیا تم فارنسک پیتھالوجسٹ کو یہاں بلا سکتے ہو پھر اس نے کانسٹیبل سے پوچھا۔ "لاش کس نے دیکھی تھی؟"

"وہ جو کار میں بیٹھا ہوا ہے۔ وہ اپنے کتے کو ٹہلانے لایا تھا تبھی اس کی نظر اس لاش پر گئی۔"

"شکریہ۔" پھر وہ اسمتھ کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ "تم یہیں ٹھہرو، میں اس شخص سے بات کرتا ہوں۔"

"اگر تمہیں میری ضرورت نہیں تو میں چلتا ہوں۔" ڈاکٹر اپنے کوٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے اور بھی بہت سے کام ہیں۔"

کار میں بیٹھے ہوئے شخص نے ہنری کو اپنی جانب آتے ہوئے دیکھا تو وہ گاڑی سے باہر آ گیا جبکہ اس کا کتا خاموش لیکن چوکس بنا کار میں ہی بیٹھا رہا۔ ہنری کو کتوں کی یہی بات پسند تھی کہ وہ چوکس رہتے ہیں اور کسی بھی غیر معمولی صورتِ حال میں بھونک کر خطرے کا احساس دلاتے ہیں۔ ہنری نے اس شخص سے پوچھا کہ اس نے لاش کیسے دریافت کی۔

"جب میں نے اس شخص کو درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھے دیکھا تو یہی سمجھا کہ وہ مراقبے کی حالت میں ہے۔ اس وقت موسم تھوڑا سا سرد تھا جبکہ یہی لوگ ستمبر میں نہیں بلکہ گرمی کے موسم میں جنگل کا رخ کیا کرتے ہیں۔"

"کیا تم اپنے کتے کو ٹہلانے کے لیے اکثر یہاں آتے ہو؟"

"ہاں تقریباً روزانہ، جب سے میں بے روزگار ہوا ہوں۔ بعض اوقات مجھے کسی جگہ انٹرویو کے لیے جانا ہوتا ہے تو پھر میں اتنی دور نہیں آتا بلکہ قریبی سڑکوں پر ہی ٹہل کر یہ کتا اپنا شوق پورا کر لیتا ہے یا اگر بارش ہو رہی ہو تو ہم گھر سے باہر نہیں نکلتے۔"

"کیا تم گزشتہ روز بھی یہاں آئے تھے؟"

"ہاں اور پرسوں بلکہ بدھ کو بھی۔ البتہ منگل کو مجھے ایک انٹرویو کے لیے جانا تھا۔ پیر کو بھی ہم یہاں آئے تھے لیکن ویک اینڈ پر میں اس کتے کے ساتھ اپنے دوستوں سے ملنے ناتھمبر لینڈ چلا گیا تھا۔"

"کیا تم نے گزشتہ روز مرنے والے شخص کو یہاں دیکھا تھا؟" ہنری نے پوچھا۔

"نہیں، دراصل یہ لاش میرے کتے نے دیکھی تھی جو بو سونگھتا ہوا درختوں کے درمیان چلا گیا۔ میں ہمیشہ سڑک پر رہتا ہوں اور مختصر واک کرتا ہوں جسے بلیو واک کہا جاتا ہے۔ بس زیادہ سے زیادہ ایک میل اور اگر کسی دن اپنے اندر توانائی محسوس کروں تو درمیانی یعنی گرین واک بھی کر لیتا ہوں۔ البتہ چھ میل طویل واک کبھی نہیں کی۔"

"تم تو اچھے خاصے صحت مند نظر آ رہے ہو؟" ہنری نے اس شخص کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا جس کے چہرے سے ہی اچھی صحت کی علامت ظاہر ہو رہی تھی۔

"میرے دونوں پیر مصنوعی ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "ایک حادثہ ہو گیا تھا، خوش قسمت ہوں کہ زندہ بچ گیا۔"

"کیا ہوا تھا؟" ہنری اپنے آپ کو سوال کرنے سے باز نہ رکھ سکا۔

"ریلوے لائن پر مرغیوں سے کھیل رہا تھا۔ اس وقت میری عمر صرف دس سال تھی۔"

"واقعی پھر تو تم خوش قسمت ہو۔ گویا تمہارا کہنا ہے کہ کتے نے یہ لاش دریافت کی؟"

''ہاں، وہ جنگل میں چلا گیا۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ پھر اس نے اچانک بھونکنا شروع کر دیا تو میں سمجھ گیا کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔''

''ہاں، میرے پاس بھی ایک کتا ہے۔ تمہارے کتے سے تھوڑا مختلف۔ ویسے تو سارے کتے ایک جیسے ہوتے ہیں۔''

''ہاں، اس نے بھونکنا شروع کیا پھر خاموش ہو گیا۔ ایک طویل وقفے کے بعد وہ دوبارہ بھونکا جس میں کوئی خطرے والی بات نہیں بلکہ ایک تجسس تھا۔ لہٰذا میں پگڈنڈی سے اتر کر درختوں کی جانب چل دیا تاکہ کتے کے بھونکنے کی وجہ جان سکوں۔ پھر میں نے وہ لاش دیکھی اور پولیس کو فون کر دیا۔ مجھے یہیں انتظار کرنے کے لیے کہا گیا پھر پولیس کانسٹیبل آیا تو میں نے اسے وہ جگہ دکھا دی جہاں لاش دیکھی تھی۔ اس نے مجھ سے کچھ سوالات کیے اور تمہارا انتظار کرنے کے لیے کہا۔''

''میں سراغ رساں ہنری ہوں اور تمہارا نام؟''

''ایڈورڈ گلیسی۔ عمر بیالیس سال۔ میں ایک سند یافتہ اکاؤنٹنٹ ہوں۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ مجھے سند یافتہ پاگل ہونا چاہیے تھا۔ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کو تو روزگار کی فکر نہیں ہونی چاہیے لیکن ہم اسی وقت مصروف ہوتے ہیں جب کمپنیوں کے پاس کام کا رش ہوتا ہے ورنہ سند یافتہ ہونے کے باوجود ہمیں کوئی نہیں پوچھتا اور ہماری روٹی معاشی صورتِ حال کے مطابق چلتی ہے۔ میں اپنے بارے میں ساری تفصیل کانسٹیبل کو بتا چکا ہوں۔''

''تم نے اس لاش کے علاوہ تو کوئی مشتبہ یا غیر معمولی بات نہیں دیکھی؟'' ہنری نے پوچھا۔

''میں تمہارا مطلب سمجھ گیا اور میرا جواب نفی میں ہے۔ میں نے آج گزشتہ روز بلکہ پورے ہفتے ایسا کچھ نہیں دیکھا اور نہ ہی مجھے کوئی مشتبہ شخص نظر آیا۔''

''تمہارا بہت بہت شکریہ مسٹر گلیسی۔ ہمارے پاس تمہارا پتا موجود ہے اگر ضرورت ہوئی تو تم سے دوبارہ رابطہ کیا جائے گا۔''

یہ کہہ کر وہ واپس جانے کے لیے مڑا۔ گلیسی بھی اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ جب ہنری جنگل کی طرف جا رہا تھا تو اس نے ایک گاڑی کو کار پارکنگ کی طرف آتے دیکھا جو پولیس کار کے پاس آکر رک گئی۔ گاڑی سے ایک دبلی پتلی عورت برآمد ہوئی جس کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کے بال پیچھے کی جانب بندھے ہوئے تھے اور اس نے ہرے رنگ کا اوور آل پہن رکھا تھا، ہاتھ میں چمڑے کا بیگ تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم بڑھاتی پُراعتماد انداز میں ہنری کی طرف بڑھی۔

''گڈ مارننگ ڈاکٹر مارتھا۔'' ہنری نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''گڈ آفٹر نون۔'' مارتھا نے سنجیدگی سے کہا۔ ''لاش کہاں ہے؟''

''اس طرف۔'' ہنری نے اشارہ کیا اور اس راستے پر چل پڑا جو جنگل کی طرف جاتا تھا۔

''مجھے سال کا یہ موسم بہت اچھا لگتا ہے۔'' ڈاکٹر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''بہت ہی خوب صورت موسم ہے، ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی ہے اور پتے ابھی تک سبز ہیں لیکن عنقریب گرنا شروع ہو جائیں گے۔''

وہ لاش کے قریب پہنچ کر رک گئی اور اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اسے اس حالت میں بٹھایا گیا ہے اور اس حال میں چھوڑا گیا ہے کہ پہلی بار دیکھنے پر حیرت دوچند ہو جائے۔''

''ڈاکٹر من کا بھی یہی مشاہدہ تھا۔'' ہنری نے کہا۔ ''اس کا کہنا تھا کہ ٹانگ کو گھٹنے کے پاس سے موڑنے کے بعد اس جگہ کی اکڑاہٹ ختم ہو گئی۔''

''اس نے یہ کہا تھا؟''

''ہاں۔'' ہنری نے کہا اور مڑ کر اس سے نظریں ملانے کی کوشش کی لیکن ڈاکٹر مارتھا کی توجہ لاش پر تھی۔ وہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''بوسیدہ لباس، پھٹے ہوئے جوتے، بڑھی ہوئی مونچھیں اور شیو، اس شخص کے حلیے سے لگتا ہے کہ یہ تنہا زندگی گزار رہا تھا اور اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ نہ بیوی، نہ بچے اور نہ ہی کوئی خادمہ۔ شاید یہ دنیا میں اکیلا تھا۔ خیر، ہمیں اپنا کام شروع کرنا چاہیے۔'' یہ کہہ کر وہ لاش پر جھکی اور اپنا میڈیکل بیگ کھول لیا۔

اسمتھ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ہنری کے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سیل فون کا کور تھا جس میں ایک پرانا بٹوا رکھا تھا۔ اسمتھ بولا۔ ''یہ مجھے مرنے والے کی جیکٹ سے ملا ہے۔ جب تم اس آدمی سے بات کر رہے تھے جس نے سب سے پہلے لاش دیکھی تو میں نے اس کی تلاشی لی تھی۔ اس کے علاوہ ایک اور بھی ہے۔'' اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک اور سیل فون کور تھا جس میں چابیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ''یہ بٹوا کسی ایسے شخص کا ہے جو آئیو رنیو سے تعلق رکھتا ہے اور یہ لوگ گریٹ بیوری میں رہتے ہیں۔ وہ جگہ یہاں سے بہت قریب ہے۔''

شاید آدھے میل کا فاصلہ ہے۔ کانسٹیبل نے یہی بتایا ہے۔ یہ اسی کا علاقہ ہے۔"

"آئیورنیو۔" ہنری نے دہراتے ہوئے کہا۔"نام تو جانا پہچانا لگتا ہے۔ شاید یہ لوگ مشرقی یورپ سے تعلق رکھتے ہیں۔"

"جی ہاں۔"

"اور یہ چابیاں غالباً اس کے گھر کی ہیں۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے جناب۔" اسمتھ نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ایک کانسٹیبل کے ساتھ اس پتے پر چلے جاؤ۔ ڈاکٹر مارتھا کا خیال ہے کہ وہ تنہا رہتا تھا۔ تم وہاں جا کر اپنے طور پر معلومات حاصل کرو اور ہو سکے تو اس کے پڑوسیوں سے بھی اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کرو، میں یہیں ڈاکٹر مارتھا کے ساتھ رہوں گا اور جب وہ اپنا کام ختم کر لے گی تو ہم یہاں سے چلے جائیں گے، اگر میں تمہیں یہاں نہ ملوں تو اپنا کام ختم کر کے ملک گیٹ بار پر آجانا۔"

"بہتر جناب۔" اسمتھ نے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔

وہ ایک چھوٹا سا کاٹیج تھا جہاں مرنے والے کی رہائش تھی۔ جس میں ایک دروازہ اور دونوں اطراف میں کھڑکیاں تھیں۔ مکان کی چھت کافی نیچے تھی۔ کھڑکیوں کے اوپر بھی ایک چھوٹی کھڑکی تھی جو بالکل چھت سے جڑی ہوئی تھی۔ چھت پر ٹائل لگے ہوئے تھے جن میں سے کئی غائب ہو چکے تھے۔ باغ کا حال بھی کچھ اچھا نہ تھا۔ گھاس کافی بڑھ گئی تھی اور کیاریوں میں خودرو پودوں کی بھرمار تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کافی عرصے سے اس کی صفائی نہ کی گئی ہو۔ دروازہ اور کھڑکیاں بند ہونے سے اندر ایک عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ اندر کا حال بھی باہر جیسا ہی تھا اور جگہ جگہ بے ترتیبی نظر آرہی تھی۔ گو کہ کچن صاف تھا لیکن چیزیں بے ترتیبی سے رکھی ہوئی تھیں۔ کھانے کے برتن دھلے ہوئے تھے لیکن انہیں اپنی جگہ پر نہیں رکھا گیا تھا۔ اسمتھ نے گھر کی حالت دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ اگر شادی نہ ہوئی ہوتی تو اس کا گھر بھی ایسا ہی ہوتا۔ کاٹیج کا نچلا حصہ ایک کمرے پر مشتمل تھا جس کی ایک دیوار پر بڑا سا پتھروں کا آتش دان بنا ہوا تھا۔ کمرے میں بھی کپڑے اور دیگر اشیا بکھری ہوئی تھیں۔ کمرے میں ایک بڑے سائز کا پرانا سا ریڈیو بھی تھا جس میں ٹرانزسٹر کے بجائے والو استعمال ہوئے تھے۔ اسمتھ نے اس مشین کو بڑے پرشوق انداز میں دیکھا۔ اس کے دادا کے پاس بھی ایک ایسا ہی ریڈیو ہوا کرتا تھا۔ سب سے اہم اور خاص بات یہ تھی کہ اس کمرے میں ٹیلی وژن نظر نہیں آرہا تھا۔

اسمتھ اور کانسٹیبل سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر آگئے اور وہاں بھی انہیں چیزیں بکھری ہوئی نظر آئیں۔ اوپری منزل بھی ایک کمرے پر مشتمل تھی جس میں ایک سنگل بیڈ اور ایک الماری رکھی ہوئی تھی۔ کمرے میں ہلکی ہلکی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی لیکن بستر صاف ستھرا تھا۔ ایک پلاسٹک بیگ میں لانڈری لے جانے کے لیے میلے کپڑے رکھے ہوئے تھے جبکہ جوتوں کے لیے بستر کے نیچے جگہ مخصوص تھی۔

اس کاٹیج میں اسمتھ کو ایسی کوئی چیز نظر نہیں آئی جس سے پتا چلتا کہ اس گھر میں رہنے والے کو کیوں قتل کیا گیا۔ اس کے بعد اس کی لاش کیوں پڑی رہی پھر اس کی پوزیشن کیوں تبدیل کی گئی۔ اسمتھ نے کانسٹیبل کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔ "ہمیں پڑوسیوں سے بھی ملنا ہوگا۔"

"چلو پھر ایک ساتھ ہی چلتے ہیں۔" اسمتھ نے کہا۔

فوٹوگرافر پال کے آنے تک ڈاکٹر مارتھا لاش کے پاس ہی کھڑی رہی اور جب کیمرامین نے مختلف زاویوں سے لاش کی تصویریں لینا شروع کیں تب بھی اس نے اپنی نظریں وہاں سے نہیں ہٹائیں۔ فوٹوگرافر نے بیس کے قریب تصویریں بنائیں۔ جارج ہنری بھی اس دوران لاش پر نظریں جمائے کھڑا رہا جو یارک ڈسٹرکٹ اسپتال کی پیتھالوجیکل لیبارٹری میں اسٹین لیس اسٹیل کی میز پر رکھی ہوئی تھی۔ فوٹوگرافر نے اپنا کام ختم کرنے کے بعد مارتھا سے کہا۔

"میں نے ہر زاویے سے تصویریں لے لی ہیں۔"

ہنری نے حیران ہوتے ہوئے اسے دیکھا۔ مردہ خانے کے عملے کی گرم جوشی اور خوش اخلاقی نے اسے بے حد متاثر کیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اسے تصویریں بنانے کے لیے لاش کو الکحل سے دھونا پڑتا تو کیا وہ بھی ان کی طرح مثبت رویہ اختیار کر سکتا تھا۔ اس طرح فارنسک پیتھالوجسٹ کے تجزیے کے لیے یہ لوگ لاش کے مختلف حصوں کو کھولتے تھے اور یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے جو خود صحت مند رویہ رکھتا ہو۔

ڈاکٹر مارتھا نے کہنا شروع کیا۔"یہ لاش شمالی یورپ سے تعلق رکھنے والے ایک مرد کی ہے جس کی عمر میری رائے میں ساٹھ اور ستر برس کے درمیان تھی۔ وہ کم خوراک کا شکار تھا۔ اس کا اندر سے پھیلا ہوا معدہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ صرف نشاستہ دار غذا پر گزارا کر رہا تھا۔ بیئر پینے سے پیٹ تو بھر جاتا ہے لیکن اس میں غذائیت نہیں ہوتی۔ میں نے اس کا پیٹ دیکھا ہے اور میرا اندازہ ہے کہ اس میں بہت

تھوڑی خوراک تھی۔ اس کی انگلیوں کے ناخن سخت اور پیلے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے کافی عرصے سے اچھی خوراک نہیں ملی۔ وہ توس اور لوبیا پر گزارا کر رہا تھا البتہ بیئر خوب پیتا تھا۔ میں شرطیہ کہہ سکتی ہوں کہ قریبی شراب خانے والے اسے اچھی طرح جانتے ہوں گے۔''

☆☆☆

''بہتر ہوگا کہ تم اس کے بارے میں رائزنگ ڈیئر سے معلوم کرو۔'' دروازے کی دہلیز پر کھڑی عورت نے اسمتھ سے کہا۔ وہ صرف سوال کا جواب دینے کی حد تک تعاون کر رہی تھی لیکن اس نے اپنے تنہائی پسند پڑوسی کے بارے میں کوئی خاص بات نہیں بتائی۔

''تمہارا بہت بہت شکریہ۔'' اسمتھ نے جواب دیا۔ ''لیکن تم آئیور نیو کے بارے میں کیا جانتی ہو۔''

''میں اس بوڑھے آئیور کے بارے میں کیا جانتی ہوں؟'' عورت نے اس کا سوال دہرایا اور ایک جانب دیکھنے لگی۔

''کچھ زیادہ نہیں۔ وہ اکیلا رہتا تھا اور ایک طرح سے مطمئن نظر آتا تھا۔ وہ انگریز نہیں بلکہ غیر ملکی تھا اور مشرقی یورپین لہجے میں انگریزی بولتا تھا۔ شاید وہ پولینڈ یا چیکو سلواکیہ کا رہنے والا تھا۔ میں ایک چیک کو جانتی ہوں۔ آئیور کو بولتا دیکھ کر مجھے اس کی یاد آ جاتی تھی۔''

''کیا وہ کہیں ملازمت کرتا تھا؟''

''کیا آئیور کہیں ملازمت کرتا تھا؟'' ایک بار پھر اس عورت نے سوال دہرایا اور دوسری جانب دیکھنے لگی۔

''عام معنوں میں تو نہیں لیکن اس کی آمدنی کا کوئی ذریعہ ضرور تھا کیونکہ اس کا نام بے روزگار لوگوں کی فہرست میں نہیں تھا اور نہ ہی وہ ہر ہفتے خیرات لینے کے لیے قطار میں کھڑا ہوتا تھا۔ اس نے یہ کاٹیج بھی مالکانہ حقوق پر لیا تھا۔ میں اس کے پرانے مالک کو جانتی ہوں۔ اس نے کاٹیج پر برائے فروخت کا بورڈ لگا دیا تھا لیکن آئیور کے آنے کے بعد وہ بورڈ اتار دیا گیا۔ وہ متفرق کام کیا کرتا تھا اور سال کے ان دنوں میں جنگل میں جا کر مشروم جمع کرتا تھا اور اسی لیے وہ اس علاقے میں مشروم جمع کرنے والے کے طور پر پہچانا جاتا تھا۔ وہ انہیں گھر گھر جا کر فروخت کرتا۔ کیونکہ یہ بازار کے مقابلے میں سستی اور تازہ ہوتی تھیں۔ اس طرح اسے اتنے پیسے مل جاتے کہ وہ شام کو رائزنگ ڈیئر میں جا کر بیئر پی سکے۔''

''اسے اس کاٹیج میں رہتے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا تھا؟'' اسمتھ نے پوچھا۔

وہ عورت حسبِ عادت اس کا سوال دہراتے ہوئے بولی۔ ''آئیور کتنے عرصے سے اس کاٹیج میں رہ رہا تھا؟'' پھر اس نے دوسری جانب دیکھا اور بولی۔ ''دس سال۔''

''کیا اس کے دوست اور رشتے دار تھے جنہیں تم بھی جانتی ہو؟''

''کیا آئیور کے دوست اور رشتے دار تھے جنہیں میں جانتی ہوں؟ نہیں۔''

''حالیہ دنوں میں یہاں کوئی شخص عجیب حرکتیں کرتا نظر آیا؟''

اس مرتبہ عورت نے جواب دینے سے پہلے سوال نہیں دہرایا بلکہ بولی۔ ''ہاں۔''

''ہاں۔'' اس بار اسمتھ نے اس کا انداز اپنایا پھر بولا۔ ''کون؟''

''کون؟ یہ میں نہیں جانتی۔''

''کیا تم اس کا حلیہ بیان کر سکتی ہو؟''

''وہ ایک عورت تھی۔''

''اس کا حلیہ بتاؤ؟''

اس عورت نے آسمان کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''اس کی عمر تیس سے کچھ زیادہ ہی ہوگی۔''

اسمتھ نے اپنی نوٹ بک نکالی اور لکھنا شروع کر دیا۔

''آگے بتاؤ۔''

''چھوٹا قد، سیاہ بال، اس نے عام سا لباس، اونی جیکٹ، جینز اور بوٹ پہن رکھے تھے جو کوہ پیمائی میں استعمال ہوتے ہیں لیکن وہ زیادہ بھاری نہیں تھے۔''

''اور؟''

''وہ عورت مجھے خوش نہیں لگ رہی تھی۔''

''یہ خیال تمہیں کیسے آیا؟'' اسمتھ نے پوچھا۔

''اس کی آنکھوں میں تلاش اور آواز میں غصہ تھا۔''

''کیا اس نے تم سے بات کی؟''

''اس نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا اور مجھ سے اس طرح پوچھ گچھ کرنے لگی جیسے یہ اس کا حق ہو۔ وہ جاننا چاہ رہی تھی کہ آئیور نیو کہاں رہتا ہے، میں نے اسے نہیں بتایا لیکن اس نے معلوم کر لیا۔ میں نے ایک دن بعد اسے سڑک پر کھڑے ہوئے دیکھا۔ وہ آئیور کے کاٹیج پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ جیسے اسے وہ جگہ پسند نہ ہو یا وہاں رہنے والے سے اسے کوئی عداوت ہو، یہ گزشتہ منگل کی بات ہے۔''

''کیا وہ بھی غیر ملکی تھی؟''

''لہجے سے وہ مقامی نہیں لگ رہی تھی اور اس کا انداز

نیوز ریڈر جیسا تھا لیکن وہ کسی بات پر ناراض تھی۔“

”وہ لمبی تھی یا چھوٹے قد کی؟“ اسمتھ نے جواب دیا۔

”لمبی یا چھوٹے قد کی؟“ اس عورت نے ایک بار پھر سوال دہرایا اور باغ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”چھوٹی، بہت ہی چھوٹے قد کی لیکن اس لباس میں وہ فٹ نظر آرہی تھی۔ اوہ، ہاں یاد آیا۔ اس نے بیس بال کیپ پہن رکھی تھی جس پر سامنے کی طرف سیاہ حروف میں این اور وائی لکھا ہوا تھا۔ یہ دونوں حرف الگ الگ نہیں بلکہ جڑے ہوئے تھے۔“

”نیویارک؟“ اسمتھ نے کہا۔

”اس کا یہی مطلب نکلتا ہے۔ اسی لیے مجھے وہ ٹوپی دیکھ کر حیرانی ہوئی۔“

”اس سے ہماری معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اس طرح کی ٹوپیاں بازار میں مل جاتی ہیں اور عام طور پر سیاح انہیں شوق سے خریدتے ہیں۔ تم نے آخری بار مسٹر آئیور کو کب دیکھا تھا؟“

”آج جمعہ ہے۔ کل نہیں۔ ہاں پرسوں بدھ کو صبح میں نے اسے دیکھا تھا۔ تم بتا رہے ہو کہ وہ مر گیا۔ اس کی موت کیسے واقع ہوئی؟“

☆☆☆

”اس کی کھوپڑی میں فریکچر ہو گیا ہے۔“ ڈاکٹر بارتھا نے سر کے اوپری حصے کی کھال اتارتے ہوئے کہا۔ ”کسی نے جنون کی کیفیت میں اس پر حملہ کیا تھا اور ایک سے زیادہ ضربیں لگائی ہیں جس کی وجہ سے دماغ کے اندر خونی رسولی بن گئی۔“

”سوری۔“ ہنری نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

”میں اپنی رپورٹ میں اس کی تفصیل لکھ دوں گی۔ فی الحال تم اتنا سمجھ لو کہ سر پر لگنے والی چوٹ کی وجہ سے خون دماغ کے خلیوں میں چلا گیا اور انہیں ختم کر دیا۔ فالج بھی دماغ کی رگ پھٹنے سے ہوتا ہے۔ کھوپڑی پر ضرب لگنے سے دماغ کو نقصان پہنچا لیکن شاید فوری طور پر اس کی موت واقع نہ ہوتی اگر یہ ہوش میں آجاتا لیکن لگتا ہے کہ وہ نشے میں تھا۔ جہاں تک موت کے وقت کا تعین ہے تو اس کی موت لاش ملنے سے پہلے چوبیس اور اڑتالیس گھنٹوں کے درمیان واقع ہوئی۔

☆☆☆

رائزنگ ڈیئر کا مالک ایک خوش پوش اور مناسب جسامت کا کلین شیو شخص تھا۔ اس نے اسمتھ کا گرم جوشی سے استقبال کیا اور جب اس نے آئیور کے بارے میں پوچھا تو وہ بولا۔ ”وہ کافی مقبول شخصیت ہے۔ چند روز پہلے ایک عورت بھی اس کو پوچھتی ہوئی آئی تھی۔“

”چھوٹے قد کی، سیاہ بال، عمر تقریباً تیس برس۔“

”ہاں، میں نے اسے کچھ نہیں بتایا اور اب پولیس بھی بوڑھے آئیور کا پتا پوچھتی آگئی ہے۔ میں نے خود اسے ایک دو دن سے نہیں دیکھا۔“

”اب تم اسے کبھی نہیں دیکھ سکو گے۔“ اسمتھ نے کہا۔

”وہ مر چکا ہے۔“

”مر گیا؟“

”ہاں۔“ اسمتھ اپنے ہونٹ بھینچتے ہوئے بولا۔ ”اور اس کی موت بہت ہی مشکوک حالات میں ہوئی ہے۔ اس لیے ہم اس کے بارے میں معلومات حاصل کر رہے ہیں۔“

”اوہ بے چارہ آئیور۔ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔“

”میرا خیال ہے کہ وہ یہاں کا مستقل گاہک تھا۔“ اسمتھ نے کہا۔

رائزنگ ڈیئر میں دو کمرے تھے جنہیں ایک بار سے الگ کر دیا گیا تھا۔ ایک طرف لاؤنج اور دوسری جانب شراب خانہ تھا۔ اس وقت لاؤنج میں کوئی گاہک نہیں تھا جہاں اسمتھ اور کانسٹیبل کھڑے ہوئے تھے۔ البتہ دوسری طرف سے بوتلیں کھلنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

شراب خانے کا مالک مسکراتے ہوئے بولا۔ ”گاؤں میں یہ واحد پب ہے۔ اگر تم اچھی بیئر کے شوقین ہو تو یقیناً اپنی شام یہیں گزارنا پسند کرو گے۔ آئیور یہاں کا باقاعدہ گاہک تھا لیکن وہ زیادہ پیسے خرچ نہیں کرتا تھا۔ وہ عمر رسیدہ شخص تھا اور اپنے ہم عمر لوگوں کی طرح سرِ شام ہی پی لیتا تھا کیونکہ آٹھ بجے کے بعد یہاں جوانوں کا جمگھٹا لگ جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ چھ بجے کے قریب آتا اور آٹھ بجے تک چلا جاتا تھا۔“

”میں سمجھ گیا۔“ اسمتھ نے کہا۔ ”تم اس کے بارے میں مزید کیا جانتے ہو؟“

”وہ ہنگری کا رہنے والا تھا۔“

”لیکن اس کی پڑوسن کا خیال ہے کہ وہ چیکوسلواکیہ سے آیا تھا۔“

”اس نے مجھے یہی بتایا تھا اور میرے پاس اس پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔“

”کیا تم جانتے ہو کہ مشروم فروخت کرنے کے علاوہ اس کا اور کیا ذریعۂ آمدنی تھا؟“

''اس سے اسے کوئی خاص آمدنی نہیں ہوتی تھی۔ وہ صرف لوگوں سے راہ و رسم بڑھانے کے لیے ان کے دروازے پر جاتا تھا۔ کم از کم میرا تو یہی خیال ہے۔''

اسی اثنا میں ایک بوڑھا شخص بار میں داخل ہوا اور دوسرے حصے میں چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے گھنٹی بجائی اور شراب خانے کا مالک معذرت کر کے اسے سرو کرنے چلا گیا۔ پھر اسمتھ نے شراب خانے کے مالک جیک کی آواز سنی۔ وہ اس شخص سے کہہ رہا تھا۔ ''تم آئیور کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''اتنا ہی جو دوسرے لوگ جانتے ہیں مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''بار کی دوسری جانب بیٹھے دو آدمی تمہارا دماغ کھانے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اگر تم انہیں تھوڑا سا وقت دے سکو۔''

''میں صرف بیئر لینے آیا تھا۔'' یہ کہہ کر اس نے چند سکے نکال کر کاؤنٹر پر رکھے اور پب سے باہر چلا گیا پھر گھوم کر عقبی حصے سے واپس لاؤنج میں آیا اور ان لوگوں کے ساتھ شریک ہو گیا۔

''تم آئیور کو جانتے ہو؟'' اسمتھ نے نووارد سے پوچھا۔

''ہاں جانتا ہوں لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''وہ مر گیا ہے۔'' مالک نے بتایا۔

''اوہ میرے خدا۔'' اس شخص نے دونوں ہاتھ بار کی سطح پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''تم پولیس والے ہو، کیا تمہیں کسی پر شبہ ہے؟''

''ہاں، ہم اس کی موت کی تحقیقات کر رہے ہیں۔ کیا میں تمہارا نام پوچھ سکتا ہوں۔'' اسمتھ نے کہا۔

''اسٹینلے بارنز، ہاں میں اسے جانتا تھا۔ وہ بے ضرر آدمی تھا۔ وہ کسی نامعلوم مقام سے آیا تھا جس کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں۔ وہ اس گاؤں میں آیا۔ کاٹیج خریدا، اور اس طرح سیٹ ہو گیا جیسے اس نے پوری زندگی یہیں گزاری ہو۔ وہ اپنی دنیا میں مگن تھا اور اسے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ یہاں کے لوگوں نے اسے قبول کیا یا نہیں۔ اس نے کبھی یہ نہیں کہا کہ لوگ اسے پسند کریں۔ اس کے لوگوں نے اسے تنہا چھوڑ دیا تو وہ بھی انہیں بھول گیا۔ حالانکہ وہ کام کر سکتا تھا بلکہ ہم دونوں نے ڈرے کاٹ کے لیے کچھ کھدائی کا کام کیا بھی تھا۔''

''یہ ڈرے کاٹ کون ہے؟'' اسمتھ نے پوچھا۔

''وہ یہاں کا ایک بڑا زمیندار ہے۔ اس کی زیادہ تر زمینیں مغرب کی جانب ہیں لیکن کچھ حصہ گاؤں میں بھی آتا ہے۔ اس نے صرف موسم گرما کے لیے ہمیں کام دیا تھا۔ وہ سردیوں کے آنے سے پہلے خندقوں کی صفائی کروانا چاہ رہا تھا۔ اس نے مجھے اور آئیور دونوں کو کام پر لگا دیا۔ ہم دوپہر کا کھانا ایک ساتھ ہی کھاتے تھے۔ ایک دن اس نے مجھے اپنے بارے میں بتایا۔ وہ ہنگری سے بھاگ کر آیا تھا۔ میں نے اس سے اس کے خاندان کے بارے میں پوچھا تو وہ مضطرب نظر آنے لگا اور اس نے گفتگو کا رخ موڑ کر میرے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔ اسے میرے پس منظر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں اس کے بارے میں کچھ پوچھوں۔''

''اوہ میں سمجھا۔'' اسمتھ نے کہا۔ اس نے شراب خانے پر نظر دوڑائی۔ وہاں پالش کیے ہوئے پیتل کے بموں کے خول رکھے ہوئے تھے جو پہلی جنگِ عظیم کے بعد سپاہی اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ ان میں سے کچھ اب بھی شراب خانوں اور لوگوں کے گھروں میں نظر آتے تھے۔ آتش دان کے اوپر ہرن کا سر رکھا ہوا تھا۔ پرانے زمانے میں شاید اس طرح کی چیزیں قابلِ قبول ہوتی ہوں گی لیکن اب یہ لوگوں کے ذوق پر ناگوار گزرتی تھیں۔ اسی لیے کئی شراب خانوں نے ان آرائشی اشیا کو ہٹا دیا تھا لیکن رائزنگ ڈیئر کا مالک ایک قدامت پسند شخص تھا اور وہ ایسی چیزوں کی قدر کرتا تھا۔

''کیا تم جانتے ہو کہ وہ ہنگری سے سیدھا اسی گاؤں میں آیا تھا یا اس سے پہلے اس نے کسی اور جگہ رہائش اختیار کی تھی؟'' اسمتھ نے نووارد سے پوچھا۔

''نہیں۔'' اسٹینلے نے بیئر کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''وہ سیدھا یہاں نہیں آیا بلکہ کچھ عرصے لندن میں بھی رہا۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس گاؤں میں آنے کی کوئی خاص وجہ تھی۔ اس گاؤں میں ایسی کوئی بات نہیں جس کی بنا پر وہ یہاں رہنے کو ترجیح دیتا اور نہ ہی یہاں اس کی ذات کے لیے دلچسپی کا کوئی سامان تھا۔ البتہ اس کا شمار پانچ خوش قسمت دیہات میں ضرور ہوتا ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اس کا اس بات سے کوئی تعلق ہے۔''

''پانچ خوش قسمت دیہات سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

اس بار اسٹینلے کے بجائے جیک نے جواب دیا۔ ''کہا جاتا ہے کہ برطانیہ کا کوئی گاؤں ایسا نہیں جہاں جنگِ عظیم

میں مرنے والوں کی قبر نہ ہو لیکن یہ سچ نہیں ہے۔ اس ملک میں پانچ ایسے خوش قسمت گاؤں ہیں جہاں کا کوئی آدمی جنگ میں نہیں مارا گیا اور یہ گاؤں بھی انہی میں سے ایک ہے۔''

''واقعی؟'' اسمتھ نے حیرت سے کہا۔

''ہاں واقعی۔'' اسٹینلے بولا۔ ''لیکن میں نہیں سمجھتا کہ آئیور اس وجہ سے یہاں آیا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔ یہ بتاؤ کہ ایک عورت اس کا پتا پوچھتی پھر رہی تھی۔ کیا تم اس کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟''

''میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ وہ یہاں آئی تھی لیکن میں نے اسے آئیور کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

''وہ پورے گاؤں میں پھرتی رہی۔ چھوٹے قد کی سیاہ بالوں والی عورت تھی اور اس نے بیس بال کیپ اوڑھ رکھی تھی، یاد آگیا۔ میں نے اسے دیکھا تھا لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ آئیور کو تلاش کر رہی ہے۔ وہ اسی ہفتے کے شروع کا کوئی دن تھا۔ پیر یا منگل۔''

''میرا خیال ہے کہ وہ پیر کا دن تھا جب وہ یہاں آئی تھی۔'' جیک اپنا سر کھجاتے ہوئے بولا۔ ''ہاں پیر... میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ پیر کا دن ہی تھا۔''

''میں نے بدھ کے روز اسے یہاں سے جاتے ہوئے دیکھا۔'' اسٹینلے نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ وہ بس اسٹاپ پر ایک چھوٹے سوٹ کیس سمیت کھڑی ہوئی تھی۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ اس نے اس گاؤں میں قیام کیا تھا؟'' اسمتھ نے امید بھرے انداز میں کہا۔ ''اور اس گاؤں میں صرف ایک ہی ایسی جگہ ہے جہاں وہ ٹھہر سکتی تھی۔''

☆☆☆

گاؤں کا واحد گیسٹ ہاؤس چلانے والی مسز سلوا بہت مددگار ثابت ہوئی اور اس نے آئیور کے قتل کے سلسلے میں ہونے والی تحقیقات میں پولیس سے پورا تعاون کیا۔ ''مجھے وہ عورت اچھی طرح یاد ہے۔'' وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''سال کے اس حصے میں آنے والے مہمان کو اتنی جلدی کیسے بھلایا جا سکتا ہے اور وہ تو اس ہفتے میں آنے والی واحد مہمان تھی جو اتوار کو آئی اور بدھ کے روز واپس چلی گئی۔ وہ چھوٹے قد کی عورت تھی اور اس نے مجھے بتایا کہ وہ کسی کی تلاش میں یہاں آئی تھی۔''

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ کہاں سے آئی تھی؟''

''کہاں سے آئی تھی؟'' مسز سلوا کچھ سوچتے ہوئے بولی پھر اس نے دراز کھول کر ایک ڈرائیونگ لائسنس نکالا اور اس پر لکھا ہوا پتا پڑھنے لگی۔ '20 چرچ اسٹریٹ، بیتھنل گرین، لندن ای 2' یہ کوئی پوش ایریا نہیں ہے، میں لندن کے بارے میں جانتی ہوں گو کہ مجھے شہر کا مشرقی حصہ پسند ہے۔'' اس نے ڈرائیونگ لائسنس اسمتھ کو پکڑاتے ہوئے کہا۔ ''وہ یہ اپنے کمرے میں چھوڑ گئی تھی، میں مسٹر ویسٹن سے پوچھنے والی تھی کہ اس کا کیا کروں؟ وہ ہمارا کمیونٹی کانسٹیبل ہے اور ہر ہفتے گاؤں آتا ہے۔''

''وہ لائسنس کسی میری نیٹو کے نام پر بنا تھا۔'' اسمتھ نے کہا۔ ''کیا تم اسے ہمارے پاس چھوڑ سکتی ہو؟''

جب اسمتھ اور کانسٹیبل، مسز سلوا کے گیسٹ ہاؤس سے باہر نکلے تو ایک نوجوان شخص سائیکل چلاتا ہوا ان کے پاس آیا اور بولا۔ ''تم وہی پولیس والے ہو جو آئیور کے بارے میں پوچھتے پھر رہے ہو؟''

''ہاں۔'' اسمتھ نے کہا۔ ''اور تم کون ہو؟''

''سب لوگ مجھے ہیری کہتے ہیں لیکن میرا پورا نام ہیرالڈ ٹیسٹ ہے۔ میں نے بوڑھے آئیور کو منگل کی شب جنگل کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا اور چلتے ہوئے تھوڑا سا لڑکھڑا رہا تھا۔ ہم دونوں قریب سے گزرے لیکن اس نے مجھ پر کوئی توجہ نہیں دی۔ میں نے سوچا کہ شاید وہ نشے میں ہے۔ میں جانتا تھا کہ وہ رائزنگ ڈیئر سے بیئر خریدتا ہے لیکن اس کی شہرت ایک شرابی کی نہیں تھی۔''

''یہ منگل کی بات ہے؟''

''ہاں، رات کا وقت تھا اور مکمل تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے ڈریے کاٹ کے احاطے سے ایک خرگوش پکڑا تھا۔''

''تم جانتے ہو کہ یہ غیر قانونی ہے۔'' رچرڈ اسے گھورتے ہوئے بولا۔

''جانتا ہوں۔'' لڑکے نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''دوسرے دن میں نے اس عورت کو دیکھا جو گاؤں میں آئیور کو پوچھتی پھر رہی تھی۔ میں نے اسے جنگل سے باہر آتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا باکس تھا۔ وہ بس اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی۔ وہ بس میں بیٹھی اور واپس یارک چلی گئی۔''

''دلچسپ کہانی ہے۔'' اسمتھ بولا۔ ''ہمیں تمہارا بیان لینا ہوگا۔''

''لیکن میں نے تمہیں خرگوش کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

''ہم اس کے متعلق تم سے کچھ نہیں پوچھیں گے۔''

بیتھل گرین ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ اس لیے ہنری اور اسمتھ کو میری نیو کا فلیٹ تلاش کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ یہ فلیٹ چھوٹا اور کافی تنگ تھا۔ دروازہ میری نے ہی کھولا اور ہنری کے استفسار پر اس نے اعتراف کرلیا کہ یہ فلیٹ اسی کی ملکیت ہے اور بولی۔ ''ابھی اس کی قسطیں ادا نہیں ہوئیں اور تم جانتے ہو کہ مورٹیج پراپرٹی کو چھوڑ کر جانا آسان نہیں ہوتا۔ اس لیے میں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ کسی تاریک رات میں قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے یہاں سے نکل جاؤں گی۔ یہ ڈرائیونگ لائسنس بھی میرا ہے۔ مجھے اس کے گم ہوجانے کا پتا ہی نہیں چلا۔ بس اتنا یاد ہے کہ اسے میں نے بیگ سے اس وقت نکالا تھا جب میں کوئی اور چیز تلاش کررہی تھی۔ اس کے بعد شاید اسے واپس بیگ میں رکھنا بھول گئی۔''

''ہم یہاں تم سے آئیور نیو کے بارے میں بات کرنے آئے ہیں۔'' ہنری نے کہا۔

''ہاں، وہ ہنگری میں اپنے بیوی بچوں کو بے یار و مددگار چھوڑ آیا تھا اور اپنے ساتھ کچھ رقم لے کر کسی طرح مغرب کی جانب فرار ہوگیا۔ کمیونزم کے زمانے میں بھی ہنگری میں چھوٹا کاروبار کرنے اور اس میں دس ملازمین رکھنے کی اجازت تھی۔ نیو کا ایک چھوٹا سا فرنیچر کا کارخانہ تھا۔ وہ ایک رات اپنے ساتھ ایک معقول رقم لے کر وہاں سے نکل گیا۔ چند ہفتوں بعد اس کے گھر کے پتے پر لندن سے بھیجا گیا ایک پوسٹ کارڈ موصول ہوا جس کا اس کے گھر والوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوا کیونکہ اس وقت تک وہ لاپتا ہو چکے تھے۔''

''لاپتا؟'' ہنری نے حیرت سے کہا۔

''ہاں، خفیہ پولیس اپنے ساتھ لے گئی۔ اس کی بیوی، تین لڑکے اور تین سالہ بیٹی۔ ان میں سے صرف اس کی بیٹی ہی کی واپسی ہوسکی۔ اس کی پرورش ایک یتیم خانے میں ہوئی جہاں پانچ سو بچے اور بھی تھے کیونکہ اس کا باپ بھاگ گیا تھا اور وہ لاوارث تھی۔''

''تم کون ہو؟'' ہنری نے پوچھا۔ ''اور تمہارا آئیور سے کیا رشتہ ہے؟''

''اس کی بیٹی، جب مشرقی بلاک ٹوٹ گیا تو میں انگلستان کا سفر کرنے کے قابل ہوگئی۔ میں نے ہنگرین کے بینک میں مترجم کے طور پر ملازمت کرلی اور ہنگرین کمیونٹی میں اپنے باپ کو تلاش کرنے لگی۔ مجھے کسی نے بتایا کہ وہ شمالی انگلستان کے کسی گاؤں میں چلا گیا ہے لیکن اس کا پتا معلوم نہیں۔ میں اس کی تلاش میں گزشتہ ہفتے وہاں پہنچ گئی اور اسے مشروم چنتے ہوئے دیکھا۔ وہ کافی کمزور، اداس اور تنہا لگ رہا تھا۔ میں اس کا تعاقب کرتے ہوئے اس کے گھر گئی اور بتایا کہ اس کے ہنگری سے فرار ہونے کے بعد گھر والوں پر کیا گزری۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا لیکن اس کے آنسو میرے اندر برسوں سے دہکتی ہوئی انتقام کی آگ کو نہ بجھا سکے اور میں نے اسے قتل کردیا جیسے اس نے میری ماں اور تین بھائیوں کو مار دیا تھا۔ میں کیسے اس ہنستے کھیلتے گھر کو بھول سکتی تھی۔''

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'' ہنری نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''میں اگلے دن دوبارہ اس کے گھر گئی لیکن وہ موجود نہیں تھا۔ میں جانتی تھی کہ وہ جنگل میں ہوگا اور میں نے اسے وہاں تلاش کرلیا...''

''اس کے علاوہ کچھ مت کہنا۔'' ہنری نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں گرفتار کررہا ہوں۔''

''اس کی کمر جھکی ہوئی تھی لہٰذا میں نے اسے درخت کے تنے کے ساتھ بٹھا دیا گو کہ اس کی ٹانگوں میں لچک نہیں تھی لیکن میں کسی طرح اپنی کوشش میں کامیاب ہوگئی۔''

''میں تمہیں تنبیہ کررہا ہوں...''

''میں نے آلۂ قتل دریائے ٹیمز میں پھینک دیا۔''

''تمہیں بولتے وقت محتاط رہنا چاہیے کیونکہ اس سے تمہارا دفاع کمزور پڑسکتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم عدالت میں وہی کہو جو تم سے پوچھا جائے۔ تم جو کچھ کہو گی وہ تمہارے حق میں یا خلاف، ثبوت کے طور پر استعمال ہوگا۔''

''میں نے اب تک جو کچھ کہا اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ میں ہر سوال کے جواب میں نو کمنٹس کہہ دوں گی۔ تم میرے خلاف کچھ بھی ثابت نہیں کرسکتے کیونکہ تمہارے پاس آلۂ قتل ہے اور نہ کوئی گواہ۔ اگر اس قتل کے لیے کوئی ترغیب ملی تو وہ تیس سال پہلے کی وہ تاریک رات ہے جب خفیہ پولیس نے ہمارے گھر پر چڑھائی کی لیکن یہ واقعہ بھی دوسرے ملک میں پیش آیا تھا۔ بے شک تم مجھے تفتیش کے لیے اپنے ساتھ لے جاؤ لیکن میں اور تم اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ ایک ایسا کیس ہے جسے ہر صورت بند ہونا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھی اور فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

کمیشن

جمال دستی

سازوسامان مکان کی خوب صورتی اور سجاوٹ میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں... لیکن گھر مکینوں سے آباد ہوا کرتے ہیں... ظاہری تزئین و آرائش کے برعکس گھروں میں رونق اور سکون و طمانیت وہاں بسنے والوں کی محبت عنایت اور دلداری سے منور ہوتے ہیں... اپنا گھر ہر عورت کی خواہش ہوتی ہے... ایسی ہی دو عورتوں کا ماجرائے خاص... ایک گھر بنانا چاہتی تھی... دوسری مکان کو ہر شے سے مزین چاہتی تھی... ان دونوں کے ٹکراؤ سے جنم لینے والی پُراثر کہانی...

کاروباری معاملات میں الجھاؤ کا شکار ہو جانے والے قریبی تعلقات کا انجام...

میری ماں نے ہمیشہ یہی نصیحت کی کہ میں اپنے لیے کوئی مضبوط اور سادہ شخص دیکھوں۔ ”خوابوں میں رہنا چھوڑ دو۔ ایسا نہ ہو کہ یہ ڈراؤنا خواب بن جائیں۔ میری بات یاد رکھنا لوئیس!“ میں نہیں جانتی کہ ڈیل خواب دیکھنے والا شخص تھا۔ البتہ منصوبے بناتا اور ان پر عمل ضرور کرتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کچھ کرنا چاہتے ہیں، بجائے اس کے کہ ہاتھ میں بیئر کا گلاس لیے سوچتے رہیں۔ میں نے اسے کبھی سادہ آدمی نہیں سمجھا۔ لیکن بعض اوقات منصوبے

پورے نہیں ہوتے اور خواب ادھورے رہ جاتے ہیں۔''
یہی کچھ اس وقت بھی ہوا جب پولیس والے برنیڈا کے دفتر میں آئے۔ ہمیں کیلی فورنیا کے شہر وکٹورل آئے ہوئے دو مہینے ہو چکے تھے اور یہ بھی ڈیل کا ہی آئیڈیا تھا کہ کسی دوسری جگہ جا کر زندگی نئے سرے سے شروع کی جائے۔ برنیڈا، اس کی بہن تھی اور ہم اس کی اسٹیٹ ایجنسی میں کسی معاوضے کے بغیر کام کر رہے تھے۔ اس دوران میں ڈیل کوئی بھی سودا کرنے میں ناکام رہا تھا۔ ہم دونوں یہ قربانی صرف اس لیے دے رہے تھے کہ ڈیل کی گزشتہ مجرمانہ زندگی پر پردہ پڑا رہے۔
سادہ کپڑوں میں ملبوس پولیس سراغ رسانوں کو دیکھ کر میرے دل میں طرح طرح کے اندیشے سر اٹھانے لگے۔ ڈیل بھی چوکنا ہو گیا۔ اس نے اپنی ٹائی درست کی اور بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے عقبی دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔
''ہم گریسن سے ملنا چاہتے ہیں۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔ ''کیا وہ موجود ہے؟''
وہ دونوں ایک جیسے لگ رہے تھے۔ ملتا جلتا قد، ایک جیسے جبڑے، نامعقول ہیئر اسٹائل اور پولیس والوں جیسی مخصوص بے باکی لیکن ان میں سے جو پہلے بولا، اس کا چہرہ نسبتاً بھاری تھا اور اس کے بائیں گال کی ہڈی داہنے کے مقابلے میں ابھری ہوئی تھی۔ انہیں دیکھ کر مجھے جیکل اور ہائیڈ کا خیال آ گیا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ ڈیل کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک جواب دیتا، برنیڈا نے دفتر سے اپنا سر باہر نکالا اور بولی۔
''میں ہی برنیڈا گریسن ہوں۔ میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں؟''
''ہمیں صرف چند منٹ چاہئیں میڈم۔'' بھاری چہرے والے مسٹر ہائیڈ نے کہا۔ ''اگر یہ ممکن ہو۔''
''بالکل۔'' برنیڈا اپنے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی۔ ''اندر آ جاؤ۔''
جیکل نے ڈیل کو غور سے دیکھا اور وہ دونوں برنیڈا کے دفتر میں چلے گئے۔
ڈیل گزشتہ ایک ہفتے سے مجھ سے بات نہیں کر رہا تھا اور میں بھی جواب میں خاموش تھی لیکن اب مجھے مجبوراً بولنا پڑ گیا۔ ''یہ یہاں کیوں آئے ہیں؟''
ڈیل نے کندھے اچکا دیے لیکن وہ مسلسل اپنا نچلا ہونٹ چبا رہا تھا۔
''ڈیل۔'' میں نے کہا۔ ''یہ نیو میکسیکو سے تمہارا تعاقب کرتے ہوئے یہاں نہیں آئے ہوں گے۔ اور اگر ایسا ہے تو یہ ضرور تمہارے بارے میں پوچھنے آئے ہیں۔''
''اس کا تعلق نیو میکسیکو سے نہیں بلکہ یہاں کا کوئی معاملہ ہے۔''
''کیا تم اس رات کے بارے میں پریشان ہو جو ہم نے بند مکان میں گزاری تھی۔''
ڈیل نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔ ''کیا ہم اس بات کو نہیں بھول سکتے؟''
''میں صرف یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ تم کیا سوچ رہے ہو؟'' میں نے برنیڈا کے دفتر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ تمہارے لیے آئے ہیں؟''
''لوئیس...!'' اس نے قدرے سخت لہجے میں کہا اور نفی میں سر ہلا دیا۔
عین اسی وقت برنیڈا کے دفتر کا دروازہ کھلا۔ ڈیل نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں سراغ رساں باہر آئے اور ان کی نظریں سیدھی ڈیل کی طرف گئیں تب مجھے گمان گزرا کہ ڈیل ابھی تک جرم کی زندگی گزار رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی بہت سے سوالات ذہن میں گردش کرنے لگے۔ کیا میں نے اسے واپس پرانے راستوں پر چلنے کے لیے مجبور کیا اگر ایسا کچھ ہوا تو اس نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔
نیو میکسیکو سے وکٹورول آتے وقت میں نے آنے والے دنوں کے بارے میں کئی خواب دیکھے تھے۔ راستے میں اسے چھیڑتے ہوئے میں نے کہا۔ ''اگر لاس اینجلس میں تمہاری کسی مووی اسٹار سے ملاقات ہو جائے تو تم کسی خوب صورت لڑکی سے بھی دوستی کر لینا۔ مجھے حسد نہیں ہو گا۔''
وہ سڑک سے سفر کرتے ہوئے ہمارا دوسرا دن تھا۔ ڈیل اپنی پرانی نووا کار چلا رہا تھا اور میں اس کے برابر میں بیٹھی میل گن رہی تھی۔ پہلے روز ہمارے درمیان کچھ تلخی ہو گئی تھی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ میں اس سے علیحدہ ہونے کے بارے میں سوچنے لگی لیکن پھر اس نے مجھے منا لیا اور وعدہ کیا کہ آئندہ وہ کوئی جرم نہیں کرے گا۔
''ہم لاس اینجلس نہیں جا رہے۔'' ڈیل نے سڑک پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''برنیڈا ہمارا انتظار کر رہی ہو گی۔ رات کا کھانا اسی کے ساتھ کھائیں گے اور کل سے کام شروع۔''

"ایک نئی شروعات۔" میں نے طنزاً کہا۔ "جو شاید منگل تک چلی جائے۔"

وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔ "میں کبھی بہت زیادہ ذمے دار شخص نہیں رہا۔ میں نے برنیڈا کو بتا دیا تھا کہ ہم اتوار کی رات اس کے ساتھ ڈنر کریں گے اور میں اس پروگرام پر عمل کرنا چاہتا ہوں۔ یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ اس کے ساتھ کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

میں سوچنے لگی کہ ڈیل کی بہن ہمارا کس طرح استقبال کرے گی۔ ڈیل میرا تعارف کس حیثیت سے کرائے گا۔ میں اس کی گرل فرینڈ ہوں یا پارٹنر۔ اس کے پاس الفاظ کی کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ اسے مطمئن کرنے کے لیے کچھ بھی کہہ سکتا تھا۔

"اس نے ہمارے لیے جو مکان تیار کیا ہے، اس میں کتنی گنجائش ہے؟" میں نے پوچھا۔

ڈیل نے کندھے اچکائے اور بولا۔ "برنیڈا نے مجھے تفصیل نہیں بتائی۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے امید ہے کہ کچن میں بڑی بڑی الماریاں اور گرینائٹ کا کاؤنٹر ہوگا اور ایک ماسٹر بیڈ روم جس میں کنگ سائز بیڈ، سنگھار میز اور تین دروازوں والی الماری ہوگی۔"

لیکن میرے خواب اس وقت چکنا چور ہو گئے جب مجھے معلوم ہوا کہ ایسا کوئی مکان سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ جب میں برنیڈا سے ملی تو میرے سارے خدشات سامنے آ گئے۔

"اوہ ڈیل، مجھے جیسے ہی موقع ملا، میں نے وہ مکان بیچ دیا۔" برنیڈا نے اس رات کھانے کی میز پر بتایا۔ "لوگ قرض کی ادائیگی کے لیے اپنے مکان بیچ رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ کو بے دخلی کے نوٹس بھی جاری ہو چکے ہیں اور ان کے مکین دوسری جگہ منتقل ہو گئے ہیں۔ اب ہم ان مکانوں کو بیچ بھی نہیں سکتے۔ اس لیے جب کوئی موقع آئے تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔"

برنیڈا کی باتوں میں کچھ ایسا جادو تھا کہ ڈیل ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔ وہ کامیابی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس کی انگلیوں میں بیش قیمت انگوٹھیاں اور جسم پر قیمتی سلک کا لباس تھا۔ اس کے گھر سے اسپرنگ ویلی کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ جس کے نیلے پانی میں فینسی کشتیاں تیر رہی تھیں۔ باہر پورچ میں ایک جگمگاتی لیکسس کار کھڑی تھی۔ دیواروں پر سنہری فریم میں تصاویر آویزاں تھیں اور پورے ہال میں قالین بچھا ہوا تھا۔ سجاوٹ کے لیے جگہ جگہ پورسلین کے بنے ہوئے جانور گائے، ہرن اور بندر وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر کسی چڑیا گھر کا گمان ہوتا تھا۔

میں اس شان و شوکت سے بالکل مرعوب نہیں ہوئی بلکہ تھوڑی سی بے چینی محسوس کرنے لگی اس لیے کہ برنیڈا کا سلوک کچھ اچھا نہ تھا۔ میں گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تو اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے میری کمر میں کچھ لگا ہوا ہے اور جب میں نے وہاں رکھا ہوا ایک خوب صورت جانور اٹھا کر دیکھا تو وہ یوں ڈر گئی جیسے میں اسے گرا دوں گی یا چوری کرلوں گی۔ کھانے میں بھی اس نے ہمارے سامنے پنیر اور بسکٹ رکھ دیے۔ اس کے ساتھ ایک پلیٹ میں تھوڑا سا بھنا ہوا گوشت بھی تھا جسے دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ کافی دیر سے فریج میں رکھا ہوا تھا۔

کھانے کے بعد ڈیل نے کام کی بات چھیڑ دی اور برنیڈا سے پوچھا۔ "ان مکانات کو فروخت کرنے کے لیے ہماری حکمت عملی کیا ہوگی؟"

"ڈیل۔" وہ اسے مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ "میں صرف یہی کہہ سکتی ہوں کہ تم اپنا کام خود کرو گے۔ اعتماد اس کی کنجی ہے۔ تمہیں جو موقع ملے، اس سے فائدہ اٹھاؤ۔"

مجھے اس کی بات سن کر بہت غصہ آیا کیونکہ یہ کوئی معقول جواب نہیں تھا۔ میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"کیا مجھے اور ڈیل کو کسی ہوٹل میں چلے جانا چاہیے؟"

"میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔" برنیڈا نے کہا۔ "تم لوگ یہاں ٹھہر سکتے ہو۔"

"نہیں، میں تمہیں پریشان کرنا نہیں چاہتی۔" میں نے ڈیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ شاید وہ بھی میری تائید کرے۔

"بالکل نہیں۔" برنیڈا مسکراتے ہوئے بولی۔ "یہ بھی ڈیل کا ہی گھر ہے۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ہمارا کمرا کون سا ہے؟"

"ہمارا؟" وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ "میں نے اس پر غور نہیں کیا۔"

میں نے اس کی بات کو اہمیت نہیں دی۔ برنیڈا کے پاس بچوں کے دو کمرے تھے۔ ہر ایک میں جڑواں بستر

موجود تھا۔ ایک کی دیواروں پر سپر مین اور دوسرے میں اسٹار وارز کے پوسٹرز لگے ہوئے تھے۔

''تمہاری بہن مجھے پسند نہیں کرتی۔'' وہ دفتر میں ہمارا پہلا دن تھا اور ہم شام میں اپنا سامان ایک چھوٹے سے اسٹور میں رکھ رہے تھے جو ڈیل نے کرائے پر لیا تھا اور یہ جگہ بھی برنیڈا نے ہی بتائی تھی۔

''وہ تمہیں بہت پسند کرتی ہے۔'' اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

وہ جگہ بہت بڑی تھی اور اس میں ایک ٹریلر بلکہ کار بھی آسکتی تھی۔ ''تم نے اتنی بڑی جگہ کرائے پر کیوں لی؟'' میں نے پوچھا۔

''اس لیے کہ اس وقت یہی دستیاب تھی۔'' اس نے ایک باکس کونے میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے لوئیس، اگر برنیڈا تمہیں پسند نہیں کرتی۔''

''گویا تم اعتراف کرتے ہو۔'' میں نے کہا۔

''وہ مجھے ایک اچھی جاب دے رہی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اور دیکھو اس نے تمہیں بھی ایک کام کی پیشکش کر دی۔''

صبح ناشتے کی میز پر برنیڈا نے مجھ سے کہا تھا کہ کیا میں استقبالیہ پر کام کر سکتی ہوں اور اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتی، وہ ہم دونوں کو اپنے ساتھ لے کر آ گئی۔ اس نے کوئی احسان نہیں کیا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ شروع سے ہی یہ منصوبہ بنائے بیٹھی تھی۔ اس نے پورا اسکرپٹ تیار کر رکھا تھا۔ ایک گلابی رنگ کے کارڈ پر سیاہ مارکر سے جلی حروف میں 'استقبالیہ' لکھا ہوا تھا اور اس کے نیچے وہ جملے درج تھے جو مجھے کسی فون کال کے جواب میں بولنا تھے۔ مثلاً گڈ مارننگ، گڈ آفٹرنون۔ گریسن ریلٹی میں خوش آمدید۔ آپ کس سے بات کرنا چاہیں گے۔'' اس کے نیچے اس نے لکھا تھا۔ اگر کوئی دفتر میں داخل ہو تو اس سے کہنا۔ ''میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں۔''

''اور اگر بارش ہو رہی ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

برنیڈا کو یہ سوال پسند نہیں آیا اور وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''رویہ ہی سب کچھ ہوتا ہے لوئیس۔''

شاید ڈیل بھی میرے رویے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے کار کے گلوو کمپارٹمنٹ سے گن نکالی اور اسے پرانے ٹی وی کے پیچھے چھپا دیا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ ابھی تک اپنی پرانی زندگی کو نہیں بھول پایا ہے۔

''کیا تم نے سنا تھا کہ گزشتہ شب تمہاری بہن کیا کہہ رہی تھی جب تم نے اسے بتایا کہ ہمارے پاس اتنا سامان ہے کہ اس کے لیے اسٹور کی ضرورت ہو گی؟''

''اس نے کہا تھا کہ وہ ہمارے لیے ایک اسٹور کا انتظام کر سکتی ہے جو اس کے استعمال میں ہے۔''

''اسے اسٹور کی کیا ضرورت ہے۔ اس نے ہر چیز تو اپنے گھر میں بھری ہوئی ہے۔''

''لوئیس۔'' اس نے مجھے گھورا جیسے کہہ رہا ہو کہ اب بس بھی کرو۔

''صرف میں ہی نہیں ڈیل۔ تم نے غور کیا کہ وہ تمہارے ساتھ کیسا برتاؤ کر رہی تھی۔ جس طرح اس نے تمہیں ملٹی پل سروس کے بارے میں بتایا، اس سے لگ رہا تھا کہ تم نے پہلے کبھی کمپیوٹر نہیں دیکھا اور تمہیں لاک باکس کے بارے میں بھی بتاتے ہوئے اس کا رویہ تحقیر آمیز تھا کہ اسے کس طرح سنبھالنا ہے اور کھونا نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔''

''وہ صرف مجھے سمجھا رہی تھی۔'' ڈیل نے کہا۔

''تم صحیح سمجھے۔'' میں نے طنزاً کہا۔ ''وہ ہم دونوں کو ہی سمجھا رہی تھی۔''

آئندہ چند ہفتوں تک برنیڈا اسے کاروبار کے بارے میں بتاتی رہی۔ اسی نے ڈیل کو کام کا شیڈول بنا کر دیا۔ کس وقت اسے ان مکانوں کے بارے میں معلوم کرنا ہے جنہیں فروخت کیا جا سکتا ہے اور کس وقت ان کی فہرست دیکھنی ہے۔ اتوار کی سہ پہر کو ان مکانوں کے بارے میں ایک نمائش منعقد کرنی ہے۔ وہ جو کچھ بھی کرے، اسے ایک رجسٹر میں لکھتا جائے اور وہ ہفتے میں دو مرتبہ کسی اسکول ٹیچر کی طرح اسے چیک کرے گی۔

''میں نے ٹیلی فون کالز کا بھی ایک شیڈول بنایا ہے۔'' ایک دن اس نے کہا۔ ''منگل کو سہ پہر میں دو گھنٹے اور دو گھنٹے جمعرات کی صبح۔''

ڈیل نے ایک نکتہ اٹھایا۔ ''برنیڈا، ان اوقات میں گھر پر کون ہو گا سوائے گھریلو خاتون کے۔''

میرا کام نسبتاً آسان تھا۔ مشکل سے ہی کبھی کوئی فون آتا اور میں اسے برنیڈا کو ٹرانسفر کر دیتی۔ برنیڈا نے مجھے اور ڈیل کو موبائل فون دے رکھے تھے جنہیں وہ اسمارٹ فون کہا کرتی تھی۔ یہ دونوں فون اس کے نام پر رجسٹرڈ تھے۔ برنیڈا چاہتی تھی کہ ہم دونوں اپنے تعلقات بڑھائیں جو کسی بھی کاروبار میں کامیابی کے لیے ضروری

ہیں۔ اس نے ڈیل کو آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ روٹری کلب میں شمولیت اختیار کرے۔ اسی طرح میں بھی برج کلب کی رکن بن جاؤں جبکہ میں نے زندگی میں کبھی برج نہیں کھیلی تھی۔ وہ کئی بار ڈیل سے پرانی نووا بیچنے اور نئی کار خریدنے کے بارے میں کہہ چکی تھی۔

”کامیاب ہونے کے لیے ضروری ہے کہ تم خود بھی کامیاب نظر آؤ۔“

”میں بھی اپنے آپ میں کوئی تبدیلی لاسکتی ہوں۔“

وہ میرے طنز کو نہ سمجھ سکی اور بولی۔ ”آج کل کاروباری دنیا میں لمبے اسکرٹ کا رواج چل رہا ہے۔“

اس بات کو چھ ہفتے گزر گئے لیکن کچھ بھی نہیں بدلا۔ ہماری جمع پونجی تیزی سے ختم ہو رہی تھی۔ اس دوران میرے اور ڈیل کے درمیان فاصلے بڑھ گئے۔ ایک دن ڈیل نے اس سکوت کو توڑا۔ وہ ایک روز دفتر آیا اور بولا۔

”لوئیس! میں نے ایک پروگرام بنایا ہے۔“ اس نے بالکل اسی انداز میں کہا جس طرح وہ نیو میکسیکو میں ڈنر پر باہر جانے کے لیے کہا کرتا تھا۔

وہ جمعے کا دن تھا اور برنیڈا دفتر میں دیر تک بیٹھا کرتی تھی۔ باہر اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اس وقت ڈیل کو کام کے سلسلے میں باہر ہونا چاہیے تھا لیکن اس کے جسم سے پھوٹنے والی کولون کی مہک بتا رہی تھی کہ وہ گھر سے تیار ہو کر آیا ہے۔ میں نے پوچھا۔ کیا مجھے کپڑے تبدیل کرنے کی ضرورت ہے؟“

”پریشان مت ہو۔“ وہ بولا۔ ”میرے پاس ہر وہ چیز ہے جس کی تمہیں ضرورت ہو سکتی ہے۔“

یہ میرے سوال کا جواب نہیں تھا لیکن میں خاموش رہی۔ اسی وقت برنیڈا بھی دفتر سے باہر آگئی اور ڈیل کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ڈنر پر جا رہے ہو؟“

”یونہی سمجھ لو۔ آج ہماری ڈیٹ ہے۔“ اس نے برنیڈا کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”زیادہ دیر مت لگانا۔“ اس نے تنبیہ کرنے کے انداز میں کہا۔

”ہمارا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔“ ڈیل نے کہا۔ اس کے لہجے میں تبدیلی دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔

کار میں سوار ہوتے وقت میں نے ڈیل سے پوچھنا چاہا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں لیکن اس نے مجھے ٹال دیا۔ جب ہماری کار اولڈ ٹاؤن روٹ چھیاسٹھ سے گزری تو مجھے کسی ایڈونچر کا احساس ہونے لگا۔ شاید اس رات کی حد

تک ایک اور نئی شروعات ہونے والی تھی۔ میں ٹھیک طرح نہیں بتا سکتی کہ ہم کہاں گئے تھے۔ وہ ایک چھوٹا سا علاقہ تھا اور وہاں تقریباً سبھی مکانات بند پڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ میں رہائش اختیار نہیں کی گئی تھی اور کچھ بینک کو واپس کر دیے گئے تھے۔ اندھیرا پھیل چکا تھا اور بیشتر مکانات تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ البتہ جو مکان فروخت ہو چکے تھے، ان میں سے روشنی آ رہی تھی۔

اچانک ڈیل نے گاڑی روک دی اور بولا۔ ''تیار ہو جاؤ۔''

''یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟'' میں حیران ہوتے ہوئے بولی۔

''مجھ پر بھروسا رکھو۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا پھر اس نے گلو باکس سے ٹارچ نکالی اور دروازہ کھول دیا۔

وہ سڑک کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا ایک ایسے مکان کے سامنے جا کر رک گیا جس پر برائے فروخت اور بینک کی ملکیت ہے، کے بورڈ لگے ہوئے تھے۔ اس نے آہستہ سے میرا بازو پکڑا اور ہم ایک بڑے پورچ کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ بیرونی دروازے پر ویسا ہی لاک باکس لگا ہوا تھا۔ ڈیل نے اسے کھولنے کے لیے وا کی ٹا کی الیکٹرانک گیجٹ کا استعمال کیا۔

گھر کا اندرونی حصہ بالکل خالی تھا۔ بڑے بڑے کمرے اور خالی دیواریں۔ کھڑکیوں سے چاند کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ میں نے لائٹ کا سوئچ آن کیا لیکن کچھ نہیں ہوا۔

''اس مکان کو بیچنے پر پابندی ہے۔'' ڈیل نے کہا۔ ''اکثر اوقات ایسے مکانات کی بجلی منقطع کر دی جاتی ہے۔'' اس نے ٹارچ روشن کی اور مجھے کچن میں لے گیا۔ وہاں اسٹین لیس اسٹیل کے برتن، گرینائٹ سے بنا کاؤنٹر اور شیشے کے دروازوں والے کیبنٹ لگے ہوئے تھے۔ میں نے ہمیشہ ایسے ہی کچن کا خواب دیکھا تھا۔ میں جانتی تھی کہ وہاں ماسٹر بیڈ روم بھی ہوگا جس میں جہازی سائز کے بیڈ ہوں گے۔

''برینڈا کہتی ہے کہ اس طرح کے مکانوں میں مالکان جاتے وقت اپنی چیزوں کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں لیکن یہاں ایسا نظر نہیں آ رہا۔'' ڈیل نے کہا۔ ''دیکھو، یہاں ہر چیز سلیقے اور ترتیب سے رکھی ہوئی ہے۔''

اس نے ایک بار پھر میرا بازو پکڑا اور بولا۔ ''آگے چلو۔''

کچن کے برابر میں لیونگ روم تھا اور اس کے وسط میں دو سلیپنگ بیگز، کچھ بڑی موم بتیاں، ایک پکنک باسکٹ اور کونے میں میرا سوٹ کیس رکھا ہوا تھا۔ ڈیل موم بتیاں جلانے کے لیے جھکا اور اسے دیکھ کر مجھے پہلی بار حقیقی خوشی کا احساس ہوا جو کیلی فورنیا آنے کے بعد ملی تھی۔ میں جانتی تھی کہ ڈیل نے ابھی تک کوئی مکان نہیں بیچا اور اس گتیا نے اسے پھوٹی کوڑی بھی نہیں دی ہوگی۔ میں وکٹورول میں رہنے کے خلاف تھی اور چاہتی تھی کہ جلد از جلد نئے مکان میں منتقل ہو جائیں۔

''ڈیل! تم یہ مکان خرید رہے ہو۔ یہ میرے لیے حیرت کی بات ہے۔''

''اوہ۔'' اس نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ فی الحال میں ایسا مکان خرید سکتا ہوں۔ تم جانتی ہو کہ ان دنوں کاروبار کی کیا حالت ہے۔''

میرے دل میں کوئی چیز چھن سے ٹوٹ گئی۔ ایک بار پھر خواب بکھر گئے تھے۔ میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''تم جو کچھ سوچ رہے تھے، اسے میں ایک وعدہ سمجھوں؟''

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا پھر اس نے شیمپین کی بوتل اٹھائی اور اسے کھولتے ہوئے بولا۔ ''میرے پاس آ جاؤ۔ آج کی رات ہماری ہے۔ اس کے بعد بھی ہمارے پاس بہت وقت ہے۔''

وہ یہ توقع کر رہا تھا کہ اس رومان پرور ماحول میں ایک اسکول گرل کی طرح دوڑ کر اس سے لپٹ جاؤں گی لیکن میں نے ایسا نہیں کیا اور کر بھی نہیں سکتی تھی۔ بالآخر ڈیل اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''یہ ہمارے لیے ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا گلاس میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے بحالت مجبوری ایک گھونٹ لے لیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی، سامنے والی کھڑکی سے نیلی روشنی نظر آنے لگی جو یقیناً پولیس کار کی تھی۔

ڈیل تیزی سے فرش پر گر گیا اور اس نے قدرے نیچی آواز میں مجھ سے بھی نیچے آنے کے لیے کہا۔ لیکن میں نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ اس نے میرا بازو کھینچا اور میرے گلاس میں بھری شیمپین قالین پر گر گئی۔ اس سے میری پتلون کا کچھ حصہ بھی گیلا ہو گیا۔ چند منٹوں بعد ڈیل رینگتا ہوا گیا اور اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ وہ اسی طرح رینگتا ہوا واپس آیا اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ''سڑک کے دوسری جانب ایک کار کھڑی ہے اور بس۔''

''کیا ہم خوش قسمت نہیں ہیں؟'' میں اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔

''ہاں۔'' ڈیل قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''ایک منٹ کے لیے تو میں یہی سمجھا تھا کہ آج کی شام بھی غارت ہوئی۔''

میری آنکھوں میں آنسو آگئے لیکن وہ نہیں دیکھ سکا۔ اس نے مجھے تسلی دینے کے انداز میں کہا۔ ''یہ کار چلی جائے تو میں دوبارہ موم بتیاں روشن کردوں گا پھر ہمارے پاس پوری رات ہوگی۔''

''ڈیل! سچ تو یہ ہے کہ میں نہیں جانتی ہم کیا کررہے ہیں۔ میں گھر جانا چاہتی ہوں۔ ہم ایک ایسے مکان میں رہ رہے ہیں جو ہمارا نہیں ہے اور اس وقت ہم جس مکان میں بیٹھے ہوئے ہیں، وہ بھی ہمارا نہیں ہے اور نہ ہی کبھی ہوسکتا ہے۔''

''لوئیس! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔'' ڈیل نے کہا اور میں حیران رہ گئی۔ اس نے کبھی اس طرح کھل کر اظہارِ محبت نہیں کیا تھا۔ ''مجھے افسوس ہے۔ میں جانتا ہوں کہ......''

میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ اس کے بعد وہ کیا کہنے والا تھا لیکن تصور کرسکتی تھی۔ میں نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی اور بولی۔ ''اب تک میں تمہارے خالی الفاظ ہی سنتی رہی ہوں اور اب میں اس کی عادی ہوتی جارہی ہوں۔''

اس کے بعد وہ مجھ سے کچھ اور دور ہوگیا۔ دفتر میں اس طرح پیش آتا جیسے میں اس کی محبوبہ نہیں بلکہ ساتھی ہوں۔ اس نے دیر تک دفتر سے باہر رہنا شروع کردیا جیسے وہ بہت مصروف ہو حالانکہ بظاہر مکانوں کا کوئی خریدار نظر نہیں آرہا تھا لیکن میں نے اس کی زیادہ پروا نہیں کی۔

یہاں تک کہ اس نے برنیڈا کی میٹنگز میں بھی جانا چھوڑ دیا۔ ''اس لڑکے کو میری بات سننی چاہیے۔'' وہ ڈیل کی غیر موجودگی میں مجھ سے شکایت کرتی۔ ''میں اس پر بہت زیادہ انحصار کررہی ہوں۔''

میں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ وہ کہاں جاتا ہے۔ کیا کرتا ہے اور رات کو اتنی دیر سے گھر کیوں آتا ہے لیکن جب اس روز پولیس والے ہمارے دفتر آئے تو میری سمجھ میں سب کچھ آگیا۔

''ہم اس مسئلے کو بہ آسانی حل کرسکتے ہیں۔'' برنیڈا نے دفتر سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں پولیس والے بھی اس کے ہمراہ تھے۔ ''ڈیل تمہارے پاس لاک باکس کا کارڈ ہے؟''

''کیا کوئی مسئلہ ہوگیا ہے آفیسر؟'' ڈیل نے پوچھا۔

''نقب زنی کی وارداتیں ہورہی ہیں۔'' پولیس والوں سے پہلے برنیڈا بول اٹھی۔ ''کوئی شخص خالی مکانوں میں گھس کر چوریاں کررہا ہے جیسے مائیکرو ویو وغیرہ۔''

''اور بھی کئی چیزیں ہیں۔'' جیکل نے کہا۔ ''جیسے ٹونٹیاں، دروازوں کے ناب، کیبنٹ ناب، ان میں سے کچھ بہت فینسی اور قیمتی ہیں۔''

''یہاں تک کہ گرینائٹ کا کاؤنٹر بھی۔'' ہائیڈ نے کہا۔ ''ایسا کئی مکانوں میں ہوچکا ہے۔''

''لیکن اسے نقب زنی نہیں کہہ سکتے۔'' جیکل نے کہا۔ ''وہ شخص دروازہ کھول کر اندر آتا ہے اور سامان سمیٹ کرلے جاتا ہے۔''

برنیڈا سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''انہیں شبہ ہے کہ شاید اس میں کوئی ایجنٹ ملوث ہو۔ کیا تم ایسا سوچ سکتے ہو؟''

جیکل نے ایک بار پھر ڈیل کی طرف دیکھا اور اس کا چہرہ زرد پڑگیا۔

''ہم یہاں صرف یہ تصدیق کرنے آئے ہیں کہ کسی کا کی کارڈ تو نہیں کھوگیا۔'' ہائیڈ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیونکہ اس طرح بہت کچھ واضح ہوجائے گا۔''

''ہمارے پاس اس ریکارڈ کو چیک کرنے کے لیے عدالتی حکم بھی موجود ہے۔'' جیکل نے کہا۔

''ڈیل! تم انہیں اپنا لاک باکس کارڈ دکھا دو۔'' برنیڈا نے کہا۔

ڈیل اپنی میز تک گیا اور اس کی دراز کھولتے ہوئے بولا۔ ''کارڈ یہاں موجود ہے۔''

''ہمارا اصول ہے کہ اگر چابیاں استعمال میں نہ ہوں تو انہیں متعلقہ میز میں رکھا جاتا ہے۔'' برنیڈا نے کہا۔

''کیا تمہاری میز مقفل رہتی ہے؟'' جیکل نے پوچھا۔

ڈیل سے پہلے برنیڈا نے کہا۔ ''پورا دفتر ہی مقفل رہتا ہے جب یہاں کوئی نہ ہو۔ اگر میں اور ڈیل باہر جاتے ہیں تب بھی لوئیس یہاں موجود رہتی ہے۔ کیوں لوئیس! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔''

میں نے تائید میں سر ہلا دیا۔ ''میں صرف باتھ روم تک ہی جاتی ہوں اور شاید ہی اس دوران میں یہاں کوئی آتا ہو۔''

"اس طرح کی بے پروائی ناقابلِ قبول ہے۔"

برنیڈا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اسی وجہ سے میں نے پہلے والی لڑکی کو نکال دیا تھا۔"

"برنیڈا!" ڈیل نے کہا۔ "تم لوئیس کو موردِ الزام ٹھہرا رہی ہو حالانکہ چابیاں یہاں موجود ہیں۔"

"لیکن ہم یہ کیسے یقین کر لیں کہ یہ چابیاں ہر وقت یہاں ہوتی ہیں۔" برنیڈا نے کہا۔

اس مرحلے پر جیکل نے مداخلت کی اور کہا۔ "اگر میں صحیح طریقے سے سمجھ سکا ہوں تو یہ ممکن ہے کہ تمہارے بھائی کی چابی گم ہوگئی ہو۔"

"میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں آفیسر۔" ڈیل نے کہا۔ "کہ میں زیادہ وقت دفتر سے باہر گزارتا ہوں اور میری پوری دوپہر مکانات کو دیکھنے میں گزرتی ہے ....."

برنیڈا نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی اور بولی۔ "اس بات کا بالکل بھی امکان نہیں کہ ڈیل وڈ کی چابی ان وارداتوں میں استعمال ہوئی ہو۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ یہ ان جرائم میں ملوث نہیں ہے اور اس کے پاس دن بھر کی مصروفیت کا پورا ریکارڈ ہوتا ہے جس سے تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ اس نے اپنا وقت کہاں گزارا ہوگا۔"

"کیا تم وہ ریکارڈ ہمیں دکھانا پسند کرو گے؟" جیکل نے کہا۔

"دراصل۔" ڈیل نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس میں ہر بات نہیں لکھی۔ رات میں کئی مرتبہ میں ایک مکان پر رکا جو خالی تھا......"

مجھے لگا کہ ڈیل اس خالی مکان کے بارے میں اعتراف کرنے والا ہے جہاں وہ مجھے اس رات لے کر گیا تھا۔ اس مرحلے پر برنیڈا نے ایک مرتبہ پھر مداخلت کی اور کمپنی کے طریقوں اور پروٹوکول کے بارے میں بتانے لگی۔ جیکل اور ہائیڈ نے کرید کرید کر سوالات کیے کہ ڈیل کہاں کہاں جاتا رہا اور اس نے کیا کیا دیکھا۔ ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ ڈیل کو ہی مشتبہ سمجھ رہے ہیں لیکن انہوں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔

ڈیل نے اس سے قبل نیو میکسیکو میں جو جرائم کیے، ان کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی اور جب اسے پیسوں کی ضرورت ہوتی تبھی وہ کوئی جرم کرتا تھا اور یہاں بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ کمیشن کے نام پر ابھی تک اسے اپنی بہن سے ایک ڈالر بھی نہیں ملا تھا اور ہم جو رقم ساتھ لے کر آئے تھے، وہ تیزی سے ختم ہو رہی تھی۔ اس لیے اگر ڈیل اس جرم میں ملوث ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں تھی۔

جب پولیس والے چلے گئے اور برنیڈا کی چیخ پکار ختم ہوگئی تو میں نے آہستہ سے کہا۔ "ڈیل! تم نے مجھے یہ سب کیوں نہیں بتایا؟"

"کیا نہیں بتایا؟" اس نے پوچھا۔

"یہی کہ تم چوریاں کرتے رہے ہو۔"

"میں نے کچھ نہیں چرایا۔" وہ گھگیاتے ہوئے بولا۔ "کیا تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں ہے؟"

میں خاموش ہوگئی۔ اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ میرے سامنے ان چوریوں کا اقرار کر لیتا۔ ایسے آدمی کے ساتھ تعلق برقرار نہیں رکھا جا سکتا تھا لیکن کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے میں معاملے کی تہ تک پہنچنا چاہتی تھی۔ مجھے اپنے طور پر معلوم کرنا تھا کہ وہ کیا کرتا ہے اور کہاں جاتا ہے۔

چند روز بعد میں نے وہ فون اٹھایا جو برنیڈا نے ڈیل کو دیا تھا اور اپنا فون وہیں رہنے دیا۔ دیکھنے میں دونوں ایک جیسے تھے۔ میں برنیڈا سے شاپنگ کا بہانہ کر کے نکلی اور مال پر واقع شیک اوور سے اس فون میں ایک ٹریکنگ ڈیوائس لگوالی۔ واپسی میں کچھ دیر کے لیے اس اسٹور پر رکی جہاں ہمارا سامان رکھا ہوا تھا۔ میں حیران تھی کہ ڈیل کب سے ان چوریوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ لگتا ہے کہ شاید اس نے بہت پہلے سے یہ اسکیم تیار کر رکھی تھی۔

لیکن مجھے وہاں اپنے سامان کے علاوہ کوئی مائیکرو ویو یا دوسری چیز نظر نہیں آئی۔ وہ گن بھی اسی طرح ٹی وی کے پیچھے رکھی ہوئی تھی اور اس کا کوئی امکان نہیں تھا کہ وہ اسے استعمال کر رہا ہو۔ میں نے واپس آ کر ڈیل کا فون اسی جگہ رکھ دیا۔ اب مجھے اس کے اگلے قدم کا انتظار تھا۔

اگلے دو دنوں میں کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ ڈیل معمول کے مطابق لوگوں کو فون کرتا رہا اور زیادہ وقت اپنی میز پر ہی رہا۔ سب کچھ معمول پر آ گیا تھا لیکن میں مطمئن نہیں تھی۔ مجھے "دیکھو اور انتظار کرو" کی پالیسی پر عمل کرنا تھا۔

ایک روز سہ پہر میں ہائیڈ اکیلا ہی ہمارے دفتر آیا اور اس نے ڈیل کو دو مکانوں کی کچھ تصویریں دکھا کر پوچھا کہ کیا وہ کبھی وہاں جا چکا ہے اور کیا اس نے وہاں کوئی مشتبہ چیز دیکھی۔ اس طرح وہ ڈیل پر یہ ظاہر کرنا چاہ رہا تھا کہ وہ اسے مشتبہ نہیں بلکہ چشم دید گواہ سمجھتا ہے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتی لیکن ایک دو مرتبہ میں نے کھڑکی کے شیشے سے اسے یا جیکل کو دفتر کے باہر کونے پر کھڑا یا کار میں بیٹھا

دیکھا تھا اور جتنی بار کوئی مکان دیکھنے یا کسی گاہک کو ساتھ لے کر گیا، وہ اس کے پیچھے لگ گئے۔

صرف وہی اس کا تعاقب نہیں کر رہے تھے بلکہ ہر گزرتے دن کے ساتھ میں بھی ٹریکر کی پریکٹس کر رہی تھی جو میں لے کر آئی تھی۔ ریڈیو شیک کے کلرک نے غلط نہیں کہا تھا۔ میں اپنے فون سے ڈیل کی نقل و حرکت مانیٹر کر سکتی تھی۔ اس کے بعد میں اس رجسٹر سے بھی وہ نام اور پتے چیک کرتی جو برنیڈا نے اسے دیا تھا۔ میں اپنے فون میں جو کچھ دیکھتی، رجسٹر سے اس کی تصدیق ہو جاتی تھی لیکن کئی بار ایسا ہوا کہ اس نے ایک مختلف راستہ اختیار کیا۔ وہ ہائیڈ اور جیکل کو چکر دینا چاہ رہا تھا یا اس نے کوئی اور ٹھکانا تلاش کر لیا تھا۔ دونوں ہی صورتوں میں اس پر شبہ کیا جا سکتا تھا۔

ایک روز ڈیل کو اس کے موبائل فون پر ایک کال موصول ہوئی جو برنیڈا نے اسے دیا تھا۔ میں چونک گئی کیونکہ کاروباری معاملات دفتر کے فون پر طے ہوتے تھے۔ وہ کافی دیر سرگوشیوں میں بات کرتا رہا پھر اس نے مجھ سے کہا۔ ”برنیڈا کو بتا دینا کہ میں باہر جا رہا ہوں۔“ جب کال ختم ہوگئی تو وہ بولا۔ ”ڈنر پر میرا انتظار مت کرنا۔“

”اگر کوئی ضروری بات ہوئی تو تمہیں فون پر بتا دوں گی۔“ میں نے کہا۔ ”اپنا فون ساتھ لے کر جانا۔“

میرے منصوبے کا پہلا حصہ شروع ہو چکا تھا۔ میں نے دس منٹ انتظار کرنے کے بعد ٹیکسی کے لیے فون کیا اور اسے ہدایت کی کہ وہ ایک بلاک کے فاصلے پر میرا انتظار کرے پھر میں نے برنیڈا کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا اور بولی۔

”ڈیل کسی کام سے گیا ہے اور مجھے ابھی ابھی یاد آیا کہ میرا ہیئر ڈریسر سے اپائنٹمنٹ ہے۔“

برنیڈا نے آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔ ”مجھے دفتر میں اکیلا رہنا ہوگا۔“

”ویسے بھی دفتر بند ہونے کا وقت ہو رہا ہے۔“ میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا اور دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔

سڑک پر آ کر میں نے ٹریکر آن کیا۔ ڈیل زیادہ دور نہیں گیا تھا۔ دو منٹ بعد ٹیکسی بھی آ گئی۔ اس کار کا تعاقب کرنا میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ ہر دو منٹ بعد مجھے ٹیکسی ڈرائیور کو بتانا پڑ رہا تھا۔ اس کی کار روٹ 66 سے گزرتی ہوئی ساتویں اسٹریٹ پر پہنچی پھر اس نے مزید دو موڑ کاٹے پھر وہ ایک بڑے سے چوراہے پر پہنچ جس کے ایک طرف میکڈونلڈ اور دوسری طرف گھنی جھاڑیاں تھیں۔ میں نے مڑ کر اطمینان کرنا چاہا کہ جیکل یا ہائیڈ تو ڈیل کا پیچھا نہیں کر رہے۔

”خاتون! کیا تمہیں یقین ہے کہ کہاں جانا ہے؟“ ٹیکسی ڈرائیور نے پوچھا۔

”فی الحال نہیں۔“ میں نے اسے فون دکھاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔“

”بے چارہ۔“ میں نے اسے کہتے ہوئے سنا۔ شاید وہ مجھے ایک ایسی عورت سمجھ رہا تھا جو اپنے بے وفا خاوند کا پیچھا کر رہی تھی۔

”گاڑی روک دو۔“ میں نے فون پر نظریں جماتے ہوئے کہا جس میں اس جگہ کی نشاندہی ہو رہی تھی جہاں ڈیل کا روٹ ختم ہو گیا تھا۔ وہاں دو مکان فروخت ہو چکے تھے اور کچھ خالی پڑے تھے۔ ان میں سے ایک زیر تعمیر تھا۔ میں نے ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر وہاں سے روانہ کر دیا۔ میں اس کونے سے مڑی تو مجھے ڈیل کی کار ایک ایسے مکان کے سامنے کھڑی نظر آئی جس پر برائے فروخت کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ ڈیل ابھی تک کار میں ہی بیٹھا ہوا تھا۔ لہٰذا میں جلدی سے ایک زیر تعمیر مکان کے گیراج میں گھس گئی گو کہ وہاں خاصا کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا اور وہاں مجھے ایک ناگوار سی بو محسوس ۔۔ ہو رہی تھی لیکن وہاں سے کم از کم ڈیل پر نظر رکھ سکتی تھی۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ کسی کا انتظار کر رہا ہے۔

ممکن ہے کہ وہ کسی گاہک کا انتظار کر رہا ہو۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اپنی شام کے ضائع ہونے کا افسوس ہوا اور میں واپس جانے کے لیے ٹیکسی کو فون کرنے کے بارے میں سوچنے لگی لیکن پھر مجھے وہ سرگوشیاں یاد آ گئیں جو ڈیل فون پر کر رہا تھا۔ کسی گاہک سے اس طرح بات نہیں کی جاتی۔ پھر میرے ذہن میں ایک اور بات آئی۔ ممکن ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کا انتظار کر رہا ہو جس کے ساتھ وہ مل کر کام کر رہا ہے۔ وہ خود چیزیں نہیں چراتا بلکہ اس نے کسی دوسرے شخص کو اس کام پر لگا رکھا ہے۔ گویا اس نے مجھ سے سچ ہی کہا تھا کہ اس نے خود کوئی چیز نہیں چرائی۔

میں نے ایک بار پھر قرب و جوار کا جائزہ لیا کہ شاید جیکل اور ہائیڈ نظر آ جائیں لیکن ان کا کہیں پتا نہ تھا۔ چند منٹوں بعد ایک دوسری کار مکان کے ڈرائیو وے میں آ کر رکی اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس میں سے ایک عورت اتری اور اس نے ڈیل کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ وہ سنہرے بالوں والی طویل قامت عورت تھی اور مختصر لباس

میں اس کی ٹانگیں نمایاں ہورہی تھیں۔ ڈیل اپنی کار سے اتر کر اس کی جانب بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں ویسی ہی ٹارچ تھی جب وہ مجھے ساتھ لے کر اس خالی مکان میں گیا تھا۔ ان دونوں نے مختصر گفتگو کی پھر ڈیل نے آہستہ سے اس کا بازو پکڑا، اور وہ دونوں پورچ کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

وہ مکان میں داخل ہوئے۔ مجھے کھڑکی کے شیشوں سے ٹارچ کی روشنی نظر آرہی تھی۔ میں محتاط انداز میں آگے بڑھی اور ایک کھڑکی سے اندر جھانکنے لگی۔ میں نے انہیں ماسٹر بیڈروم میں جاتے ہوئے دیکھا۔ میں نے مکان کے عقبی حصے میں جاکر اندر جھانکنے کی کوشش کی لیکن کھڑکی سے ٹارچ کی مدھم روشنی کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔

میں نے اپنے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ ممکن ہے کہ وہ عورت ایک گاہک ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ وہی چور ہو جس کے بارے میں، میں سوچ رہی تھی۔ کیا عورتیں چوری نہیں کرسکتیں لیکن وہ لڑکی بہت خوب صورت اور نوجوان تھی۔ میرے دل میں شک کا ناگ سر اٹھانے لگا۔ میں حیران ہورہی تھی کہ ڈیل اتنا احمق ہوسکتا ہے جبکہ مجھے یہ سوچنا چاہیے تھا کہ کیا میں اتنی بے وقوف ہوسکتی ہوں۔

جب انہیں بیڈروم میں گئے کافی دیر ہوگئی تو مجھ سے برداشت نہ ہوسکا اور میں نے اپنے منصوبے کے دوسرے حصے پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے پولیس کو فون کر کے اس مکان کا نمبر بتایا اور دوسرا فون ٹیکسی کو بلانے کے لیے کیا تاکہ وہ مجھے گھر لے جائے۔

میں جیسے تیسے آفس واپس آئی تو میرا ٹکراؤ برنیڈا سے ہوگیا۔

''تمہارے بال تو ویسے ہی ہیں۔'' برنیڈا نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

''میں غلطی پر تھی۔'' میں نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ ''اپائنٹمنٹ آج نہیں تھا۔''

برنیڈا نے بے یقینی سے مجھے دیکھا اور بولی۔ ''کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ ڈیل کب واپس آئے گا؟''

میں نے نفی میں سر ہلا دیا اور سوچنے لگی کہ کیا پولیس نے ڈیل اور اس عورت کو پکڑ لیا ہوگا۔ کیا پولیس انہیں اندر کر دے گی یا معمولی پوچھ گچھ کے بعد انہیں جانے دیا ہوگا۔ سب سے اہم سوال یہ تھا کہ اس کے بعد ڈیل کیا کرے گا اور مجھے کیا کرنا ہوگا۔ میں نے موبائل نکال کر ڈیل کی نقل و حرکت کے بارے میں جاننا چاہا۔ وہ گاڑی چلا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کی گاڑی رک گئی۔ نقشے پر دیے گئے نشان کے مطابق وہ پولیس اسٹیشن تھا۔ اس کے بعد تقریباً ایک گھنٹے تک وہ سگنل وہیں رکے رہے۔

ڈیل کی گاڑی کے رکنے کی آواز سن کر میں کمرے سے باہر آئی۔ برنیڈا کچن میں برتن دھو رہی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ اندر آنے کے بعد وہ مجھ سے کیا کہے گا اور میں جواب میں کیا کہوں گی؟ کیا سچ سامنے آئے گا یا وہ ایک بار پھر جھوٹ کا سہارا لے گا۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''میں پولیس اسٹیشن میں تھا۔''

اسی وقت برنیڈا بھی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے ڈیل کا جملہ سن لیا تھا۔ وہ تیز آواز میں بولی۔ ''مجھے اسی بات کا ڈر تھا۔'' اس کے چہرے پر خوف یا مایوسی کے بجائے غصہ نظر آرہا تھا۔ ''جس دن وہ پولیس والے دفتر آئے اور مجھے معلوم ہوا کہ تم چوری چھپے خالی مکانوں میں رات کے وقت جاتے ہو۔ تب سے میں اسی دن کا انتظار کررہی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ تم دونوں میرے کام میں مددگار ثابت ہو گے۔ میں نہیں جانتی تھی کہ تم نے میری بات کیوں نہیں سنی اور میرے کہنے پر عمل کیوں نہیں کیا۔ اگر ایسا کرتے تو یہ نوبت نہیں آتی۔''

وہ ایک چمچہ صاف کررہی تھی۔ اسے فضا میں لہراتے ہوئے بولی۔ ''اس سے میرے کاروبار پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ میں نے بہت محنت کی ہے اور تم نے جو نقصان کیا ہے، اس کا تو ازالہ کرنا ہی ہوگا لیکن میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گی۔''

وہ کچن میں واپس گئی۔ چمچہ سنک میں رکھا اور فریج سے پنیر کی ٹرے نکالتے ہوئے بولی۔ ''میں نے پہلے ہی ایک وکیل سے بات کرلی تھی جس دن پولیس یہاں آئی تھی تو میں نے اسے فون کر کے بتایا کہ ڈیل اس کاروبار میں نیا ہے اور ابھی پوری طرح اس کے طور طریقوں سے واقف نہیں ہوا۔ اسی طرح لوئیس بھی بے پروا واقع ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ چابیاں غائب ہوگئی ہیں اور اس لڑکی نے ان چیزوں پر نظر نہیں رکھی اگر کوئی مشکل پیش آئی تو اسی پر الزام آئے گا۔''

''مجھ پر؟'' میں نے کچن میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

برنیڈا گھومی اور میری طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''ہاں تم۔ کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی۔ کیا میرے وکیل کو تمہارے ماضی کے بارے میں جاننے سے دلچسپی نہیں ہوگی۔ تم نیو میکسیکو میں جس اسٹور میں کام کرتی تھیں وہاں بھی تو ڈکیتی ہوئی تھی۔ یہ مجھے اس وقت معلوم ہوا

جب میں نے تمہیں آن لائن دیکھا۔''

''تم نے مجھے گوگل پر سرچ کیا؟'' میں نے کہا۔ ''اور اب تم مجھے اس کا الزام دے رہی ہو۔'' میں کہتے کہتے رک گئی کہ وہ ڈکیتی تمہارے بھائی نے ہی کی تھی۔

''اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ مکمل چھان بین کے بغیر میں تمہیں اپنے گھر میں رہنے کی اجازت دے سکتی تھی۔ میں تمہیں بتاؤں گی کہ اس سے کیا فائدہ ہوا؟''

''کیا تم سن رہے ہو ڈیل؟'' میں نے کہا۔ وہ بھی کچن میں آ گیا تھا لیکن میری بات پر اس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ میں دوبارہ برنیڈا کی طرف مڑی اور کہا۔ ''کیا تم سمجھتی ہو کہ ڈیل مجھے چھوڑ سکتا ہے۔''

''میں نے کبھی اسے تمہارے بارے میں بات کرتے ہوئے نہیں سنا۔'' اس کے چہرے پر ایک زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''شاید تم نے غور نہیں کیا کہ وہ زیادہ وقت باہر کیوں رہتا ہے اور یہاں بھی تم سے زیادہ بات نہیں کرتا۔ میں نے سوچا کہ شاید وہ کسی اور عورت سے بھی ملتا رہتا ہے جو جائے واردات سے اس کی غیر موجودگی کی گواہی دے سکے۔''

اس کی بات سن کر میں اس لمبی سنہرے بالوں والی عورت کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گئی۔ ڈیل اس خالی مکان میں اس کے ساتھ کیا کر رہا تھا۔ مجھے اس کی خاموشی گراں گزر رہی تھی لیکن وہ میری طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔

''لیکن تم پریشان مت ہو۔'' برنیڈا نے کہا۔ ''میں نہیں سمجھتی کہ وہ تمہیں شریکِ جرم سمجھیں گے گو کہ تم سے چابیوں کے معاملے میں غفلت ہوئی ہے اور ڈیل! وہ تم پر کوئی بھی الزام عائد کریں۔ مجھے یقین ہے کہ تم عدم ثبوت کی بنا پر بری ہو جاؤ گے اور اس وقت تمہیں خوشی ہو گی کہ میں نے ساری مصروفیات رجسٹر میں لکھنے کی ہدایت کی تھی اور اس سے یہ ثابت ہو سکے گا کہ تم کبھی رات کے وقت خالی مکانوں میں نہیں گئے۔''

برنیڈا بول رہی تھی اور ڈیل خاموش کھڑا سن رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ تائید میں سر بھی ہلا دیتا۔ اس کے نتیجے میں مجھے بھی خاموش ہونا پڑا۔ ویسے بھی میں نہیں جانتی تھی کہ مجھے کیا کہنا چاہیے۔ بالآخر ڈیل نے اپنی خاموشی توڑی اور دھیمی آواز میں بولا۔ ''جہاں تک چابیوں کا تعلق ہے تو میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ زیادہ تر دفتر سے باہر رہتا ہوں اور میری غیر موجودگی میں چابیاں میز کی دراز میں ہی ہوتی ہیں۔ البتہ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ جب میں نے واپس آ کر دراز کھولی تو چابیاں مختلف جگہوں پر رکھی ہوئی تھیں جیسے کسی نے انہیں نکال کر دوبارہ رکھ دیا ہو۔''

''یہی وہ تفصیلات ہیں جو پولیس والے جاننا چاہیں گے۔'' برنیڈا مسکراتے ہوئے بولی۔ ''اب تمہیں اعتماد کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ ہمیں اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنا ہو گا۔ اسی میں ہم دونوں کی بھلائی ہے۔''

''گھر کے لوگ ہی ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔'' ڈیل نے کہا۔ ''مل کر کام کرنے کا نتیجہ ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔''

اس کے بعد ڈیل معذرت کر کے اپنے بیڈروم میں چلا گیا۔ میں برنیڈا سے نظریں نہیں ملا رہی تھی۔ اس نے ایک کپڑا اٹھا کر کافی کی میز صاف کرنا شروع کر دی جس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے ایک منٹ رک کر اپنے اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کی اور ڈیل کے کمرے کی طرف چل دی۔ شاید وہ میرا ہی انتظار کر رہا تھا۔ اس نے بیڈ کی طرف اشارہ کیا اور جب میں بیٹھ گئی تو وہ تھوڑا سا مجھ پر جھک گیا۔ گزشتہ چند روز میں وہ پہلی بار میرے اتنا قریب آیا تھا۔ میں فیصلہ نہ کر سکی کہ یہ صلح کی کوشش تھی یا وہ مجھے ذہنی طور پر علیحدگی کے لیے تیار کر رہا تھا۔ میرے ذہن میں اس سنہرے بالوں والی عورت کی تصویر چپک کر رہ گئی تھی اور میں کوشش کے باوجود اسے نہیں بھلا پا رہی تھی۔

''میری بہن ٹھیک ہی کہتی ہے۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔ ''تم وہی کرو جو تمہیں کرنا چاہیے۔ لوئیس! میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔'' اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''کیونکہ مجھے اس کام میں کوئی آمدنی نہیں ہو رہی تھی۔ اس لیے میں نے ایسے دو بینکوں سے رابطہ کیا جن کے پاس یہ بند مکان گروی رکھے ہوئے ہیں اور مالکان کی عدم دلچسپی کی وجہ سے اس کی حالت خراب ہو رہی ہے۔ میں نے ان کی مرمت اور دیکھ بھال کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ اسی وجہ سے میں زیادہ تر سہ پہر اور کبھی کبھی شام میں بھی دفتر سے باہر رہا کرتا تھا۔ زیادہ تر بینکرز کو یقین نہیں تھا کہ ان مکانوں پر پیسے خرچ کرنے سے انہیں کوئی فائدہ ہو گا لیکن میں نے انہیں بہت کم معاوضے پر کام کرنے کی پیشکش کی کیونکہ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔''

''تم نے یہ بات مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی؟''

''مجھے اپنی ناکامی کا اعتراف ہے۔ ہم نے نئی شروعات کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں مسلتے ہوئے کہا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ

کسی نے پولیس کوفون کر دیا۔ میں اس مکان میں ایک بینکر کے ساتھ میٹنگ کر رہا تھا۔ کسی نے بیڈ روم کی دیوار میں سوراخ کر دیا تھا اور ہم اسی کے بارے میں بات کر رہے تھے کہ وہی دونوں سراغ رساں وہاں پہنچ گئے جو یہاں بھی آچکے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ میں نقب زنی کے لیے آیا ہوں اگر وہ وہاں نہ آتے ......"

"تو سچ کبھی سامنے نہیں آتا۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

ڈیل نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "مجھے کچھ دیر کے لیے شبہ ہوا تھا کہ برنیڈا کے ساتھ کیا ہو رہا ہے جب وہ دونوں سراغ رساں پہلی بار اس دفتر میں آئے تھے لیکن آج رات تک مجھے اس پر یقین نہیں آیا تھا۔"

"اور جن مکانوں کے تالے کھولے گئے وہاں تمہاری چابی استعمال ہوئی۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہی ہوں؟"

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "اگر ایسی بات ہوتی تو وہ کبھی مجھے وہاں سے نہ آنے دیتے۔ صرف برنیڈا ہی چابیاں نہیں بدل سکتی۔ میں نے بھی اس کی چابی بدل دی تھی لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے یہ بات معلوم ہو۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "وہ دونوں سراغ رساں دوسری چابیاں چیک کرنے کے لیے کل آ رہے ہیں۔"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ اس نے جو کچھ کیا، وہ بھگتے گی۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ اس کے لیے کچھ کر سکوں گا۔"

"تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے ڈیل۔ انہیں سچ جاننے دو۔ تمہیں صرف اپنی پوزیشن صاف کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ تمہارے ساتھ کیا کرتی رہی اور اس نے ہم دونوں کو پھنسانے کی کوشش کی۔"

"اس نے کبھی ہمیں پھنسانے کی منصوبہ بندی نہیں کی لیکن اس کا خیال تھا......"

میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "وہ سمجھ رہی تھی کہ اس کا بے پروا بھائی نہیں جانتا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ وہ تمہاری سابقہ ہسٹری سے بھی واقف تھی۔ اس لیے اس نے یہ کھیل کھیلا۔ اس کا محاسبہ ہونا چاہیے۔"

ڈیل لمحہ بھر سوچنے کے بعد بولا۔ "یہ اس کا گھر ہے۔ اس کی اپنی زندگی ہے۔ اس کے پاس کھونے کے لیے بہت کچھ ہے لیکن ہم بالکل خالی ہاتھ ہیں۔ جیسا کہ تم نے اس رات کہا تھا۔ واقعی سب کچھ غلط ہو گیا۔ میں نہیں جانتا کہ ہم کہاں کھڑے ہیں یا کہاں جا رہے ہیں لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ اب تک میں نے تمہارے ساتھ جو کچھ کیا، وہ سب غلط اور ناجائز تھا۔"

"اب میں مزید خاموش نہیں رہ سکتی ڈیل۔" میں نے کہا۔ "میں بھی تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔" اس کے بعد میں نے سب کچھ اس کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ کس طرح میں اس کا تعاقب کرتی رہی۔ اس پر بھروسا نہیں کیا۔ میں نے ہی اس رات پولیس کو فون کر کے بلایا تھا۔ میں نے اپنے تمام غلط اقدامات اور ناجائز عمل اسے بتا دیے۔

وہ خاموشی سے میری بات سنتا رہا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ ناراض ہے یا اسے میری بات سن کر مایوسی ہوئی ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ "لوئیس! میں جانتا ہوں کہ تم کبھی کبھی کچھ اور بھی چاہتی ہو تم ہالی وڈ اسٹارز اور لانگ ڈرائیو کے خواب دیکھتی ہو۔ خواب دیکھنا کوئی بری بات نہیں لیکن میں ایسا نہیں ہوں۔ مجھے لیکسس کار یا بڑا گھر نہیں چاہیے کیونکہ یہ چیزیں میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں بلکہ......"

وہ کہتے کہتے رک گیا پھر اپنی سبز آنکھیں میرے چہرے پر جماتے ہوئے بولا۔ "میں جو کہنا چاہ رہا ہوں، وہ یہ کہ تم ہی میرا گھر ہو اور میں تمہارے ساتھ ہی رہنا چاہتا ہوں۔ کوئی ہالی وڈ ایکٹریس یا دوسری عورت تمہاری جگہ نہیں لے سکتی۔" "کیا تم میرا ساتھ دینا پسند کرو گی؟"

یہ ایسا سوال تھا جس کا جواب دینا میں نے ضروری نہیں سمجھا۔

کیونکہ ہمارا زیادہ تر سامان گودام میں رکھا ہوا تھا۔ اس لیے ہمیں لمبی چوڑی پیکنگ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ جب ہم لیونگ روم میں واپس آئے تو برنیڈا نے عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ ہمیں دیکھا جیسے ڈیل پر واضح کرنا چاہ رہی ہو کہ وہ یہاں سے نہیں جا سکتا لیکن اسے اس وقت شدید دھچکا لگا جب ڈیل نے کی کارڈ اسے واپس کرتے ہوئے کہا۔

"پولیس نے اس کے ذریعے سب چیک کر لیا ہے لیکن یہ میرا نہیں بلکہ تمہارا کی کارڈ ہے۔ اسے میں نے گزشتہ روز بدل لیا تھا۔"

برنیڈا نے اسے ہاتھ میں پکڑا اور دو تین دفعہ الٹ پلٹ کر دیکھا جیسے وہ اس کا معائنہ کر رہی ہو پھر اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی اور وہ بے ربط انداز میں بولنے لگی۔ "ایسا لگتا ہے کہ میری چابی...... ایسا لگتا ہے کہ میں نے...... وہ کبھی یقین نہیں کریں گے کہ......"

میں اس کے نامکمل جملے پورے کر سکتی تھی لیکن میں

نے اپنی زبان بند رکھی۔ ”یہ سب میں تمہارے لیے ہی کر رہا ہوں۔“ ڈیل نے کہا۔ ”کل جب پولیس آئے تو تم انہیں بتا سکتی ہو کہ میں نے تمہارے کارڈ سے اپنا کارڈ تبدیل کر لیا تھا اور یہی سچ ہے اور ہمارے جانے کا سن کر وہ ہمیں ہی قصوروار ٹھہرائیں گے۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔“

”لیکن ڈیل! میرا یہ منصوبہ نہیں تھا۔“

”تمہارا منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکا۔“ ڈیل نے کہا۔ ”یہ عقل میں آنے والی بات نہیں کہ چابی اس طرح اندر باہر جائے جب تک اندر کا کوئی آدمی اسے نہ جانتا ہو۔ تم تو ایک اچھی مجرم بھی نہیں ہو۔“

وہ کرسی پر بیٹھ گئی اور ہاتھ مسلتے ہوئے بولی۔ ”کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ مجھے مجرم کے نام سے یاد کیا جائے گا۔ میں نے شوہر کے انتقال کے بعد اس کے کاروبار کو بڑی محنت سے آگے بڑھایا ہے......“

”یہ تو تم ہمیں پہلے روز ہی بتا چکی ہو کہ تم نے کچھ ایسے کام بھی کیے ہیں جن پر فخر نہیں کیا جا سکتا۔ میں بھی تم جیسا ہی ہوں۔ میرے پاس بھی فخر کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔“

برنیڈا ہمیں سامان کار میں رکھتے ہوئے دیکھتی رہی۔

ہم تینوں تاریک ڈرائیو وے میں کھڑے ہوئے تھے اور چاند کی روشنی نے سڑک کو منور کر رکھا تھا۔ برنیڈا معافی تلافی کر رہی تھی۔ اس کی آنکھ میں آنسو تھے اور وہ بار بار ڈیل کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ مجھ سے یہ منافقت برداشت نہ ہو سکی اور میں ایک مرتبہ پھر مکان کی جانب چل دی۔

”جانے سے پہلے ایک مرتبہ باتھ روم میں چلی جاؤں۔“ میں نے مڑ کر کہا۔

ہم دونوں گودام میں گئے اور اپنا سامان ٹریلر میں لادنا شروع کر دیا جو ہم نے کرائے پر لیا تھا۔ جب سارا سامان رکھ دیا گیا تو ڈیل کار کا دروازہ کھول کر سوار ہونے ہی والا تھا کہ میں نے اسے روک دیا اور کہا۔ ”ابھی ہمارا کام ختم نہیں ہوا ہے۔“

یہ کہہ کر میں ایک اور گودام کی طرف چل دی جو دو دروازے چھوڑ کر تھا۔ ”یہ کیا ہے؟“ ڈیل نے پوچھا۔

”ابھی معلوم ہو جائے گا۔“ یہ کہہ کر میں نے جیب سے چابی نکالی اور دروازہ کھول دیا۔ اندر بہت سارے مائیکروویو اوون، پیتل کی ٹونٹیوں اور تانبے سے بھرے ہوئے باکس، دو پورسلین کے سنک اور ایک گرینائٹ کا کاؤنٹر بھی تھا۔

”یہ برنیڈا کا گودام ہے؟“ ڈیل نے پوچھا۔

”اس نے گودام کی چابی کچن میں لٹکا رکھی تھی۔ جب میں باتھ روم جانے کے بہانے مکان میں گئی تو میں نے یہ چابی قبضے میں کر لی۔ میرا خیال تھا کہ جب تم پر الزام آ ہی رہا ہے تو یہ چیزیں تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہئیں۔“

ڈیل نے سامان پر نظر ڈالی اور بولا۔ ”ہم اس میں سے آدھی چیزیں لے جائیں گے۔ باقی برنیڈا کے لیے چھوڑ دو۔ اس کا بھی ان پر حق ہے۔“

یہ کہہ کر ڈیل ٹریلر کو اندر لے آیا اور ہم نے جلدی جلدی وہ سامان اس میں رکھنا شروع کر دیا۔ ہماری کوشش تھی کہ زیادہ سے زیادہ چیزیں سمیٹ لیں۔ اس کے بعد ہم دونوں کار میں بیٹھ گئے۔

”جانتے ہو کہ ہم ان چیزوں سے کہاں چھٹکارا حاصل کریں گے۔“ میں نے کار کے عقب میں لگے ہوئے ٹریلر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ یہ کہہ کر اس نے کار اسٹارٹ کر دی اور کھلی سڑک پر آ گیا۔

”تم کہاں جانا چاہتی ہو؟“ اس نے مضبوطی سے ہاتھ اسٹیئرنگ وہیل پر رکھتے ہوئے کہا۔

نقشہ کار کے گلو باکس میں رکھا ہوا تھا لیکن میں نے اسے نکالنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اس وقت میں چشم تصور میں برنیڈا کو اپنے بال نوچتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ جب اس نے اپنا گودام کھولا ہوگا تو اس کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ اس کا میں بخوبی اندازہ کر سکتی تھی۔ کوئی چور تصور نہیں کر سکتا کہ اس کے گھر میں بھی چوری ہو سکتی ہے لیکن برنیڈا کے ساتھ ایسا ہو گیا تھا۔ وہ ڈیل کا کارڈ استعمال کر کے خالی مکانوں میں چوریاں کرواتی رہی تاکہ اگر کبھی بات کھل جائے تو سارا الزام ڈیل پر آئے لیکن وہ بھی اسی کا بھائی تھا۔ اس نے برنیڈا کا داؤ اسی پر الٹ دیا اور اب وہ بیٹھی اپنے زخم چاٹ رہی ہوگی۔

میں نے مسکراتے ہوئے ڈیل کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”کیا یہ نئی شروعات کی خوب صورتی نہیں ہے کہ ہمیں منزل کے بارے میں معلوم ہی نہ ہو۔“

یہ کہہ کر میں نے اپنا ہاتھ اسٹیئرنگ وہیل پر رکھا اور اس کا دایاں ہاتھ مضبوطی سے پکڑتے ہوئے بولی۔

”کیوں نہ ہم تھوڑی دیر کے لیے اس سفر سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔“

واقعی ہماری زندگی کی نئی شروعات ہو چکی تھی۔
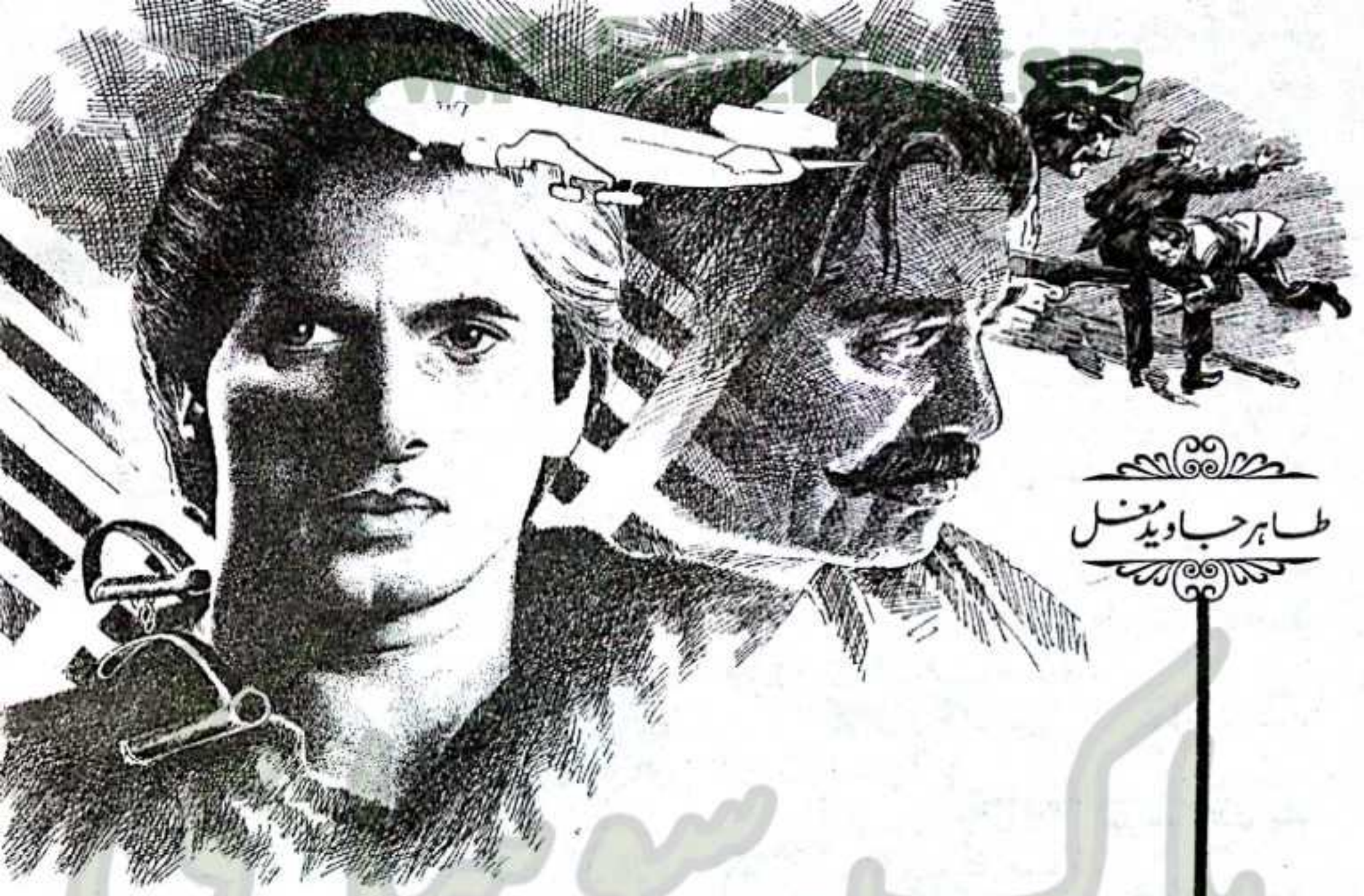
طاہر جاوید مغل

انگارے

تیسری قسط

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خودغرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کررہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثرورسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

ول گداز داستان...
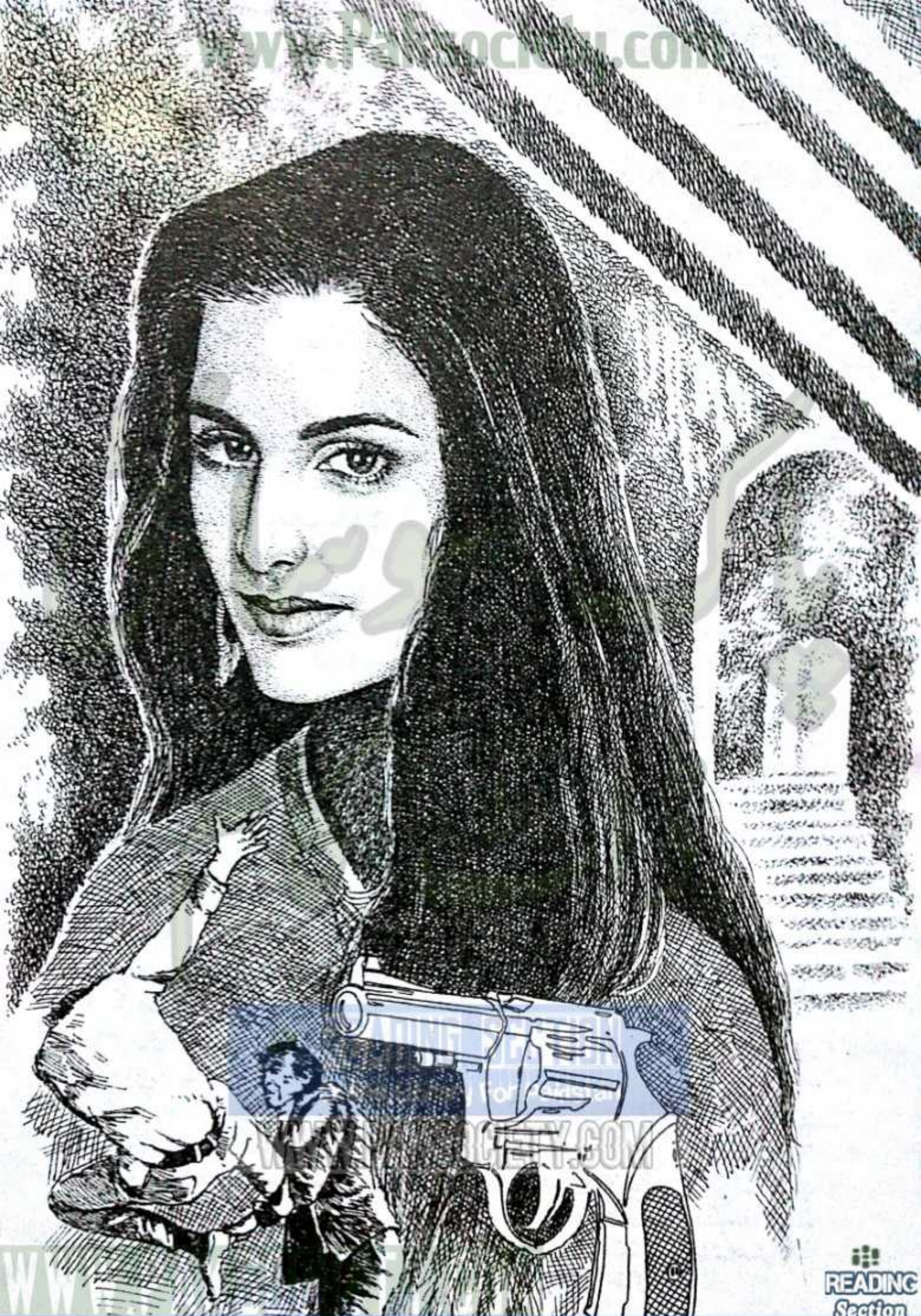
داؤد بھاؤ کے منہ سے عاشرہ کی شادی کی خبر سن کر مجھے وہ ساری باتیں یاد آگئیں جو آتش زدگی والے خوف ناک واقعے کی وجہ سے کچھ دیر کے لیے پس منظر میں چلی گئی تھیں۔ حاجی نذیر کی خوبرو بیٹی عاشرہ ہوس کے شکنجے میں تھی۔ داراب فیملی کا جواں سال چشم وچراغ شکیل داراب اسے اپنے جال میں جکڑ چکا تھا۔ خبر یہی تھی کہ وہ اسے شادی سے پہلے ہی اپنی بیوی بنا چکا ہے اب وہ مستقل طور پر اسے اپنی چار دیواری میں بند کر رہا تھا۔

میری نگاہوں کے سامنے زخمی عارف کا غم زدہ چہرہ گھوم گیا۔ آخری بار میں نے اسے اسپتال میں ہی دیکھا تھا۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا اور سر کے زخم پر بھی کافی ٹانکے نظر آرہے تھے۔ یہ زخم اسی واقعے کی نشانی تھا جب کسی نے سرِراہ اس کی بائیک کو ٹکر ماری تھی اور موت کے منہ میں پہنچا دیا تھا۔ یہ نامعلوم، کوئی اور نہیں تھا۔ یہ وہی لوگ تھے جو عارف کو شکیل داراب کی راہ کا روڑا سمجھتے تھے۔ وہ اسے ہٹا کر شکیل کے لیے عاشرہ تک کا راستہ صاف کرنا چاہتے تھے اور انہوں نے ایسا کرلیا تھا۔

سب کچھ ذہن میں تازہ ہوگیا۔ سارے انگارے دہک اٹھے۔ مجھے یاد آیا کہ اپنی آخری ملاقات میں، میں نے مایوس عارف کو اسپتال میں امید دلائی تھی اور اس سے کہا تھا کہ میں اس کے لیے جو بن پڑا کروں گا۔ اس وقت میری سوچ کچھ اور تھی۔ میں بااختیار لوگوں کی مدد لینا چاہتا تھا۔ قانون کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہتا تھا اور ایسی ہی ساری دیگر کوششیں کرنا چاہتا تھا لیکن اب بہت کچھ بدل گیا تھا شاید ابھی تھوڑی دیر پہلے داؤد بھاؤ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میرا وہ خول ٹوٹ گیا تھا جس کے اندر میں نے خود کو سمیٹ رکھا تھا۔ میں نے خود کو سنبھالے رکھنے کی بڑی کوشش کی تھی مگر بڑی تیزی سے اور بری طرح ناکام ہوا تھا۔ پاکستان لوٹتے وقت میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ میرے ساتھ ایسا کچھ ہوگا اور مجھے اتنی جلدی شکست تسلیم کرنا پڑے گی لیکن اب شکست تسلیم ہوچکی تھی اور میری یہ شکست کچھ لوگوں کو بدترین انجام سے دوچار کرنے والی تھی۔ یہ شکست دراصل ان کے مقدر کی شکست تھی... ہاں خول ٹوٹ گیا تھا۔ تذبذب دور ہوگئے تھے، ہچکچاہٹیں دم توڑ گئی تھیں۔ اب معاملات چل نکلے تھے تو پھر رکنا کیا اور سوچنا کیا۔ میں نے داؤد بھاؤ سے کہا۔ ''کیا واقعی ہورہی ہے شادی؟''

''ہاں کنفرم اطلاع ہے۔''

''میں یہ شادی نہیں ہونے دوں گا۔''

''مجھے اندازہ تھا، تم یہی کہو گے لیکن یہ بڑا مشکل کام ہوگا۔''

''کچھ لوگوں کی ڈکشنری میں مشکل اور ناممکن جیسے لفظ نہیں ہوتے داؤد بھاؤ۔''

''کیا اس وقت ایک اور محاذ کھولنا تمہارے لیے مناسب ہوگا؟''

''اب اگر یہ محاذ نہ کھولا تو بعد میں کھولنے سے کیا فائدہ؟'' میں نے ترت جواب دیا۔

''تمہاری یہ بات تو صحیح ہے۔'' داؤد نے اپنا بڑا سا سر اوپر نیچے ہلایا۔ ''تو اب کیا کرنا چاہو گے؟'' بھاؤ کو جیسے اب میرے طور طریقے دیکھ کر مزہ آنے لگا تھا۔

''کسی طرح عارف کا پتا کرواؤ داؤد بھاؤ... اور ہوسکے تو ایک دفعہ میری اس سے بات کروادو۔ سامنے نہیں تو فون پر ہی ہوجائے۔''

''ٹھیک ہے میں کوشش کرتا ہوں۔'' داؤد بھاؤ نے آمادگی ظاہر کی۔

داؤد بھاؤ بلاتردّد میری مدد کررہا تھا۔ نہ صرف اس نے مجھے پناہ دی تھی بلکہ ہر طرح کی سپورٹ بھی فراہم کررہا تھا۔ ایسا کرنے میں اس کے لیے اور اس کے اس زیرِزمین ٹھکانے کے لیے رسک ہی رسک تھا مگر وہ یہ رسک لے رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ داؤد مجھ سے ہمدردی رکھتا ہے اور میری صلاحیتوں سے خاطر خواہ متاثر بھی ہوا ہے لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ داؤد جیسے لوگ بے وجہ کسی کی مدد نہیں کرتے۔ یوں لگتا تھا کہ میرے حوالے سے داؤد بھاؤ کے ذہن میں مستقبل قریب کے لیے کوئی پلان موجود ہے۔

اگلے روز داؤد بھاؤ نے اپنے وسائل استعمال کیے اور عارف تک پہنچنے میں کامیاب رہا۔ داؤد بھاؤ کا اسسٹنٹ مختار جھارا میرے پاس ایک سیل فون لے کر آیا اور مجھے اطلاع دی کہ میں عارف سے بات کرسکتا ہوں۔ میں نے ہیلو کہا۔

دوسری طرف واقعی عارف کی آواز اُبھری۔ ''کون؟'' اس نے پوچھا۔

''شاہ زیب... بڑی کوشش سے رابطہ ہوسکا ہے تمہارے ساتھ۔''

''بھائی اب کیا کہنا ہے آپ کو؟'' عارف کے لہجے میں بیزاری کے علاوہ بیگانگی بھی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ شاید نشے میں ہے جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا اس نے سکون بخش دوا کھا رکھی تھی۔

میں نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ''عارف مجھے لگ رہا ہے کہ تم نے ہار مان لی ہے۔ لڑنے سے پہلے ہی شکست کھا کر بیٹھ گئے ہو۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اگلے ہفتے عاشرہ کی شادی ہو رہی ہے؟''

دوسری طرف خاموشی رہی۔ مجھے خدشہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ فون ہی بند نہ کر دے لیکن پھر چند سیکنڈ بعد اس کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''شاہ زیب بھائی! اِن باتوں سے اب کوئی فائدہ نہیں سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ اب وہی ہونا ہے جو نظر آ رہا ہے۔''

''نظر وہی آتا ہے عارف جو ہم سوچتے ہیں، تم اپنی سوچ بدل لو، سب کچھ بدل جائے گا۔ اب بھی بہت دیر نہیں ہوئی ہے۔''

''دیر ہونا اور کس کو کہتے ہیں بھائی؟'' اس کی آواز بھرا گئی۔

میں نے بدلے ہوئے آہنگ میں کہا۔ ''مجھے صرف ایک بات... صرف ایک بات بتاؤ عارف۔ کیا تم اب بھی عاشرہ کو چاہتے ہو۔ کیا اس کو حاصل کرنے کی خواہش اب بھی تمہارے دل میں ہے؟''

''وہ تو زندگی کی آخری سانس تک رہے گی۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

''تو پھر تیار ہو جاؤ عارف... عاشرہ تمہیں ضرور ملے گی۔ ہم بازی پلٹ دیں گے۔''

دوسری طرف پھر چند لمحے کے لیے خاموشی طاری ہو گئی۔ ''ہیلو۔'' میں نے کہا۔

جواب میں عارف کی پژمردہ آواز ابھری۔ ''شاید تم اپنے حواس میں نہیں ہو شاہ زیب بھائی۔ تم جن لوگوں سے ٹکر لینے کی بات کر رہے ہو، وہ میرے اور تمہارے جیسوں کو کیڑے مکوڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور ہم ان کے لیے ہیں بھی کیڑے مکوڑے ہی۔ خدا کے لیے... مجھے معاف کر دو۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میری تقدیر میں تو جو عذاب لکھے ہیں وہ اب میں جھیل لوں گا لیکن میں نہیں چاہتا کہ وہ بھی زندگی اور موت کے درمیان لٹک جائے۔'' وہ سے اس کی مراد عاشرہ ہی تھی۔

''تم کوئی عذاب نہیں جھیلو گے اور نہ وہ جھیلے گی۔ عذاب وہی جھیلیں گے جنہوں نے جرم کیا ہے، جو گناہ گار ہیں۔''

عارف بولا۔ ''تم نے اُن سے ٹکر لینے کا انجام دیکھ ہی لیا ہے شاہ زیب۔ مجھے سب معلوم ہو چکا ہے۔ جو کچھ ہوا ہے اس پر میرا دل خون کے آنسو روتا رہا ہے۔ تمہارے چچا کے گھر کو آگ لگ گئی۔ تمہاری بہن اور چچی زندہ جل گئیں۔ تمہارا چچا زاد ولید اسپتال میں پڑا ہے اور پولیس کے پہرے میں ہے۔ تمہارے چچا بھی زندگی اور موت کی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ پتا نہیں کہ بچتے بھی ہیں یا نہیں۔ یہ سب کس وجہ سے ہوا ہے؟ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی جانتا ہوں۔''

''تو پھر تم نے کچھ اور بھی تو جانا ہوگا عارف؟ خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ تم نے خبر سنی ہی ہوگی۔ قبضہ مافیا کا کرتا دھرتا لالہ نظام اور اس کا قریبی ساتھی امتیاز احمد ایک ٹریفک حادثے میں مارے گئے ہیں۔ اس کا خبیث داماد قیصر چودھری اسپتال میں ہے۔''

''حادثے میں تو ایک نظام مرا ہے، بھائی یہاں تو پورا نظام ہی بگڑا ہوا ہے۔ ابھی دیکھنا چند روز تک ایک دو اور نظام پیدا ہو جائیں گے۔ تم نظام کے چھوٹے بھائی لالہ وریام کو کیا سمجھتے ہو؟ وہ اس سے دو ہاتھ آگے ہوگا اور پھر جب تک ان لوگوں کا پشت پناہ موجود ہے کوئی چھوٹا بڑا ایکسیڈنٹ ہم جیسوں کی بدنصیبیوں کو کم نہیں کر سکتا۔''

''میں تم سے لمبی بحث نہیں کرنا چاہتا عارف... صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا تمہارے لیے عاشرہ اب بھی قابل قبول ہے؟''

''یہ تم کیسی بات کرتے ہو شاہ زیب؟'' عارف جیسے تڑپ کر بولا۔ ''وہ تو میری زندگی ہے۔ میری نس نس میں بسی ہوئی ہے۔ میں اب بھی اس کے ایک اشارے پر اپنی جان دینے کے لیے تیار ہوں۔ اس نے خود ہی حالات کا رخ دیکھ کر اپنے رستے بدل لیے ہیں۔ میں اس کو حاصل کرتا تو خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتا لیکن یہ میرا نصیب ہی نہیں تھا۔''

''بس... اپنے ان الفاظ کو یاد رکھنا عارف اور یہ بھی یاد رکھنا کہ تمہارے اور عاشرہ کے لیے میں جو کچھ کروں گا، اس کی وجہ سے تم پر یا تمہاری فیملی پر کوئی زد نہیں آئے گی... ایک ہلکی سی آنچ بھی نہیں آئے گی۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو شاہ زیب۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا؟''

''خدا حافظ۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

کچھ دیر بعد میں اور دادا بھاؤ پھر پرائیویٹ کمرے میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ میں نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ ''بھاؤ، میں دار اب فیملی سے ٹکر لینا چاہتا ہوں۔ مجھے بتاؤ،

میں کیا کروں؟"

"میں تو کہوں گا کہ یہ کیڑا دماغ سے نکال دو۔"

"یہ فیصلہ تو اب ہو چکا۔ آگے بات کرو۔"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کہوں۔ تمہارے ذہن میں کیا ہے؟"

میں نے قیمتی صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ "ہر بڑے سے بڑے دبنگ شخص کے لیے کوئی نہ کوئی چیلنج ہوتا ہے۔ داراب فیملی کے لیے کون چیلنج ہے؟"

"جونہ فیملی۔" داؤد نے فوراً جواب دیا۔ "یہ علاقے کی دوسری بڑی سیاسی فیملی ہے لیکن یہ بھی داراب فیملی کی طرح بے ایمان، گھمنڈی اور بے رحم لوگ ہیں۔ ان سے کسی خیر کی توقع کی ہی نہیں جاسکتی۔ میرے تمہارے جیسوں کو تو یہ وی آئی پیز لوگ اپنے دو کوس قریب سے بھی نہیں گزرنے دیتے۔"

"مگر آپس میں اختلاف بھی تو ہوتے ہیں ان بڑے لوگوں کے اور اپنے اپنے مفاد بھی ہوتے ہیں۔"

"لیکن ایک حد تک۔ جہاں سے سچائی، انصاف اور انسانیت وغیرہ کی حدیں شروع ہوتی ہیں وہیں پر ان لوگوں کے آپس کے اختلاف ختم ہوجاتے ہیں اور ہم تو ویسے بھی حقیر کیڑے مکوڑے ہیں۔ ہم کیا اور ہماری اوقات کیا۔"

داؤد بھاؤ کے لہجے میں زہر بھرا ہوا تھا۔ انڈر ورلڈ کا ایک نامی گرامی کردار ہونے کے باوجود وہ خود کو ان سیاسی مافیاز کے سامنے حقیر فقیر ہی سمجھ رہا تھا۔

"آگے بڑھنے سے ہی راستے ملتے ہیں داؤد بھاؤ اور میں آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن اگر غلط سمت میں آگے بڑھو گے تو یہ لوگ دو چار قدم پر ہی تمہیں پیس کر رکھ دیں گے۔"

"تم کوئی تجویز دے سکتے ہو تو دو ورنہ میں اپنے طور پر سوچتا ہوں۔" میں نے روکھے لہجے میں کہا۔

داؤد بھاؤ یک ٹک مجھے دیکھتا رہا۔ میرا رویہ اسے متاثر کر رہا تھا اور شاید مزہ بھی دے رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد وہ پہلو بدل کر بولا۔ "ایک بندہ ہے تنویر پاشا... ہے تو بہت ڈنگا پر پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ یہ تمہارے لیے فائدے مند ثابت ہوسکتا ہے۔"

"کیا بیچتا ہے یہ تنویر پاشا؟"

"بیچتا کچھ نہیں... خریدتا ہے... روپے کے زور پر اور اپنے تعلق کے زور پر۔"

"کیا خریدتا ہے؟"

"وہی سب کچھ جو ایک آوارہ کو موج مستی کی زندگی گزارنے کے لیے چاہیے ہوتا ہے۔ دنیا کی بہترین شراب، بہترین رہائش، عورتیں اور فارن کے ٹور وغیرہ... اور ہاں اس کے علاوہ انڈیا کے بہترین کبوتر بھی۔"

"کبوتر؟"

"ہاں اس عیاش پٹھے کے ساتھ تین بازیاں لگی ہوئی ہیں۔ نشے بازی، عورت بازی اور کبوتر بازی۔ لاہور کے بہترین علاقے میں چار کنال کی کوٹھی میں رہتا ہے۔ نوکر چاکر، گارڈز سب کچھ ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کا کِلّا بڑا مضبوط ہے اور یہ کِلّا یعنی کھونٹا ٹھکا ہوا ہے شکیل داراب کے محلات میں۔"

"مطلب یہ کہ شکیل داراب کا آدمی ہے؟"

"دو سو فیصد۔ آج سے پانچ چھ سال پہلے تک یہ عام سا بندہ تھا۔ کہیں جنوبی پنجاب سے آکر لاہور میں رہ رہا تھا۔ کسی انگلش اسکول میں کینٹین وغیرہ کا ٹھیکا تھا اس کے پاس۔ اب عیاشیوں کے تالاب میں مگرمچھ بن کر بیٹھا ہوا ہے۔ اس مگرمچھ کی عیاشیوں کی ایک خاص بات اور ہے۔ شاید تمہیں یہ بات عجیب لگے گی۔ اس کے شکنجے میں زیادہ تر منگیتر اور شادی شدہ عورتیں ہی پھنستی ہیں۔ اب پتا نہیں یہ ایک اتفاق ہے یا پھر وہ جان بوجھ کر ایسی عورتوں کو ٹارگٹ کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ جان بوجھ کر ہی ایسا کرتا ہے۔ بعض لوگوں کو ایسی چیز مزہ نہیں دیتی جو آسانی سے ہاتھ آجائے۔ اب دیکھو، کبوتر بھی اس نے بس وہ رکھے ہوئے ہیں جو انڈیا سے آتے ہیں۔ سنا ہے اس کے کبوتروں میں سے کچھ کی قیمت دس پندرہ لاکھ روپے تک ہے۔ ایسے کبوتروں کی خرید وفروخت باقاعدہ ڈی این اے ٹیسٹ کروانے کے بعد ہوتی ہے۔"

مجھے اس قصے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی' میں نے داؤد سے پوچھا۔ "یہ بندہ میرے لیے کس طرح فائدے مند ثابت ہوسکتا ہے؟"

داؤد نے وہسکی کا ایک تلخ گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "پتا نہیں کیوں... ہاں پتا نہیں کیوں مجھے یہ شک ہے کہ یہ شخص، شکیل داراب یا اس کے کسی قریبی عزیز کی دکھتی رگ سے واقف ہے۔ شاید کوئی ایسا خاص بھید ہے اس کے پاس جس کے سبب شکیل اس پر ماہانہ لاکھوں خرچ کر ڈالتا ہے۔"

"یہ کرتا کیا ہے؟"

"یہی تو مزے کی بات ہے۔ یہ دو ٹکے کا بندہ ہے۔ اسے پچھلے پانچ چھ سال سے صرف اور صرف اپنی موج

مستیوں سے غرض ہے۔ پچھلے سال یہ بیمار بھی ہوا تھا اور داراب فیملی کے خرچے پر ہی انگلینڈ سے علاج کروا کے آیا ہے۔ تین چار لاکھ ڈالر کے چیک تو پہنچ گئے ہوں گے انگلینڈ کے کسی اسپتال میں۔"

"اس سے ملاقات کیسے ہو سکتی ہے؟"

"ایسے لوگوں سے ملاقات ہی تو مشکل ہوتی ہے۔" داؤد نے کہا پھر ذرا سوچ کر بولا۔ "اس کا ایک خاص باڈی گارڈ ہے۔ ارشد کپتان۔ اسے کپتاناں، کپتاناں بھی کہتے ہیں۔ یہ ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے۔ کپتانے کی رہائش اچھرہ کے علاقے میں ہے۔ ہر روز شام کو پندرہ بیس منٹ کے لیے اپنے گھر کا چکر ضرور لگاتا ہے۔"

"اس کے گھر کا اتا پتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

داؤد نے اثبات میں سر ہلایا۔

☆☆☆

کچھ ہی دیر بعد میں اور انیق ایک بار پھر بیسمنٹ سے باہر نکلنے کے لیے تیار تھے۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے انیق دیکھنے میں بالکل یونیورسٹی کا اسٹوڈنٹ ہی لگتا تھا۔ قطعی بے ضرر سا لیکن اگر یہ لڑکا داؤد بھاؤ کے ساتھ تھا تو یقیناً اس میں کچھ خاص گن تھے۔ ابھی تو اس کا ایک گن ہی سامنے آیا تھا اور وہ یہ کہ یہ لاہور کے چپے چپے سے واقف تھا اور پاکستانی فلموں کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔

جب میں اور انیق بیسمنٹ کے وسیع ہال کے قریب سے گزرے، ایک بار پھر میں نے ٹی وی پر اپنی ایک جھلک دیکھی۔ ایک غیر ملکی اسپورٹس چینل پر کونٹیکٹ فائٹ دکھائی جارہی تھی۔ اس فائٹ کے دوران میں ایک فائٹ کا اشتہار چلایا گیا تھا اور اس میں، میں موجود تھا۔ کمنٹیٹر کی پُرجوش آواز سنائی دی۔ وہ انگلش میں کہہ رہا تھا۔

"ایک بار پھر ایسٹرن ینگ کنگ... بمقابلہ ڈچ اسٹارم... سانس روک دینے والا یادگار مقابلہ... آپ کی پُرزور فرمائش پر پھر ری ٹیلی کاسٹ کیا جائے گا۔ آج شب، ساڑھے گیارہ بجے۔"

کمنٹیٹر کی آواز معدوم ہوتی چلی گئی۔ ہم بیسمنٹ سے نکل کر اس بیس میٹر لمبے چور راستے میں داخل ہو چکے تھے جو گیسٹ ہاؤس میں کھلتا تھا۔ اب قریباً نو بجے کا وقت تھا۔ گیسٹ ہاؤس میں مقیم افراد رات کا کھانا وغیرہ کھا رہے تھے۔ حسب سابق ہم نے ون سیون فائیو موٹر سائیکل نکالی۔ میں نے ہیلمٹ پہنا۔ انیق میرے پیچھے بیٹھا اور ہم باہر سڑک پر آگئے۔

میں انیق کی رہنمائی میں آگے بڑھنے لگا۔ ہم نے اس حادثے کے بارے میں کوئی بات نہیں کی جو آج سر شام لاہور کے مضافات میں ہوا تھا اور جس نے میڈیا اور لوگوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ لالہ نظام چودھری مارا گیا تھا۔ کوئی اور جانتا ہو یا نہ لیکن انیق ضرور جانتا ہوگا کہ میں عین حادثے کے وقت کہاں موجود تھا اور میری موجودگی کتنی بھید بھری تھی۔ بہرحال وہ اس حوالے سے بالکل خاموش رہا۔ غالباً داؤد بھاؤ کی طرف اسے زبان بندی کی ہدایت تھی۔

ہم اچھرہ کے گنجان علاقے میں پہنچے۔ مطلوبہ سڑک پر جا کر ایک جگہ انیق نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔ ہم ایک چائے خانے کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ یہاں رش تھا۔ کرکٹ میچ دکھایا جارہا تھا۔ پاکستان اور سری لنکا آمنے سامنے تھے۔ سڑک پر کھڑے لوگ دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ ہم بھی ناظرین میں شامل ہوگئے۔ میری طرح اور بھی دو راہگیر ہیلمٹ سمیت ہجوم میں موجود تھے اور میچ دیکھ رہے تھے۔ ہیلمٹ کا یہ شاندار استعمال مجھے بہت پسند آرہا تھا۔ اس ہیلمٹ نے میرے لیے ایک نقاب کا درجہ حاصل کرلیا تھا۔ ان سڑکوں پر جہاں پولیس اہلکاروں کی ان گنت نگاہیں مجھے ڈھونڈ رہی تھیں، میں آزادانہ پھر رہا تھا۔ میں نقاب پوش تھا اور میرا نقاب میرا سیاہ ہیلمٹ تھا۔

انیق کی نگاہیں بار بار گھڑی کی سوئیوں کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ ہماری معلومات کے مطابق ارشد کپتاناں یہاں آنے والا تھا یا یہاں سے جانے والا تھا۔ دونوں صورتوں میں اسے اس اندرونی سڑک سے گزر کر جانا تھا۔ اس کے پاس سبز رنگ کی سوزوکی مہران کار تھی اور کار کا نمبر بھی مجھے معلوم تھا۔ مجھے اور انیق کو بہت زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ قریباً بیس منٹ بعد ہمیں ایک سبز مہران گاڑی بازار کے موڑ سے نمودار ہوتی دکھائی دی۔

انیق نے مجھے ٹھوکا دیا۔ "لیں بھائی جان، آپ کا دوست تشریف لے آیا ہے۔"

میں پہلے ہی تیار تھا۔ مہران کار چوک کی طرف سے نمودار ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ارشد کپتاناں اپنے گھر سے ہو کر واپس آرہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں میرا کام شروع ہوگیا تھا۔ اب مجھے اسے روکنا تھا۔ پروگرام کے عین مطابق میں ٹہلتا ہوا سڑک کے کنارے پہنچ گیا۔ مہران قریب آئی۔ میں ارشد کپتانے کی تصویر دیکھ چکا تھا اس لیے فوراً پہچان گیا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر موجود تھا اور اکیلا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل گول اور ناک کسی سیاہ فام ہی کی طرح

چوڑی تھی۔ میں نے گاڑی کے تقریباً سامنے آکر ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔ اسے بریک لگانا پڑے۔ میری قسمت نے ساتھ دیا۔ دروازہ اندر سے لاک نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ ارشد کپتاناں کچھ سمجھتا، میں نے دروازہ کھولا اور اس کے برابر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ہیلمٹ ابھی تک میرے سر پر تھا۔ اس نے بے حد حیرت سے میری طرف دیکھا۔ میں نے پستول اس کی بغل کے نیچے عین دل کے مقام پر رکھ دیا۔

''اس پر سائیلنسر لگا ہوا ہے۔ آواز بھی نہیں آئے گی اور تم قتل ہو جاؤ گے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔

اس نے جیسے تڑپ کر میری طرف دیکھا۔ ایک لحظہ کے لیے لگا کہ وہ زبردست مزاحمت کرے گا لیکن اگلے ہی لمحے اس نے ارادہ بدل دیا۔ میرے لہجے اور انداز نے اسے سمجھا دیا تھا کہ آنے والے دو تین سیکنڈ میں کچھ بھی ہو سکتا ہے اور اس نے ٹھیک فیصلہ کیا تھا۔ اگر وہ میرے لیے مسئلہ پیدا کرتا تو میں یقیناً اسے شوٹ کرنے میں دیر نہ لگاتا۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ آج شام لالہ نظام کی مرسیڈیز کو بھاری بھرکم بیلوڈوزر کے نیچے روندنے کے بعد میرے سر پر خون سوار ہو چکا تھا اور اس خون کی بُو اور حدت میرے لب و لہجے میں سرایت کر چکی تھی۔

''کون ہو تم؟'' ارشد کپتاناں نے مینڈک جیسی بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔ یقیناً اس کی آواز ایسی نہیں تھی، حیرت اور خوف کی زیادتی نے آواز کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔

میں نے جواب میں کہا۔ ''اگر تم نے چپ چاپ گاڑی آگے نہ بڑھائی تو سمجھو میں موت کا فرشتہ ہوں۔'' میں نے ایک بار پھر سرد لہجے میں اسے آگاہ کیا اور اس کے ساتھ ہی اس کی بالائی پسلیوں پر پستول کا دباؤ بڑھا دیا۔

''گجراتی کے بندے ہو؟'' نہ جانے کیوں اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

''یہی سمجھ لو۔'' میں نے اس کی الجھن کو برقرار رکھنا مناسب جانا ورنہ میں کسی شجراتی گجراتی کو نہیں جانتا تھا۔

اس نے لمبا سانس لے کر دائیں بائیں دیکھا پھر چپ چاپ گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ مضبوط اعصاب کا مالک نظر آتا تھا اور اعصاب ہی نہیں اس کا جسم بھی بے حد مضبوط اور گٹھا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس نے سخت سردی کے باوجود ایک ہلکا سا سلیولیس سوئیٹر پہن رکھا تھا۔ تو انا رانوں پر نیلی جینز کسی ہوئی تھی۔ ناک حبشیوں جیسی تھی لیکن رنگ صاف تھا۔ عمر ستائیس اٹھائیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔

کچھ آگے جا کر نسبتاً کم رونق والی جگہ پر اس نے گاڑی روک دی۔ شاید بات چیت کرنا چاہ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''نہیں برادر گاڑی روکنی نہیں۔ اگر گاڑی روکو گے تو پھر مجھے اپنی شہادت کی انگلی کو حرکت دینا پڑے گی اور تمہیں پتا ہی ہے اس وقت یہ انگلی کہاں رکھی ہوئی ہے۔''

''لیکن...''

''لیکن کچھ نہیں... اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں صرف خالی دھمکی دے رہا ہوں یا تمہارے دماغ میں یہ کیڑا کلبلا رہا ہے کہ تم اچانک مجھ پر جھپٹ پڑو گے تو پھر سمجھ لو کہ... ابھی کچھ دیر پہلے تم اپنے گھر والوں کو آخری بار دیکھ چکے ہو...'' میرا پُرسکون انداز اسے جتنا خوفزدہ کر رہا تھا اتنا شاید میرا پستول بھی نہیں کر رہا تھا۔

''کیا چاہتے ہو؟'' وہ قدرے ڈھیلے لہجے میں بولا۔

''کوئی بھی اور سوال پوچھے بغیر مجھے سیدھا تنویر پاشا کے گھر کے اندر لے چلو۔ اس سے کم کسی بھی قیمت پر تمہاری جان بچ نہیں سکتی۔''

اس نے ایک بار پھر میری آنکھوں میں جھانکا... اور پھر چپ چاپ گاڑی آگے بڑھا دی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ میری بات اس کی سمجھ میں آگئی ہے۔

ہم مختلف سڑکوں سے گزرتے ہوئے ڈیفنس کے علاقے میں آگئے۔ میں نے اپنا پستول والا ہاتھ اپنی جیکٹ کے نیچے چھپا لیا تھا۔ بہرحال سائیلنسر لگے ہوئے بیرل کا رخ کپتاناں کی طرف ہی تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میں اسے بہ آسانی نشانہ بنا سکتا ہوں۔ سیاہ ہیلمٹ ابھی تک میرے سر پر ہی تھا۔ بہرحال ڈیفنس کی اندرونی سڑکوں پر داخل ہونے کے بعد میں نے ہیلمٹ اتار دیا۔ ایک دو جگہ مجھے بڑے بڑے ہورڈنگ نظر آئے۔ انہیں دیکھ کر اندازہ ہوا کہ علاقے میں شاید الیکشن وغیرہ کا ماحول بن رہا ہے۔ ان ہورڈنگز پر شکیل داراب اور عطا داراب وغیرہ کی بلند کرداری پر سلوگن لکھے ہوئے تھے۔

تنویر پاشا کی وسیع و عریض کوٹھی مجھے دور ہی سے نظر آگئی۔ اس کی پہچان یہ تھی کہ کوٹھی کی بلند و بالا چھت پر کبوتروں کے بہت بڑے بڑے پنجرے دکھائی دے رہے تھے۔ کشادہ گیٹ پر مسلح گارڈ موجود تھا۔ اس نے گاڑی میں ارشد کو دیکھنے کے بعد بڑا گیٹ کھول دیا۔ طویل ڈرائیو وے سے گزر کر ہم پورچ کی طرف آئے۔ وہ پورچ کی طرف جانا چاہ رہا تھا۔ تاہم اسی دوران میں مجھے بائیں جانب چار پانچ گیراج دکھائی دیے۔ میں نے ارشد کپتاناں کو ہدایت کی کہ

وہ گاڑی گیراج میں لے جائے۔

گاڑی کو نیم تاریک گیراج میں پارک کرنے کے بعد کپتاناں سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ”مجھے کسی ایسے کمرے میں لے چلو جہاں بیٹھ کر اطمینان سے بات کرسکیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہم نے دس پندرہ منٹ سکون سے بات کرلی تو یہ ہم دونوں کے لیے بہت اچھا ہوگا اور خاص طور سے تمہارے لیے۔“

”چلو آؤ۔“ اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

”ذرا ٹھہرو۔“ میں نے اسے روکا۔ اب تک مجھے اندازہ ہوچکا تھا کہ کپتانے نے اپنے سوئٹر کے نیچے کمر کی طرف پستول یا ریوالور وغیرہ اُڑسا ہوا ہے۔ میں نے احتیاط سے ہاتھ بڑھا کر یہ ہتھیار نکال لیا۔ یہ اعشاریہ پچیس کا ایک چھوٹا بریٹا پستول تھا۔ اس میں پوری گولیاں موجود تھیں اور یہ بالکل ورکنگ پوزیشن میں تھا۔ میں نے اسے اپنی پنڈلی میں جراب کے اندر اُڑس لیا۔ کپتانے کے سڈول جسم پر تیزی سے ہاتھ گھما کر میں نے اس بات کی تسلی کی کہ اس کے پاس کوئی اور ہتھیار تو موجود نہیں ہے۔ اس کے بعد میں نے اپنے پستول کا سائیلنسر اتار کر جیکٹ کے اندر رکھ لیا۔ اب میں اپنا دایاں ہاتھ بہ آسانی پستول سمیت جیکٹ کی سائڈ پاکٹ میں گھسا سکتا تھا۔ کپتاناں یہ ساری کارروائی ایک تلخ خاموشی کے ساتھ دیکھ رہا تھا اور یہ بات اس کی سمجھ میں بڑی اچھی طرح آرہی تھی کہ میں اسے مہم جوئی کا کوئی موقع دینے کے لیے تیار نہیں۔

ہم پہلو بہ پہلو چلتے گیراج سے نکلے اور پورچ کی طرف جانے کے بجائے کوٹھی کے پہلو کی طرف آگئے۔ ایک طویل برآمدے میں چلتے ہم ایک چھوٹے دروازے کے ذریعے عمارت کے اندرونی حصے میں داخل ہوئے۔ ایک مسلح شخص نے ارشد کپتانے کو جھک کر سلام کیا اور ایک گھریلو ملازم بھی ارشد کو سلام کرتا ہوا شاید کچن کی طرف چلا گیا۔ کسی کمرے سے کسی شوخ لڑکی کے ہنسنے کی آواز بلند ہورہی تھی۔ یہ کوٹھی باہر کی طرح اندر سے بھی بے حد شاندار تھی۔ یوں لگتا تھا کہ تعمیر میں پانی کی طرح روپیا بہایا گیا ہے۔ ایک قالین پوش راہ داری سے گزر کر ہم ایک مستطیل کمرے میں پہنچے۔ یہاں داخل ہوتے ہی باہر سے آنے والی آوازیں یکسر ختم ہوگئیں۔ مجھے فوراً اندازہ ہوا کہ یہ ایک ساؤنڈ پروف یا سیمی ساؤنڈ پروف کمرا ہے۔ اس کمرے تک پہنچتے پہنچتے مجھے پتا چل چکا تھا کہ ارشد کپتاناں کو اس کوٹھی میں کافی اختیارات حاصل ہیں۔ اس کے علاوہ اپنی چال ڈھال اور اپنے انداز سے وہ کافی پھرتیلا اور خطرناک شخص لگتا تھا۔ میں اس کی طرف سے زیادہ محتاط ہوگیا۔ اس ساؤنڈ پروف کمرے میں دو بڑے صوفے تھے۔ اس کے علاوہ ایک میز تھی جس کی دونوں جانب کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ دائیں جانب ایک بڑی الماری سی تھی جس کے دروازے سلائڈ کرتے تھے۔

بالکل اچانک کپتانے نے کام دکھا دیا۔ وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ گھوما اور اس نے اپنا بایاں ہاتھ میرے پستول والے ہاتھ پر مارا۔ یہ بڑی تگڑی ضرب تھی۔ میں بمشکل پستول کو اپنے ہاتھ میں رکھنے میں کامیاب ہوا۔ اس وار کی ناکامی نے کپتانے کو حواس باختہ نہیں کیا۔ ایک لحظہ ضائع کیے بغیر اس نے میرے سینے پر اپنے فولادی سر کی چوٹ رسید کرنا چاہی۔ میں اس کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کا فولادی کدو میری طرف بڑھتا، میں نے اس کے پیٹ میں گھٹنے کی جچی تلی ضرب لگائی۔ وہ لڑکھڑا کر تین چار قدم پیچھے گیا اور دیوار گیر الماری سے ٹکرایا۔ میں پستول سیدھا کرچکا تھا۔ انگلی کو ذرا سی حرکت دیتا تو تنویر پاشا کا یہ انتہائی پھرتیلا گارڈ مقتول قرار پاجاتا۔

لیکن میں نے اسے پستول سے صرف دھمکایا، فائر نہیں کیا۔ اس کی سرخ آنکھوں میں خوف اور طیش یکجا ہوچکے تھے۔ اس نے مٹھیاں بھینچ رکھی تھیں اور اس کا انداز حملہ کرنے والا تھا۔ اس کے کھڑے ہونے کے انداز نے ہی مجھے سمجھا دیا تھا کہ وہ بائیں ہاتھ کا زیادہ استعمال کرتا ہے اور گتھم گتھا ہونے کے بجائے دور رہ کر لڑنا زیادہ پسند کرتا ہے۔ میں نے دیکھا کمرے کا دروازہ اندر سے لاک ہوچکا تھا۔ کوئی خفیہ کیمرا بھی مجھے یہاں نظر نہیں آیا۔ میں نے پستول جیکٹ کی اندرونی جیب میں ڈالا تو کپتانے کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”لگتا ہے بہت بھروسا ہے تمہیں اپنی تیز طراری پر۔“ میں نے کہا۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔ جیسے سمجھ نہ پارہا ہو کہ اس موقع پر کیا کہے۔

میں نے کہا۔ ”چلو آؤ، میں تمہیں تھوڑا سا موقع دیتا ہوں اپنی تیزی طراری آزمانے کا۔ میرا خیال ہے کہ یہ جگہ ساؤنڈ پروف ہے۔ اگر تمہیں رونا چلانا پڑا تو تمہاری آواز باہر نہیں جائے گی۔“

یقیناً اسے اپنے قوت بازو پر ضرورت سے زیادہ بھروسا تھا۔ اس نے مزید کوئی بات کہے بغیر مجھ پر حملہ کردیا۔ بے شک وہ لڑائی کے گر جانتا تھا اور اس میں وہ آگ بھی تھی جو ایک فائٹر کو اضافی توانائی دیتی ہے لیکن اس کا

سامنا ایک پروفیشنل شخص سے ہوا تھا۔ میں نے اس کا پہلا وار آسانی سے بچایا اور پھر اگلے پورے ایک منٹ تک اسے بار بار خود پر حملہ کرنے کا موقع دیا۔ وہ میری ٹھوڑی پر ایک اچٹتا ہوا سا ہاتھ لگانے کے سوا اور کچھ نہ کرسکا۔ وہ ہانپ رہا تھا اور اس کی حیرت بڑھتی جارہی تھی پھر اس نے ایک فاؤل کیا۔ اس نے جھپٹ کر الماری کی ایک زیریں دراز کھولی اور اس میں سے ایک ہتھیار نکالنے کی کوشش کی جیسا کہ بعد ازاں معلوم ہوا یہ ایک ریوالور تھا۔ میں نے تیزی سے اس کا بازو جکڑ لیا۔ اس نے ٹانگ چلائی اور یہ ٹانگ میں نے اپنی دونوں ٹانگوں کی گرفت میں لے لی۔ اس نے بوکھلاہٹ میں اندھا دھند زور لگایا اور ٹخنے کے اوپر سے اپنی پنڈلی تڑوا بیٹھا۔ ہڈی ٹوٹنے کی آواز بڑی واضح تھی۔

وہ درد کی شدت سے ڈکرایا اور اس کا رنگ لیموں کی طرح زرد ہوگیا۔

میں نے کہا۔ ''جو کچھ کیا ہے، تم نے خود کیا ہے کپتاناں... لیکن اب اگر تم نے میری بات نہ مانی تو پھر جو کچھ ہوگا، وہ میں کروں گا اور وہ کچھ زیادہ اچھا نہیں ہوگا۔''

''تک... کون ہو تم؟'' وہ درد کی شدت سے بل کھاتے ہوئے بولا۔

''تمہیں بتایا تو ہے گجراتی کا بندہ۔''

''نہیں، تم جھوٹ بول رہے ہو۔ گجراتی کے پاس تمہاری طرح کا کوئی بندہ نہیں ہوسکتا۔ میں اس کے لڑکوں کی کیٹیگری جانتا ہوں۔ تم... تم...''

''ہاں... ہاں بولو تمہاری پنڈلی کی ہڈی ٹوٹی ہے۔ زبان کی ہڈی تو نہیں ٹوٹی۔''

وہ خشک زرد ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ ''تم وہی ہو شاید جس کے بارے میں کچھ دن پہلے ٹی وی پر خبریں چلی تھیں۔ تم نے لاہور کے نواحی علاقے میں دہشت گردی کی کارروائی میں حصہ لیا اور پھر پولیس کی حراست سے بھاگے۔''

''چلو اب اگر تم نے اس دہشت گرد کو پہچان ہی لیا ہے تو پھر خود پر تھوڑی سی دہشت بھی طاری کرلو کیونکہ میری بات نہ ماننے کی صورت میں یہاں تمہارے ساتھ جو کچھ ہونے والا ہے، تم اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔''

اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی مضروب پنڈلی دبا رکھی تھی اور اس کا ماتھا پسینے سے تر ہوتا جارہا تھا۔

''کیا چاہتے ہو مجھ سے؟'' اس نے پوچھا۔

''بس چار پانچ سوالوں کے جواب لیکن بالکل ٹھیک ٹھیک۔''

''اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اب یہاں سے بچ کر نکل سکو گے تو یہ تمہاری بھول ہے۔''

''اور اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تم یوں خالی ڈرم کی طرح بج کر مجھے میرے ارادوں سے باز رکھ سکو گے تو یہ تمہاری بھول ہے۔'' اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی زخمی پنڈلی کو اپنے پاؤں سے ہلکی سی ٹھوکر لگائی۔ وہ بے ساختہ چلا اٹھا، آواز میں درد کا دریا بہہ گیا تھا۔

میں نے کہا۔ ''اس سے دس گنا زیادہ آواز سے بھی چلاؤ گے تو تمہاری پکار باہر نہیں جائے گی۔ میں نے اس کمرے کی ساؤنڈ پروف کوالٹی کو اب اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔ اگر کوئی شک ہے تو تجربہ کرکے دیکھ لو۔'' اس مرتبہ میں نے قدرے شدت سے کپتاناں کی ٹوٹی ہوئی ہڈی کو ٹھوکر ماری۔ وہ درد کی شدت سے بلند آواز میں ڈکرایا اور اس کی پوری ٹانگ تھرتھر کانپنے لگی۔

وہ سمجھ گیا تھا کہ صورتِ حال اس کے بس سے باہر ہوچکی ہے۔ جسمانی طور پر تو میں نے اسے شکست فاش دی ہی تھی، ذہنی طور پر بھی وہ بے طرح میرے نیچے لگ گیا تھا۔

وہ قالین پر گرا پڑا تھا۔ نیلی جین کے نیچے اس کی پنڈلی سوجتی جارہی تھی اور بڑے بے ڈھنگے انداز سے مڑی ہوئی تھی۔ میں اس کے قریب چرمی صوفے پر بیٹھ گیا۔ ''ہاں جی کپتان صاحب! اس وقت یہاں اس عمارت میں آپ کی ٹیم کے کتنے بندے اور بندیاں ہیں؟ لیکن جواب ایک سو ایک فیصد ٹھیک ہونا چاہیے ورنہ آپ کے پاؤں کو تھوڑی سی کوشش کے ساتھ باقی ٹانگ سے علیحدہ بھی کیا جاسکتا ہے۔''

وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ''تین بندے ہیں، ایک گارڈ، ایک چوکیدار اور ایک ملازم۔''

''بندیاں کتنی ہیں؟''

اس بار وہ ذرا ہچکچایا اور کراہتی آواز میں بولا۔ ''پانچ... ان میں سے تین گھر کی ملازمائیں ہیں اور دو پاشا صاحب کی دوستیں۔''

''واہ کیا مزیدار لفظ ہے دوستیں... یعنی فرینڈز۔ چلو ٹھیک ہے اور خود جناب پاشا صاحب اس وقت کہاں تشریف فرما ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ کس کمرے میں؟''

اس نے اپنی ٹوٹی ہوئی رسٹ واچ دیکھی اور بولا۔

''میرا خیال ہے کہ وہ اپنے بیڈروم میں جاچکے ہوں گے۔''

''اس بیڈروم یعنی Bad room میں آپ جناب کے پاس کون سا ہتھیار ہوگا؟ اور ایک بار پھر بتادوں، مجھے

جواب بالکل ٹھیک چاہیے۔“

”ان کے پاس بیڈروم میں ایک ٹرپل ٹو رائفل ہوتی ہے۔ ان کے سرہانے کی طرف بیڈ کے باکس میں رکھی رہتی ہے۔“

”جو تین بندے تم نے بتائے ہیں، ان کے پاس کیا اسلحہ ہے؟“

”گارڈ کے پاس سیون ایم ایم ہے۔ باقی دونوں ملازموں کے پاس کچھ نہیں۔ کم از کم میرے علم میں تو یہی ہے۔“ اس نے آخری فقرہ جیسے احتیاطاً ادا کیا۔ اس کی ٹانگ درد کی شدت سے لرزتی چلی جارہی تھی۔

میں نے یونہی دیوار گیر الماری کے سلائڈنگ دروازے کو حرکت دی اور بری طرح چونک گیا۔ اس الماری کو بس الماری کی طرح بنایا گیا تھا ورنہ یہ اندر سے کچھ اور تھی۔ ایک بڑے پینل پر آٹھ دس اسکرینز نظر آرہی تھیں۔ یہ دراصل ایک پورا نگرانی کا سسٹم تھا جس کے ذریعے کوٹھی کے مختلف حصوں میں لگے ہوئے سی سی ٹی وی کیمرے مختلف مناظر دکھا رہے تھے۔ ایک منظر اس مین گیٹ کا تھا جہاں سے ہم کچھ ہی دیر پہلے گزر کر اندر آئے تھے۔ ایک اسکرین پر کوٹھی کے بڑے سے کچن کا منظر دکھایا جارہا تھا۔ یہاں دو درمیانی عمر کی ملازمائیں برتن دھونے میں مصروف تھیں۔ ان میں سے ایک کو ہم نے اس ساؤنڈ پروف کمرے میں آنے سے پہلے دیکھا تھا۔ ایک منظر شاندار ٹی وی لاؤنج کا تھا۔ چھتیس اڑتیس برس کا ایک نشئی سا شخص پھیل کر بیش قیمت صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ ایک خوبرو اسمارٹ لڑکی اس کے پہلو میں بیٹھی اپنے سیل فون سے چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھی۔ شاید کوئی گیم وغیرہ کھیل رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے لاتعلق بیٹھے تھے۔ شاید ان میں کوئی لڑائی وغیرہ چل رہی تھی۔ درمیانی عمر کے شخص نے گلابی رنگ کا سلیپنگ گاؤن پہن رکھا تھا اور کوئی برانڈی قسم کی چیز ٹن پیک سے پی رہا تھا۔ اس کا سوجا ہوا تھوبڑا اور مخمور آنکھیں دیکھ کر میں جان گیا کہ یہی اس محل نما کوٹھی کا مالک بلکہ عیاش مالک اور مختارِ کل پاشا ہے۔

بقول داؤد بھاؤ اس شخص کو تین بازیاں لاحق تھیں۔ کبوتر بازی، نشے بازی اور عورت بازی اور اپنی ان تمام بازیوں سمیت یہ دو ٹکے کا بندہ شکیل داراب کی ناک کا بال بنا ہوا تھا۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے پاشا کے محافظِ خاص ارشد کپتانے نے بتایا تھا کہ پاشا صاحب بیڈروم میں جاچکے ہیں لیکن وہ شاید ابھی گیا نہیں تھا۔ غالباً کسی وجہ سے اس کا موڈ اپ سیٹ تھا اور وہ اپنی بغل میں موجود حسین لڑکی میں بھی کوئی خاص رغبت محسوس نہیں کررہا تھا۔

میں نے ارشد کپتانے سے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تم کوٹھی میں موجود تینوں مرد ملازموں کو یہاں اس کمرے میں بلاؤ۔ میرا خیال ہے کہ تم ایسا کرسکتے ہو؟“

اس کے تاثرات نے مجھے سمجھا دیا کہ وہ ایسا کرسکتا ہے لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور تذبذب کے عالم میں میری طرف دیکھتا رہا۔ میں نے پھر وہی کیا جو مضروب کپتانے کو گھائل جانور کی طرح چلّانے پر مجبور کردیتا تھا۔ میں نے بے رحمی سے اس کی ٹوٹی ہوئی ہڈی پر ضرب لگائی۔ وہ جیسے تڑپنے لگا بہرطور اس بے رحمی کا نتیجہ مثبت نکلا۔ قریباً دس منٹ بعد گارڈ سمیت کوٹھی کے تینوں ملازم اس ساؤنڈ پروف کمرے میں موجود تھے۔ پٹھان گارڈ اپنی سیون ایم ایم رائفل سے محروم ہوچکا تھا اور دونوں ہاتھ سر پر رکھے میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے خانساماں کو اپنی مدد پر مجبور کیا اور سب سے پہلے پٹھان گارڈ کے ہاتھ نائیلون کی رسی سے اس کی پشت پر بندھوائے بعدازاں باقی دونوں افراد کے ہاتھ بھی اسی طرح بندھ گئے۔

اب ملازماؤں کی باری تھی۔ دونوں ملازمائیں ابھی تک کچن میں نظر آرہی تھیں۔ میرے حکم پر ارشد نے جس طرح تھوڑی دیر پہلے گارڈ غلام خان کو فون کیا تھا اور اس سے کہا تھا کہ وہ باقی دونوں ساتھیوں کو لے کر فوراً میٹنگ والے کمرے میں پہنچے، فوری کام ہے۔ اسی طرح اب اس نے کچن میں کام کرتی ہوئی دراز قد ملازمہ سے کچن کے انٹر کام پر رابطہ کیا۔

بیل ہونے پر بھرے بھرے جسم والی خوبرو ملازمہ نے نیپکن سے ہاتھ صاف کیے اور ریسیور اٹھایا۔

”ہیلو۔“ ارشد کپتاناں نے بھاری آواز میں کہا۔

”جی کپتاناں صاحب۔“ ملازمہ جلدی سے بولی۔

”آسیہ تم نسرین اور بلی کو لے کر فوراً میٹنگ والے کمرے میں آؤ۔“

”خیریت تو ہے کپتاناں صاحب؟“ لڑکی آسیہ نے ذرا پریشان ہوکر کہا۔

”ہاں خیریت ہی ہے۔ تم جلدی کرو ضروری کام ہے۔“

اس نے جی اچھا کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا اور سی ٹی وی کیمرے کے فریم سے آؤٹ ہوگئی۔

قریباً تین چار منٹ بعد اس ساؤنڈ پروف کمرے سے باہر ہلکا سا بزر بجا۔ پہلے کی طرح میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ میں دروازے کی اوٹ میں ہوگیا۔ سامنے کپتاناں اسی طرح قالین پر پڑا تھا اور زخمی ٹانگ دونوں ہاتھوں سے تھام رکھی تھی۔

"کیا ہوا کپتاناں صاحب؟" آسیہ نامی وہ لڑکی چلّائی اور دیگر لڑکیوں کے ساتھ تیزی سے اندر آگئی۔ میں نے دروازہ فوراً لاک کردیا۔ میرے ہاتھ میں اب گارڈ غلام خان والی سیون ایم ایم رائفل تھی۔

ملازمائیں تقریباً ایک ساتھ چلّا اٹھیں۔ ان کی سمجھ میں آگیا تھا کہ یہاں کچھ بہت برا ہوچکا ہے۔ انہوں نے بندھے ہاتھوں والے مرد ملازمین کو بھی دیوار کے ساتھ کھڑے دیکھ لیا تھا۔ آسیہ کے پاس سیل فون موجود تھا۔ دیگر افراد کے سیل فونز کی طرح یہ فون بھی میں نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس بات کی تسلی میں پہلے ہی بہت اچھی طرح کرچکا تھا کہ یہاں اور کوئی فون موجود نہیں ہے۔ کوئی لینڈ لائن بھی نہیں۔

اب اسکرین والے چینل پر ٹی وی لاؤنج والا صوفہ بالکل خالی نظر آرہا تھا۔ ایل سی ڈی بھی آف تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ پاشا اپنے بیڈروم میں جاچکا ہے۔

قریباً پندرہ منٹ بعد میں اپنی ساری کارروائی مکمل کرچکا تھا۔ پاشا کی گرل فرینڈز میں سے ایک تو اس کے ساتھ بیڈروم میں تھی، دوسری باہر تھی۔ یہ بھی گداز جسم والی ایک دلکش لڑکی تھی۔ عمر چھبیس ستائیس سال رہی ہوگی۔ اس کا نام فرح معلوم ہوا تھا۔ میں نے اسے بھی گن پوائنٹ پر رکھ کر میٹنگ روم میں پہنچا دیا تھا۔ سب کے ہاتھ مضبوطی سے باندھے جاچکے تھے۔ مجھے صرف دو افراد کی طرف سے تھوڑا سا اندیشہ تھا۔ ایک گارڈ غلام خان اور دوسری ملازمہ آسیہ۔ یہ لڑکی آسیہ بھی دیگر افراد کی طرح مجھے کوئی چور ڈاکو ہی سمجھ رہی تھی اور مسلسل دھمکا رہی تھی۔ اس کی باتوں کا مفہوم یہ تھا کہ میں نے غلطی سے شیر کی کچھار میں قدم رکھ دیا ہے۔ اب یہاں میری ہڈیاں بھی نہیں ملیں گی۔ اگر مجھ میں تھوڑی بہت عقل بھی موجود ہے تو بدترین انجام سے بچنے کے لیے اب بھی یہاں سے دفان ہوجاؤں۔

کچھ اسی قسم کی باتیں غلام خان بھی کررہا تھا۔ اسے شاید یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ کوئی اکیلا شخص اس طرح دندناتا ہوا تنویر پاشا کے گھر میں گھس سکتا ہے اور کپتاناں جیسے شخص کو مارپیٹ کر اور لنگڑا کرکے فرش پر ڈال سکتا ہے۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا۔ "تم پاشا صاحب کو جانتا نہیں ہے... اور اگر جانتا ہے تو پھر تم سے بڑا بے وقوف اور کوئی نہیں۔ تم کو اندازہ نہیں ہے کہ یہاں تمہارا کیا حشر ہونا ہے..."

میں نے مناسب سمجھا کہ غلام خان کو مزید احتیاط کے طور پر اٹیچ باتھ روم میں لاک کردیا جائے اور میں نے ایسا ہی کیا۔ اس میٹنگ روم کا آہنی دروازہ بالکل محفوظ تھا اور میں نے پوری تسلی کرلی تھی کہ یہاں سے کوئی باہر نہیں نکل سکتا اور نہ ہی اپنی آواز باہر پہنچا سکتا ہے۔ موبائل فونز کے علاوہ کسی بھی قسم کا کوئی ہتھیار بھی میں نے میٹنگ روم میں نہیں رہنے دیا تھا۔ میٹنگ روم کو باہر سے لاک کرنے کے بعد میں نے گارڈ غلام خان والی سیون ایم ایم رائفل سنبھالی اور پاشا کے بیڈروم کا رخ کیا۔ دروازہ اندر سے لاک تھا۔ میں نے دو تین بار ہلکی ناک کی۔

"کون ہے؟" اندر سے باریک نسوانی آواز سنائی دی۔

میں نے پھر ناک کی۔ دروازہ کھل گیا اور لڑکی کی جھلّائی ہوئی شکل نظر آئی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں دہشت کے آثار ابھرے۔ میں نے لپک کر اس کے ہونٹوں پر اپنا مضبوط ہاتھ رکھ دیا اور اسی بازو کے ساتھ اسے عقب سے جکڑ لیا۔ میرے دوسرے ہاتھ میں رائفل تھی اور یہ رائفل میں نے جہازی سائز کے لگژری بیڈ کی طرف کردی تھی۔

بیڈ پر پاشا دبیز کمبل اوڑھے لیٹا تھا یقیناً سو رہا تھا۔ مجھے اس کے خراٹوں کی بہت مدھم آواز سنائی دی۔ سائڈ ٹیبل پر برانڈی کی بڑی بوتل اور گلاس وغیرہ پڑے تھے۔ بیڈروم میں بھی برانڈی کی بو رچی بسی تھی۔ خوبرو لڑکی میرے بازو کے شکنجے میں ایک مرتبہ چڑیا کی طرح پھڑپھڑائی پھر اس نے جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ میں نے تیز سرگوشی کی۔ "اگر شور نہیں کروگی تو کچھ نہیں کہوں گا اور رائفل بھی تمہاری طرف نہیں کروں گا۔"

لڑکی سرتاپا لرز رہی تھی۔ تاہم اس نے خود کو تیزی سے سنبھالا اور اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ اس کی طرف سے اطمینان محسوس ہوا تو میں نے اس کے ہونٹوں سے ہاتھ ہٹا لیا اور بازو کی گرفت بھی ڈھیلی کردی۔ وہ تڑپ کر مجھ سے جدا ہوئی اور پلٹ کر میری طرف دیکھنے لگی۔ وہ خوف زدہ ہونے کے باوجود دلکش نظر آرہی تھی۔

"کون ہو تم؟" وہ دھیمی لرزاں آواز میں بولی۔

"تمہیں کہا ہے نا جو کوئی بھی ہوں تمہیں نقصان نہیں

پہنچاؤں گا۔ میرا جھگڑا تمہارے اس منہ بولے خاوند پاشا سے ہے۔''

مجھے لڑکی کی شکل کچھ جانی پہچانی محسوس ہوئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے اسے ٹی وی اور رسالوں میں دیکھا ہوا ہے۔ میں نے اسے دیوار کے ساتھ کھڑا رہنے کا حکم دیا اور خود دبے پاؤں آگے بڑھ کر پاشا کے سرہانے پہنچ گیا۔ کپتانے نے اس باکس کی نشاندہی کردی تھی جس میں پاشا کی ٹرپل ٹو رائفل رکھی رہتی تھی لہٰذا مجھے رائفل تک پہنچنے اور اسے قبضے میں لینے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اس دوران میں، میں نے لڑکی پر بھی نظر رکھی۔ پاشا کی رائفل میں سے میگزین نکال کر میں نے جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا اور رائفل واپس رکھ دی۔

پاشا بدستور سو رہا تھا۔ میں نے لڑکی سے اس کا نام پوچھا۔ اس نے جاناں بتایا۔ میں نے کہا۔ ''تم ٹی وی پر کام کرتی ہو؟''

وہ منمنائی۔ ''بب... بس ایک دو اشتہاروں میں کام کیا ہے۔''

''یہاں اس بیڈروم میں پاشا کے ساتھ کون سا اشتہار بنوا رہی ہو؟''

وہ کٹ کر رہ گئی اور نیچے دیکھنے لگی۔ اس کی صورت بتا رہی تھی کہ وہ یہاں انجوائے نہیں کر رہی بلکہ بہ امر مجبوری موجود ہے۔ کسی پھنسی ہوئی لڑکی کی طرح۔

اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے وہ دلدوز منظر یاد آ گیا جب میں زخمی عارف کو اسپتال پہنچانے کے پاداش میں حوالات کے اندر بند کردیا گیا تھا اور پھر چچا حفیظ نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر مجھے انسپکٹر قیصر سے بے وجہ معافی مانگنے پر مجبور کیا تھا۔ جب میں معافی مانگنے انسپکٹر قیصر کے کمرے میں پہنچا تھا تو وہ فون پر بازار حسن کے کسی شخص سے بات کر رہا تھا۔ کسی لڑکی کا معاملہ تھا ایک ایسی آوارہ لڑکی جو اپنے گاہک سمیت پولیس کی گرفت میں آ گئی تھی۔ گفتگو میں اس لڑکی کا نام بھی آیا تھا۔ مجھے یاد آ گیا وہ نام جاناں ہی تھا۔ نوے فی صد امکان تھا کہ یہ وہی لڑکی ہے۔

''ابھی تک تمہاری جان ان لوگوں سے چھوٹی نہیں جاناں؟'' میں نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔

''کک... کیا... مطلب؟''

''خیر چھوڑو، یہ بات بعد میں ہو جائے گی۔ ابھی وقت کم ہے میں ذرا انٹرویو لے لوں تمہارے ان پاشا صاحب کا۔''

''کیسا انٹرویو؟'' وہ ہکلائی۔

''پاشا صاحب کو نوکری دینی ہے نا۔''

''نن... نوکری؟''

''ہاں دوزخ میں کھڑکیاں صاف کرنے کی نوکری۔'' میرا لہجہ زہرناک تھا۔

وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ میں نے احتیاطاً اسے کمرے کے اٹیچ باتھ روم میں لاک کردیا۔ وہ ہکا بکا تھی شاید یہاں کے دیگر مکینوں کی طرح اسے بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ کوئی اکیلا شخص پاشا جیسے دبنگ کے گھر میں گھس کر اس طرح کی کارروائی کرسکتا ہے۔

اس لڑکی جاناں کی طرف سے مطمئن ہو کر میں پاشا کے شاندار لگژری بیڈ تک پہنچا اور ٹھوکر مار کر اسے جگایا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ پہلے پچی ہوئی آنکھوں سے میری جانب دیکھتا رہا پھر جیسے یکایک اسے صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہوا۔

''کون ہو؟'' وہ گمبھیر آواز میں بولا۔

پھر میرے جواب دینے سے پہلے وہ تڑپ کر بیڈ کے اس چوبی باکس کی طرف بڑھا جو سرہانے کی طرف تھا۔ اس نے تیزی سے باکس کا ڈھکن اٹھایا اور اپنی ٹرپل ٹو رائفل نکال لی۔ اس نے رائفل کا رخ میری طرف کیا اور دہاڑا۔

''ہاتھ اوپر اٹھاؤ... کون ہو تم؟''

میں اس کی طرف بڑھا تو اس نے فائر کردیا۔ ٹریگر دبانے سے رائفل میں سے بس ٹرچ کی آواز نکل کر رہ گئی۔ میں نے کہا۔ ''پاشا! یہ بھی تمہاری طرح کھوکھلی ہو چکی ہے۔ بس نام کی رائفل ہے۔''

پاشا کا چہرہ حیرتوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ یقیناً اسے ایسا ہی لگ رہا تھا کہ وہ جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہا ہے پھر وہ ایک دم پکارنے لگا۔ ''کپتانے... کپتانے... غلام خان...''

میں نے اس کے سلیپنگ گاؤن کو گریبان کے پاس سے پکڑا اور ایک زوردار جھٹکا دے کر اسے قالین پر گرا دیا۔ اس نے گلابی گاؤن کے نیچے صرف ایک انڈرویئر پہن رکھا تھا۔ وہ پشت کے بل گرا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ رائفل اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے ایک بار پھر بے دریغ میری طرف ٹریگر دبایا۔ نتیجہ وہی نکلا جو پہلے تھا۔ اب اسے پتا چل گیا کہ رائفل کے ساتھ میگزین نہیں ہے۔ ''کون ہو تم... کیا چاہتے ہو؟'' وہ پھر

چنگھاڑا۔ اس کی ناک بری طرح سرخ ہو رہی تھی اور آواز بھی نزلہ زدہ تھی۔ غالباً اسے شدید قسم کا زکام لگا ہوا تھا۔ شاید اسی لیے وہ برانڈی وغیرہ بھی پی رہا تھا۔ جاناں جیسی لڑکی کے موجود اور دستیاب ہونے کے باوجود اس کے سو جانے کی وجہ بھی شاید یہی نزلہ زکام تھا۔ باتھ روم کے اندر لڑکی مسلسل دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی اور پاشا کو وہاں اپنی موجودگی کا پتا دے رہی تھی لیکن پاشا اس کی کیا مدد کر سکتا تھا وہ تو خود لوہے کے جال میں تھا اور برے حال میں تھا۔

میں اس کے قریب پہنچا تو اچانک اس نے پھرتی دکھانے کی ناکام کوشش کی۔ اس نے مجھے ٹانگوں سے پکڑ کر گرانا چاہا اور میرے اوپر سوار ہونا چاہا لیکن وہ ست الوجود شرابی اس سے دس گنا تیزی کا مظاہرہ کرتا تو بھی شاید اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہوتا۔ میں نے بہ آسانی اپنی ٹانگ بچائی اور پھر اس کے منہ پر ایک زوردار ٹھوکر لگانے کے بعد اسے بالوں سے گھسیٹتا ہوا بیڈ روم سے ٹی وی لاؤنج میں لے آیا۔ اسی کھینچا تانی میں پاشا کا ریشمی گاؤن بھی اس کے جسم سے جدا ہو گیا اور وہ انڈر ویئر میں مضحکہ خیز نظر آنے لگا۔ دراصل میں چاہتا تھا کہ پاشا کو اپنی اس بے عزتی کی پوری پوری کوریج ملے۔ بیڈ روم میں سی سی ٹی وی کیمرا موجود نہیں تھا لیکن یہاں ٹی وی لاؤنج میں تھا۔ ساؤنڈ پروف میٹنگ روم میں یقیناً ٹی وی لاؤنج کا پورا منظر دکھائی دے رہا تھا۔

رائفل ابھی تک پاشا کے ہاتھ میں تھی۔ میں اس کے سامنے خالی ہاتھ کھڑا تھا۔ کپتاناں کی طرح میں نے پاشا کو بھی اس کے دل کی حسرت نکالنے کا پورا موقع دیا۔ اگلے قریباً دو منٹ میں اس نے رائفل کو آہنی لاٹھی کی طرح استعمال کیا اور مجھ پر کئی اندھا دھند حملے کیے پھر اس نے رائفل چھوڑ کر ایک ٹوٹا ہوا بلوری گلدان پکڑ لیا اور اس کے نوکیلے کنارے کو خنجر کی طرح استعمال کر کے مجھے زخمی کرنے کی کوشش کی مگر مجھے چھو بھی نہیں سکا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ اس نے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں زخمی کر لیں۔ اس کا چربی دار جسم تھل تھل کر رہا تھا اور وہ بالکل ہانپا ہوا نڈھال بھینسا دکھائی دینے لگا تھا۔ ایل سی ڈی کی اسکرین برباد ہو گئی تھی اور دو کھڑکیوں کے شیشے بھی چکنا چور تھے۔ پاشا کی حالت اس دیوار کی سی تھی جسے ہوا کا ایک تیز جھونکا بھی مسمار کر دیتا ہے۔ یہ جھونکا میری ٹھوکر کی صورت میں اس کی دہنی پسلی پر لگا اور وہ گالیاں بکتا ہوا ایک صوفے پر جا گرا۔ پاشا کو جگانے سے پہلے میں نے گارڈ سے چھینی ہوئی سیون ایم رائفل ایک میز کے نیچے رکھ دی تھی۔ اب میں نے رائفل پھر اٹھالی اور اس کا بیرل پاشا کے پیٹ پر رکھ دیا۔

''کیا خیال ہے؟'' میں نے کہا۔ ''تمہاری ناف کے ساتھ ہی ایک اور ناف نہ بنا دی جائے؟''

اس نے پھر ایک گالی دی اور خطرناک دھمکی کا اعادہ کیا۔ میں نے جواباً اس کے منہ پر ٹھوکر ماری اور اسے خون تھوکنے پر مجبور کر دیا۔ ''دیکھ میرے پیارے بھینسے، پیٹ میں گولی لگے تو بندے کو مرنے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے اور میرا دل یہی چاہ رہا ہے کہ تجھے گولی ماروں تو پیٹ میں ماروں۔''

اس نے ایک بار پھر مجھ پر جھپٹنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں وہ صوفے سے قالین پر گر پڑا۔ میں نے اس کی گردن پر اپنا پاؤں رکھ دیا۔ وہ بری طرح کھانسنے لگا اور تکلیف کی شدت سے اس کی زبان باہر نکل آئی۔ اس کا انڈر ویئر کچھ نیچے کھسک گیا تھا اور وہ نیم عریاں نظر آنے لگا تھا۔ مجھے یہ سوچ کر مزہ آ رہا تھا کہ میٹنگ روم میں کنٹرول پینل کی اسکرین پر یہ سارا تماشا دیکھا جا رہا ہوگا۔

اگلے دو تین منٹ میں وہ بالکل بے بس نظر آنے لگا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ آج رات اس کے اس عشرت کدے میں کچھ بہت انوکھا ہو چکا ہے اور اس کی آہ و بکا سن کر اس کا کوئی پالتو اس کی مدد کے لیے یہاں نہیں آئے گا۔

وہ کچھ دھیما پڑا تو میں نے اس سے کہا کہ مجھے اس سے اپنے چند سوالوں کے جواب چاہئیں۔ اگر وہ ٹھیک جواب دے گا تو میں اس کی جان بخشی کر کے یہاں سے جا بھی سکتا ہوں۔ دوسری صورت میں اللہ نے چاہا تو کل شام سے پہلے پہلے اس کی نماز جنازہ ادا ہو جائے گی۔

وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ ''پہلے مجھے میرا گاؤن دو۔''

میں نے گاؤن کی طرف دیکھا۔ وہ بیڈ روم اور ٹی وی لاؤنج کے درمیان پڑا تھا۔ میں نے گاؤن اسے تھما دیا۔ اس نے لرزاں ہاتھوں کے ساتھ گاؤن پہنا اور اس مرتبہ اس کی بیلٹ بھی باندھی۔ میں اسے رائفل سے دھکا کر ایک ساتھ والے کمرے میں لے آیا۔ میں نے دیکھ لیا تھا یہاں سی سی ٹی وی کیمرا موجود نہیں تھا۔ یہاں تسلی کے ساتھ پاشا صاحب سے پوچھ گچھ کی جا سکتی تھی۔ داؤد کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ یہ بندہ شکیل داراب کی کسی دکھتی رگ سے واقف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں ہے۔

اس کمرے میں پہنچنے کے بعد پاشا نے مجھ سے پہلا

سوال یہی کیا کہ اس کا عملہ اور ارشد کپتان وغیرہ کہاں ہیں۔
میں نے کہا۔ ''ان کے بارے میں تسلی رکھو۔ وہ تم سے بہت بہتر پوزیشن میں ہیں۔ میٹنگ روم میں حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کررہے ہوں گے۔ تم ان کی فکر چھوڑ دو اور اپنی کرو۔ مجھے تم سے شکیل داراب کے بارے میں کچھ پوچھنا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تم اس سے اپنی وفاداری نبھانے کی کوشش کرو لیکن یاد رکھو، آج رات تم کسی ایک سے ہی وفا کرسکو گے۔ شکیل سے یا اپنی زندگی سے۔''
''مجھے سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کہہ رہے ہو؟''
میں اس کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔ ''تم ایک عظیم کبوتر باز ہو اور کبوتر باز کی نظر بہت تیز ہوتی ہے۔ مجھے شاید پہچانا نہیں ہے تم نے؟''
اس نے ایک بار پھر آنکھیں کھول کر بڑے دھیان سے مجھے دیکھا اور اس کے تمتماتے ہوئے چہرے پر سنسنی سی پھیل گئی، بولا۔ ''کہیں تم... میرا مطلب ہے... کہیں وہی تو نہیں ہو جس نے قیصر چودھری کو گن پوائنٹ پر...''
''ہاں وہی ہوں۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''اور اب تمہیں یہ بھی یاد آگیا ہوگا کہ میں نے مفرور ہونے سے پہلے اور کیا کیا کارنامے کررکھے ہیں۔ بم پھوڑے ہیں، دہشت گردیاں کی ہیں، پولیس مقابلے فرمائے ہیں اور قیصر چودھری کی ساری باتیں مانی جائیں تو پھر میں نے قتلِ عام اور قتلِ خواص بھی کیے ہیں۔''
اچانک وہ ہوا جس کی توقع مجھے ہرگز نہیں تھی۔ کم از کم اس اسٹیج پر تو نہیں تھی۔ ابھی تو پاشا سے بات چیت ہی شروع ہوئی تھی۔ اس نے دفعتاً اپنے گاؤن کی کشادہ جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھرتی سے کوئی چیز منہ میں ڈال کر چبالی۔
''یہ کیا ہے؟'' میں نے اس کا منہ دبوچ کر اسے اس کے ارادے سے باز رکھنا چاہا لیکن وہ منہ میں ڈالی ہوئی چیز نگل چکا تھا۔ یہ کوئی نہایت تیزی سے اثر کرنے والی دوا تھی۔ میں نے اسے سر کے بالوں سے پکڑ کر جھنجوڑا اور پوچھا کہ اس نے کیا کھایا ہے۔
اس نے کوئی معقول جواب نہیں دیا۔ بس مجھے خطرناک دھمکیوں سے نوازتا رہا۔ اسی دوران میں اس کی آنکھیں نیم باز نظر آنے لگیں۔ مشکل سے ایک منٹ گزرا ہوگا کہ اس کے چہرے کا رنگ بدلا اور اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے۔ اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ وہ بے ہوش ہوچکا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ نہایت سریع الاثر بے ہوشی کی دوا تھی۔ بالکل انستھیسیا کی طرح اثر کرنے والی۔
اس نے بزدلی آمیز چالاکی دکھائی تھی اور خود کو بے ہوشی کے حوالے کرکے میری بازپرس سے جان چھڑالی تھی۔
میں نے اس کے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیے۔ اسے جھنجوڑا، ہلایا جلایا لیکن اندازہ ہوا کہ اس کی بے ہوشی گہری اور طویل ہے۔ چند لمحوں کے لیے میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ پاشا کے بیڈروم کی طرف سے گاہے بگاہے دروازہ پیٹنے کی آواز آرہی تھی۔ یہ وہی جاناں نامی لڑکی تھی جسے میں نے باتھ روم میں بند کیا تھا۔ چند روز پہلے یہ لڑکی اپنے کسی گاہک کے ساتھ پولیس کے ہتھے چڑھی تھی اور ابھی تک اس چکر میں پھنسی ہوئی تھی یقیناً وہ ابھی تک اپنے ٹھکانے پر واپس نہیں گئی تھی۔
میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ یہ جاناں نئی نئی پھنسی ہوئی مچھلی ہے۔ یہ پاشا کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتی تھی لیکن وہ دوسری فرح نامی لڑکی اس تالاب کی پرانی مچھلی لگتی تھی۔ کوشش کرکے اس سے کوئی کام کی بات معلوم کی جاسکتی تھی اور نہ جانے کیوں میرا دل بھی یہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ بتائے گی۔
میں نے بے ہوش پاشا کو گھسیٹا اور اسے بھی کمرے کے باتھ روم میں لاک کردیا۔ اس کے ریشمی گاؤن کی تلاشی لی تو جیب کی اندرونی جانب ٹیپ سے چپکایا ہوا ایک اور کیپسول برآمد ہوا۔ کچھ دیر پہلے اسی طرح کا کیپسول پاشا نے چبایا تھا جیسا کہ بعد میں فرح نامی لڑکی سے مجھے معلوم ہوا۔ اگر وہ یہ دونوں کیپسول ایک ساتھ چبالیتا تو اس کی موت واقع ہوجاتی۔ یہ کیپسولز کسی ہنگامی صورتِ حال کے لیے پاشا نے اپنے لباس میں رکھے ہوئے تھے۔ اس کی بے مہار عیاشیوں نے یقیناً اس کے کئی دشمن بھی پیدا کررکھے تھے۔ شاید کسی ایسے ہی دشمن کے قہر سے بچنے کے لیے اس نے یہ انتظام کررکھا ہوگا۔
پاشا کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے غلام خان والی رائفل اٹھائی اور میٹنگ روم کا رخ کیا۔ میں فرح کو پوچھ گچھ کے لیے میٹنگ روم سے نکالنا چاہتا تھا۔ اس کام میں تھوڑی سی دشواری تو ہوئی لیکن میں کامیاب رہا۔ فرح کو لے کر میں اس کمرے میں آگیا جہاں پاشا سے سوال جواب کیے تھے۔
فرح بھی خوش شکل تھی۔ اس نے شب بسری کا ڈھیلا ڈھالا سلکی لباس پہن رکھا تھا۔ بال جوڑے کی صورت میں کس کر باندھے ہوئے تھے۔ وہ سی سی ٹی وی کیمرے کے ذریعے اپنے باس کا حشر دیکھ چکی تھی۔ اس کا دم خم تو اسی وقت

ختم ہوگیا تھا جب اس نے میٹنگ روم میں کپتانا کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ ملاحظہ کی تھی اور دیگر ملازمین کو بندھے ہوئے دیکھا تھا۔ اب پاشا کی درگت دیکھنے کے بعد وہ بالکل ہی لرزاں و ترساں نظر آتی تھی۔ میرے اشارے پر چل رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''تم سمجھ ہی گئی ہوگی، آج کی رات تم لوگوں پر بہت بھاری ہے۔ زندہ وہی بچے گا، جو مجھ سے تعاون کرے گا۔''

اس نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر اثبات میں سر ہلایا۔

''اپنے بارے میں بتاؤ؟'' میں نے تحکم سے کہا۔

جواب میں اس نے جو کچھ کہا، اس سے پتا چلا کہ...

وہ لالہ نظام کے ایک پراپرٹی ڈیلنگ آفس سبحان ڈویلپرز میں ملازمت کرتی تھی۔ بدقسمتی سے وہیں پر ایک دن پاشا آیا اور اس کی نظرِ کرم اس پر پڑ گئی۔ اس کی منگنی ہوچکی تھی لیکن اپنے منگیتر سے اس کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ وہ دبئی میں رہتا تھا۔ پاشا نے اپنا رعب داب استعمال کر کے دو چار مہینوں میں اس کے منگیتر کو فار ایسٹ بھگا دیا اور اسے اپنے تصرف میں لے آیا۔ شروع میں وہ اس سے شادی کا وعدہ بھی کرتا تھا لیکن بعد میں اس وعدے سے بالکل انکاری ہوگیا وغیرہ وغیرہ۔

مجھے اندازہ ہوا کہ اندر سے یہ لڑکی پاشا کے خلاف غم و غصے سے بھری ہوئی ہے۔ ظاہر نہیں ہونے دے رہی ورنہ شاید پاشا کی شاندار درگت دیکھنے کے بعد وہ اندر سے بہت مسرور تھی۔

میں نے کہا۔ ''دیکھو فرح! اس کمرے میں جو بات چیت ہو رہی ہے، وہ ہم دونوں تک ہی رہے گی۔ تمہیں یقین دلانے کے لیے میں بس یہی کہوں گا کہ یہ ایک مرد کی زبان ہے۔''

''لیکن میں سچ کہہ رہی ہوں... م... میں پاشا صاحب کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتی۔ شاید اتنا ہی جانتی ہوں جتنا عام ملازم جانتے ہوں گے۔ دراصل وہ...''

وہ رک گئی۔

''ہاں ہاں کہو۔'' میں نے اسے اکسایا۔

''دراصل... یہ بہت گہرا بندہ ہے۔ اپنے سائے پر بھی بھروسا نہیں کرتا۔'' اس بار بولتے ہوئے فرح کے لہجے میں ایک زہر سا سرایت کر گیا۔

میں نے یہ بات بھانپ لی کہ وہ ویسے تو پاشا کے خلاف بھری ہوئی ہے اور پاشا کا حشر دیکھنے کے بعد اس کے اندر تھوڑی بہت جرأت بھی پیدا ہوئی ہے مگر وہ زیادہ کچھ نہیں جانتی ہے اور اس کی یہ بات درست ہے کہ پاشا بہت گہرا اور گھنا بندہ ہے۔

میں اسے مسلسل اعتماد میں لینے کی کوشش کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ جرأت بھی دے رہا تھا کہ اگر وہ کوئی اہم بات جانتی ہے تو بتا دے۔

آخر اس نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔ ''بھائی جی! میرا اندازہ ہے کہ پاشا کی کوئی منکوحہ بیوی بھی ہے... یا پھر تھی۔''

''اس اندازے کی وجہ؟''

''کبھی کبھی جب وہ بہت نشے میں ہوتا ہے تو کسی ناہید نامی عورت کا نام لیتا ہے۔ اسے بہت گالیاں دیتا ہے اور اول فول بکتا ہے۔''

''تمہارا کیا قیافہ ہے... وہ واقعی اس کی بیوی ہے؟''

''میرا یہی خیال ہے اور یہ بھی اندازہ ہے کہ شاید وہ بے اولاد ہے۔''

''ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟''

''پاشا نے ایک بار اسے بانجھ، بنجر اور کمینی وغیرہ کے خطاب دیے تھے۔''

میں نے بہت کوشش کی کہ فرح نامی اس لڑکی سے اس بارے میں کچھ اور جان سکوں لیکن یہی محسوس ہوا کہ اس بارے میں وہ جو جانتی تھی، اس نے بتا دیا ہے۔ اس سے صرف ایک اضافی بات معلوم ہوسکی۔ اس نے بتایا۔ ''میٹنگ روم کے ساتھ ایک چھوٹا کمرا ہے جو ہر وقت لاک رہتا ہے۔ اس میں پاشا کی ذاتی چیزیں پڑی ہیں۔ کچھ کاغذات، نایاب شراب کی کچھ بوتلیں، کچھ حنوط شدہ کبوتر، اسمگل کیے ہوئے چند ہتھیار اور اسی طرح کا اور سامان ہوسکتا ہے کہ جس سے آپ کو کوئی کام کی بات معلوم ہوجائے۔''

''اس کی چابی کہاں ہوگی؟''

''پاشا کے بیڈروم میں ہے، ڈھونڈنا پڑے گی۔'' فرح نے جواب دیا۔

''کیا تم اس سلسلے میں کوئی مدد کرو گی؟''

اس نے بڑی عاجزی سے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''میں آپ کی منت کرتی ہوں مجھے اس میں انوالو نہ کریں۔ آپ نے وعدہ کیا ہے کہ یہاں جو بھی تھوڑی بہت بات ہوئی ہے، وہ بھی ہمارے درمیان ہی رہے گی۔''

اس کی سیاہ آنکھوں میں عجز والتجا کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ میں نے باتھ روم میں جا کر پاشا کا معائنہ کیا۔ وہ سلیپنگ گاؤن میں ٹائلوں کے فرش پر بے سدھ پڑا تھا۔ فرح بے شک تعاون کر رہی تھی لیکن اس کے حوالے سے بھی میں کوئی رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔ میں نے اسے بھی باتھ روم میں مقفل کر دیا اور پاشا کے بیڈروم میں چلا گیا۔ یہاں کے باتھ روم سے جاناں کے رونے کی مدھم آواز ابھر رہی تھی۔ غالباً رونے چلّانے کے بعد وہ نڈھال سی ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ پاشا کے بیڈروم میں، میں نے قریباً دس منٹ لگائے اور ایک الماری کی اندرونی دراز سے میں مطلوبہ چابی ڈھونڈنے میں کامیاب ہوا۔

سات آٹھ سیڑھیاں اتر کر میں پاشا کے پرائیویٹ کمرے میں پہنچا۔ یہ قریباً پندرہ ضرب پندرہ فٹ کا کمرا تھا۔ باقی عمارت کی طرح اس کی آرائش میں بھی بے تحاشا امارات کی جھلک تھی۔ یہاں وہ سب کچھ موجود تھا جس کی اس فرح نامی لڑکی نے نشاندہی کی تھی۔ جدید طرز کے قیمتی پسٹل، پرانی شراب کی قیمتی بوتلیں، شیشے کے ایک منقش آبنوسی باکس میں حنوط شدہ کبوتروں کا ایک جوڑا، رجسٹریاں، اقرار نامے، چیک بکس اور پتا نہیں کیا کچھ۔

میں نے ایک دیوار گیر الماری کی تلاشی لینا شروع کی۔ اس میں موجود بیشتر اشیا تنویر پاشا کی عیاش طبیعت کی غماز تھیں۔ بیس تیس منٹ میں، میں نے اس مختصر کمرے کے ایک ایک انچ کی تلاشی لی اور سب کچھ تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ یوں لگتا تھا کہ کمرے میں جنات نے تہلکہ مچا دیا ہے۔ میں نے ایک تیز دھار چاقو کی مدد سے صوفہ ادھیڑ دیا اور کرسیوں کی نشستوں کو بھی چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ دیوار گیر الماری کی سب درازیں فرش پر پڑی تھیں اور میں لکڑی کے تختوں کو ٹھوک بجا کر دیکھ چکا تھا۔ مجھے کوئی ایسی چیز یا ایسا کاغذ وغیرہ نہیں ملا جو کسی طور اس بات کی تصدیق کر سکتا جو ابھی کچھ دیر پہلے فرح نے مجھے بتائی تھی۔ کوئی ایسا کلیو بھی نہیں ملا جو تنویر پاشا کے ماضی پر کوئی روشنی ڈال سکتا۔ صرف... چند پیپرز سے اتنا معلوم ہو سکا کہ دو ڈھائی سال پہلے، پاشا کو کثرتِ شراب نوشی کی وجہ سے گردوں کی تکلیف لاحق ہوئی تھی اور وہ علاج کے لیے لندن کے ایک معروف اسپتال میں گیا تھا۔ یہ بات مجھے پہلے سے معلوم تھی۔

میں نے دس پندرہ منٹ مزید سر مارا اور پھر مایوس ہو گیا۔ اس کمرے میں داخل ہونے سے پہلے جو امید نمودار ہوئی تھی، وہ یکسر اوجھل ہو گئی۔ میں نے جھلاہٹ میں دیوار گیر الماری کو ٹھوکر ماری تو اچانک اس کی ایک اندرونی شیلف کا چند انچ چوڑا ٹکڑا کھل کر نیچے لٹک گیا۔ یہاں ایک چور خانہ تھا۔ چور خانے میں کچھ پراپرٹی کے پیپرز تھے، کچھ غیر ملکی کرنسی اور ضروری کاغذات تھے۔ یہیں پر مجھے ایک پرانے شناختی کارڈ کی فوٹو اسٹیٹ ملی، یہ ایک خاتون کا شناختی کارڈ تھا۔ نام نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ ناہید فیضان۔ شناختی کارڈ کے ساتھ ہی دو تین مزید کاغذ تھے۔ ان کو دیکھ کر مجھ پر انکشاف ہوا کہ یہ ناہید فیضان کا کوئی پرانا اپائنٹمنٹ لیٹر ہے۔ اس لیٹر سے اس انگلش اسکول کا نام معلوم ہوا جہاں وہ بطور ٹیچر سروس کر رہی تھی۔ اس لیٹر پر ناہید کا نام ناہید پاشا درج تھا۔ یہ بے حد اہم پیش رفت تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے فرح نے جو کچھ بتایا تھا وہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ ماضی قریب میں پاشا شادی شدہ تھا اور اس کی شریکِ حیات وہی ناہید نامی لڑکی تھی جسے وہ کبھی کبھار نشے میں دھت ہو کر گالیاں دیتا تھا۔ یہ لڑکی کسی اسکول میں ٹیچنگ کرتی رہی تھی۔

پھر میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے فرح کی یہ بات بھی یاد آئی کہ پاشا چند سال پہلے تک ایک معمولی شخص تھا۔ پوش علاقے کے کسی اسکول میں اس کے پاس کینٹین وغیرہ کا ٹھیکا تھا۔ غالباً وہ یہی اسکول تھا جہاں ناہید فیضان ملازمت کرتی تھی۔ فوری خیال ذہن میں یہی آیا کہ شاید وہیں پر ان دونوں کی ملاقات ہوئی جو بعدازاں ازدواجی بندھن کی شکل اختیار کر گئی (لیکن یہ خیال بعد میں غلط ثابت ہوا)

ایک اہم سرا ہاتھ آ گیا تھا اور اس سرے کے ذریعے میں کسی سراغ تک پہنچ سکتا تھا۔ داؤد کے الفاظ میرے ذہن میں گونج رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی پاشا کے پاس شکیل داراب کا کوئی ایسا راز ہے جس کی وجہ سے وہ بغیر ایک تنکا دہرا کیے عیاشیوں کی زندگی گزار رہا تھا۔

اپنے سارے ملازموں کے سامنے تنویر پاشا کی یادگار درگت بنی تھی۔ آج رات کے لیے یہ سزا اس کے لیے کافی تھی۔ یہ جگہ چھوڑنے سے پہلے میں نے کپتاناں کی مدد سے تین سی سی ٹی وی کیمروں میں موجود آج رات کی تمام فوٹیج ضائع کر دی۔ کپتاناں بہت خودسر شخص تھا لیکن ٹانگ کی سنگین چوٹ نے اس کے لیے وہی کام کیا تھا جو مشتعل اونٹ کے لیے نکیل کرتی ہے۔ میں ٹانگ کو ہلکی سی ٹھوکر لگاتا تو وہ جیسے بلبلا اٹھتا تھا۔ میں واپسی کے لیے کپتاناں کی سبز مہران کار استعمال کرنا چاہ رہا تھا لیکن مسئلہ وہی میرے پہچانے جانے کا تھا۔ میں ہیلمٹ کے بغیر باہر نکلنا نہیں چاہتا

تھا۔ میں نے گھریلو ملازم کی موٹر سائیکل استعمال کی۔ سر پر ہیلمٹ رکھ کر میں ایک بار پھر بہ آسانی لاہور کی سڑکوں پر سے گزرا۔ میں اس موٹر سائیکل کو گیسٹ ہاؤس کے اندر ہی لے گیا۔ یہاں انیق بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ بیسمنٹ میں پہنچ گیا۔

☆☆☆

اگلا روز بڑا اہم تھا۔ داؤد بھاؤ کی ہدایت پر انیق نے بڑی ہوشیاری اور تیز رفتاری سے کام لیا۔ صبح دس بجے سے پہلے ہی وہ اس انگلش میڈیم اسکول میں پہنچ گیا جس کا سراغ میں نے پاشا کے خاص کمرے سے لگایا تھا۔ یہ پوش علاقے کا ایک کافی مہنگا اور مشہور اسکول تھا۔ یہاں بیوروکریٹس، انتظامی عہدیداروں اور دیگر معروف لوگوں کے بچے زیرِ تعلیم تھے۔

میڈیا پر یا اخبار میں کہیں بھی رات والے واقعے کی خبر موجود نہیں تھی۔ کہیں پر ہلکا سا اشارہ بھی نہیں تھا کہ پاشا جیسے دبنگ شخص کے گھر میں کل رات کیا تماشا ہوا ہے۔ ہاں ایک دن پہلے والے ایکسیڈنٹ کے بارے میں نمایاں خبریں اور تبصرے موجود تھے۔ لالہ نظام چودھری کی لاش کی تصویر بھی جاری ہوئی تھی۔ اس کے نتھنوں میں روئی تھی اور منہ کھلا ہوا تھا۔ جیسے آخری لمحوں میں اسے یقین ہی نہ آرہا ہو کہ ایک دیوہیکل ٹرک اس کی زندگی کا چراغ گل کرنے کے لیے اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک اور نہایت اہم اور غیر متوقع خبر بھی نیوز میں موجود تھی اور میرے نقطۂ نظر سے یہ بڑی خوش کن خبر تھی۔ ٹرک کا نشے باز ڈرائیور سر کی چوٹ کی وجہ سے جانبر نہیں ہوسکا تھا۔ جس وقت لوڈر ٹرک مرسڈیز سے ٹکرایا ڈرائیور فرنٹ سیٹ پر بے ہوش پڑا تھا۔ تصادم سے اس کا سر ونڈ اسکرین سے ٹکرایا تھا جس سے ونڈ اسکرین بھی ٹوٹ گئی تھی۔ اس چوٹ نے انٹرنل بلیڈنگ کی اور وہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اب اس بات کا کھوج دینے والا کوئی نہیں تھا کہ ٹرک اور مرسڈیز کا تصادم ڈرائیور کی غلطی کی وجہ سے نہیں ہوا تھا۔

اسکول سے انیق کی واپسی دوپہر دو بجے کے قریب ہوئی۔ اس نے مجھے معلومات فراہم کرتے ہوئے بتایا۔

''شاہ زیب بھائی! ناہید پاشا اسکول کی ایک بہت اچھی اور پسندیدہ ٹیچر تھی لیکن وہ کوئی چھ سال پہلے اسکول کی ملازمت چھوڑ گئی تھی۔ یہ ملازمت اس نے اپنی مرضی سے چھوڑی تھی۔ وہ اب کہیں لاہور میں ہی رہائش رکھتی ہے۔ میں ایک دوسری ٹیچر کے ذریعے اس کا کھوج لگانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ ٹیچر آج شام تک مجھے کچھ نہ کچھ بتائے گی۔''

''پاشا کے بارے میں کیا معلوم ہوا؟'' میں نے انیق سے پوچھا۔

''پاشا اور ناہید میاں بیوی تھے۔ یہ دونوں بارہ تیرہ برس پہلے ملتان کے علاقے سے لاہور آئے تھے۔ یہاں ناہید کو اسکول میں جاب مل گئی بعد میں پاشا کو بھی اسی اسکول میں کینٹین اور پارکنگ وغیرہ کا ٹھیکا مل گیا۔ بظاہر میاں بیوی میں سلوک تھا لیکن ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔''

''کوئی اور خاص بات؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ کافی مہنگا، ہائی فائی تعلیمی ادارہ ہے۔ پتا چلا ہے کہ داراب فیملی کے بچے بھی یہاں پڑھتے رہے ہیں اور تو اور کچھ عرصہ شکیل داراب بھی اس اسکول میں رہا ہے۔ بعد میں وہ انگلینڈ کے کسی تعلیمی ادارے میں چلا گیا تھا۔''

میرے جسم میں جیسے کرنٹ سا دوڑ گیا۔ کچھ لنکو سے بن رہے تھے۔ شکیل داراب بھی اسی اسکول میں پڑھتا رہا تھا۔ اس کے اس اسکول میں پڑھنے اور اب تنویر پاشا کے عیاشیوں میں ڈوبے ہونے میں کیا ناتا ہوسکتا تھا؟ داؤد بھاؤ کے الفاظ پھر میرے کانوں میں گونجے... یوں لگتا ہے کہ پاشا کے پاس داراب فیملی کا کوئی خاص بھید ہے۔

اب مجھے بے چینی سے شام کا انتظار تھا کیونکہ انیق کو ناہید کے پتے ٹھکانے کے بارے میں کچھ بتانا تھا۔ میں اس ساری پیش رفت سے داؤد بھاؤ کو بھی آگاہ رکھے ہوئے تھا۔ میں نے تنویر پاشا کے گھر میں گھس کر کل رات جو دھانسو قسم کی کارروائی کی تھی، اس نے مجھ پر داؤ کا اعتماد کچھ اور بڑھا دیا تھا۔ (قیصر چودھری کے بارے میں اطلاعات تھیں کہ اس کا ایک بازو دو جگہ سے ٹوٹ گیا ہے اور سر پر بھی چوٹیں ہیں۔ وہ اسپتال میں تھا)

شام آٹھ بجے سے کچھ دیر پہلے انیق نے فون پر مجھ سے رابطہ کیا۔ اس کی یہ کال مایوس کن ثابت ہوئی۔ اس نے بتایا کہ ناہید یا ناہید پاشا کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ ایک ذریعے سے یہ بات بھی پتا چلی ہے کہ وہ لاہور میں نہیں بلکہ سیالکوٹ میں کہیں رہائش رکھتی ہے۔

یہ معاملہ کھٹائی میں پڑتا نظر آرہا تھا لیکن میں اسے کھٹائی میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ گھڑی کی سوئیاں چل رہی تھیں۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ سات روز بعد ہفتے کے دن عاشرہ کی شادی شکیل داراب کے ساتھ تھی۔ یہ میرے لیے ڈیڈ لائن تھی۔ مجھے ہفتے کے دن سے پہلے پہلے کچھ کرنا تھا۔ میں نے بھاؤ سے درخواست کی اور بھاؤ نے اسی وقت

انیق کو بذریعہ فلائنگ کوچ سیالکوٹ روانہ کردیا۔
میرے اندازے کے عین مطابق داؤد بھاؤ کو بھی انیق کی صلاحیتوں پر پورا اعتماد تھا۔ اسے معلوم تھا کہ بظاہر یہ عام سا لڑکا دیواروں میں در بنانے کا ہنر جانتا ہے اور ہر قسم کے حالات سے نبرد آزما ہوسکتا ہے۔ میں نے بے چینی سے انیق کے فون کا انتظار کیا۔ خدا خدا کر کے اگلے روز سہ پہر کے وقت انیق کا حوصلہ افزا فون آگیا۔ اس نے بتایا کہ اس نے سیالکوٹ کے انڈسٹریل ایریا کے قریب ایک پوش علاقے میں ناہید نام کی ایک خاتون کا سراغ لگایا ہے۔ وہ دس مرلہ کی ایک کوٹھی میں ایک بوڑھی عورت کے ساتھ رہائش پذیر ہے۔ خیال ہے کہ یہی خاتون ماضی کی اسکول ٹیچر ناہید پاشا ہے۔
ایک گھنٹے بعد انیق کا فون دوبارہ آیا۔ اس مرتبہ اس کی آواز جوش سے لرز رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''شاہ زیب بھائی! میں بہت خوش ہوں۔ سمجھئے کہ فلم آئینہ میں گمشدہ شبنم کو دوبارہ دیکھنے کے بعد ندیم اتنا خوش نہیں ہوا ہوگا جتنا میں ہو رہا ہوں۔''
''ہاں بتاؤ، کیا اطلاع ہے؟'' میں نے بدستور سنجیدہ رہتے ہوئے کہا۔
وہ بولا۔ ''یہ ناہید صاحبہ وہی اسکول ٹیچر ہیں۔ ان کے ساتھ کوٹھی میں رہنے والی ان کی بوڑھی آیا جتولہ ہے۔ ناہید طلاق یافتہ ہیں۔ ان کی گزر بسر قریبی مارکیٹ میں موجود چند دکانوں کے کرائے سے ہوتی ہے۔ محلے میں ان کی نیک نامی ہے۔ ضرورت مندوں کی مدد کرتی رہتی ہیں۔''
''کیا تم اس عورت سے براہِ راست مل چکے ہو؟''
''نہیں جناب لیکن جس مارکیٹ میں ان کی دکانیں ہیں وہاں سے تسلی بخش معلومات حاصل ہوگئی ہیں۔''
میں نے تیزی سے سوچتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے انیق، تم سیالکوٹ میں ہی رکو، میں چند گھنٹوں میں تم تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اپنا ایڈریس بتاؤ۔''
انیق نے ایک ہوٹل کا پتا بتایا اور میں جانے کے لیے تیار ہوگیا۔
داؤد بھاؤ کی اطلاع کے مطابق لاہور اور گرد و نواح میں بڑی سرگرمی سے میری تلاش ہو رہی تھی۔ میں کسی عام گاڑی کے ذریعے سفر نہیں کرسکتا تھا۔ داؤد بھاؤ مجھے پوری پوری لاجسٹک سہولتیں فراہم کر رہا تھا۔ اس نے اس بار میرے سفر کا انتظام ایک ٹرک کے ذریعے کیا۔ یہ ٹرک دلی دروازے کی ایک گڈز ایجنسی سے معمول کے سفر پر سیالکوٹ جا رہا تھا۔ اس پر لاہور سے سیالکوٹ ٹرانسفر ہونے والے کسی سرکاری افسر کا گھریلو سامان لدا ہوا تھا۔ میرے لیے اس سامان کے اندر ہی بیٹھنے کے لیے جگہ بنا دی گئی۔ میں ایک ڈبل صوفے پر آرام سے نیم دراز ہوگیا۔ سامان کے اوپر ترپال ڈال دی گئی تھی۔ داؤد بھاؤ کا کہنا تھا جس طرح کی بے کار چیکنگ ٹرکوں کے سامان کی ہوتی ہے۔ ہاتھی کو بھی بہ آسانی چھپا کر ایک شہر سے دوسرے شہر لے جایا جاسکتا ہے۔''
اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ لاہور سے سیالکوٹ تک کے سفر میں تقریباً پانچ گھنٹے لگے۔ کئی جگہ ٹرک رکا بھی لیکن کسی ایک جگہ بھی کوئی معائنہ کار ٹرک کے پچھلے حصے میں نہیں آیا۔ میں نے سیالکوٹ روانگی سے پہلے داؤد بھاؤ سے ایک دو ضروری چیزیں مانگی تھیں جن میں ایک کیمرا بھی شامل تھا۔ بھاؤ نے کہا تھا۔ ''یہاں سے کچھ لے جانے کی ضرورت نہیں۔ سیالکوٹ میں اپنا بندہ موجود ہے۔ انیق سے کہنا جو چاہو گے مل جائے گا۔''

☆☆☆

رات ساڑھے نو بجے کے لگ بھگ میں سیالکوٹ کے ایک اچھے ہوٹل میں انیق کے ساتھ موجود تھا۔ انیق کے پاس پریس کا ایک کارڈ موجود تھا۔ یہ کارڈ ایک ایسے مشہور روزنامے کا تھا جس کے ایک سینئر رپورٹر کو سبق سکھانے کے لیے داؤد کے کارندوں نے چند دن پہلے سخت مار لگائی تھی اور اس سے ہاتھ وغیرہ جڑوا کر اس کی تصویریں کھینچی تھیں۔ پروگرام کے مطابق کل ہم نے اس ناہید نامی خاتون تک پہنچنے کے لیے یہی کارڈ استعمال کرنا تھا۔ رات کو ہی انیق نے مجھے وہ اشیا بھی مہیا کردیں جن کی ضرورت ہمیں پڑ سکتی تھی۔ ان میں ایک تو وہ کیمرا تھا جو پریس کے فوٹوگرافرز استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور اسپائی کیمرا تھا۔ ناروے میں، میں نے ایسے اسپائی کیمرے کا ایک دو دفعہ بڑا کامیاب استعمال کیا تھا۔ یہ جدید اسپائی کیمرے یوں تو بہت چھوٹے بھی ہوتے ہیں لیکن جو مجھے چاہیے تھا، اسے پن ہول ڈی وی آر کہتے ہیں اور اسے پورٹ ایبل مانیٹر پر آسانی سے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یہ سائز میں تقریباً انسانی ناخن کے سائز کا ہوتا ہے اور اس کی اہم خصوصیت اس کا آڈیو اور اس کی بیٹری کا بیک اپ ہے جو 48 گھنٹے سے زیادہ کا ہوتا ہے۔
میں نے ایک کیمرا منگوایا تھا لیکن انیق دو لے آیا۔ وہ ہر کام اور ہر طرح کی گفتگو میں کہیں نہ کہیں فلم کے حوالے

ڈھونڈ لیتا تھا۔ جس طرح لوگ اپنے دلائل کی مضبوطی کے لیے کتابوں، دانشوروں اور ضرب المثل وغیرہ کے حوالے دیتے ہیں، وہ فلموں کے حوالے دیتا تھا۔ پتا نہیں کہ وہ جان بوجھ کر ایسا کرتا تھا یا اس کی طبع ہی ایسی تھی۔ اب بھی بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ''میں احتیاطاً دو کیمرے لے آیا ہوں۔ آپ کو راج مور کی وہ فلم تو یاد ہی ہوگی جس میں ایسا ہی ایک کینڈڈ کیمرا خراب ہوگیا تھا لیکن دوسرے نے کام کر دکھایا تھا۔''

میں نے دانستہ اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا ورنہ وہ مذکورہ ایکٹر اور اس کی ساری فلموں کا انسائیکلو پیڈیا کھول کر بیٹھ جاتا۔ میرا خیال تھا کہ صبح وہ میرے ساتھ بطور کیمرا مین ناہید کے گھر جائے گا لیکن بھاؤ نے اس کے بجائے ایک اور وقاص نامی لڑکے کی ڈیوٹی لگائی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ بھاؤ، انیق کو ایسے کاموں سے دور رکھتا ہے جن میں پولیس کی نگاہوں میں آنے کا خدشہ موجود ہو۔

اگلے روز ایک موٹر سائیکل پر سوار ہم انڈسٹریل ایریا کے اس پوش رہائشی علاقے میں پہنچے جہاں ناہید کی رہائش تھی۔ حسبِ معمول موٹر سائیکل میں چلا رہا تھا اور میرے سر پر ہیلمٹ تھا۔ سیالکوٹ میں مجھے شاندار سڑکیں اور عالیشان عمارتیں دیکھنے کو ملیں۔ ہم ایک رہائشی علاقے میں داخل ہوئے اور ایک خوب صورت گھر کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔ کال بیل دینے پر ایک ادھیڑ عمر ملازمہ باہر نکلی۔ اس نے آنے کی وجہ پوچھی۔ میں نے پریس کارڈ اسے دکھایا اور کہا کہ ''ہم میڈم سے ملنا چاہتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا انٹرویو کرنا ہے۔''

عورت اندر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد آ کر اس نے کہا۔ ''بیگم صاحبہ کسی سے ملتی نہیں ہیں نہ ہی انٹرویو وغیرہ دیتی ہیں۔ ویسے آپ کس سلسلے میں انٹرویو لینا چاہتے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''اگر آپ ان سے بات کروا دیں تو میں تفصیل بتا دیتا ہوں۔ اگر وہ راضی ہوں گی تو ٹھیک ہے ورنہ ہم اصرار نہیں کریں گے۔''

ملازمہ پھر اندر چلی گئی۔ اس بار دروازے کے پیچھے سے جو آواز ابھری، وہ یقیناً ناہید کی ہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''جی فرمائیں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے دروازے کی جھری میں سے باہر نگاہ ڈالی۔ مجھے صرف بڑی بڑی حسین آنکھیں دکھائی دیں۔ آنکھوں میں ایک کشش سی تھی۔

میں نے کہا۔ ''میڈم! تکلیف کے لیے بہت معذرت۔ دراصل ہم ان خاتون اساتذہ کے بارے میں معلومات جمع کر رہے ہیں جو اب ریٹائرمنٹ لائف گزار رہی ہیں۔ ان کے معاشی احوال اور ان کے طرزِ زندگی کو عام لوگوں تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ آپ سے بس پندرہ منٹ درکار ہوں گے۔''

''آپ کو یہاں کا ایڈریس کیسے ملا؟''

''کچھ معلومات آپ کے اسکول سے حاصل ہوئیں۔ کچھ ہم نے تگ و دو کی۔ دراصل آپ جیسی کامیاب اور ہردلعزیز استاد تک رسائی حاصل کرنا ہمارے لیے اعزاز کی بات تھی۔ اب اگر آپ تھوڑا سا وقت بھی...''

''سوری جی۔'' خاتون نے تیزی سے میری بات کاٹی۔ ''میں ریٹائرمنٹ کی لائف گزار رہی ہوں اور بس چار دیواری میں رہنا پسند کرتی ہوں۔''

میں نے پینترا بدلا۔ ''ٹھیک ہے میڈم اگر آپ انٹرویو نہیں دینا چاہتیں تو نہ دیں ہم آپ کی تصویر وغیرہ بھی نہیں لیتے لیکن آپ کے خیالات سے تو مستفید ہو سکتے ہیں؟''

''نہیں... میں نہیں چاہتی کہ کسی بھی حوالے سے میرا نام وغیرہ اخبار میں آئے۔''

''ٹھیک ہے میڈم، آپ کہتی ہیں تو ہم آپ کا کوئی تذکرہ نہیں کریں گے لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر ہم صرف آپ کے خیالات سے ہی مستفید ہو سکے تو ہمارے اس کام کی اہمیت بہت بڑھ جائے گی۔''

وہ متذبذب نظر آنے لگی تھی۔ میں اس کے ذہن کو پڑھنے میں کامیاب ہو رہا تھا۔ وہ یقیناً ایک نیک خُو خاتون تھی اور اپنی ذات سے کسی کو فائدہ پہنچانے میں بخل سے کام نہیں لیتی تھی۔ میں نے تھوڑی سی کوشش مزید کی اور اسے رضامند کرنے میں کامیاب رہا۔

ہم اس کے گھر میں داخل ہوئے۔ ڈرائنگ روم میں لکڑی کا کام وغیرہ ہو رہا تھا۔ اس لیے خاتون نے ہمیں ایک اور کمرے میں بٹھایا۔ کمرے کی آرائش سے خاتونِ خانہ کے سلیقے اور رکھ رکھاؤ کا پتا چلتا تھا۔ وہ خود بھی دلکشی اور وقار کا مجسمہ نظر آتی تھی۔ عمر چھتیس اڑتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ جسم کچھ فربہ ہونا شروع ہوگیا تھا لیکن اچھے قد کی وجہ سے یہ مٹاپا زیادہ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ ایک شال نے اس کے جسم کو اَز فراہم کر رکھی تھی۔ شال کے نیچے دوپٹا تھا جس نے نصف سر ڈھانپ رکھا تھا۔

اس نے ملازمہ کو چائے لانے کا کہا اور ہمارے ساتھ بات چیت شروع کی۔ اس نے اپنا نام نہ لکھے جانے

کی شرط پر ہمیں یہ بتایا کہ پرائیویٹ اسکولز میں کس کس طرح خاتون اساتذہ کا استحصال کیا جاتا ہے۔ انہیں بہت کم تنخواہیں دی جاتی ہیں اور پیپرز میں زیادہ ظاہر کی جاتی ہیں۔ ان سے جبری مشقت لی جاتی ہے اور کہیں کہیں تو انہیں جنسی طور پر بھی ہراساں کیا جاتا ہے۔

میں نے گفتگو کا رخ ناہید کی ذاتی زندگی اور ملازمت کے دورانیے کی طرف موڑ دیا۔ اس کے بعد میں نے داراب فیملی کا ذکر کر دیا۔ میں نے کہا۔ ''میڈم! جن دنوں آپ اسکول میں ٹیچنگ کر رہی تھیں۔ کئی اعلیٰ خاندانوں کے بچے وہاں پڑھ رہے تھے۔ میرے خیال میں داراب فیملی کے شکیل صاحب بھی نویں یا دسویں کلاس میں تھے؟''

میں نے دیکھا، میڈم ناہید کے چہرے پر عجیب سا رنگ آ کر گزر گیا۔ اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''ہاں... ایسا ہی تھا۔''

''ان بڑے لوگوں کے بچوں کو پڑھانا اور ان کو ہینڈل کرنا آپ کو کیسا لگتا تھا؟'' میں نے دریافت کیا۔

''بس... کچھ مشکل بچے تو ہوتے ہیں اور یہ ہر طبقے میں ہوتے ہیں۔ استاد اچھا ہو تو وہ مینج کر لیتا ہے۔'' ناہید نے گول مول جواب دیا۔

''شکیل داراب کیسا بچہ تھا؟ میرا مطلب ہے کبھی آپ کو اس سے کوئی مسئلہ تو پیش نہیں آیا؟ میرا مطلب ہے بڑے لوگوں کے بچے ہر جگہ پروٹوکول مانگتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ ان کے ساتھ خصوصی رعایت برتی جائے؟''

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں تھی۔'' ناہید نے مختصر جواب دیا۔ صاف محسوس ہوا کہ وہ اس موضوع کو طول دینا نہیں چاہتی۔

وہ بڑے دھیمے اور شائستہ لہجے میں بات کرتی تھی۔ کسی وقت وہ یقیناً کافی دلکش رہی ہوگی لیکن اب عمر کے اثرات نے اس کے سراپا پر پنجے گاڑنے شروع کر دیے تھے۔ میں نے سوچا کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ شکیل کی تعلیم کے سلسلے میں میڈم ناہید کی ملاقات اس کے والد عطا داراب وغیرہ سے ہوتی رہی ہو۔ عطا جیسے لوگوں سے کچھ بعید نہیں ہوتا کہ کس کے بارے میں کس طرح سوچنے لگیں۔

میں نے کہا۔ ''آئی ایم ویری سوری میڈم! میں نے آپ کے کافی کان کھالیے ہیں۔ بس ایک آخری سوال آپ سے کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے اس وقت جاب چھوڑی جب اسکول کو آپ کی ضرورت تھی۔ آپ اسکول کی دو تین اہم ترین ٹیچرز میں تھیں۔ کیا آپ کے جاب چھوڑنے کے پیچھے کسی طرح کا کوئی تنازعہ تھا یا پھر آپ کی کوئی نجی مجبوری تھی؟''

ایک بار پھر ناہید کے چہرے پر رنگ لہرایا تاہم وہ بدستور نارمل لہجے میں بولی۔ ''یہ میری ذاتی، گھریلو مجبوری تھی۔ اس میں اسکول یا اسکول کے حالات کا کوئی دخل نہیں تھا۔''

قدرت نے ہماری مدد کی۔ ساتھ والے کمرے میں لینڈ لائن فون کی گھنٹی بجی۔ ناہید نے پہلے ملازمہ سکینہ کو آواز دی پھر خود ہی کال ریسیو کرنے کے لیے گئی۔ میں مائیکرو کیمرا چسپاں کرنے کے لیے جگہ پہلے ہی تاڑ چکا تھا۔ اس سے بہتر جگہ کوئی مل ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ دیوار پر ایک آرائشی لیمپ تھا جس پر بہت سے رنگ برنگے آرٹی فیشل نگینے جڑے ہوئے تھے۔ ہمارا کیمرا بھی تقریباً ان نگینوں کے سائز کا تھا۔ میں نے ایک سبزی مائل نگینے کے اوپر اسے چسپاں کر دیا۔ چسپاں کرنے کے بعد میں نے دیکھا تو مجھے خود بھی فوراً پتا نہیں چلا کہ کیمرا کہاں ہے۔

ایک منٹ کے اندر ہی ناہید واپس آگئی۔ چائے کی ٹرالی بھی آگئی تھی۔ ہم نے چائے پی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ خوش اخلاق ہونے کے باوجود میڈم ناہید ہماری موجودگی سے خوش نہیں ہے اور ہمیں جلد سے جلد چلتا کرنا چاہتی ہے۔

''بہت شکریہ میڈم۔'' میں نے کہا۔ ''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم اپنے آرٹیکل میں آپ کی دانشمندانہ باتوں کا تذکرہ تو ضرور کریں گے لیکن آپ کا نام کہیں نہیں آئے گا۔''

کچھ دیر بعد ہم رخصت ہو کر باہر نکل رہے تھے۔ جب گھر کا دروازہ بند ہو گیا اور میرے کیمرا مین ساتھی نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنا شروع کی تو مجھے ایک اور سنہری موقع مل گیا۔ دوسرا اسپائی کیمرا میرے پاس موجود تھا اور اسے استعمال کرنے کے لیے ایک بڑی مناسب جگہ بھی نظر آگئی تھی۔ گیٹ سے تھوڑے ہی فاصلے پر ٹین کی چادر کا ایک کیبن سا بنا ہوا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے تک شاید یہ کیبن اس اسٹریٹ کا چوکیدار استعمال کرتا ہوگا لیکن اب اس کا دروازہ ٹوٹ چکا تھا اور اندر جالے لگے ہوئے تھے۔ نیا کیبن کنکریٹ کا تھا اور کچھ فاصلے پر بنایا گیا تھا۔ میں یونہی ٹین کے کیبن میں جھانکنے کے لیے آگے بڑھا اور ایک کونے میں ٹین پر کیمرا چسپاں کر دیا۔ کیمرے کا رخ ناہید کی رہائش گاہ کے دروازے کی طرف تھا۔

ایسے کیمرے بڑی آسانی سے اپنی ٹرانسمیشن طویل فاصلے تک پہنچا سکتے ہیں۔ ہمارا ہوٹل تو یہاں سے بمشکل چار پانچ کلومیٹر کی دوری پر تھا۔ ہوٹل پہنچ کر میں نے انیق کو اپنی کارروائی کا احوال بتایا۔ ہم نے سب سے پہلے اپنا ریسیونگ ڈیوائس نکالا اور اسے دھڑکتے دل کے ساتھ آن کیا۔ فریکوئنسی سیٹ ہوگئی تو سگنل صاف ہوگئے اور پھر ایکا یکی اسکرین پر دونوں کیمروں کے مناظر نمودار ہوگئے۔ رزلٹ میری توقعات سے بڑھ کر تھا۔ باہر والے کیمرے کی تصویر زیادہ واضح اور روشن تھی اور وہ گھر کے گیٹ کو ٹھیک ٹھیک کور کر رہا تھا۔ اندر کمرے میں شاید ایک لائٹ آن تھی اس کے باوجود کمرے کے پورے خدوخال نظر آرہے تھے اور آڈیو سگنل بھی موصول ہو رہے تھے۔ یہ حساس ڈیوائس دس پندرہ فٹ کی دوری سے بہ آسانی آواز پکڑ لیتا تھا۔ گھریلو ملازمہ کچن میں برتن کھڑکھڑا رہی تھی اور مدھم آواز ہم تک بھی پہنچ رہی تھی۔

''زبردست۔'' انیق نے تعریف کی۔

''بیٹری کا بیک اپ کتنا ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے ڈبے سے پڑھ کر بتایا۔ پین کر رہا ہو تو 36 گھنٹے اور اسٹل ہو تو قریباً 50 گھنٹے۔

نہ جانے کیوں میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ ہم جلد ہی کوئی اہم منظر دیکھ پائیں گے یا آواز سن سکیں گے۔

یہ دو کیمروں کے دو ریسیور تھے جو ہم نے ساتھ ساتھ ایک میز پر رکھ دیے تھے۔ رات تک یہ دونوں ریسیور مسلسل ہماری نگاہ میں رہے۔ مختلف اوقات میں مختلف مناظر ہماری آنکھوں کے سامنے آئے۔ ہم نے اس کمرے میں ناہید کو دو بار نماز پڑھتے دیکھا پھر اپنی ستر اسّی سالہ آیا سے باتیں کرتے دیکھا اور سنا۔ اس گفتگو میں ہمارا ذکر بھی آیا۔ عمر رسیدہ آیا کا خیال تھا کہ ایسے لوگوں کو گھر میں گھسنے ہی نہیں دینا چاہیے۔ (اور اس کا خیال بالکل ٹھیک تھا) ایک مرتبہ مجھے اندر والے کیمرے کا ریسیور آف کرنا پڑا کیونکہ ناہید اپنا کوئی نیا سلا ہوا کرتہ پہن کر دیکھ رہی تھی۔ باہر کا کیمرا بھی مختلف آوازیں سنا رہا تھا اور مناظر دکھا رہا تھا۔ بہرحال یہ مناظر زیادہ اہم نہیں تھے۔ بس ایک مرتبہ غالباً کیبل کی فیس مانگنے والا گیٹ پر دکھائی دیا۔ ایک مرتبہ ایک ہمسائی اپنے چار پانچ سالہ بچے کے ساتھ گھر میں گئی۔ رات کو بھی ہم دونوں دو ڈھائی بجے تک باری باری نگرانی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ آخر اندر باہر بالکل سکوت چھا گیا۔ ہم بھی سوگئے۔

صبح آٹھ ساڑھے آٹھ بجے پھر نگرانی کا یہ سلسلہ شروع ہوگیا۔ اب ہم کچھ کچھ بور ہونے لگے تھے۔ اندر والے کیمرے کی تصویر صاف نہیں آرہی تھی کیونکہ کمرے کی لائٹ آف تھی۔ باہر والے کیمرے کی تصویر تو بہت واضح تھی لیکن اس کے آڈیو سگنلز میں کوئی گڑبڑ ہوگئی تھی۔ بہرحال اس کے بغیر بھی نگرانی تو جاری تھی۔ دس گیارہ بجے کے قریب ڈرائنگ روم میں کام کرنے والے کارپینٹر کے جھگڑے کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ غالباً ان کا کوئی ساتھی بتائے بغیر کام سے غائب ہوگیا تھا اور جاتے جاتے کچھ اوزار بھی اُڑا لے گیا تھا۔

دوپہر کے وقت میں نے انیق سے کہا۔ ''بجائے اس کے کہ ہم الوؤں کی طرح دیدے پھاڑ پھاڑ کر بس ان دو اسکرینز کو ہی دیکھتے رہیں۔ کچھ ہاتھ پاؤں بھی ہلانے چاہئیں۔''

''شاید آپ چاہتے ہیں کہ میں سپر مارکیٹ جاؤں اور میڈم کی دکانوں کے کرائے داروں سے کچھ انفارمیشن لینے کی کوشش کروں۔''

میں نے کہا۔ ''میں یہ کام خود کرتا لیکن تم جانتے ہو میرا کھلے عام پھرنا رسک سے خالی نہیں ہے۔''

''آپ میرے منہ کی بات چھین لیتے ہیں۔'' اس نے کہا پھر خود ہی مسکرا کر بولا۔ ''ویسے کسی کا موبائل یا پرس چھیننے اور منہ کی بات چھیننے میں کتنا فرق ہے؟''

وہ اکثر مزاحیہ بات بھی کرتا تھا اور بڑی سادگی سے کرتا تھا لیکن فی الوقت میرا موڈ ایسا ہرگز نہیں تھا کہ اس کی باتوں سے لطف اندوز ہوسکتا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ چلا گیا اور میں کمرے میں بستر پر لیٹ کر اسکرینز کو واچ کرتا رہا اور خیالوں کے تانے بانے بُنتا رہا۔ ناہید کا کردار کافی پُراسرار محسوس ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ہونے والی گفتگو سے صاف پتا چلا تھا کہ اس نے اسکول کی ملازمت نارمل انداز میں نہیں چھوڑی تھی۔ کوئی تنازعہ ہوا تھا یا کوئی اور معاملہ اور اس میں کچھ نہ کچھ ہاتھ تو شکیل داراب کا بھی تھا جو اس وقت نویں دسویں کا طالب علم تھا۔

سارا دن ہم کوئی کام کی بات معلوم نہ کرسکے۔ انیق بھی اپنی تمام تر ہوشیاری کے باوجود بھی سپر مارکیٹ سے کوئی انفارمیشن ڈھونڈنے میں ناکام تھا۔ رات قریباً بارہ بجے تک ہم واچ کرتے رہے۔ شاید تھوڑی دیر بعد ہم یہ نگرانی ختم کر کے سو جاتے لیکن پھر ایک اسکرین پر کچھ ہلچل

نظر آئی۔ یہ اندر والا کیمرا تھا۔ کمرے کی لائٹس روشن تھیں اس لیے منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ہم نے ناہید کو دیکھا، وہ اندر آئی اور اس نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرلیا تھا۔ وہ کچھ بے چین سی نظر آرہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ دیوار گیر الماری کی طرف گئی۔ یہ غیر معمولی طور پر بڑی الماری تھی۔ اچانک ناہید نے آگے بڑھ کر الماری کا دروازہ کھولا۔ کوئی شخص الماری میں سے نکل کر اطمینان سے چلتا ہوا کمرے میں آگیا۔ اس نے شلوار قمیص اور ویسٹ کوٹ پہن رکھا تھا۔ گھنے بال سلیقے سے سر پر جمے ہوئے تھے۔

''یہ کیا ہے بھئی؟'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

انیق نے بھی تعجب سے میری طرف دیکھا۔ ایک شخص کا کمرے میں آنا اور وہ بھی الماری کے راستے سے۔ بالکل افسانوی سی بات لگتی تھی لیکن جو کچھ ہوا، ہماری آنکھوں کے سامنے تھا۔

''اوہ گاڈ... اوہ گاڈ'' انیق نے بے پناہ حیرت سے کہا۔

''کیا ہوا؟''

''اس کو پہچانیے جی... اس کو دیکھیے۔'' انیق کی آواز لرز رہی تھی۔ میں نے دھیان سے اس شخص کو دیکھا جو اب سکون سے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ آرائشی لیمپ میں چھپا ہوا اسپائی کیمرا اسے بائیں رخ سے واضح طور پر دکھا رہا تھا۔ ایک دم مجھے لگا جیسے کسی نے میرے سر پر بم پھوڑ دیا ہے۔ میں ہکا بکا سا چھ انچ کی اس اسکرین کو دیکھتا رہ گیا۔ اپنی نگاہوں پر یقین ہی نہیں ہو رہا تھا۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا تھا تو کمرے میں ناہید کے ساتھ نظر آنے والا جواں سال شخص کوئی اور نہیں خود شکیل داراب تھا۔ میں نے کئی بار اخبار و رسائل اور الیکٹرانک میڈیا پر اس کی تصویر دیکھی تھی۔ شکیل داراب جیسا نامور شخص اور یہاں اس گمنام ٹیچر کے کمرے میں... اور اس سے بھی بڑھ کر حیرانی کی بات ایک اور بھی تھی، یہ الہ دین کے چراغ کے جن کی طرح اچانک ہی کمرے کے اندر سے نمودار ہوا تھا۔

میں نے کہا۔ ''انیق، یہ شکیل ہی ہے نا؟''

''ایک سو فی صد جناب۔'' انیق کی آواز کی کپکپاہٹ برقرار تھی۔ اس نے ریسیور کی ایک ناب گھما کر تصویر کی کوالٹی کو مزید بہتر کیا اور سرسراتی آواز میں بولا۔ ''لیکن یہ آیا کہاں سے ہے جی۔ باہر والے کیمرے نے تو کسی کی آمد نہیں دکھائی...''

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کو کہا۔ آڈیو سگنل آرہے تھے۔ شکیل کچھ کہہ رہا تھا، ہم نے آڈیو کا والیم بڑھایا۔ پہلے شور شامل تھا مگر پھر آواز واضح سنائی دینے لگی۔ ناہید اور شکیل داراب لگژری صوفے پر قریب قریب بیٹھے تھے۔ ناہید نے شکیل کے الجھے ہوئے بالوں میں انگلیاں چلائیں اور اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ شکیل نے قدرے بیزاری سے کہا۔

''مجھے سگریٹ دینا۔''

ناہید اٹھ کر سائڈ ٹیبل تک گئی اور سگریٹ کیس اور لائٹر لا کر شکیل کے قریب رکھ دیے۔

وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ ''تم رویہ دکھا رہی ہو۔ جو کچھ ہو رہا ہے یہ سب تمہیں پہلے سے معلوم تھا۔ ابھی شادی والی بات چیت شروع بھی نہیں ہوئی تھی جب میں نے تمہیں الف سے یے تک سب بتا دیا تھا۔''

''تو میں کچھ کہہ رہی ہوں شکیل؟ میں تو دل سے خوش ہوں۔ بس یہی کہہ رہی ہوں نا کہ اگر ہو سکے تو اب ہم ملاقات نہ کیا کریں۔ ویسے بھی...'' وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔

''کیا... ویسے بھی؟'' شکیل نے خشک لہجے میں پوچھا۔

وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ''ویسے بھی... میں جانتی ہوں شکیل، اب تمہیں مجھ میں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ تم بس کسی وقت مجبوری سے ہی میری طرف آتے ہو۔''

''ہاں نہیں ہے دلچسپی... اور مجھے بھی پتا ہے کہ اب تمہیں بھی میری شکل دیکھنا کچھ زیادہ اچھا نہیں لگتا۔ تو پھر کیوں نا یہ سلسلہ اب ختم ہی کردیں... قانونی طور پر ختم کردیں۔ Divorce لے لو مجھ سے...''

''پلیز شکیل... پلیز یہ لفظ زبان سے مت نکالو۔ میں ایک دفعہ یہ زہر پی چکی ہوں پھر پینا نہیں چاہتی۔ میں تم سے کچھ مانگ نہیں رہی، کوئی چھوٹی سے چھوٹی توقع بھی نہیں رکھتی۔ میں جہاں ہوں خوش ہوں۔ بس مجھے اسی حالت میں یہاں پڑا رہنے دو۔ ویسے تو گھڑی پل کا پتا نہیں لیکن مجھے نہیں لگتا کہ دو چار سال سے زیادہ جی سکوں گی۔'' وہ آزردہ لہجے میں بولی۔

وہ سگریٹ کا کش لیتے ہوئے بند کھڑکی کی طرف چلا گیا اور کیمرے کے فریم سے نکل گیا۔ اس نے کچھ کہا لیکن آواز واضح طور پر سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

ناہید فریج کی طرف گئی۔ اس نے وہاں سے ایک ڈونگا نکالا۔ کوئی سوئٹ ڈش تھی، ساتھ میں باؤل اور چمچ تھا۔

اس نے یہ چیزیں میز پر رکھیں۔
''کیا کر رہی ہو؟'' شکیل نے پھر بیزاری سے کہا۔
''رس ملائی ہے... گھر کی۔''
''ابھی نہیں کھانا مجھے کچھ۔ رکھو اسے فریج میں۔'' شکیل گمبھیر آواز میں بولا پھر سر پکڑ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد اس نے واسکٹ کی جیب سے سیل فون نکالا اور اس پر شاید میسج وغیرہ کرنے لگا۔ اس نے دھیمی آواز میں ایک دو فقرے بھی ادا کیے جو سمجھ میں نہیں آئے۔ ناہید کچھ دیر اس کے پاس بیٹھی رہی پھر دھیرے دھیرے اس کے کندھے دبانے لگی۔ وہ لاتعلق سا سیل فون سے مصروف رہا۔

انیق نے کہا۔ ''شاہ زیب صاحب یہ کیا چکر ہے جی... مجھے تو یقین نہیں آرہا۔ یہ... یہ خبیث شکیل اس عورت سے نو دس سال چھوٹا تو ہوگا اور یہ اس کا اسٹوڈنٹ بھی رہا ہے۔''

''ہاں... ہے تو یہ سب کچھ بہت انوکھا لیکن ناممکن نہیں ہے۔ ایسے واقعات دیکھنے میں آتے ہیں جب اسٹوڈنٹس اپنے ٹیچرز میں اس طرح انوالو ہوجاتے ہیں۔''
''لیکن... یہ سب کچھ تو ایک حد تک ہوتا ہے جی۔''
''کل تم نے خود ہی کہا تھا۔ ان امیروں کے لیے کوئی حد نہیں ہوتی...''

ہم دونوں خاموش ہوگئے اور اپنے اپنے طور پر حساب جوڑنے لگے۔ آج سے دس گیارہ سال پہلے شکیل داراب یقیناً میٹرک کا اسٹوڈنٹ تھا۔ اس وقت ناہید کی عمر پچیس چھبیس سال ہوگی۔ یقیناً یہ سلسلہ اسی دور میں شروع ہوا ہوگا۔

انیق لرزتے ہاتھوں سے باہر والے کیمرے کو آپریٹ کرنے لگا۔ اس نے اس کی ریکارڈنگ دیکھنے کے لیے اسے ری وائنڈ کیا۔ وہ قریباً ایک گھنٹا پیچھے چلا گیا پھر اس نے پلے کا بٹن دبا کر فارورڈ کا بٹن دبایا۔ فوٹیج اسپیڈ کے ساتھ چلنے لگی۔ تین چار منٹ میں ہم نے پچھلے ایک گھنٹے کی ریکارڈنگ دیکھ لی۔ گیٹ سے کوئی بندہ ناہید کے گھر میں داخل نہیں ہوا تھا۔ یہ بڑی حیران کن بات تھی۔ تو کیا شکیل داراب پہلے سے اس کمرے کی الماری کے اندر موجود تھا؟ یہ ناقابلِ یقین بات تھی اور اس کی کوئی لاجک بھی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

اسی دوران میں اندر والے کیمرے کی آڈیو پر کال کا میوزک سنائی دیا۔ یہ کال شکیل کے سیل فون پر آئی تھی۔ اس نے قیمتی موبائل کان سے لگا کر ہیلو کہا پھر دوسری طرف سے کی جانے والی بات سن کر بولا۔ ''اوکے، روکو اُن کو۔ میں آرہا ہوں تھوڑی دیر میں۔''

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ناہید نے اسے اس کا سگریٹ کیس تھمایا۔ وہ سگریٹ کیس لیتا ہوا دیوار گیر الماری کی طرف گیا اور اندر داخل ہوگیا۔ بالکل جیسے کسی دروازے میں داخل ہوتے ہیں۔ ناہید نے الماری کا دروازہ باہر سے بند کردیا۔
''اوگاڈ... یہ تو کوئی دروازہ ہے۔'' انیق نے کہا۔
''اور لگتا ہے کہ کسی دوسرے گھر میں کھل رہا ہے۔'' میں نے خیال ظاہر کیا۔
''امیزنگ... بے حد حیران کن ہے یہ سب کچھ۔ یہ تو بہت تہلکہ مچانے والی نیوز ہے۔''
''لیکن ابھی یہ صرف اور صرف ہم تک رہنی چاہیے۔'' میں نے انیق کو یاد دلایا۔

اس نے تسلی بخش انداز میں سر ہلایا اور ایک بار پھر اندرونی کیمرے کے ریسیور کی طرف متوجہ ہوگیا۔ کمرے کا منظر اب دھندلا ہوچکا تھا کیونکہ صرف ایک چھوٹی لائٹ آن تھی۔ ناہید باہر جاچکی تھی اور جاتے جاتے دروازہ لاک کرگئی تھی۔

''یہ تو تھرتھلی مچادینے والی صورتِ حال ہے۔'' انیق نے کمرے میں بے قراری سے ٹہلتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو پتا ہی ہوگا ضمنی الیکشن میں شکیل داراب کے علاوہ اس کا نہایت قریبی ساتھی اور دوست لالہ وریام ایم این اے کا الیکشن لڑ رہا ہے۔ اس کے علاوہ بھی ان لوگوں نے مختلف علاقوں کی آٹھ دس سیٹوں پر امیدوار کھڑے کررکھے ہیں۔ اگر اس موقع پر یہ دھواں دھار اسکینڈل سامنے آگیا تو ان لوگوں کا تو کونڈا ہوجائے گا۔ کونڈا سمجھتے ہیں نا آپ یعنی بربادی۔''

میں نے اثبات میں سر ہلا کر اس کی تائید کی۔

وہ بولا۔ ''اب یہ بات تو کلیئر ہوگئی ہے کہ یہ پاشا لاہور کے ڈیفنس جیسے علاقے میں اتنے عیش آرام کے دن کیوں گزار رہا ہے۔ لگتا یہی ہے کہ اس نے شکیل داراب کے کہنے پر ناہید کو طلاق دی تھی اور اس کے بدلے موج مستی کی زندگی کا سودا کیا تھا۔ اب وہ شکیل کے ایک اہم راز کا امین ہے اس لیے بے خطر عیش کررہا ہے۔''

''ظاہر ہے کہ کچھ پانے کے لیے تھوڑا بہت تو کھونا پڑتا ہے اور شاید وہ یہی سمجھتا ہے کہ اس نے تھوڑا کھویا ہے اور بہت پایا ہے... اور میرا خیال ہے انیق کہ اگر وہ شادی شدہ عورتوں اور دوسروں کی گرل فرینڈز وغیرہ میں دلچسپی لیتا

ہے تو اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس کی اپنی عورت اس سے شکیل داراب نے چھینی ہے۔"

"بڑی سنسنی خیز قسم کی کہانی بنتی ہے۔ پندرہ سولہ سالہ لڑکے کی اپنی خوب صورت ٹیچر سے محبت اور صرف محبت ہی نہیں محبت کا عملی جامہ بھی۔۔۔ شاہ زیب بھائی، آپ نے وہ فلم دیکھی تھی، نہیں ابھی نہیں۔ جس میں کم عمر لڑکا فیصل بڑی عمر کی شبنم کو پسند کرنے لگتا ہے۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ میں نے نہیں دیکھی تھی۔" میں نے شروع میں ہی بات ختم کردی ورنہ وہ اس موضوع کو کھینچنا شروع کردیتا۔

میرا ذہن اپنے تانے بانے میں الجھا ہوا تھا۔ اب رات کے دو بج چکے تھے۔ دل چاہتا تھا کہ ابھی ہوٹل سے نکلوں اور کچھ نہ کچھ کر گزروں لیکن ہر پہلو پر غور کرنا بھی ضروری تھا۔ رات ایک طرح کی بے چینی میں ہی گزری۔ صبح میں نے انیق کو سب کچھ سمجھایا اور وہ اپنے ساتھ وقاص کو لے کر نکل گیا۔

ان دونوں کی واپسی دوپہر کے کھانے پر ہوئی۔ حسب توقع انیق نے وہ ساری معلومات حاصل کی تھیں جن کی ضرورت تھی۔ سب سے اہم سوال رات کو ہمارے ذہن میں یہ ابھرا تھا کہ شکیل داراب کمرے میں کہاں سے آیا اور نکل کر کہاں گیا تھا۔ اس سوال کا جواب دلچسپ تھا۔ ناہید کے دس مرلہ کوٹھی کے عین پیچھے کنال کنال کے گھروں والی لین تھی۔ ایسی ہی ایک دو کنال کی کوٹھی ناہید کی کوٹھی کے عین پیچھے واقع تھی۔ اس کوٹھی کا فرنٹ دوسری طرف تھا یعنی دونوں گھروں کی پشت جڑی ہوئی تھی۔ یہ دو کنال کی کوٹھی شکیل داراب کے ایک نہایت قریبی دوست پرویز خان کی تھی۔ پرویز خان انڈسٹریل تھا اور سیالکوٹ میں لیدر کی جیکٹس وغیرہ بنانے کا وسیع کام کرتا تھا۔ دوسری طرف شکیل داراب کا ایک بڑا کارخانہ بھی سیالکوٹ میں موجود تھا۔ وہ اپنے کام کے سلسلے میں کبھی کبھار سیالکوٹ آتا تھا تو پرویز خان کے گھر ہی ٹھہرتا تھا۔

اب یہ سارا چکر سمجھ میں آرہا تھا۔ ان دونوں گھروں کے رخ دو مختلف سڑکوں پر تھے لیکن ان کی عقبی دیواروں میں ایک راستہ موجود تھا اور یہ راستہ ایک بڑے راز کا امین تھا۔ انیق نے مجھے مکمل تفصیل بتائی اور دونوں گھروں کے نمبرز وغیرہ سے بھی آگاہ کیا۔

میں نے پوچھا۔ "شکیل داراب کے بارے میں کیا معلوم ہوا؟"

"شکیل، کل صبح سیالکوٹ آیا تھا۔ ابھی گیارہ بجے کے لگ بھگ وہ لاہور واپس روانہ ہوگیا ہے۔"

میں نے دونوں کیمروں کے مانیٹرز دیکھے۔ دونوں کیمرے کام کررہے تھے۔ باہر والا کیمرا دس مرلہ گھروں والی لائن کا منظر آگے تک دکھا رہا تھا۔ تعطیل کی وجہ سے ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ کبھی کبھی کوئی کار یا موٹر بائیک گزر جاتی تھی۔ اندر والا کیمرا خالی کمرا دکھا رہا تھا۔ کہیں پاس سے بوڑھی آیا کے کھانسنے کی آواز آجاتی تھی۔ کچھ دیر بعد ناہید کی آواز بھی آئی۔ اس نے ملازمہ کو پکارا تھا۔ کنفرم ہوگیا کہ وہ گھر میں ہی موجود تھے۔ چند سیکنڈ بعد ملازمہ کی آواز ابھری۔ وہ کیمرے کے آس پاس ہی موجود تھی لیکن دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

"جی بی بی جی۔" ملازمہ نے کہا۔

"پلمبر کو فون کیا؟" ناہید کی مدھم آواز سنائی دی۔

"ہاں جی۔ عرفان صاحب کو کہا ہے وہ کہتے ہیں بندہ کام پر نکلا ہوا ہے آدھے گھنٹے تک آجائے گا۔" ملازمہ نے جواب دیا۔

میں نے انیق سے کہا۔ "انیق، میں وہاں پہنچنا چاہتا ہوں۔ پندرہ بیس منٹ کے اندر۔"

"کوئی مسئلہ نہیں جی۔" وہ چوکس ہوکر بولا۔

وقاص ہمارے ساتھ ہی موجود تھا۔ اس کی موٹر سائیکل بھی نیچے پارکنگ میں موجود تھی۔

"کوئی بیگ یا تھیلا مل جائے گا؟" میں نے پوچھا۔

"بیگ تو اس کی موٹر سائیکل کے ساتھ ہی موجود ہے۔" انیق نے کہا۔

"اس کو تھوڑا سا وزنی کیا جاسکتا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ پلمبر کا بیگ نظر آئے۔" میں نے کہا۔

"یہ موم بتی کا اسٹینڈ ہے۔ یہ دو چھوٹے گلدان بھی اندر رکھے جاسکتے ہیں۔" انیق نے رائے دی۔ یہ مناسب رائے تھی۔

ٹھیک بیس منٹ بعد میں موٹر سائیکل پر ناہید کے گھر کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ یہ سارا راستہ مجھے حفظ ہو چکا تھا۔ کسی طرح کی دشواری پیش نہیں آئی۔ میں نے ہیلمٹ پہنا ہوا تھا اور ایک ٹی ٹی پسٹل میری جیکٹ میں موجود تھا۔ میں نے بے دھڑک ناہید کے گھر کی کال بیل دی۔ ملازمہ۔۔۔ باہر نکلی۔

"کون؟" اس نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر پوچھا۔

"پلمبر۔" میں نے جواب دیا۔

میں نے ہیلمٹ کی اسکرین اٹھا رکھی تھی، اس کے باوجود اسے ذرا سا شک بھی نہیں ہوا۔ موٹر سائیکل لاک کرکے اور بیگ کو کندھے سے لٹکا کر میں اندر چلا گیا۔ ملازمہ مجھے سیدھا بیڈروم کے واش روم میں لے گئی۔ یہاں واش بیسن کے پائپ سے پانی کی مسلسل دھار نکل رہی تھی۔ ناہید بھی مجھے اس مسئلے کے بارے میں بتانے کے لیے کمرے کے اندر آگئی۔ میں نے ابھی تک اپنا ہیلمٹ سر سے اتارا نہیں تھا۔ یہ بات شاید ان دونوں کو عجیب لگ رہی تھی۔ میں نے ملازمہ سے کہا۔ ''باہر سے پانی کا گیٹ وال بند کردیں۔''

ملازمہ گیٹ وال بند کرنے گئی۔ ناہید ذرا شک کی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ وہ مجھے اور میری آواز کو پہچاننے کی کوشش کررہی تھی۔ میں نے لپک کر اسے دبوچ لیا۔ میں نے اپنی توجہ اس بات پر مرکوز رکھی تھی کہ وہ آواز نہ نکال سکے اور میں کامیاب رہا۔ وہ بری طرح مچلی لیکن میں نے اسے پوری طرح شکنجے میں کس لیا تھا۔ میں نے اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''میڈم آپ نے صحیح پہچانا ہے۔ میں وہی ہوں جس نے پرسوں آپ سے بات کی تھی۔ دیکھیں میں یقین دلاتا ہوں آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ یوں سمجھیں کہ میں اس وقت شکیل صاحب کا ایک خاص پیغام لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔''

شکیل کا نام سن کر اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ پلٹ کر میری طرف دیکھنے کی کوشش کرنے لگی لیکن اس کے چہرے پر میری گرفت مضبوط تھی اس لیے کامیاب نہیں ہوئی۔ میں نے کہا۔ ''میں اب آپ کے منہ سے ہاتھ ہٹاتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ آپ کسی کو پکاریں گی نہیں۔ میں پھر دہراتا ہوں آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔''

تھوڑا سا توقف کرکے اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے اس کے ہونٹوں سے اپنی ہتھیلی ہٹائی اور پھر اس پر سے گرفت بھی ختم کردی۔ وہ پلٹ کر میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کا چہرہ زرد ہورہا تھا۔ میں نے اسے جیکٹ کی پھولی ہوئی جیب دکھاتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس پستول موجود ہے لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ آپ جیسی خاتون پر اسے نکال سکوں۔ میں آپ سے بس چند باتیں کرکے یہاں سے جانا چاہتا ہوں اور ان باتوں میں آپ کا فائدہ ہے۔''

اس نے کچھ بولنا چاہا لیکن بس تھوک نگل کر رہ گئی۔

''ابھی آپ کی ملازمہ آئے گی، وہ مجھے پہچان نہیں سکی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی بے خبری برقرار رہے۔ میں

آپ سے فقط چند منٹ چاہوں گا۔"

عورت سمجھ دار تھی اس نے نہایت تیزی سے خود کو سنبھالا...... ملازمہ واپس آئی تو ناہید نے کہا۔ "اچھا بھائی، میں تمہیں اوپر کا ایک پائپ بھی دکھادوں۔" پھر وہ ملازمہ سے مخاطب ہوکر بولی۔ "تم جلدی سے دونوں بل جمع کروا آؤ۔ کہیں دیر نہ ہو جائے اور واپسی پر سبزی بھی پکڑ لینا۔"

ملازمہ جی اچھا کہتی ہوئی اور چوکسی کا مظاہرہ کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔ ویسے وہ کچھ تھوڑا سا کھٹکی ہوئی تھی اور شاید اس کی وجہ ناہید کی پریشان صورت تھی۔

ملازمہ کے جانے کے بعد ناہید سیڑھیاں عبور کر کے اوپر آگئی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ وہ بڑی ہمت کا مظاہرہ کررہی تھی پھر بھی اس کا سارا وجود جیسے اندر سے کپکپا رہا تھا۔ شکیل کا ذکر کر کے میں نے ایک بہت بڑی بات کہہ دی تھی اور اس بات نے اس کے دل و دماغ کی ساری چولیں ہلادی تھیں۔ وہ گاہے بگاہے متوحش نظروں سے میری طرف دیکھنے لگتی تھی۔ بالائی منزل پر آکر ہم کامن روم میں بیٹھ گئے۔ مجھے ماننا پڑا کہ وہ واقعی کمزور اعصاب کی عورت نہیں۔ اس نے بڑی تیزی سے خود کو صورتِ حال کے مطابق ڈھالا تھا اور ملازمہ کو گھر سے باہر بھیج دیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "آپ کے گھر میں آپ کی آیا بتولہ بیگم کے علاوہ اور تو کوئی نہیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا اور خشک لبوں پر زبان پھیر کر بولی۔ "تم نے... ابھی کسی شکیل کا نام لیا ہے۔ میں کچھ سمجھی نہیں؟"

"لیکن میرا خیال ہے کہ آپ سمجھ گئی ہیں۔ ورنہ آپ کی یہ حالت نہ ہورہی ہوتی۔" اس کا رنگ کچھ اور پھیکا پڑ گیا۔

اپنے ہاتھوں کی لرزش چھپانے کے لیے اس نے انہیں اپنی چادر کے نیچے کھسکا لیا بولی۔ "دیکھو، تمہیں جو کہنا ہے صاف کہو۔ مم... میرے پاس زیادہ وقت نہیں۔ آیا سوئی ہوئی ہیں لیکن وہ کسی بھی وقت اٹھ سکتی ہیں۔"

"اٹھ تو سکتی ہوں گی لیکن زینے چڑھ کر اوپر نہیں آسکیں گی۔ اتنا تو میں بھی جانتا ہوں۔ میرے اندازے کے مطابق اگر اگلے چند منٹ میں ہمیں کوئی ڈسٹرب کرسکتا ہے تو وہ عرفان صاحب کا وہ پلمبر ہوگا جو آپ کے دروازے پر دستک دے گا۔"

ابھی میری بات منہ میں ہی تھی کہ دروازے پر بیل ہوگئی۔ میں نے کھڑکی سے نیچے جھانکا۔ گیٹ کا منظر نظر آرہا تھا۔ پلمبر اپنے کھٹارا اسکوٹر پر موجود تھا۔ میں نے کہا۔ "کیں وہ آگیا ہے۔ اسے اندر بلا کر واش بیسن دکھا دیں لیکن یہ بھی کہہ دیں کہ ابھی کام نہیں کروانا وہ بعد میں آجائے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی ملازمہ کو بعد میں کسی طرح کا شبہ نہ ہو۔"

ناہید مسلسل عقل مندی کا ثبوت دے رہی تھی۔ اس نے اب بھی دیا۔ اس نے پلمبر کو اندر بلایا اور چند منٹ میں فارغ بھی کردیا۔

اس کے بعد وہ پھر میرے پاس بالائی منزل کے کامن روم میں آن بیٹھی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "دیکھیں، میں تمہید باندھوں گا تو ہم دونوں کا وقت ضائع ہوگا اور اگر آپ انجان بننے کی کوشش کریں گی تو بھی یہی ہوگا۔ شکیل داراب کا نام سننے کے بعد آپ کو کچھ نہ کچھ اندازہ تو ہوگیا ہوگا کہ میں کیا کہنے والا ہوں؟"

"کک... کون شکیل داراب؟" ناہید کی حالت ابتر ہوتی جارہی تھی۔

میں نے کہا۔ "وہ شکیل داراب جو دس گیارہ سال پہلے آپ کا اسٹوڈنٹ تھا اور پھر جس نے آپ کی شادی ختم کروانے کے بعد خود آپ سے شادی کی اور آپ اب بھی جس کی منکوحہ ہیں اور چوری چھپے اس سے ملتی ہیں۔ چور دروازوں کے راستے۔" میں نے سارے انکشافات ایک ساتھ ہی کر ڈالے۔ میں چاہتا تھا کہ اس کو جو بھی شاک لگنے ہیں، وہ ایک ہی بار لگ جائیں۔

چند سیکنڈ کے لیے تو مجھے لگا کہ اسے کچھ ہوجائے گا۔ اس کا سارا جسم لرزنے لگا تھا اور ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے۔ میں نے قریب پڑے جگ میں سے تھوڑا سا پانی گلاس میں لے کر اسے تھمایا۔ اس سے گلاس تھامنا مشکل ہورہا تھا لیکن اس نے دو تین گھونٹ پیے۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "میں آپ سے پھر کہتا ہوں جو کچھ میں بتا رہا ہوں، وہ آپ کے لیے سخت ضرور ہے لیکن ایک ایسے شخص کے سینے میں ہے جو آپ کو کسی طرح کا نقصان پہنچانا نہیں چاہتا اور اگر وہ یہاں آپ کے سامنے موجود ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے۔"

"تم... ہو کون؟ کیا تمہارا تعلق پولیس سے ہے؟" وہ ہکلائی۔

"میرے بارے میں جانکاری حاصل کرنے سے آپ کو کسی طرح کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ بس اتنا سمجھ لیں کہ

میں شکیل داراب کے ستائے ہوئے لوگوں میں سے بلکہ بہت زیادہ ستاتے ہوئے لوگوں میں سے ایک ہوں اور اب وہ میرے داؤ کے نیچے آیا۔ اس کے ساتھ میرا ایک اہم سودا ہونا ہے۔ اگلے چند دن اس کے لیے بہت بھاری ثابت ہونے والے ہیں۔''

ناہید خشک لبوں پر زبان پھیرنے کے سوا اور کچھ نہیں کر پا رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''میں نے ابھی آپ پر جو انکشافات کیے ہیں ان کے نہایت ٹھوس ثبوت میرے پاس موجود ہیں۔ آپ کچھ نہ بھی بتائیں گی تو شکیل داراب کو شکنجے میں لینے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوگی لیکن اگر آپ بتادیں گی تو میرا خیال ہے کہ آپ کے لیے میری ہمدردی بڑھے گی کیونکہ میں جانتا ہوں آپ بھی شکیل داراب کے اثر ورسوخ اور جبر کا شکار ہونے والوں میں سے ایک ہیں۔''

ناہید جیسے گنگ سی ہوگئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے اور کیا نہ۔ میں نے کوشش کرکے دھیرے دھیرے اس کے خوف کو کم کیا۔ وہ میرے سوالوں کے چھوٹے چھوٹے جواب دینے لگی۔ میرا ہمدردانہ رویہ غیر محسوس طور پر اس پر اثر کر رہا تھا۔ کچھ وقت تو لگا لیکن بالآخر وہ اپنے ماضی قریب کے بارے میں اہم باتیں بتانے پر آمادہ ہوگئی۔ یہ گفتگو تو کافی طویل تھی اور کہیں کہیں بے ربط ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی۔ بہر حال اس کا خلاصہ میں یہاں بیان کردیتا ہوں۔

''قریباً دس گیارہ سال پہلے شکیل داراب اس انگلش اسکول میں ناہید کا اسٹوڈنٹ تھا۔ ناہید ٹیوشن نہیں پڑھاتی تھی لیکن داراب فیملی کے سامنے انکار کی جرأت کون کرسکتا تھا۔ وہ اسے ٹیوشن بھی پڑھانے لگی۔ ان دونوں کے درمیان وابستگی پیدا ہوئی لیکن شکیل کی وابستگی کا رنگ کچھ اور تھا۔ اس کی صحبت بھی کچھ اچھی نہیں تھی۔ ایک دو مرتبہ اسے ناہید سے بری طرح ڈانٹ بھی کھانا پڑی۔ بہر حال ناہید کوشش کے باوجود ان سفلی خیالات کو شکیل کے دماغ سے کھرچنے میں کامیاب نہیں ہوئی جو اس کے کچے اور خودسر ذہن میں جگہ بنا چکے تھے۔ اسکول سے فارغ ہوجانے کے بعد بھی گاہے بگاہے شکیل اس سے ٹیلی فونک رابطہ کرتا رہا۔ ان کی گفتگو کا رنگ بس ایک ہی ہوتا تھا۔ ناہید اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کرتی تھی اور کبھی کبھی شرم بھی دلاتی تھی کہ وہ اس طرح کے خیالات رکھتا ہے۔ دوسری طرف شکیل اپنے دل کی بات زبان پر لانے سے نہیں چوکتا تھا اور بات کو زبان پر لانے کے لیے کبھی کبھی کسی نشے کا سہارا بھی لے لیتا تھا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا، وہ زیادہ خودمختار ہوتا جارہا تھا اور سرکش بھی۔ اس کو اپنے بڑوں کی فکر نہیں تھی اور بڑے بھی ایسے کون سے دانا بینا تھے۔ ایسے لوگوں کو تو اپنے ہی اللوں تللوں سے فرصت نہیں ہوتی پھر ایک وقت ایسا آیا جب شکیل ملک سے باہر چلا گیا اور تین چار سال کے لیے یہ معاملہ پس منظر میں جاتا محسوس ہوا۔

ناہید کو بھی اب قدرے اطمینان تھا لیکن وہ جانتی نہیں تھی کہ پندرہ سولہ سالہ میٹرک کا لڑکا اب ایک اکھڑ اور خودسر جوان بن چکا ہے اور اس کے ارادے اس کے بارے میں نیک نہیں ہیں پھر وہ کچھ ہوا جس کی توقع نہیں تھی۔ جب شکیل پاکستان آیا تو ہاتھ دھو کر ناہید کے پیچھے پڑ گیا۔ اس کے پاس بے پناہ وسائل تھے۔ وہ جس چیز پر انگلی رکھتا، وہ اس کی ہوسکتی تھی۔ اس کی ریشہ دوانیوں سے خوف کھا کر ناہید نے اسکول کی ملازمت چھوڑ دی مگر تب تک وہ اس کے شوہر پاشا کو شیشے میں اتار چکا تھا۔ پاشا اور ناہید کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ ان کے ازدواجی تعلقات بھی بس گزارے لائق ہی تھے۔ جب شکیل نے پاشا کو زمینی جنت کی جھلکیاں دکھائیں اور اس کے اکاؤنٹ کو نوٹوں سے بھرا تو وہ ناہید کو طلاق دینے پر آمادہ ہوگیا۔ ناہید نے مزاحمت کی۔ اس مزاحمت کو ختم کرنے کے لیے شکیل نے ہر حربہ استعمال کیا۔ منت سماجت سے لے کر ڈرانے دھمکانے تک سب کچھ کیا۔ یہاں تک کہ خود کو آگ لگانے کی سنگین دھمکی بھی دی۔ بالآخر ناہید مجبور ہوگئی۔ اس نے حالات سے سمجھوتا کرلیا۔ شکیل کی ایک شادی پہلے بھی تھی۔ دوسرا نکاح اس نے بڑی رازداری سے کرلیا اور ناہید کو لاہور سے نکال کر سیالکوٹ کے ایک علاقے میں گھر لے دیا۔ دوسری طرف پاشا کو اس کی من مرضی کی زندگی مل گئی۔ اس نے خود کو عیاشیوں میں گم کرلیا۔ شکیل داراب اور ناہید کا نکاح ایک ٹاپ سیکرٹ کے طور پر ہوا اور اب تک ٹاپ سیکرٹ ہی تھا۔

اب اس گفتگو کا آخری مرحلہ شروع ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''ناہید صاحبہ! آپ سے بڑھ کر کون جانتا ہوگا کہ یہ شکیل ایک بہت بڑا بلیک میلر بھی ہے۔ میں بھی اس کو بلیک میلر بن کر ہی ٹکرا رہا ہوں مگر افسوس کہ اس میں آپ کی انوالومنٹ ہے۔ بہرحال اگر آپ میرے مشورے پر عمل کریں گی تو کسی بھی مصیبت سے بچی رہیں گی۔''

''میں کچھ سمجھی نہیں؟'' وہ آنسو پونچھ کر بولی۔

''آپ نے غلطی کی، دو دن پہلے مجھے اور میرے

ساتھی کو اندر آنے دیا یقیناً آپ کو یہ جان کر شاک لگے گا کہ ہم نے آپ کے گھر میں دو جگہ چھوٹے کیمرے لگائے۔ ان میں آپ اور شکیل کی ملاقات اور گفتگو کی فوٹیج بھی موجود ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کی اس غلطی کی وجہ سے شکیل کے غضب کا نزلہ آپ پر گرے۔ آپ مجھے بتائیں، آپ نے شکیل کو کچھ بتایا تو نہیں ہماری آمد اور انٹرویو کے بارے میں؟''

''نہیں۔'' ناہید نے سخت پریشانی کے عالم میں سر کو نفی میں ہلایا۔

''آپ بتائیں گی بھی نہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ شکیل سے ڈیل کرتے ہوئے فوٹیج دیکھنے دکھانے تک نوبت ہی نہ پہنچے اور اگر پہنچ بھی گئی تو آپ اس کا پیشگی بندوبست کر لیں۔''

''وہ کس طرح؟''

''اس صورت میں آپ کو یہ ظاہر کرنا ہوگا کہ چند دن پہلے کوئی آپ کی بے خبری یا غیر موجودگی میں داخل ہوا تھا۔''

''وہ... وہ کس طرح؟''

''کسی بھی طرح۔'' میں نے جواب دیا پھر ذرا سوچتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے ڈرائنگ روم میں لکڑی کا کام ہو رہا تھا نا ایک دن پہلے تک؟''

''ہاں۔''

''اور ٹھیکے دار بتا رہا تھا کہ ایک کاریگر بتائے بغیر لاپتا ہو گیا ہے اور ایک دو اوزار بھی لے گیا ہے؟'' ناہید نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے کہا۔ ''آپ اس اتفاق کو اپنے حق میں استعمال کر سکتی ہیں۔ ان کیمروں کے سلسلے میں اس شخص کو بھی مشکوک ٹھہرایا جا سکتا ہے یا پھر اس طرح کا کوئی اور بندوبست کر لیں۔ گھر کا کوئی تالا وغیرہ خراب کر دیں۔ ایک دو چٹخنیاں اکھاڑ دیں، کچھ بھی کر لیں جس سے آپ براہِ راست الزام سے بچ سکیں۔''

ناہید کی آنکھوں سے ٹپاٹپ آنسو گرنے لگے۔ وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ''کیا تم اپنی اور شکیل کی لڑائی میں مجھے معاف نہیں رکھ سکتے؟''

''مجھے بہت افسوس ہے۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں جو زیادہ سے زیادہ آپ کے لیے کر سکتا تھا، وہ کر رہا ہوں... آئی ایم سوری اور میں زیادہ دیر یہاں رک بھی نہیں سکتا، کہیں آپ کی ملازمہ یا کوئی اور نہ آ جائے... خدا حافظ۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ باہر والا کیمرا میں نے گھر میں داخل ہونے سے پہلے ہی اتار لیا تھا، اندر والا جاتے جاتے اتار لیا۔ اس کے علاوہ الماری میں موجود چور دروازہ بھی اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کر لیا۔ وہ سکتہ زدہ سی سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر ہیلمٹ سر پر رکھا اور موٹر سائیکل اسٹارٹ کر دی۔

☆☆☆

دوپہر کا وقت تھا۔ میں سیالکوٹ سے واپس لاہور پہنچ چکا تھا۔ انیق بھی میرے ساتھ ہی تھا۔ ہم داؤد بھاؤ کے انڈر گراؤنڈ ڈیرے پر موجود تھے۔ داؤد بھاؤ کو سیالکوٹ میں میری کارکردگی کا علم ہو چکا تھا اور وہ باقاعدہ اش اش کر رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر زور سے میری پیٹھ ٹھپکی اور بولا۔ ''شاہ زیب! تم وہ نہیں ہو جو نظر آتے ہو۔ فی الحال میں اس تفصیل میں نہیں جاؤں گا کہ تم کون ہو؟ ابھی ہم صرف اس کامیابی کو انجوائے کریں گے۔'' اس نے اپنی نوخیز رکھیل روبی کو آواز دی اور اس نے پینے پلانے کے لوازمات ہمارے سامنے سجا دیے۔ میں نے داؤد کو بھی بتا رکھا تھا کہ میں آج کل الکحل سے پرہیز کر رہا ہوں اس لیے میرے لیے ٹیبل پر جوس موجود تھے۔

میں جب بھی خوبرو روبی کے شہد رنگ بال دیکھتا تھا، مجھے کوئی اور یاد آ جاتا تھا۔ ایسے ہی یا شاید اس سے بھی بڑھ کر بے مثال بالوں والا۔ جس کے ساتھ میں نے لاہور کے طوفانی دورے میں چند گھنٹے گزارے تھے۔ جس کی جلترنگ سی معصوم، سادہ ہنسی ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی اور جسے کوشش کے باوجود میں ابھی تک بھول نہیں پایا تھا۔ تین سال گزرنے کے باوجود وہ پری جمال ہر جگہ میرے ساتھ رہی تھی۔ ڈنمارک کی سرسبز سیرگاہوں میں، روم کی چمکیلی دوپہروں میں، پیرس کی حسین شاموں میں اور وینس کی دلفریب آبی گزرگاہوں کے عکس میں وہ ہر جگہ مجھے دکھائی دی تھی۔ میرے پاس اس کا کوئی پتا ٹھکانا نہیں تھا۔ تاہم جب میں پاکستان پہنچا تھا تو میرے دل میں یہ دھیمی سی خواہش موجود تھی کہ میں اسے ڈھونڈنے کی کوشش کروں گا لیکن یہاں آتے ہی حالات کی ایسی تند آندھی چلی تھی جس نے میرے اندر موجود ہر لطیف جذبے کو کند چھری سے ذبح کر دیا تھا۔ داؤد بھاؤ کے اس بیسمنٹ میں، میں جب بھی روبی کے یہ منفرد لانبے بال دیکھتا تھا تو مجھے وہ بال یاد آ جاتے تھے حالانکہ ان بالوں کی پاکیزہ خوشبو اور روبی کے بالوں کی مصنوعی سجاوٹ میں کوئی میل نہیں تھا، ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

داؤد کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ ''شاہ زیب! جو کچھ تمہارے ہاتھ میں آگیا ہے، اس کو صحیح استعمال کر کے تم شکیل داراب اور اس کی فیملی کو جڑوں سے ہلا سکتے ہو۔''

''صحیح استعمال سے تمہارا کیا مطلب ہے؟'' میں نے پوچھا۔

بھاؤ بولا۔ ''یہ کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے، اس کے مطابق قیمت مانگو۔ یہ قیمت نہ اتنی کم ہو کہ شکیل تمہیں نادان سمجھے اور نہ اتنی زیادہ کہ وہ دینے سے انکار کر دے۔''

''بھاؤ، تمہارے خیال میں اس کی قیمت کیا ہونی چاہیے؟''

''شکیل کے پنجے سے عاشرہ کی رہائی۔ عاشرہ کے والد حاجی نذیر کا تحفظ اور اگر ہو سکے تو تمہارے اپنے کنبے کا تحفظ جس میں ولید کی گلوخلاصی بھی شامل ہو۔''

''بھاؤ، تم نے میرے منہ کی بات چھینی ہے۔ میری اپنی سوچ بھی اس بارے میں یہی ہے۔ مجھے کم از کم اتنے مطالبات تو اس سے منوانے ہی چاہئیں۔''

''یہ بڑا گھاگ کھلاڑی ہے شاہ زیب، اس کو سودے بازی کا پرنس بھی کہتے ہیں۔ اپنے نفع نقصان کی جانچ بڑی اچھی طرح کر لیتا ہے یہ خبیث۔''

''بس میری تم سے ایک ہی درخواست ہے بھاؤ... وہی بات جو میں نے شروع میں کہی تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ ایک بدمعاش سیاست داں کے ساتھ ایک پکی کھری ڈیل ہو۔ میں اپنے مطالبات کے بدلے جو گارنٹی اس کو دوں، وہ واقعی گارنٹی ہو۔''

''میں تمہاری بات بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں شاہ زیب۔ اگر تمہیں دوست کہا ہے تو میں دوستی کا مطلب بھی جانتا ہوں۔ یہ خیال بھی اپنے ذہن میں نہ لانا کہ میں تمہاری حاصل کی ہوئی معلومات کو بھی استعمال کرنے کا سوچوں گا بھی۔ سمجھو کہ مجھے یا انیق کو اس بات کی خبر ہی نہیں کہ پچھلے دو تین دن میں تم کہاں تھے اور کیا کرتے رہے ہو۔'' پھر اس نے مسکراتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔ ''سمجھو میرے یار! کہ یہ تین دن، تین صفحوں کی طرح میری اور انیق کی زندگی کی کتاب سے پھٹ گئے ہیں۔''

''تھینک یو بھاؤ۔''

''دوستوں میں تھینک یو نہیں چلتا۔'' اس نے وہسکی کا طویل گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد میں ایک علیحدہ کمرے میں بیٹھ کر سیل فون کے ذریعے شکیل داراب سے رابطے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سیل فون میں ایک فیک نام پتے والی سم تھی۔ بھاؤ نے مجھے بتایا تھا کہ شکیل سے رابطہ آسان نہیں ہوگا۔ اس کے پرسنل سیکریٹری سے پہلے پرسنل سیکریٹری کے اسسٹنٹ سے بات کرنا پڑے گی اور بھرائی ہوئی آواز والا یہ رانا رفیق نامی شخص پرلے درجے کا بدزبان اور راشی ہے۔

پتا نہیں کیوں ایسے لوگوں سے بات کر کے مجھے آج کل مزہ آ رہا تھا۔ فون اسی رانا رفیق نامی شخص نے اٹھایا۔ ظاہر ہے کہ میری آواز اس کے لیے اجنبی تھی۔ روکھے پھیکے لہجے میں بولا۔ ''کون ہے؟''

میں نے اپنا نام عالمگیر بتایا اور کہا کہ میں شکیل صاحب سے بات کرنا چاہتا ہوں کیونکہ مجھے پتا چلا ہے کہ وہ ہفتے کے روز دوپہر دو بجے سے پانچ بجے تک عام لوگوں کے مسئلے فون پر سنتے ہیں۔''

''یہ سلسلہ اب ختم ہو چکا ہے۔'' وہ خشک لہجے میں بولا۔

''کیا مسئلے ختم ہو گئے ہیں؟'' میں نے روانی سے پوچھا۔

''تمہیں کہا ہے ناں، بات نہیں ہو سکتی۔ وہ میٹنگ میں ہیں۔'' اس نے اکھڑا ہوا جواب دیا۔

''میٹنگ کب ختم ہوگی؟''

اس نے اپنے طیش پر بہت ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''ڈھائی تین گھنٹے میں۔''

''یعنی پانچ بجے کے قریب، چلو ٹھیک ہے میں پانچ بجے فون کر لوں گا۔''

''اگر تمہارے پاس کوئی ریفرنس ہے تو ٹھیک ہے ورنہ کال کرنے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے سخت غصیلے انداز میں کہا۔

''مطلب یہ کہ مسائل کی کالوں والا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ صرف ان لوگوں کے فون سنے جاتے ہیں جن کا کوئی ریفرنس ہوتا ہے۔''

اس نے بڑبڑانے کے انداز میں سخت نازیبا الفاظ استعمال کیے اور ریسیور پٹخ دیا۔

میں نے دوبارہ کال ملائی۔ تیسری چوتھی کوشش میں پھر اسی بددماغ شخص نے ریسیور اٹھایا اور پھنکارا۔ ''کیا بات ہے؟''

''تم نے ریفرنس کا کہا تھا، ریفرنس ہے میرے پاس۔''

''کیا ہے؟''
''اپنے افسر سے کہو کہ وہ شکیل صاحب کو بتائے... سیالکوٹ کے چور دروازے والا بندہ ملنا چاہ رہا ہے۔''
''سیالکوٹ کا چور دروازہ؟'' اس نے چبا چبا کر کہا۔ ''یہ کون سا ریفرنس ہے؟ تمہارے ہوش تو ٹھکانے ہیں؟''
''ہوش ٹھکانے ہیں رانا ٹنگا صاحب اور تمہارے بھی آجائیں گے۔ اگر تم نے میری کال شکیل صاحب یا ان کے سیکریٹری سے نہ ملائی تو۔''
رانا ٹنگا کے خطاب نے جیسے اس شخص کی دم پر ہاتھی کا پاؤں رکھ دیا۔ وہ چنگھاڑا۔ ''اوئے... اوئے، کون بدبخت ہے تو؟ کیوں موت آواز دے رہی ہے تجھے؟''
میں نے کہا۔ ''میری موت تو شاید آواز نہیں دے رہی لیکن تیری بے روزگاری تجھے ضرور آواز دے رہی ہے۔ اگر تو نے اگلے دو منٹ تک میری کال شکیل صاحب یا ان کے سیکریٹری جواد سے نہ ملائی تو میں تیری نوکری کھا جاؤں گا۔ کل دوپہر سے پہلے پہلے تیری تشریف پر لات پڑ جائے گی اور تو اپنے دفتر سے باہر گرے گا۔''
دوسری طرف چند سیکنڈ خاموشی رہی۔ یوں لگا جیسے رانا رفیق پر اثر ہوا ہے اور وہ مزید بکواس کرنے سے پہلے کچھ سوچ رہا تھا مگر وہ میری توقع سے زیادہ کریک نکلا۔ اس نے ایک گالی دی اور ایک بار پھر ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔
مجھے یہ سب کچھ مزہ دے رہا تھا۔ میں نے چار پانچ منٹ انتظار کیا اور پھر ایک اور گمنام نمبر سے رانا رفیق کو کال کی۔ ذرا بدلے ہوئے لہجے میں'' میں نے کہا۔ ''رانا صاحب، شکیل صاحب کے پرسنل سیکریٹری جواد صاحب سے بات کروائیں۔ میں گوجر خاں سے نادرو ڑائچ بول رہا ہوں۔ ایم این صاحب کا بھائی (یہ ریفرنس مجھے داؤد بھاؤ نے بتایا تھا)
اس ریفرنس نے فوراً کام کیا۔ رانا رفیق نے مجھ سے ایک دو سوال پوچھے اور پھر سیکریٹری جواد کا سیل نمبر دیتے ہوئے کہا۔ ''وہ سیٹ سے اٹھے ہوئے ہیں اس نمبر پر بات کرلیں۔ وہ شکیل صاحب سے رابطہ کروادیں گے۔''
میں نے کہا۔ ''وہ میٹنگ میں تو نہیں ہیں؟''
''نہیں، ابھی تو نہیں۔''
میں نے کہا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک خبیث مجھ سے کہہ رہا تھا کہ وہ میٹنگ میں ہیں۔ بڑے بڑے جھوٹے، کمینے بیٹھے ہوئے ہیں ان سیٹوں پر۔''
''کیا مطلب؟'' وہ حیران ہو کر بولا۔
''میں وہی بے وسیلہ شہری ہوں پہلی کال والا۔''
''شہری... مم... میں سمجھا نہیں؟'' وہ گڑبڑا گیا۔
''کتے کے بچے... رانا ٹنگے تیری نوکری ختم ہو چکی ہے۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔
کچھ دیر بعد میں پرسنل سیکریٹری جواد احمد سے بات کر رہا تھا۔ اس نے بھی مجھ سے ریفرنس مانگا۔ میں نے کہا۔ ''جواد صاحب! ریفرنس بڑا خطرناک ہے لیکن جو بھی ہے، مذاق نہیں ہے سو فی صد درست کہہ رہا ہوں۔ شکیل صاحب سے کہیے کہ سیالکوٹ کی دو دیواروں میں جو راستہ ہے وہ اب سیکرٹ نہیں رہا۔ اس بارے میں وہ مزید جاننا چاہیں تو مجھ سے بات کریں۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔''
یہ بندہ نسبتاً سمجھ دار نکلا۔ اس نے سنبھلتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ کی بات کچھ سمجھ میں نہیں آرہی۔ آپ کس چور راستے کی بات کر رہے ہیں؟''
میں نے کہا۔ ''اگر بات آپ کی سمجھ میں آجائے تو پھر آپ سیکریٹری نہ ہوں، خود باس ہوں۔ کیا سمجھے؟''
''آپ کی بات سے تو لگ رہا ہے کہ آپ سر کو کسی طور دھمکانے کی کوشش کر رہے ہیں؟''
''میں کوشش نہیں کر رہا، میں باقاعدہ دھمکا رہا ہوں۔ بس میں جو بات کہہ رہا ہوں، وہ اسی طرح شکیل صاحب تک پہنچا دیجیے۔ آپ کی ذمے داری ختم ہو جائے گی۔ آپ کہتے ہیں تو میں ہولڈ کرتا ہوں۔''
''ٹھ... ٹھیک ہے، آپ ہولڈ کریں۔''
اسپیکر پر میوزک ابھرنا شروع ہو گیا۔ میں نے قریباً دو منٹ ہولڈ کیا۔ بالآخر فون پر ایک نئی آواز ابھری۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ شکیل دارا ب ہے۔ اس کی آواز جوان اور پاٹ دار تھی مگر اس وقت آواز میں ایک ہلکی سی لرزش محسوس ہو رہی تھی۔
اس نے کہا۔ ''آپ کون بول رہے ہیں؟''
میں نے جواب دیا۔ ''نام میں کیا رکھا ہے شکیل صاحب۔ آپ کام دیکھیں اور کام کا دام دیکھیں۔''
''تمہیں بات کرنے کی تمیز نہیں؟'' سپاٹ لہجے میں کہا گیا۔
''اور آپ کو بات سننے کی تمیز نہیں۔ میں نے جو ریفرنس آپ کو دیا ہے اس پر شاید آپ نے غور نہیں فرمایا۔ سیالکوٹ کے دو گھروں میں ایک چور دروازہ ہے۔ کیا خیال ہے اس کے بارے میں؟''
دوسری طرف خاموشی طاری ہوگئی۔ چند سیکنڈ بعد

شکیل کی آواز دوبارہ ابھری تو وہ زیادہ گمبھیر اور بھرائی ہوئی تھی۔ ''تم کس چور دروازے کی بات کر رہے ہو؟''

''وہ جو پچھلے چھ سال سے ہے اور جو آپ کو آپ کی منکوحہ سے ملاتا ہے۔''

اب کہنے سننے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ میرے کہے ہوئے الفاظ کا بے پناہ وزن شکیل داراب جانتا تھا اور میں بھی جانتا تھا۔

ایک بار پھر چار پانچ سیکنڈ تک فون لائن پر سناٹا طاری رہا۔ تب شکیل کی آواز ابھری۔ ''ہم کو شاید... آمنے سامنے بات کرنے کی ضرورت ہے۔''

''جیسے آپ کی مرضی۔''

ایک توقف کے بعد پھر پوچھا گیا۔ ''کہاں اور کیسے ملنا چاہو گے؟''

''جہاں اور جیسے میں محفوظ رہوں اور آپ کی رازداری بھی برقرار رہے۔ میں جانتا ہوں آپ ایک طاقت ور شخص ہو اور طاقت اپنا آپ دکھانے کی کوشش ضرور کرتی ہے۔''

''میری طرف سے پوری تسلی رکھو۔'' وہ بولا۔ آواز کی ہلکی سی لرزش برقرار تھی۔

''کب ملاقات ہو سکتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جس وقت تم چاہو، ابھی ڈھائی بجے ہیں اگلے ایک دو گھنٹوں میں جو ٹائم تمہیں سوٹ کرے۔''

میں دل ہی دل میں مسکرایا۔ شکیل کی بات سے اس کے اندرونی اضطراب اور عجلت کا اظہار ہوتا تھا۔ ایسے لوگ تو ہفتوں اور مہینوں کے حساب سے وقت دیتے ہیں، وہ ایک دو گھنٹوں کی بات کر رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''شکیل صاحب! کوئی بھی پروگرام بنانے سے پہلے میں ہاتھ جوڑ کر ایک درخواست آپ سے کرنا چاہتا ہوں۔ میرے ساتھ کسی طرح کا دھوکا نہ ہو ورنہ میں ایسا انتظام کر چکا ہوں کہ جو کچھ میرے پاس موجود ہے وہ ایک آدھ گھنٹے کے اندر خود ہی پبلک ہو جائے گا۔''

''دھمکانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس پر عمل کروں گا۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے ایک طرح کی کمزوری شکیل کے لہجے میں اتر آئی۔ شکیل جیسے فرعون زادے کے لہجے میں کمزوری کی اس لہر نے مجھے مزہ دیا۔

اگلے دس پندرہ منٹ میں سب کچھ طے ہو گیا۔ شکیل مجھ سے ملاقات کر رہا تھا۔ ایسی ملاقات کے لیے لوگوں کو ہفتوں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ سفارشیں لڑانا پڑتی تھیں اور پتا نہیں کیا کیا پاپڑ بیلنا پڑتے تھے۔

رات ساڑھے نو بجے کا وقت تھا۔ یہ ایک سرد اور اندھیری شب تھی۔ میں ملاقات کی جگہ پر پہنچ چکا تھا۔ یہ شاہدرہ سے آگے شیخوپورہ روڈ پر ایک مزار کے قریب قدرے سنسان جگہ تھی۔ جو کچھ طے ہوا تھا اس کے مطابق میری اور شکیل داراب کی ون ٹو ون ملاقات ایک اسٹیشن ویگن میں ہونا تھی۔ شکیل داراب کے ساتھ اس کے حفاظتی دستے کے پانچ افراد بھی ہوتے .... تاہم ان مسلح افراد کو اسٹیشن ویگن سے کم از کم سو میٹر دور رہنا تھا۔ اسی طرح میں بھی اپنے ساتھ پانچ افراد لا سکتا تھا مگر انہیں موقع سے سو میٹر دور رہنا تھا۔ شکیل داراب نے وعدہ کیا تھا کہ میری طرح اس کے پاس بھی کوئی ہتھیار نہیں ہوگا۔

داؤد بھاؤ نے میرے ساتھ اپنے پانچ اچھے شوٹر روانہ کیے تھے۔ ہم ایک ہی ٹویوٹا گاڑی میں موقع پر پہنچے۔ پروگرام کے مطابق میں نے ان پانچوں افراد کو مزار کے پہلو میں روک دیا اور خود گاڑی سے اتر آیا۔ کچھ فاصلے پر مجھے سلور رنگ کی اسٹیشن ویگن کی پارکنگ لائٹس نظر آگئیں۔ اپنے ساتھ آنے والوں کو ضروری ہدایات میں پہلے ہی دے چکا تھا۔ ان لوگوں کا انچارج مختار جھارا تھا۔ مختار خود بھی ایک اے کے 47 گن سے مسلح تھا۔

میں مستحکم قدموں سے اسٹیشن ویگن کی طرف بڑھا۔ شکیل نے کہا تھا کہ وہ ویگن میں اکیلا ہوگا مگر ویگن کے قریب ایک فربہ اندام شخص کو دیکھ کر مجھے تشویش ہوئی۔ میں قریب پہنچا تو فربہ اندام شخص نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''سوری جی، آپ پریشان نہ ہوں۔ میری ڈیوٹی صرف یہ ہے کہ میں تسلی کرلوں کہ آپ کے پاس کوئی ہتھیار نہیں۔''

''میں نے زبان پر اعتبار کیا تھا تو شکیل صاحب کو بھی کرنا چاہیے تھا۔ چلو خیر... تم اپنی ڈیوٹی پوری کرلو۔'' میں نے کہا۔

اس نے شائستگی کے ساتھ میری پتلون اور جیکٹ کی جیبیں ٹٹولیں پھر پنڈلیاں وغیرہ چیک کیں اور تھینک یو کہتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ چند سیکنڈ بعد وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا مخالف سمت کے درختوں کی طرف چلا گیا۔ میں نے دروازہ کھولا اور اسٹیشن ویگن کے نیم گرم ماحول میں داخل ہو گیا۔ اس شاندار لگژری ویگن کی کھڑکیوں کے شیشے ٹنڈڈ تھے اور اندر کی مدھم روشنی میں درمیانی نشست پر وہ بے تاج شہزادہ بیٹھا نظر آ رہا تھا جس کے ایک اشارے سے لوگوں کی قسمتیں

بنتی اور بگڑتی تھیں... اور زندگی موت کے فیصلے ہوتے تھے۔ جوان عمری میں ہی اسے اقتدار اور اختیار کے ایسے تیز رفتار گھوڑوں کی سواری نصیب ہوگئی تھی کہ وہ اپنے قدموں کی زمین کو دھول بنا کر اڑا رہا تھا۔ فلموں، ڈراموں میں عموماً ولن بدصورت یا کم صورت ہوتے ہیں لیکن میرا یہ ولن (جو یقیناً ولن ہی تھا) اپنے چہرے مہرے سے دیکھنے والوں کو صریح دھوکا دیتا تھا۔ تمتماتا ہوا کلین شیوڈ چہرہ، تیکھے نقوش، فقط اس کی آنکھیں ایسی تھیں جن کے اندر کہیں گہرائی میں عیاری اور کمینگی چھپی ہوئی تھی۔

اس نے مجھے سرتاپا دیکھا اور بولا۔ ''ویلکم مسٹر شاہ زیب، مجھے توقع تھی کہ جو بندہ مجھ سے بات کرنے اس وین میں آئے گا، وہ تم ہی ہوگے۔''

میں نے کہا۔ ''اگر آپ نے مجھے پہچان لیا ہے تو پھر یہ بھی جان گئے ہوں گے کہ میں ایک بہت بڑا دہشت گرد ہوں جس نے بیرونِ ملک سے دہشت گردی کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کی ہیں اور یہاں پاکستان پہنچ کر اور اپنے کزن ولید کے ساتھ مل کر ظلم و ستم کی نئی داستانیں رقم کی ہیں۔''

''کم از کم پولیس کی رپورٹیں تو یہی کہہ رہی ہیں۔'' شکیل داراب نے کہا۔

''اور پولیس سے سچا کھرا ادارہ ہمارے ملکِ عزیز میں بھلا اور کون سا ہے۔''

''بہت غصے میں لگتے ہو؟'' وہ پاٹ دار آواز میں بولا۔

''شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں غلطی کررہا ہوں۔ مجھے تو ہنسنا چاہیے، ہنس ہنس کر آپ کو بتانا چاہیے کہ قیصر چودھری اور اس کے ساتھیوں نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہے اور اس پر تو مسرت سے میرے قہقہے ہی نہیں رکنے چاہئیں کہ میں نے اپنی کزن اور اپنی چچی کو آگ میں زندہ جلتے دیکھا ہے اور ولید کو گولیوں سے چھلنی ہو کر تڑپتے پایا ہے۔ یہ سارے بڑے دلچسپ منظر تھے۔ مجھے ان مناظر کو یاد کر کے انجوائے کرنا چاہیے اور آپ کو بھی انجوائے منٹ کا موقع دینا چاہیے۔'' میری آنکھیں شدت دکھ سے جلنے لگیں۔

وہ بغور میری طرف دیکھتا رہا۔ اس نے ڈینم کی نہایت بیش قیمت پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے اوپر کسی مہنگے ملک کی مہنگی شاپ کا سویٹر تھا۔ پرفیوم نے وین کے اندر کے ماحول کو معطر کر رکھا تھا۔ ہماری نشستیں آمنے سامنے تھیں۔ درمیان میں ایک خوب صورت فولڈنگ میز تھی۔ اس پر چند کاغذات رکھے تھے اور سگریٹ کیس وغیرہ پڑا تھا۔

شکیل گہری سانس لے کر بولا۔ ''اس بات سے تو کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ ولید نامی اس لڑکے نے پولیس پارٹی پر حملہ کیا۔ ایک اہل کار کو فائر مارا۔ اس بات سے بھی انکار کرنا ناممکن ہے کہ تم نے قیصر چودھری کو زخمی کیا۔ تمہاری وجہ سے اس کی گاڑی نہر میں گری اور تم اس کی حراست سے فرار ہوئے...''

''بالکل... بالکل اور اس بات سے انکار کرنا بھی ناممکن ہوگا کہ ہم لوگ بیکری کی آڑ میں وہاں بم اور بارودی سرنگیں بنا رہے تھے اور میرے چچا اس اسلحہ ساز فیکٹری کے ماسٹر مائنڈ تھے اور اس سے بھی انکار مشکل ہے کہ کچھ دن پہلے میں نے ہی پمپ ایکشن کے ذریعے لاہور کے نواحی مقام پر اندھا دھند فائرنگ کی اور سات بے گناہ افراد کو موت کے گھاٹ اتارا۔ ہاں اس بات سے ضرور انکار کیا جاسکتا ہے کہ ایک گروہ قیصر چودھری جیسے لوگوں کی مدد سے علاقے کی زمینوں پر قبضے کررہا ہے اور جو مزاحمت کرتے ہیں ان کو عبرت کا نشان بنا رہا ہے۔ ان کی پروپرٹیز کو آگ لگا دی جاتی ہے اور کچھ ایسے بھی ہوں گے جنھیں پولیس مقابلوں میں پار کردیا جاتا ہے۔ ہاں اس سے ضرور انکار کیا جاسکتا ہے۔''

وہ خاموشی سے سن رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ایک اَن دیکھے شکنجے میں ہے ورنہ اس جیسے لوگ خاموشی سے کب سنتے ہیں۔

ایک لمبی سانس لے کر اس نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہمیں بات مختصر کرنی چاہیے۔ تم نے فون پر کس چور راستے کی بات کی ہے؟''

''شکیل صاحب! آپ بس رسماً پوچھ رہے ہیں۔ ورنہ آپ کو پتا تو سب چل گیا ہے۔ آپ کی ٹیچر ناہید پاشا کو اس کے شوہر نے قریباً چھ سال پہلے طلاق دے دی تھی۔ اس طلاق کے پیچھے آپ کا ہاتھ تھا۔ اس کا شوہر پاشا اب لاہور میں ایک عالی شان گھر میں موج مستی کی زندگی گزار رہا ہے۔ ناہید سے آپ نے خفیہ طور پر نکاح کیا ہے اور وہ اب سیالکوٹ کے ایک ایسے گھر میں رہ رہی ہے جس کی دیوار کے ساتھ آپ کے قریبی دوست پرویز خان کی کوٹھی کی دیوار ملی ہوئی ہے۔ اتنا کافی ہے یا کچھ اور بھی بتاؤں؟''

شکیل داراب یقیناً مضبوط اعصاب کا مالک تھا پھر

بھی اس کا اندرونی اضطراب اس کے چہرے پر جھلک رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”شکیل صاحب! آپ نے اپنی ایک محترم ٹیچر کو مجبور و بے بس کر کے اس سے نکاح کا ڈھونگ رچایا اور اسے چھ سال تک ایک طرح کے حبس بے جا میں رکھا اور اب اس سے دل بھر جانے کے بعد آپ ایک اور بے گناہ لڑکی کی زندگی برباد کر رہے ہیں۔ طریقہ کار مختلف ہے لیکن حاجی نذیر کی بیٹی عاشرہ بھی اسی قسم کا شکار ہو رہی ہے جس کا شکار کبھی ناہید پاشا ہوئی تھی۔ مجھے یقین ہے آپ کا یہ بھید کھل گیا تو آپ کی فیملی کا بیڑا غرق ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہے گی۔“

”شاید تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے۔“ وہ دلیری سے بولا۔

”اگر غلط فہمی ہو رہی ہے تو آپ انکار فرما دیجیے۔ میں دعویٰ کرتا ہوں کہ ایک گھنٹے کے اندر میڈیا اور سوشل میڈیا پر آپ کے سارے کپڑے اتار دوں گا۔ بڑے پکے ثبوت ہیں میرے پاس۔“

”تم تمیز سے بات کرو۔ ابھی مرنے کی عمر نہیں ہے تمہاری۔“ وہ خطرناک لہجے میں بولا۔

”آپ کی عمر بھی برباد ہونے کی نہیں ہے۔ الیکشن سر پر ہے۔ یہ الیکشن آپ کی فیملی کا بینڈ اس طرح بجا سکتا ہے کہ آپ کی اگلی نسل بھی ہاتھ لگا لگا کر روتی رہے گی۔“

اس کا چہرہ سرخ انگارا ہو گیا۔ اس نے جھپٹ کر میرا گریبان پکڑ لیا اور اتنی زور سے بھینچا کہ میرا کالر اُدھڑ کر رہ گیا لیکن میں پورے اطمینان سے اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ ”تم جانتے نہیں ہو مجھے؟“ وہ پھنکارا۔

”جانتا ہوں، آپ بہت بڑی توپ ہیں لیکن آپ سے بڑی بڑی توپوں کا گولا میں نے ان کے اندر ہی پھٹتے دیکھا ہے پھر ان کے ٹکڑے بھی ڈھونڈنے سے نہیں ملتے اور سچی بات سننا چاہتے ہیں تو آپ کوئی اتنی بلند و بالا شے بھی نہیں ہیں۔ ایسے بے شمار خاندان اس برصغیر میں موجود ہوں گے جن کی دولت آپ جناب کی دولت سے سو گنا زیادہ تھی لیکن جب ان کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسکنا شروع ہوئی تو ان کو گندی نالیوں میں اوندھے پڑے دیکھا گیا۔“

اس نے ایک زوردار جھٹکا دیا اور میرا گریبان نیچے تک پھٹتا چلا گیا۔ اس نے اپنا دایاں گھونسا مجھے مارنے کے لیے تانا لیکن بس اسے تان کر ہی رہ گیا۔ میں اسی طرح سکون سے اپنی جگہ بیٹھا رہا۔

چار پانچ سیکنڈ تک اس نے خونخوار نظروں سے مجھے گھورا پھر ایک دھکا دے کر میرا گریبان چھوڑ دیا۔

اس نے ایک جھٹکے سے اسٹیشن ویگن کا سلائڈنگ دروازہ کھولا اور باہر نکل کر کھڑا ہو گیا۔ میں اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ اپنے بے پناہ غیظ و غضب پر غلبہ پانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور اس کا ایک گہرا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا پھر بے قراری سے ٹہلنے والے انداز میں چند قدم اٹھائے۔ میں اسی طرح اپنی نشست پر بیٹھا، یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

قریباً ایک منٹ بعد وہ دوبارہ اندر آ گیا اور دروازہ بند کر دیا۔ اندر کی مدھم روشنی میں، میں نے دیکھا کہ اس نے خود کو کافی حد تک سنبھال لیا ہے۔ مجھے بھاؤ کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ شکیل اپنے نفع نقصان کو بے حد اہمیت دینے والا شخص ہے اور اس لیے ایک بہترین سودے باز یا سوداگر بھی ہے۔

میں بھی جانتا تھا کہ شکیل داراب نے میرا گریبان پھاڑنے کے بعد جو ڈیڑھ دو منٹ وین سے باہر گزارے ہیں، ان میں اس نے کوئی بہت بڑا فیصلہ کر لیا ہے۔

آنے والے ایک دو منٹ میں یہ بات بالکل درست ثابت ہوئی۔ شکیل داراب کچھ لے اور کچھ دے کی بنیاد پر یہ معاملہ طے کرنے کو تیار تھا۔ حسبِ توقع سب سے پہلے تو اس نے مجھ سے میرے دعوے کا ثبوت مانگا۔ میں نے کہا۔ ”شکیل صاحب، میں نے گزارش کی ہے نا کہ ثبوت پکے ہیں اور وہ پکے ہی ہیں۔ آپ کو تھوڑا سا اندازہ اس بات سے ہی ہو جائے گا کہ بارہ تاریخ کو رات بارہ بجے کے لگ بھگ آپ نے ناہید صاحبہ کے گھر میں آ کر ان سے جو بات چیت کی تھی، وہ میرے علم میں ہے اور جو سوئٹ ڈش کھانے سے آپ نے انکار کیا تھا وہ بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔“

وہ حیرت زدہ نگاہوں سے میری جانب دیکھتا رہا۔ اس کا ذہن تیزی سے بہت کچھ سوچ رہا تھا۔

”ایک درخواست آپ سے اور ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس سلسلے میں ناہید صاحبہ یا ان کے گھر کا کوئی ملازم ذمے دار نہیں ہے۔ اگر آپ اپنے غصے کا نزلہ ان میں سے کسی پر گرائیں گے تو یہ غلط ہوگا۔ آگے آپ کی مرضی۔“

”تم چاہتے کیا ہو؟“ شکیل نے فیصلہ کن انداز میں پوچھا۔

میں نے اپنی پھٹی ہوئی قمیص کی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور شکیل کی طرف بڑھا دیا۔ ”میں جو کچھ چاہتا ہوں

میں نے اس پر لکھ دیا ہے۔''

وہ کاغذ لے کر اندرونی روشنی میں پڑھنے لگا۔ میں نے اپنے جو مطالبات لکھے، وہ کچھ یوں تھے۔

''یہ وہ کم از کم مطالبات ہیں جن پر ہماری ڈیل ہو سکتی ہے۔ نمبر ایک، میرے کزن ولید کو فی الفور رہا کیا جائے اور اس پر درج جھوٹے بلکہ سراسر جھوٹے مقدمے ختم کیے جائیں۔ نمبر دو مجھ پر درج مقدمات بھی ختم کیے جائیں۔ مجھے اور ولید کو چچا حفیظ کے علاج کے لیے ملک سے باہر جانے کی اجازت دی جائے۔ نمبر تین، آپ عاشرہ سے دستبردار ہو جائیں۔ اسے اس کی منشا کے مطابق رہنے کی اجازت دیں (اور میرے خیال میں آپ کے لیے اب یہ کام اتنا مشکل بھی نہیں۔ آپ اس کو حاصل کرنے کی ضد تو پوری کر ہی چکے ہیں) اس کے علاوہ عاشرہ کے والد حاجی نذیر صاحب کے خلاف قتل کے بوگس مقدمے کی پرانی فائل دوبارہ نہ کھولنے کی گارنٹی دی جائے۔ نمبر چار، چچا حفیظ کی زمین پر قبضہ نہ کیا جائے اور نہ زمین زبردستی خریدی جائے۔ نیز حویلی میں لگنے والی آگ کی بالکل غیر جانب دارانہ تحقیق ہونے دی جائے۔ نمبر پانچ، یہ آخری مطالبہ ذرا غیر اہم لگے گا اور شاید دلچسپ بھی محسوس ہو لیکن یہ میرے لیے دوسرے مطالبوں کی طرح ہی اہم ہے۔ آپ جناب کے عملے میں پرسنل سیکریٹری صاحب نے اپنے اسسٹنٹ کے طور پر ایک کالے رنگ کا گتار کھا ہوا ہے اس بولی گتے کو رانا رفیق کہا جاتا ہے۔ کل دوپہر سے پہلے پہلے اس کو نوکری سے فارغ کیا جائے اور کم از کم ایک سال تک کسی بھی صورت میں اس کی بحالی یا ایڈجسٹمنٹ نہ ہو۔''

شکیل داراب نے بڑے تحمل اور غور سے اس تحریر کو دوبار پڑھا۔ تب اس نے کاغذ سامنے بیش قیمت تپائی پر رکھا اور میری آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔ ''اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ اگر میں ان مطالبات میں کچھ یا سارے مان لوں تو تم اپنی زبان بند کر لو گے اور یہ ہمیشہ بند رہے گی؟''

''یہ ایک مرد کی زبان ہے۔''

''بلیک میلنگ کرنے والے عام طور پر مرد ہی ہوتے ہیں اور ان کے مطالبات کو اکثر بریک نہیں لگتے یا پھر بریک لگانے کے لیے ان کی زندگی کو بریک لگانے پڑتے ہیں۔''

''یہاں ایسا کچھ نہیں ہوگا شکیل صاحب۔ شاید آج تک آپ کا واسطہ کسی مرد سے پڑا ہی نہیں۔ بریک لگیں گے اور فل بریک لگیں گے۔ اگر ہماری یہ ڈیل ہو جاتی ہے تو آپ اپنی زندگی کی آخری سانس تک اس ڈیل کو یاد رکھیں گے اور اپنی آنے والی نسل کو بھی بتائیں گے کہ جب ایک مرد کا بچہ زبان دیتا ہے تو وہ کیا ہوتی ہے۔''

میرے دل نے گواہی دی کہ شکیل جو کچھ بھی ہے لیکن ایک مردم شناس شخص ہے۔ وہ میری آنکھوں میں جھانکتا رہا اور شاید آنکھوں کے راستے ہی دل میں اترنے کی کوشش کرتا رہا۔ یہ فیصلے کے لمحے تھے اور پھر شاید فیصلہ ہو گیا۔ شکیل کے تاثرات بدلے۔ اس نے نیا سگریٹ سلگانے کے لیے اپنے ہاتھ ٹیبل کی طرف بڑھائے لیکن پھر یہ سوچ کر روک لیے کہ اس مختصر جگہ میں تمباکو نوشی کی گنجائش نہیں۔

وہ ٹھہرے لہجے میں بولا۔ ''میں تمہارے مطالبات پڑھ چکا ہوں اور غور کر چکا ہوں۔ پہلا مطالبہ بھی کچھ مشکل ہے کیونکہ ملزم ولید نے آن ڈیوٹی اہل کار پر گولی چلائی ہے لیکن میں اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کر لوں گا... بہر حال تیسرے مطالبے کو ماننا میرے لیے ناممکن ہے۔''

وہ عاشرہ والے مطالبے کی بات کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''اور یہی مطالبہ میرے لیے سب سے اہم ہے۔ اگر یہ نہیں تو پھر ڈیل پر کوئی بات کرنے کا فائدہ ہی نہیں۔''

اگلے دس منٹ میں ہم دونوں کے درمیان ان پانچوں مطالبات پر اور خاص طور سے عاشرہ والے مطالبے پر زبردست نگوسی ایشن ہوئی۔ درحقیقت وہ تیسرے یعنی عاشرہ والے مطالبے کے سوا سارے مطالبے ماننے کو تیار تھا۔ میرے پاس ترپ کا پتا تھا اور یہ پتا شکیل کی ہر چال کو ناکام بنا رہا تھا۔ وہ بارگیننگ میں اپنا فن دکھا رہا تھا لیکن میں اس فن کاری کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ بالآخر اس نے کڑوا گھونٹ بھرا اور عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے تقریباً یہ مطالبات تسلیم کر لیے۔ جو سب سے سخت فیصلہ اسے کرنا پڑا وہ یقیناً عاشرہ والا ہی تھا۔ ولید کے سلسلے میں، میں نے اس کی یہ بات تسلیم کر لی کہ اس پر دہشت گردی کا کوئی بوگس کیس نہیں بنے گا۔ کوشش کی جائے گی کہ اسے جیل کے بجائے زیادہ سے زیادہ اسپتال میں ہی رکھا جائے اور سارے واقعے کی جوڈیشنل انکوائری بغیر کسی دباؤ کے ہو۔

عاشرہ کے حوالے سے طے ہوا کہ فی الحال یہ اعلان کیا جائے کہ یہ شادی ملتوی کر دی گئی ہے۔ بعد ازاں اسے کینسل کر دیا جائے گا۔ اگر عاشرہ باہر جانا چاہے تو اپنے والد حاجی نذیر کے علاج کے سلسلے میں باہر جا سکے گی۔ یہ اصولی فیصلہ بھی ہو گیا کہ میں واپس ڈنمارک چلا جاؤں گا اور جب بھی ولید کو موقع ملے گا اسے بھی باہر بھجوا دیا جائے گا تاکہ وہ بے بنیاد مقدمات سے بچ سکے۔

اس کے علاوہ بھی کئی جزئیات طے ہوئیں۔ ہماری اس گفتگو نے غیر معمولی طور پر طول پکڑا اور یہ قریباً قریباً تین گھنٹے جاری رہی۔ آخر میں سب کچھ طے ہوگیا۔

☆☆☆

شام کا وقت تھا۔ آج سردی معمول سے زیادہ تھی۔ بادل بھی تھے، لاہور کے گلی کوچوں میں کبھی کبھی رم جھم ہونے لگتی تھی۔ میں جوہر ٹاؤن کی کشادہ سڑکوں پر موٹر بائیک چلاتا ہوا ایک کوٹھی کے سامنے رکا۔ ایک کینال کی اس کوٹھی کے بس ایک دو کمروں میں ہی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے بائیک روکی اور ہیلمٹ سر سے اتارا۔ کال بیل دی، تیسری چوتھی بیل کے بعد اندر کھٹ پٹ کی آواز سنائی دی اور پھر ایک دبلے پتلے اٹھارہ بیس سالہ لڑکے نے دروازہ کھولا۔ وہ صورت اور حلیے سے گھر کا فرد ہی لگتا تھا۔

''عارف صاحب گھر پر ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں جی، آپ کون؟''

جواب دینے سے پہلے ہی میں موٹر بائیک گیٹ کے اندر لے گیا اور بائیک کے ہینڈل سے اُڑسا اخبار نکال لیا۔ لڑکا سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''ان کو بتاؤ، آپ کا دوست شاہ زیب آیا ہے۔''

لڑکے نے الجھے ہوئے انداز میں گیٹ بند کیا اور اندرونی حصے کی طرف چلا گیا۔ میں جانتا تھا کہ گھر میں عارف اور اس لڑکے کے سوا اور کوئی نہیں۔ عارف کے سر کی چوٹ کا علاج معالجہ ابھی تک جاری تھا۔ اسے روزانہ جنرل اسپتال جانا پڑ رہا تھا اس لیے وہ مراد پور واپس جانے کے بجائے یہیں لاہور میں ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ گھر اس کے ایک قریبی دوست کا تھا جو اپنی فیملی سمیت چند ہفتوں کے لیے کراچی گیا ہوا تھا۔ لڑکے کا نام سلیم تھا اور وہ عارف کا چھوٹا بھائی تھا۔ یہ ساری معلومات میں نے کل ہی حاصل کر لی تھیں۔

سلیم نے ایک بند کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ''کیا بات ہے؟'' اندر سے قدرے جھلائی ہوئی آواز آئی۔

''بھائی کوئی ملنے آیا ہے آپ سے۔'' سلیم نے کہا۔

میں نے آگے بڑھ کر دروازے پر دباؤ ڈالا۔ وہ اندر سے بند نہیں تھا، کھل گیا۔ کمرے میں گہرا اندھیرا تھا۔ گیس ہیٹر کی ہلکی سی سرخ روشنی ماحول کو پُراسرار رنگ دے رہی تھی۔ گیس ہیٹر کے قریب ہی سگریٹوں کے ان گنت ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے بٹن دبا کر روشنی کی۔ سامنے ہی بستر پر الجھے بالوں اور ویران آنکھوں والا عارف نیم دراز دکھائی دیا۔ وہی عارف جسے ایک دن میں نے جائے حادثہ سے اٹھا کر اسپتال پہنچانے کی غلطی کی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر حیرت اُمڈ آئی۔

''تم یہاں؟''

میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ابھی سات بجے ہیں۔ یہ کون سا وقت ہے بتیاں بجھا کر سونے کا؟''

''تمہیں یہاں کا پتا کیسے چلا؟''

''کل اسپتال سے ہی معلوم ہوا تھا اور سناؤ کیا حال ہے؟''

''حال تمہارے سامنے ہے شاہ زیب بھائی۔ سر کی چوٹ کی وجہ سے گردن میں شدید درد رہتا ہے۔ اس کی ٹریٹمنٹ ہو رہی ہے۔''

''اس حال کا پتا تو مجھے کل اسپتال سے ہی چل گیا تھا۔ میں دوسرے حال کی بات کر رہا ہوں۔''

عارف نے اپنے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھا جو دروازے میں ہی کھڑا تھا۔ عارف نے اس سے کہا۔ ''چائے وغیرہ لے آؤ۔''

''اگر پکوڑے یا بسکٹ وغیرہ بھی ہو سکیں تو ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔

عارف کے چہرے پر عجب سی آدم بیزاری ہوتی تھی۔ اس کے باوجود وہ کسی نہ کسی طور پر مجھے برداشت کرتا تھا۔ آج بھی کر رہا تھا۔

ہم نے کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کیں تب میں پھر اصل موضوع پر آگیا۔ میں نے کہا۔ ''عاشرہ کی کچھ خیر خبر ہے؟''

اس نے ایک لمبی سانس لی۔ ''یہ بات آپ کیوں چھیڑتے ہو شاہ زیب بھائی۔ اس سے راستے اب علیحدہ ہو چکے ہیں۔''

''ہو سکتا ہے کہ راستے علیحدہ نہ ہوئے ہوں۔ ابھی کچھ امید باقی ہو۔'' میں نے کہا۔

اس نے نہایت دکھ بھرے انداز میں انکشاف کیا۔ ''آج اس کے اُبٹن کی رسم ہے۔''

''میں نے کہا نا امید باقی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آج اس کی اُبٹن کی رسم نہ ہو۔''

''آج ہی ہے۔'' وہ مرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اور اب ان باتوں سے فائدہ بھی کیا؟'' آخری الفاظ ادا کرتے کرتے وہ پھر جھلا سا گیا۔

میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا دوپہر کا اخبار کھولا اور فرنٹ پیج پر لگی ہوئی ایک دو کالمی خبر اس کے سامنے کر دی۔

خبر کی سرخی کچھ یوں تھی۔
''شکیل داراب کی شادی ملتوی۔''
ذیلی سرخی تھی۔ ''ان کے ہونے والے سسر حاجی نذیر علاج کے لیے بیرون ملک جائیں گے۔''
عارف حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر یہ خبر دیکھ رہا تھا۔ ''یہ کیا ہے؟ کب ہوا یہ؟'' اس نے لرزاں آواز میں کہا۔
''کل ہوا... اور خبر آج دوپہر چھپی ہے۔ بالکل تصدیق شدہ خبر ہے۔ سارے پیپرز میں آئی ہے۔ یقینا الیکٹرانک میڈیا پر بھی ہوگی لیکن تمہیں کیا پتا تم تو ساری دنیا سے کٹ کر یہاں اس اندھیرے کمرے میں پڑے ہو۔''
''یہ کیسے ہوسکتا ہے شاہ زیب، چند دن بعد تو...''
''یہ ہو چکا ہے۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''اور صرف یہی نہیں ہوا کہ شادی ملتوی ہوئی ہے یہ شادی کینسل بھی ہونے والی ہے اور یہ سب کچھ شکیل کی مرضی اور رضامندی سے ہوگا۔ عاشرہ پر یا اس کے گھر والوں پر کسی طرح کا کوئی بوجھ آئے گا اور نہ ان کی سبکی کا پہلو نکلے گا...''
''تم یہ سب کیسے کہہ سکتے ہو، اتنے یقین کے ساتھ؟''
''میں نے اسپتال میں تم سے وعدہ کیا تھا نا عارف کہ میں اپنی پوری کوشش کروں گا اور ان حالات کو بدل کر دکھاؤں گا۔''
''مگر... یہ سب... کیسے؟'' عارف گڑبڑا گیا۔ اسے الفاظ نہیں سوجھ رہے تھے۔
میں نے کہا۔ ''یہ سب باتیں چھوڑو عارف... مجھے صرف ایک بات کی پھر یقین دہانی کروا دو... صرف ایک بات۔''
اس کی آنکھوں میں نمی تھی اور سوالیہ نگاہیں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ وہ کچھ بھی نہیں بول پا رہا تھا۔ میں نے اس مرتبہ بالکل صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کیا اور کہا۔
''تمہیں معلوم ہو چکا ہے عارف کہ عاشرہ کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، اس میں وہ بالکل بے قصور ہے۔ ہمیں سو فی صد یقین نہیں لیکن کہا یہ جا رہا ہے کہ جب وہ مجبور ہو کر شکیل سے ملنے شیخوپورہ والے ٹھکانے پر پہنچی تو وہاں شکیل نے اس کے ساتھ زبردستی کی۔ یہ باتیں تمہارے علم میں بھی ہیں۔ کیا ان باتوں کی موجودگی میں تم اسے قبول کرنے اور اپنانے کو تیار ہو؟''
وہ کراہ کر بولا۔ ''شاہ زیب بھائی! تم نے جتنی بار مجھ سے یہ سوال کیا ہے، اتنی ہی بار میرے دل میں خنجر اتارا ہے۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ تم جو بات کہہ رہے ہو میرے نزدیک اس کی ذرا سی بھی اہمیت نہیں۔ میں بس یہ جانتا ہوں کہ میں اسے اپنی جان سے بڑھ کر پیار کرتا ہوں اور وہ اس سارے معاملے میں بالکل مجبور اور بے قصور ہے۔''
میں نے اسے دونوں کندھوں سے تھاما اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''عارف! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تم دونوں کو ملا کر رہوں گا۔ میں نے تم دونوں کے لیے گھڑی کی سوئیوں کو الٹا چلایا ہے اور یہ سوئیاں اب اسی مقام پر پہنچیں گی جہاں سے تم دونوں جدا ہوئے تھے۔''
وہ سرتا پا لرز رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، بولا۔ ''شاہ زیب! یہ بہت لمبے ہاتھوں والے لوگ ہیں۔ ان کی دشمنی بہت زہریلی ہے۔ تمہیں پتا ہے ناں کہ عاشرہ کے والد والی فائل کھلی تھی جس کی وجہ سے وہ بستر پر جا پڑے ہیں۔ یہ فائل پھر کھل جائے گی اور اس کے علاوہ...''
''اب کچھ نہیں کھلے گا عارف۔'' میں نے پورے وثوق سے اس کی بات کاٹی۔ ''اگر کچھ کھلے گا تو وہ راستہ کھلے گا جو تمہیں عاشرہ تک لے جائے گا۔''
میرا یقین اور اعتماد دیکھ کر عارف کی حیرتیں انتہا کو چھونے لگیں۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا۔ ''کیا تم شکیل سے خود ملے ہو؟''
''ہاں ملا بھی ہوں اور اس کے اندر بھی اترا ہوں۔ اس کی رگ رگ میں گھس گیا ہوں۔ اس ملاقات کو وہ بڑی دیر تک بھول نہیں سکے گا۔''
عارف سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ کتنی ہی دیر خاموش رہا پھر مجھے اس کی مدھم سسکی سنائی دی۔ ''کیا ہوا بھئی کیا اب بھی رونے کا موقع ہے؟''
وہ ایک دم اٹھ کر میرے گلے لگ گیا۔ اشک بار آواز میں بولا۔ ''شاہ زیب بھائی! مجھے تمہاری کچھ سمجھ نہیں آرہی۔ تم کیا ہو؟ یہ سب کس طرح کر رہے ہو؟ اور اس کا فائدہ...؟''
''تم اپنے دماغ پر زیادہ بوجھ نہ ڈالو عارف۔ بس اپنی صحت کی بحالی پر توجہ دو۔ مجھ پر بھروسا رکھو۔ اللہ نے چاہا تو میں تمہیں منزل پر پہنچا کر دم لوں گا۔''
''لیکن کیوں؟ آخر کیوں شاہ زیب بھائی؟''
''اس لیے کہ تم نے مجھے طعنہ دیا تھا۔ تم نے کہا تھا کہ میں نے حادثے کے بعد کیوں تمہاری جان بچائی۔ تمہیں کیوں نہ مرنے دیا۔''
''وہ تو... میں اب بھی کہتا ہوں۔'' وہ کمزور آواز

میں بولا۔

”میں بہت جلد یہ لفظ تم سے چھین لوں گا۔ ہمیشہ کے لیے۔“

اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”شاہ زیب! میں تمہیں سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں تم... یہ سب کس طرح کر پا رہے ہو کس کی مدد سے؟ کس کے تعاون سے؟“

”پیار کی مدد سے، پیار کے تعاون سے۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”تمہاری طرح میں بھی کسی سے پیار کرتا ہوں۔ اس کی جدائی جھیل رہا ہوں۔ اس تڑپ اور درد کو اچھی طرح جانتا ہوں... لیکن اب یہ نہ پوچھنے بیٹھ جانا کہ کون تھی... کیا تھی... کیا ہوا... کیسے ہوا؟ ابھی یہ موضوع چھیڑنے کا وقت نہیں۔ وقت آیا تو بتاؤں گا۔“

”تمہیں پتا ہے شاہ زیب بھائی، لالہ نظام اور اس کا دوست امتیاز ٹریفک حادثے میں مارے گئے ہیں۔ انسپکٹر چودھری قیصر زخمی ہو کر اسپتال میں پڑا ہے۔“

”ہاں، میں یہ خبر سن چکا ہوں۔ خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔“

عارف بولا۔ ”ان لوگوں نے اَت اٹھائی ہوئی تھی۔ انسان کو انسان نہیں سمجھتے تھے جو کچھ وہاں تمہاری حویلی میں ہوا، اس کے پیچھے بھی ضرور اسی لالہ نظام کا ہاتھ تھا۔“

”اس میں تو کوئی شک ہی نہیں ہے عارف۔ ولید نے حوالدار رمضان کو تھپڑ ضرور مارا تھا لیکن اس بات کو بس بہانہ بنایا گیا۔ لالہ نظام وغیرہ ہاتھ دھو کر اس زمین کے پیچھے پڑے ہوئے تھے...“

اچانک بات کرتے کرتے میں رک گیا۔ میری نگاہ سامنے غالیچے کے اوپر رکھی شیشے کی خوب صورت گول تپائی پر پڑی یہاں ایک دو سنڈے میگزین اور انگلش رسالے رکھے تھے۔ اسپورٹس کے ایک غیر ملکی رسالے کا بیک ٹائٹل دیکھ کر میں چونکا تھا۔ انرجی ڈرنک کے ایک اشتہار میں میری تصویر موجود تھی۔ میرا نام بھی موجود تھا ایسٹرن کنگ۔ ایسٹرن کنگ اپنے ایکشن میں نظر آ رہا تھا۔ لمبے بال شانوں تک جاتے ہوئے۔ داڑھی اور گھنی مونچھیں، یہ حلیہ اس حلیے سے بہت مختلف تھا جس میں... میں یہاں جوہر ٹاؤن کی اس کوٹھی میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ زندگی بھی کیا کیا تماشے دکھاتی ہے۔

عارف نے میری نگاہوں کا تعاقب کیا۔ ”کیا دیکھ رہے ہو؟“

میں نے اشتہار والا رسالہ اٹھایا۔ ”لگتا ہے تمہیں اسپورٹس سے بھی دلچسپی ہے۔“

”نہیں شاہ زیب بھائی۔ یہ تو چھوٹا سلیم پڑھتا ہے۔“

میں اپنی تصویر دیکھ رہا تھا جب کچھ آوازوں نے میرے ساتھ ساتھ عارف کو بھی بری طرح چونکا دیا۔ یہ آوازیں باہر سے آ رہی تھیں۔ بالکل یہی لگا جیسے کوئی عورت کسی سے جھگڑ رہی ہے اور دروازوں کو دھکے دیتی ہوئی اندر آ رہی ہے۔ یہ کوئی لڑکی ہی تھی۔ اس کی آواز کے ساتھ کسی وقت عارف کے چھوٹے بھائی سلیم کی آواز بھی آتی تھی۔

میں اور عارف دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ عارف نے شاید یہ آواز پہچان لی تھی۔ وہ ایک دم گھبرایا ہوا نظر آیا۔ اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ”شاہ زیب تم ساتھ والے کمرے میں چلے جاؤ۔“

میں نے سوال جواب مناسب نہیں سمجھا۔ اس کی ہدایت پر فوراً عمل کیا اور بغلی دروازے سے گزر کر ملحقہ کمرے میں چلا گیا۔ عارف نے دروازہ بند کر دیا۔ یہ ایک اسٹور روم ٹائپ جگہ تھی۔ یہاں اندھیرا تھا۔ میں ایک کھڑکی کی درز میں سے دوسرے کمرے میں جھانکنے میں کامیاب ہوا۔ میرے دیکھنے سے دو چار سیکنڈ پہلے عارف والے کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھل چکا تھا۔ اس دروازے کے راستے جو لڑکی اندر آئی تھی، میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہوا۔ میرے سامنے عاشرہ کھڑی تھی۔ وہ ساڑی میں تھی۔ بارش کی وجہ سے کپڑے بھیگ چکے تھے اور بال بھی۔ اس کا حسین چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے دروازے میں سلیم ڈرا سہا کھڑا تھا۔

وہ بڑے طیش کے عالم میں عارف سے مخاطب ہوئی۔ ”یہ سب کیا ہو رہا ہے عارف؟ کیوں ہو رہا ہے؟ کیوں مجھے زندہ دفن کرنے پر تلے ہوئے ہو؟ کیوں ہم سب کو بے رحمی کی موت مارنا چاہتے ہو؟ میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا؟ کیوں اتنی بڑی سزا دے رہے ہو مجھے؟“

وہ بھونچکا کھڑا تھا جیسے حیرت اور پریشانی کے سبب پتھرا گیا ہو۔ وہ آگے بڑھی اس نے عارف کے دونوں ہاتھ پکڑے اور اپنی بھیگی ہوئی شفاف گردن پر رکھ کر چلائی۔ ”اس سے بہتر ہے کہ تم مجھے اپنے ہاتھوں سے مار دو۔ ابھی میری جان لے لو۔ میں تمہیں اپنا خون معاف کرتی ہوں۔“

”عاشرہ! خدا کے لیے مجھے بتاؤ، میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ کراہ کر بولا۔

”جو کچھ کیا ہے تم نے ہی کیا ہے۔ تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ میری شادی رک گئی ہے۔ میں کسی طرف کی نہیں رہی۔ دونوں طرف سے خوار ہو گئی ہوں لیکن اگر تم سمجھتے ہو کہ میں واپس تمہارے پاس پلٹ آؤں گی تو یہ تمہاری بھول

ہے۔ میں مرجاؤں گی، زہر کھالوں گی' اب اپنے ماں باپ کے لیے اور امتحان نہیں بنوں گی۔''

عارف نے عاجزی سے کہا۔'' عاشرہ! مجھے تمہاری بات کی سمجھ نہیں آرہی۔ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ تمہاری شادی کے رکنے کی وجہ میں ہوں؟ میں یہ کیسے کرسکتا ہوں عاشرہ؟ میری بھلا کیا حقیقت ہے شکیل کے سامنے اور دارا ب فیملی کے سامنے؟''

''لیکن میں جانتی ہوں جو کچھ ہوا ہے، تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ تمہارے اسی ہمدرد نے کیا ہے جو پورے شہر میں غنڈا گردی کرتا پھر رہا ہے۔ دہشت پھیلائی ہوئی ہے، بے گناہ لوگوں کو مار رہا ہے اور پولیس مقابلے کر رہا ہے۔ وہ تو یہ سب کچھ کرکے یہاں سے چلا جائے یا کُتّے کی موت مارا جائے گا اور ہم رہ جائیں گے اس کے کرتوتوں کی سزا بھگتنے کے لیے۔''

عارف نے بپھری ہوئی عاشرہ کو شانوں سے تھام کر بمشکل کرسی پر بٹھایا۔ عاشرہ کا دلکش سراپا ٹیوب لائٹ میں دمک رہا تھا۔ عارف بڑی لجاجت سے بولا۔'' اگر تمہارے دل میں میرے لیے تھوڑی سی... تھوڑی سی بھی محبت باقی ہے تو میری بات پر یقین کرلینا۔ جو کچھ ہوا ہے اس میں میرا ذرا سا بھی عمل دخل نہیں ہے۔ جہاں تک تم شاہ زیب کی بات کررہی ہو اس کے بارے میں تمہاری اطلاعات بالکل درست نہیں ہیں۔ وہ دہشت گرد نہیں ہے، نہ قاتل ہے۔ وہ تو تمہاری اور میری طرح ہی مظلوم ہے۔ اس کی بہن' اس کی سگی چچی، شکیل اور قیصر چودھری کی درندگیوں کا شکار ہوئی ہیں۔ میں اپنی مری ماں کی قسم کھا کر تمہیں یقین دلاتا ہوں عاشرہ وہ میری اور تمہاری طرح ہی مظلوم ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ میری اور تمہاری طرح بے بس نہیں ہوا یا پھر شاید اس میں ہم دونوں سے زیادہ حوصلہ ہے۔ مجھے لگتا ہے، اس نے ہمت کرکے... شکیل کی کوئی دکھتی رگ پکڑلی ہے بس یہی لگ رہا ہے مجھے۔''

اچانک عاشرہ نے اپنا ماتھا عارف کے شانے سے ٹیک دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔'' خدا کے لیے عارف، مجھ میں اب اور ہمت نہیں۔ مجھے معاف کردو۔ اب میرا خیال دل سے نکال دو۔ جو ہو رہا ہے اسے ہوجانے دو۔ میں اب تمہاری نہیں ہوسکتی... اور نہ اس قابل ہوں کہ تمہاری ہوسکوں... میں اب وہ نہیں رہی ہوں۔ بہتر یہی ہے کہ اب شکیل کی چادر ہی مجھ کو ڈھک لے...''

عارف نے بے ساختہ اس کے نم بالوں کو چوم لیا۔ ''ایسا نہ کہو عاشرہ... میں تمہاری ہر بات سن سکتا ہوں لیکن یہ نہیں۔''

دفعتاً عارف کے بھائی سلیم کے چلّانے کی آواز سنائی دی پھر وہ زور سے بولا۔ کسی نے گرج کر کچھ کہا اور دندناتا ہوا برآمدے تک آگیا۔ ایک ساتھ کئی قدموں کی آواز آرہی تھی۔ عاشرہ سہم کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ ہم دونوں بھی ٹھٹک گئے۔ دو بٹے کٹے افراد بھیگے کپڑوں کے ساتھ دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔ ایک غیر معمولی بڑے چہرے والے شخص نے آتے ساتھ ہی عارف کو گریبان سے پکڑا اور دیوار سے دے مارا۔ عاشرہ چلّائی اور دیوار کے ساتھ جا لگی۔ آنے والے شخص کے ہاتھ میں پستول صاف نظر آرہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ عارف کو الٹے ہاتھ کا تھپڑ مارتا، میں دروازہ کھول کر اندر آچکا تھا۔ میں نے اس کی کلائی تھام لی۔ اس کے ساتھی نے بھنّا کر میرے چہرے پر مُکا رسید کرنا چاہا لیکن یہ اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے جھک کر یہ وار بچایا اور پھر پستول والے کے ہاتھ پر ٹانگ کی جچی تلی ضرب لگائی۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر چھت سے ٹکرایا اور صوفوں کے عقب میں جا گرا۔

یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ دونوں افراد کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ اسی دوران میں میری کہنی کی کاری ضرب نے دوسرے شخص کے جبڑے کا کڑاکا نکال دیا اور وہ الٹ کر شیشے کی گول تپائی کو چکنا چور کر گیا۔ یہی وقت تھا جب ایک تیسرا شخص عقب سے نمودار ہوا اور اس نے میرے سر کے پچھلے حصے سے پستول کی نال لگادی۔

''خبردار!'' وہ گرجا۔

مگر تب تک میں اپنا پستول نکال چکا تھا اور اسے اپنے سامنے والے کی کنپٹی پر رکھ چکا تھا.... میرے اندازے کے مطابق یہی بڑے چہرے والا شخص ان کا سرغنہ تھا۔

اب یہ برابر کی چوٹ تھی۔ اگر وہ شخص مجھ پر فائر کرتا تو میں اس کے باس پر فائر کردیتا۔ جس طرح اس نے انگلی ٹریگر... پر رکھی ہوئی تھی۔ میں نے بھی رکھی ہوئی تھی کمرے میں شدید تناؤ کی کیفیت تھی۔ عارف کے چھوٹے بھائی کی آواز نہیں آرہی تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا اسے کوریڈور کی طرف ایک شخص نے گن پوائنٹ پر رکھا ہوا تھا۔ کمرے میں پوزیشن کچھ ایسی تھی کہ ایک ذرا سی غلطی یہاں کی دیواروں کو خون سے رنگین کرسکتی تھی۔ میں ایسی سچویشنز سے پہلے بھی گزر چکا تھا۔ یہ شدید تناؤ میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ میں نے سرغنہ سے کہا۔'' مجھے لگتا ہے کہ تم شکیل کے پالتو ہو اور اس کے حکم پر حاجی صاحب کی بیٹی کے پیچھے

لگے ہوئے ہو؟''

وہ پھنکارا۔ ''زبان سنبھال کر بات کرو۔ یہاں لاشیں گر جائیں گی ابھی اور لوگ بھی پیچھے آرہے ہیں۔''

عاشرہ کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ سنگین صورتِ حال کے ساتھ ساتھ اسے میری آمد نے بھی بھونچکا کر دیا تھا۔

میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ میں جان گیا تھا اور لوگوں والی بات صرف دھمکی ہے شاید ایک یا دو بندے یہاں اور موجود تھے۔

میں نے سرغنہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''لگتا ہے ابھی تمہیں تازہ صورتِ حال کی خبر نہیں۔ اسی لیے بی بی کے پیچھے کتے کی طرح گھوم رہے ہو۔ فون لگاؤ اپنے بڑے صاحب کو اگر لگا سکتے ہو تو۔''

''میں کہتا ہوں اپنی زبان سنبھالو۔'' وہ پھر لال پیلا ہونے لگا۔

میں نے بائیں ہاتھ سے اپنی جیکٹ کی جیب سے سیل فون نکالا اور ایک ہی ہاتھ سے نمبر پریس کیا۔ یہ ڈائریکٹ اس شخص کا نمبر تھا جو علاقے کا غیر اعلانیہ کرتا دھرتا تھا چند سیکنڈ بعد اس کی آواز اسپیکر پر ابھری۔ ''ہیلو شکیل اسپیکنگ۔''

''گڈ ایوننگ، آپ کا خادم شاہ زیب عرض کر رہا ہوں۔''

ایک توقف کے بعد شکیل نے اپنی پاٹ دار آواز میں کہا۔ ''ہاں شاہ زیب کہو کیا بات ہے؟''

''آپ کے تین چار ملازم جو شاید پچھلے چوبیس گھنٹے سے بھنگ پی کر سوئے ہوئے تھے۔ مس عاشرہ کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں جوہر ٹاؤن پہنچے ہیں۔ دھمکیاں دے رہے ہیں۔''

ایک بار پھر فون لائن پر سناٹا چھا گیا۔ یوں لگا جیسے وہ فون بند کر گیا ہو لیکن میں جانتا تھا، وہ فون بند نہیں کر سکتا۔ آخر اس کی آواز ابھری۔ ''شاید غلط فہمی ہوئی ہے۔ اگر وہ پاس ہی ہیں تو ان میں سے کسی کو فون دو۔''

میں نے سیل فون بڑے تھوبڑے والے سرغنہ کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے فون سنا اور یس سر... یس سر کی گردان کرتا چلا گیا۔ شاید وہ میرے پستول سے اتنا خوف زدہ نہیں تھا جتنا اس فون سے ہوا تھا۔

چند سیکنڈ بعد اس نے فون بڑے ادب سے میری طرف بڑھا دیا اور ساتھ ہی اپنے ساتھی کو اشارہ کیا کہ وہ پستول نیچے کرے۔ میں نے فون سنا۔ شکیل نے کہا۔ ''تمہیں پریشانی ہوئی اس کا افسوس ہے۔ تم نے اچھا کیا، کال کر لی۔ بہرحال اٹ از آل او کے۔''

''تھینکس۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

''معافی چاہتے ہیں جی۔ یہ سب غلط فہمی سے ہوا۔ ویری سوری۔'' سرغنہ نے مجھ سے نظر ملائے بغیر سر جھکا کر کہا۔

عاشرہ اور عارف حیرت سے بت بنے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اس بڑے تھوبڑے والے شخص کو شکیل داراب کے کارندے کی حیثیت سے جانتے ہیں اور اس کے دبدبے اور جارحیت سے بھی آگاہ ہیں۔ اس نے جس طرح کال سننے کے بعد سلنڈر کیا تھا، وہ ان دونوں کے لیے تعجب خیز تھا۔

باہر والے شخص نے بھی عارف کے بھائی کو چھوڑ دیا تھا۔ اس کے ماتھے پر چوٹ لگی تھی۔ گومڑ بن گیا تھا اور خون رس رہا تھا۔ اسے گن پوائنٹ پر رکھنے والا شخص بھی اب شرمسار نظر آرہا تھا۔

سرغنہ نے ایک بار پھر گردن کو خم دیا۔ ''سوری سر جی، جو کچھ ہوا غلط فہمی سے ہوا۔ اب بڑے صاحب نے آپ کا تعارف کروا دیا ہے۔ اب آئندہ کوئی گستاخی نہیں ہوگی۔''

میں نے کہا۔ ''آئندہ کی بات تو آئندہ دیکھی جائے گی لیکن جو گستاخی اس بچے کے ماتھے پر لگی ہے اس کا حساب تو ابھی دینا پڑے گا۔'' میں نے نوعمر سلیم کے ماتھے کے زخم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''جی، میں سمجھا نہیں۔'' سرغنہ نے بڑی بھاری آواز میں کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا، میں نے پستول کا دستا گھما کر اس کی پیشانی پر مارا۔ وہ لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے گیا۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ آگ بگولا ہو کر مجھ پر پل پڑے گا اس کے ساتھی بھی ایک تن سے گئے مگر پھر سرغنہ نے خود کو سنبھالا۔ اس کے گلے کی پھولی ہوئی رگیں ڈھیلی پڑ گئیں۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے ساتھیوں کو ٹھنڈا رہنے کی ہدایت کی۔

''حساب برابر کرنا ضروری ہوتا ہے برادر... پھر ہی آگے چلا جا سکتا ہے۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔ ''ناؤ یو کین گو۔'' عارف، عاشرہ اور سلیم حیرت زدہ کھڑے تھے۔ میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ عاشرہ کی خوب صورت آنکھوں میں جما ہوا خوف پگھل رہا ہے۔

خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آیندہ ماہ پڑھیے

اولڈ نارمن اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ آدمی کو خود اپنے دونوں پیروں پر کھڑا رہنا چاہیے اور دوسروں کا سہارا نہیں لینا چاہیے۔ تب ہی تو جب موسمِ بہار کی طوفانی بارش نے اس کے باغ کے برساتی کنوئیں کی دیوار گرادی تو اس نے اپنے پڑوسیوں سے اس کی تعمیرِ نو میں کسی قسم کی مدد لینے کی خواہش نہیں کی بلکہ خود ہی فوری طور پر اس کی مرمت کا کام شروع کردیا اور جب اس نے دیکھا کہ پولیس برمنگھم بینک کے ڈاکوؤں اور کیشئر جارج ایس کے قاتلوں کو گرفتار

لبوں پر بے ساختہ مسکان بکھیر دینے والی خوش گوار کہانی...

بزرگوں سے پنگا ہمیشہ بھاری پڑتاہے... اس کے باوجود احمق و ناسمجھ یہ غلطی کر بیٹھتے ہیں... مجرموں کے ایک گروہ کی واردات... مالِ مسروقہ کو وہ جس جگہ دفن کرائے تھے... ان کے خیال میں وہ بہترین محفوظ ٹھکانا تھی... مجرموں اور ایک بوڑھے عقل مند کی باہمی چپقلش... وہ جوان تھے... اسلحے سے لیس تھے... اور بوڑھا نہتا تھا مگر زندگی کے تجربے و مشاہدے جیسے ہتھیار رکھتا تھا...

ایس۔ انور

کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہی ہے تو اس نے اس بارے میں خود ہی کچھ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ بینک کے آنجہانی کیشئر جارج ایس سے بے حد مانوس تھا اور اس کا شیدائی تھا۔

آج رات وہ اپنے فارم کچن میں تنہا بیٹھا ایک ہفت روزہ کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس کے دوغلی نسل کے کتے اسپاٹ نے جو ایک میز کے پائے کے ساتھ بندھا ہوا تھا، اچانک غرانا شروع کر دیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ باہر کوئی موجود ہے۔

جونہی بوڑھے نارمن نے اپنی کرسی سے اٹھنا چاہا تو دو افراد اندر در آئے۔ ان میں سے ایک سیاہ فام اور بھاری بھرکم جسم کا مالک تھا جبکہ دوسرا بید کی سی رنگت کا دبلا پتلا شخص تھا۔ ان دونوں نے اپنے داہنے ہاتھ میں آٹومیٹک پستول تھامے ہوئے تھے۔

موٹے سیاہ فام نے اپنا پستول نارمن پر تان لیا اور اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''یہاں کا اچھی طرح جائزہ لے ڈالو، آئزک ....''

''اوکے رنگو.... !'' آئزک نے منہ ٹیڑھا کرتے ہوئے کہا اور اندر کا جائزہ لینے چلا گیا۔ پھر چند لمحوں بعد واپس آ گیا اور بولا۔ ''سب کچھ ٹھیک ہے، پارٹنر....''

رنگو نے یہ سننے کے بعد اپنے آٹومیٹک پستول کی سرد نال بوڑھے نارمن کی کنپٹی سے لگا دی۔ ''آل رائٹ گرینڈ پا....'' اس نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ''وہ سوٹ کیس کہاں ہے جو ہم نے وہاں باہر سڑک کے کنارے تمہارے سوکھی گھاس کے مخروطی گٹھے میں چھپایا تھا؟ اس کی بازیابی کی ابھی تک کوئی اطلاع نہیں ہے اور گھاس کا وہ گٹھا بھی غائب ہے۔ لہٰذا ہم جان گئے ہیں کہ وہ سوٹ کیس تمہارے پاس ہے۔ سیدھی طرح اعتراف کر لو.... اور جلدی سے.... ورنہ؟''

بوڑھے نارمن نے دیکھ لیا تھا کہ جن ہاتھوں نے وہ آٹومیٹک پستول تھاما ہوا تھا وہ پُرسکون اور متوازن تھے۔ ان ہاتھوں میں کسی قسم کی کپکپاہٹ نہیں تھی اور نہ ہی ان دونوں مجرموں پر کسی قسم کی گھبراہٹ طاری تھی۔

لیکن نارمن کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ جب تک وہ سوٹ کیس ان لوگوں کو نہیں مل جاتا، اس کی جان کو کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے۔ وہ سوٹ کیس کا پہلی ہی فرصت میں جائزہ لے چکا تھا۔ سوٹ کیس میں بینک سے لوٹی ہوئی رقم، اسلحہ، ماسک اور وہ سوٹ رکھے ہوئے تھے جو انہوں نے واردات کے وقت پہن رکھے تھے۔

سوٹ کیس ان لوگوں کے ہاتھ لگنے کے بعد کیا ہوتا.... یہ رسک تو اسے لینا ہی ہوگا۔

وہ نظریں اٹھا کر ان دونوں کی جانب دیکھتے ہوئے جھینپی سی ہنسی ہنس دیا۔ ''بے شک وہ سوٹ کیس میرے ہاتھ لگ گیا تھا۔ جب میں نے وہ سوکھی ہوئی گھاس کا گٹھر بیچا تو اس کا خریدار اسے لادنے کے لیے گاڑی لینے چلا گیا۔ تب مجھے وہاں وہ سوٹ کیس دکھائی دیا۔ میں نے فوراً اسے کھول کر دیکھا تو اندر موجود اشیا کو دیکھ میں سمجھ گیا کہ اس کا مالک کسی نہ کسی وقت اسے لینے کے لیے ضرور آئے گا۔ سو میں نے سوچا کہ جب تک اس کی خاطر اس سوٹ کیس کو اپنے پاس ہی رکھ لوں۔ تم لوگ کہیں یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ....''

''ہم کچھ بھی نہیں سمجھ رہے ہیں گرینڈ پا....'' آئزک پھٹ پڑا۔ ''ہمیں وہ سوٹ کیس اور اس میں موجود ہر وہ شے چاہیے جو ہم نے تمہارے سوکھے گھاس کے گٹھے میں چھپاتے وقت اس میں چھوڑی تھی۔ کیا سمجھے؟''

''یقیناً دوستو، میں وہ تمہیں دے دوں گا۔ میں تو بس یہ یقین کرنا چاہتا ہوں کہ کیا میں یہ اس کے اصل مالکان ہی کو لوٹا رہا ہوں یا نہیں۔ بس اتنی سی بات ہے۔'' بوڑھے نارمن نے ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔

رنگو نے اس دوران ایک سگریٹ سلگا لیا۔ ''تو تم سوٹ کیس کی واپسی کے لیے سخت رویہ اختیار کرنا چاہتے ہو؟'' اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''ویل، شاید اس سے تمہارا ارادہ بدل جائے۔''

یہ کہہ کر رنگو نے جلتا ہوا سگریٹ بوڑھے نارمن کے گال سے مس کر دیا۔ نارمن بے ساختہ جھرجھری لے کر رہ گیا۔

''اگلی مرتبہ میں یہ تمہاری آنکھ میں چپکا دوں گا، گرینڈ پا.... اب یہ بتاؤ وہ سوٹ کیس کہاں ہے؟ اب ٹال مٹول سے کام نہ لینا ورنہ اپنا کام تمام سمجھو....'' رنگو نے زہریلے لہجے میں کہا۔

نارمن کو احساس تھا کہ ان قاتلوں کے لیے ایک اور قتل کرنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ وہ بینک کے کیشئر جارج کو پہلے ہی قتل کر چکے ہیں۔ وہ اس سے پہلے بھی شاید کئی قتل کر چکے ہوں گے اور وہ انہیں قتل سے باز رکھنے کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔

وہ اب تک جو کچھ کرتے چلے آئے تھے اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ پیشہ ور ہیں.... کوئی اناڑی نہیں ہیں۔ ان کا بینک میں عین اس وقت داخل ہونا جب بینک بند ہونے والا تھا اور اندر داخل ہوتے ہی چہروں پر ماسک

چڑھالینا تاکہ ان کی صورتیں جارج ایمس کے علاوہ کوئی نہ دیکھ پائے جو کہ بینک کے داخلی دروازے کو تالا لگانے کے لیے آگے آگیا تھا.... انہوں نے نیلے اور سفید باریک دھاری دار رنگ کے سوٹ اور ہلکے گرے رنگ کے ہیٹ پہنے ہوئے تھے۔

پھر جائے واردات سے فرار ہو کر انہوں نے راستے میں اپنے لباس مع ہیٹ تبدیل کردیے تھے اور انہیں لوٹ کی رقم کے ساتھ سوٹ کیس میں رکھ دیا تھا پھر اس سوٹ کیس کو سڑک کے کنارے نارمن کے مویشیوں کے چارے کے ڈھیر میں چھپا دیا تھا۔ سوٹ کیس میں لوٹی ہوئی رقم، گنیں، ماسک اور سوٹ اور ہیٹ میں سے کوئی شے نکالنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ انہوں نے سوچا تھا کہ جب ان کی تلاش کا معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا وہ کسی شب آکر اس سوٹ کیس کو خشک چارے کے ڈھیر سے نکال کر لے جائیں گے۔

انہوں نے پوری پلاننگ نہایت ہوشیاری اور مہارت کے ساتھ کی تھی اور اس کو پرفیکٹ طریقے سے سرانجام دینے میں کامیاب رہے تھے۔

لیکن شہر کے باسی ہونے کے ناتے انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ کسان نئی گھاس کے اگنے کے بعد اپنی پرانی سوکھی گھاس سے چھٹکارا حاصل کرلیتے ہیں جو انہوں نے مویشیوں کے چارے کے طور پر محفوظ کر رکھی ہوتی ہے۔

ان کی کہانی بھی نہایت عمدہ ثابت ہوئی تھی۔ جب ہائی وے پیٹرول پولیس نے انہیں پکڑا تھا تو انہوں نے فوراً اعتراف کرلیا تھا کہ نئے ماڈل کی یہ فورڈ کار وہی تھی جو بینک ڈکیتی کی واردات میں استعمال ہوئی تھی.... لیکن ساتھ ہی قسمیں کھاتے ہوئے پولیس کو بتایا کہ ڈاکوؤں کی اس کار کا ٹائر پنکچر ہوگیا تھا تو انہوں نے اسلحے کے زور پر ان کی گزشتہ سال کے ماڈل کی فورڈ کار زبردستی چھین لی تھی اور اس میں فرار ہوگئے تھے۔ وہ لوگ ڈاکوؤں کی پنکچر کار لے کر قریبی ٹاؤن میں قانون کو خبر دینے کے لیے جارہے تھے کہ ہائی وے پیٹرول پولیس نے انہیں راستے میں دھر لیا۔ اس وقت ان دونوں میں سے کسی کے جسم پر وہ نیلا اور سفید باریک دھاریوں والا سوٹ اور وہ گرے رنگ کا ہیٹ موجود نہیں تھا جو ڈاکوؤں کے حلیے کے طور پر نشر ہوا تھا۔

اس لباس کا جسم پر موجود نہ ہونا اور کار کا فلیٹ ٹائر ان دونوں کے بیان کی سچائی کو ثابت کررہا تھا۔

انہوں نے پولیس کو بتایا تھا کہ وہ کیلی فورنیا سے واپس اپنے گھر انڈیانا جارہے تھے اور ان میں سے ایک

غائب دماغ

ایک غائب دماغ پروفیسر جب گھر آئے تو بیوی نے کہا۔ ''صبح تو آپ کار پر گئے تھے، کار کہاں ہے؟''

''ہیں کار.... وہ، ہاں بیگم میں کار پر ہی گھر واپس آرہا تھا۔ راستے میں ایک نوجوان نے لفٹ مانگی، میں نے اسے بٹھالیا جب میرا گھر آیا تو میں نے اس کا شکریہ ادا کیا تو اس نے کار اسٹارٹ کی اور چلا گیا۔''

چوہنگ لاہور سے عبدالجبار رومی انصاری کا انکشاف

انکشاف

جیک اور میگ گہرے دوست اور شادی شدہ تھے۔ ایک روز جیک نے میگ کو رازدارانہ لہجے میں بتایا کہ اس نے چرچ کے راہب کی بیوی سے گہری دوستی گانٹھ لی ہے اور اگلے اتوار کو اس نے عبادت کے بعد راہب کی بیوی کے ساتھ وقت گزارنے کا پروگرام بنایا ہے۔

جیک نے خواہش ظاہر کی کہ چرچ سروس کے بعد میگ راہب کو کچھ دیر کے لیے اپنی باتوں میں الجھالے تاکہ جیک اپنی ملاقات سے اچھی طرح لطف اندوز ہو سکے۔

میگ کو کیا عذر ہوسکتا تھا۔ اگلے اتوار کو اس نے دعائیہ تقریب کے بعد راہب کو دھر لیا۔ کچھ دیر بامعنی سوال جواب ہوتے رہے پھر میگ نے دوست کی محبت میں اوٹ پٹانگ سوالات شروع کردیے۔

آخر کار راہب کو غصہ آگیا۔ ''تم نے اتنی دیر سے بلاوجہ مجھے یہاں روکا ہوا ہے... آخر تم چاہتے کیا ہو؟''

میگ بوکھلا گیا اور اس کی زبان سے سچ بہہ نکلا۔ اسے یقین تھا کہ اب راہب اس کا گلا دبوچ لے گا لیکن وہ حیران رہ گیا جب راہب نے ہنستے ہوئے اس کے کندھے کو تھپتھپایا۔ ہنسی تھمنے کے بعد راہب نے کہا۔

''میرے بچے! میری بیوی کو مرے ہوئے ایک سال گزر چکا ہے، میں گھر میں اکیلا رہتا ہوں۔ تم جاکر اپنی بیوی کی خبر لو... تمہارا مکار دوست وہیں خرمستیاں کررہا ہوگا۔''

بنگلہ دیش سے خرم علیم کی سرمستی

گزشتہ سال کے ماڈل کی فورڈ کار کا حقیقت میں مالک تھا۔ پولیس نے ریکارڈ اور ان کے گھروں کو چیک کروایا تو واقعی وہ فورڈ کار جوان کی ملکیت تھی، وہاں موجود نہیں تھی۔

جائے واردات سے ان کی عدم موجودگی کا یہ ایک ٹھوس ثبوت تھا۔ ان دونوں کا پولیس ریکارڈ موجود تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی پولیس کے مطلوبہ افراد کی فہرست میں شامل نہیں تھا۔ لہٰذا شیرف ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکا۔

اڑتالیس گھنٹے کی چھان بین کے بعد پولیس نے ان دونوں کو رہا کر دیا تھا اور اب وہ دونوں بوڑھے نارمن کے سامنے تھے۔

''وہ سوٹ کیس مکان میں نہیں ہے۔'' نارمن نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''میں نے اسے اپنے آڑو کے باغ میں دفن کر دیا تھا۔ میں اپنی لالٹین اور بیلچہ لے کر آتا ہوں۔''

''لالٹین کی ضرورت نہیں۔'' موٹے سیاہ فام رنگو نے ترش لہجے سے کہا۔ آئزک کے پاس فلیش لائٹ ہے۔ آئزک تم اس کے ساتھ جاؤ، میں یہاں کی نگرانی کر رہا ہوں۔''

یہ سنتے ہی بوڑھے نارمن کے دل کی دھڑکن رک سی گئی۔ اسے اپنا پلان تباہ ہوتا دکھائی دیا۔ ان دونوں کا اس کے ہمراہ چلنا لازمی تھا.... لیکن اس بارے میں کوئی بحث کرنا اس کے لیے ہلاکت خیز ثابت ہو سکتا تھا۔ لہٰذا وہ جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا اپنا لہجہ نارمل رکھتے ہوئے گویا ہوا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو مسٹر.... بہتر یہی ہوگا کہ تم میں سے ایک یہاں پیچھے کا دھیان رکھے۔''

اس بات پر رنگو نے ہونٹ حقارت سے سکیڑتے ہوئے اسے گھور کر دیکھا۔ ''ہم دونوں کو اپنے ہمراہ نہیں لے جانا چاہتے ہو، ایں؟ ہمیں بدھو سمجھا ہوا ہے؟ ٹھیک ہے اسی بات پر میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔''

آئزک نے اپنی فلیش لائٹ آن کر دی اور راستہ دکھانے لگا۔ نارمن انہیں لے کر اپنے آڑو کے باغ کی جانب روانہ ہو گیا۔ وہ دونوں نارمن کے دائیں بائیں چل رہے تھے۔

سوٹ کیس ہاتھ لگنے کے بعد نارمن کا پہلا خیال تو یہی تھا کہ وہ اسے شیرف کو پہنچا دے لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ سوٹ کیس پولیس کی تحویل میں آنے کے بعد کوئی بھی اس کا دعویدار سامنے نہیں آئے گا اور جتنے ہوشیار اور چالاک یہ لوگ تھے تو انہوں نے کسی بھی شے پر اپنی انگلیوں کے نشانات نہیں چھوڑے ہوں گے کیونکہ ڈکیتی کے دوران انہوں نے دستانے پہن رکھے تھے۔

حتیٰ کہ اگر شیرف سوٹ کیس کی نگرانی کا کھیل رچاتا ہے اور وہ لوگ کسی رات کو اسے لینے کے لیے آتے ہیں تو اندھیرے میں شاید بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائیں اور ہو سکتا ہے کسی اور کو قتل بھی کر دیں۔

اور پھر جارج ایمس کے قاتل شاید کبھی پکڑے نہ جا سکیں ....

نہیں، اس سوٹ کیس کو وہ ٹھوس ثبوت ہونا چاہیے جسے عدالت میں پیش کیا جا سکے۔ ایسا ناقابلِ تردید ثبوت جو ان چالاک ترین وکیلوں کو بھی ناکام کر دے جن کی خدمات یہ پیشہ ور مجرم اپنے دفاع کے لیے حاصل کرتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اس سوٹ کیس کا ان مجرموں سے تعلق بھی ظاہر کر دے.... جیسے کہ ان کا اسے حاصل کرنے کے لیے واپس آنا پھر اس طرح رنگے ہاتھوں پکڑے جانا کہ وہ سوٹ کیس ان کی تحویل سے برآمد ہو۔

''اس مال و اسباب کی ہماری خاطر حفاظت کرنا ظاہر کرتا ہے کہ تم نے اپنا دماغ استعمال کیا ہے گرینڈ پا....'' آئزک نے کہا۔ ''ہم بھی تمہیں فراموش نہیں کریں گے .... ہے نا رنگو....؟''

''میں بھی یہی کہوں گا کہ ہم کبھی تمہیں فراموش نہیں کریں گے!'' رنگو نے اپنے ساتھی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

نارمن نے ان کے بگڑے ہوئے چہروں کے تاثرات سے بھانپ لیا کہ وہ دونوں جھوٹ بول رہے ہیں۔ ان الفاظ کا کھوکھلا پن اس پر عیاں ہو گیا تھا۔ ایک بار وہ سوٹ کیس ہاتھ میں آنے کے بعد وہ اسے قتل کرنے کا منصوبہ بنا چکے تھے۔

تب کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی کہ کیا کچھ ہو گیا ہے۔

''یہ تم لوگوں کی بڑی فراخ دلی ہے، دوستو....!'' نارمن نے جواب دیا۔ ''جب بھی تمہیں کوئی چیز چھپانے کی ضرورت پیش آ جائے تو بے دھڑک یہاں لے آنا، میں کوئی سوال نہیں کروں گا۔ اور جو کچھ مجھے معلوم ہوتا ہے وہ میری ذات تک ہی محدود رہتا ہے، آگے کہیں نہیں جاتا۔''

''تم بہت سمجھدار ہو، گرینڈ پا.... بہت زیادہ سمجھدار، ہے نا رنگو....؟''

آئزک نے تائید میں سر ہلا دیا۔

''ابھی اور کتنا آگے جانا ہے؟'' رنگو نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''بس پہنچنے ہی والے ہیں۔'' نارمن نے جواب دیا۔

''وہ آگے درختوں کی تیسری قطار کے پاس.....''

''اپنی فلیش کی روشنی وہاں ڈالو آئزک، دیکھو کہ سب کچھ ٹھیک ہے ناں....'' رنگو نے کہا۔

''وہ کار کس کی ہے؟'' آئزک نے پوچھا تو نارمن کو رنگو کے آٹومیٹک پستول کی نال کی چبھن اپنی کمر میں محسوس ہونے لگی۔

روشنی کے حلقے میں سامنے ایک کار کھڑی دکھائی دے رہی تھی۔

نارمن نے زبردستی ایک ہلکا سا قہقہہ بلند کیا اور بولا۔ ''یہ میری پرانے ماڈل کی ٹی کار ہے، جب سے میں اپنی خشک گھاس اس پر لاد کر لایا تھا، تب سے یہ یہیں کھڑی ہوئی ہے۔''

''آگے بڑھ کر اسے چیک کرو آئزک....'' رنگو نے کہا۔

آئزک آگے گیا، کار کا فلیش لائٹ میں جائزہ لینے کے بعد وہ پلٹ کر آ گیا اور مطمئن لہجے میں بولا۔ ''سب کچھ ٹھیک ہے۔''

''اور وہ ان درختوں کے نیچے ڈھیر نما کیا ہے؟'' رنگو آگے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے غرایا۔

''اچھا! کیا تم لوگ غلے کے خشک ڈنٹھلوں سے واقف نہیں ہو؟ یہ میرے آڑو کے باغ میں تمام درختوں کے چاروں طرف لگے ہوئے ہیں، یہ انہیں وقت سے پہلے کھلنے سے روکتے ہیں، مجھے ابھی انہیں مزید ایک مہینے تک یوں ہی پڑے چھوڑنا ہوگا جب تک آڑو کی فصل تیار نہیں ہو جاتی۔''

''خدا کے لیے بتاؤ کہ اس سوٹ کیس کے لیے ہمیں ابھی مزید اور کتنا آگے جانا پڑے گا؟'' رنگو نے طیش بھرے لہجے میں پوچھا۔

''بس سمجھو ہم وہاں پہنچ چکے ہیں۔'' نارمن نے کہا اور بے ساختہ رک گیا۔

وہ دونوں بھی اس کے ساتھ وہیں کھڑے ہو گئے۔

''مجھے اپنا جیکٹ اتارنا پڑے گا دوستو!'' نارمن نے کہا... ''ابھی قدرے کھدائی بھی کرنی ہے، میں نے اسے گہرائی میں دفن کر دیا تھا۔''

نارمن نے اپنا بیلچہ نیچے رکھ دیا۔ اپنی ڈینم کی جیکٹ اتارنے کے لیے اوپری دھڑ کو جھکا دیا۔ جیکٹ اتارتے کے اس عمل کے بعد جب وہ سیدھا ہونے لگا تو دھیرے دھیرے اٹھتے ہوئے اس کے جسم کے تمام پٹھے اس طرح تن گئے جیسے یہ پرانا بدن فولاد کا بنا ہوا ہو۔ برسوں کی کھیت اور فارم میں محنت اور مشقت نے اس کے بڑے مضبوط ہاتھوں کو اتنا سخت بنا دیا تھا جیسے ارنا بھینسے کے سینگ ہوتے ہیں۔

وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو بجلی کی سی سرعت سے پیچھے لے گیا اور پھر دو پاور فل پسٹنوں کے مانند قوس بناتے ہوئے ان دونوں کی پشت پر اس زوردار طریقے سے وار کیا کہ ان کے قدم اکھڑ گئے اور وہ جیسے اڑتے ہوئے اس مقام پر جا گرے جہاں خشک ڈنٹھلوں کی تہیں ایک چھوٹا سا مخروط بنا رہی تھیں۔

ان خشک ڈنٹھلوں کے نیچے لکڑی کی کمزور پٹیاں جو انہیں سہارا دینے کے لیے لگائی گئی تھیں، وہ ان دونوں کا وزن برداشت نہیں کر سکیں اور چیخ گئیں۔

وہ دونوں سر کے بل اس پرانے کنوئیں میں تیزی سے گرنے لگے جس کی تہ میں فارم کے رد کردہ آلات، اوزار اور کاٹھ کباڑ کا ایک ڈھیر تھا۔ وہ ڈھیر نہیں موت کا کنواں تھا جس کی تیس فٹ گہرائی میں سر کے بل گرنے والا کوئی بھی انسان زندہ بچ نہیں سکتا تھا۔

☆☆☆

''مجھے اس کا خیال اس وقت آیا تھا جب میں اس پرانے کنوئیں کی برسات میں گرنے والی دیوار کی مرمت کر رہا تھا۔'' نارمن نے اخباری نمائندوں کو بتایا جو تفصیل جاننے کے لیے اس کے اردگرد جمع تھے۔

''میں نے سوچا کہ میں اس پرانے کنوئیں کے منہ کو چوڑا کر دوں تاکہ جب وہ دونوں کنوئیں میں گریں تو ایک ساتھ ہی گریں تاکہ ان کا ساتھ آخر تک نہ چھوٹے۔ وہ دونوں ہی سوٹ کیس کے حصول کے لیے اتنے مضطرب تھے کہ مجھ سے ان کی بے تابی دیکھی نہ گئی اور میں نے انہیں وہیں پہنچا دیا جہاں کنوئیں کی تہ میں وہ سوٹ کیس موجود تھا۔''

''اور وہ رقم کیا ہوئی جو ان ڈاکوؤں نے بینک سے لوٹی تھی۔'' ایک اخباری نمائندے نے پوچھا۔

''وہ میں نے پہلے ہی سوٹ کیس میں سے نکال لی تھی اور میرے پاس امانت ہے جو میں بینک کو لوٹا رہا ہوں۔''

''رقم بینک کو پہلے کیوں نہیں لوٹائی؟''

''میں چاہتا تھا کہ پہلے جارج ایمس کے قاتل کیفرِ کردار تک پہنچ جائیں اور اب مجھے قرار آ گیا ہے کہ میں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔''

شکار اور شکاری

تنویر ریاض

زندگی کی قیمت کیا ہے... جان سے بڑھ کر کیا اہم ہے... وہ اس حقیقت کا ادراک رکھتا تھا... زندگی سے زندگی کو کھو دینے والے شخص کی کہانی... بدلہ اور انتقام اس کی رگوں میں بس چکے تھے... وہ ہر قیمت پر وہ کرنا چاہتا تھا... جس کی منصوبہ بندی بہت پہلے کر چکا تھا...

مچھلیوں کی اسمگلنگ اور ہیرا پھیری کی نذر ہو جانے والی کہانی کے اتار چڑھاؤ

ولی کوستا عقبی صحن میں لگے آم کے درخت کے نیچے لان چیئر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی نظریں درخت کی شاخوں پر تھیں۔ یہ جون کا وسط تھا اور آموں کا گرنا کسی وقت بھی شروع ہو سکتا تھا اور ایسی صورت میں اس کے لیے یہاں بیٹھنا خطرناک تھا۔ اس سے پہلے ایک آم اس کی گردن پر لگ چکا تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ دوبارہ ایسا ہو۔ اس نے سوچ لیا کہ وہ اپنے بچاؤ کی خاطر اگلے روز سے پورچ میں بیٹھا کرے گا۔ اس کی نظریں اب بھی درختوں پر

جمی ہوئی تھیں کہ سیل فون کی گھنٹی نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پاس پڑی ہوئی میز پر سے فون اٹھالیا اور بولا۔

''ولی کوستا۔ پرائیویٹ انویسٹی گیشنز۔''

''کیا میں مسٹر کوستا سے ہی مخاطب ہوں؟'' ایک مردانہ آواز نے کہا۔

بولنے والے کا لہجہ بھاری لیکن قدرے مختلف تھا۔ کوستا کو اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کوئی غیر ملکی ہے، اس کے بہت سے کلائنٹ لاطینی تھے۔ اسی لیے وہ اپنے اشتہارات انگریزی اور ہسپانوی میں دیا کرتا تھا۔ وہ میامی پولیس ڈپارٹمنٹ انٹیلی جنس اسکواڈ میں بھی رہ چکا تھا جو بین الاقوامی نوعیت کے جرائم سے نمٹتا ہے۔ وہاں موجود اس کے پرانے دوست اکثر لوگوں کو اس کے پاس بھیجا کرتے تھے اور اگر کسی کلائنٹ کا لہجہ مختلف ہوتا تو وہ سمجھ جاتا تھا کہ کوئی لاطینی بول رہا ہے لیکن اس وقت جو شخص اس سے مخاطب تھا وہ لہجے سے کوئی ایشیائی لگ رہا تھا۔

''ہاں، میں کوستا ہی ہوں۔ کیا میں جان سکتا ہوں کہ مجھے کس سے گفتگو کا شرف حاصل ہو رہا ہے؟''

''میرا نام مسٹر چو ہے۔'' اجنبی نے کہا۔

''تمہارا تعلق کہاں سے ہے؟''

''میں شنگھائی کا رہنے والا ہوں۔''

ولی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ بولا۔ ''کیا تم شنگھائی سے فون کر رہے ہو؟''

''نہیں، اب میں چین میں نہیں رہتا۔ تمہارے ہی شہر میں ہوں اور میں نے یہ جاننے کے لیے فون کیا ہے کہ کیا تم میرا ایک انتہائی خفیہ کام کرنے کے لیے دستیاب ہو۔''

''ہاں، اسی لیے کمپنی کا نام پرائیویٹ انویسٹی گیشنز ہے کیونکہ ہم انتہائی رازداری سے کام کرتے ہیں۔''

''اس کام میں چند روز یا ایک ہفتہ بھی لگ سکتا ہے۔ کیا تم اس کے لیے وقت نکال سکو گے؟''

''ہاں، کیوں نہیں۔'' کوستا نے جواب دیا۔

ان دنوں وہ فارغ تھا۔ اس لیے ایک ہفتے کی معروفیت اسے پُرکشش لگی۔ دس روز قبل اس نے ایک انیس سالہ برازیلین لڑکی کا کیس حل کیا تھا جو چھٹیاں گزارنے میامی آئی اور اچانک ہی غائب ہوگئی۔ برازیلی قونصل خانہ نے ولی سے رابطہ کیا اور اسے لڑکی کے والدین سے ملوا دیا۔ لڑکی کا باپ بہت پریشان اور ماں غم سے پاگل ہو رہی تھی۔ عام طور پر ولی اپنے فائدے کے لیے کیس کو طول دیتا تھا لیکن وہ اس غریب عورت کی پریشانی دیکھ کر اپنے آپ کو اس کے لیے آمادہ نہ کر سکا اور اس نے لڑکی کو ایک ہی دن میں برآمد کر لیا جسے ساؤتھ بیچ کلب کے دربان نے چھپا رکھا تھا۔ اسے وہ لڑکی بار ڈانسر کے لیے بہت موزوں لگی اور وہ اسے اس کام کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لڑکی کے والدین کے پاس ولی کو دینے کے لیے ایک دن کے معاوضے اور شکریہ کے علاوہ کچھ نہیں تھا اور یہ اتنی معمولی رقم تھی جس سے مکان کا کرایہ بھی ادا نہیں کیا جا سکتا تھا۔

''ہاں، میں ایک ہفتے بلکہ اس سے بھی زیادہ کے لیے دستیاب ہوں۔'' ولی نے اپنے متوقع گاہک سے کہا۔

''اوہ، یہ تو بہت اچھا ہوگا۔'' مسٹر چو بولا۔ ''میں تم سے ملنا چاہتا ہوں مسٹر کوستا۔ کیا تمہارے لیے ممکن ہوگا کہ مینڈرین اورینٹل ہوٹل آسکو؟''

ہوٹل کا نام سن کر ولی کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ میامی کا سب سے عالی شان اور مہنگا ہوٹل تھا اور اس ہوٹل میں قیام کرنے والے شخص سے بھاری معاوضہ ملنے کی توقع کی جاسکتی تھی، ولی فوراً ہی اس ملاقات پر رضامند ہوگیا اور اس نے مسٹر چو سے کہہ دیا کہ وہ ایک گھنٹے میں ہوٹل پہنچ رہا ہے۔

اس نے اپنی کار ہوٹل سے دو بلاک کے فاصلے پر کھڑی کی اور پیدل ہی ہوٹل کی جانب روانہ ہوگیا۔ وہ ہوٹل میں بھی گاڑی پارک کر سکتا تھا لیکن وہاں کی پارکنگ فیس اس کے آدھے دن کی تنخواہ کے برابر تھی اور وہ فی الوقت اس عیاشی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ ہوٹل کی لابی سے گزرتا ہوا مسٹر چو کی بتائی ہوئی سمت کی جانب چل دیا۔ جہاں تالاب کے کنارے کچھ میزیں رکھی ہوئی تھیں اور ان پر بڑی بڑی سفید چھتریاں لگا دی گئی تھیں۔ مسٹر چو نے اسی جگہ ملنے کے لیے کہا تھا اور اسے اپنے گاہک کو تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں تھی ہوئی کیونکہ سیزن ختم ہو جانے کی وجہ سے ہوٹل تقریباً آدھا خالی ہو چکا تھا۔ دوسرے یہ کہ مسٹر چو ہی وہاں واحد ایشیائی باشندہ تھا۔

مسٹر چو اسے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ولی نے محسوس کیا کہ وہ ایک غیر معمولی طویل قامت چینی شخص سے مل رہا ہے۔ اس کا قد کم از کم چھ فٹ دو انچ اور وزن دو سو بیس پونڈ ہوگا۔ اس نے سلک کی قمیص اور لینن کی پتلون پہن رکھی تھی۔ ولی نے اندازہ لگا لیا کہ اس کی عمر چالیس اور

پچاس کے درمیان ہوگی۔ اس کے بال سیاہ، سیدھے اور لمبے تھے اور اس نے کالے فریم کا چشمہ لگا رکھا تھا۔

''تمہارے آنے کا شکریہ مسٹر کوستا۔'' چو نے ولی کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ولی نے گردوپیش کا جائزہ لیا اور آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''راتیں گزارنے کے لیے اچھی جگہ ہے۔''

مسٹر چو نے تائید میں سر ہلایا اور بولا۔ ''یہاں دن میں بھی بہت آرام ملتا ہے۔''

''وہ کون سا اہم معاملہ ہے جس کے لیے تمہیں میری مدد کی ضرورت پڑ گئی؟''

''مجھے ایک ایسے کشتی چلانے والے کی تلاش ہے جو کچھ لوگوں کو پیورٹو ریکو سے فلوریڈا پہنچا سکے۔ اسی سلسلے میں تمہاری مدد چاہیے۔''

اس کے الفاظ نے ولی کو چونکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ قانونی طور پر لوگوں کو لانے کی بات نہیں کر رہا تھا۔ ورنہ وہ ولی کے بجائے کسی ائرلائن سے رابطہ کرتا۔ اس کا مطلب بالکل واضح تھا۔ وہ لوگوں کی اسمگلنگ، غیر قانونی آمدورفت اور غیر قانونی امیگریشن کی بات کر رہا تھا اگر ولی اس معاملے میں ملوث ہو جاتا تو اسے اپنے پرائیویٹ سراغ رساں کے لائسنس سے ہاتھ دھونا پڑ سکتے تھے۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ تم نے پرائیویٹ سراغ رسانوں کے بارے میں کیا سن رکھا ہے لیکن ہم لوگوں کو خلافِ قانون کام کرنے کی اجازت نہیں ہے۔''

چو نے اپنا بڑا سا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں تم سے کسی ایسے کام کے لیے نہیں کہوں گا جو خلافِ قانون ہو۔ میں تم سے صرف اتنی مدد چاہتا ہوں کہ کسی ایسے آدمی سے میرا رابطہ کروا دو جو میرے مقاصد پورے کر سکے۔ میں اس بات کو یقینی بناؤں گا کہ تم سامنے آئے بغیر کام کر سکو۔ لوگوں کو لانے لے جانے میں تمہارا کوئی کردار نہیں ہوگا اور نہ ہی میں کبھی کسی کو بتاؤں گا کہ میں نے اس معاملے میں تم سے مشورہ کیا تھا۔''

یہ سب کہنا بہت آسان تھا لیکن کون جانتا تھا کہ آگے چل کر کیا ہوگا۔ کیریبین کے پار سے لوگوں کو دوسری جانب اسمگل کرنا بہت ہی خطرناک کام تھا اور امریکی کوسٹ گارڈ ..... اس کاروبار کے کرنے والوں کو بالکل بھی معاف نہیں کرتے تھے۔ ولی، مسٹر چو کو نہیں جانتا تھا اور اس کے بارے میں پہلے سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اگر ولی پکڑا گیا تو وہ اس کے لیے کیا کر سکے گا۔

''میں اسمگلنگ بزنس میں پڑنا نہیں چاہتا مسٹر چو۔ یہاں تک کہ خفیہ مشیر کی حیثیت سے بھی نہیں۔ بہتر ہوگا کہ تم اس کام کے لیے کسی اور شخص کو تلاش کرو۔''

''میں تم سے بات کر رہا ہوں مسٹر کوستا، کیونکہ ہم دونوں ہی جانتے ہیں کہ اپنے پیاروں کو ایسے انسانی اسمگلروں کے حوالے کرنا کتنا خطرناک ہو سکتا ہے جنہیں ہم نہیں جانتے اور جن کا کوئی حوالہ نہ ہو۔''

ولی اس نکتے پر بحث نہیں کر سکا۔ آئے دن اخبارات میں ایسی خبریں شائع ہوتی تھیں کہ میکسیکو کی سرحد پر لوگوں نے انسانی اسمگلروں کی خدمات حاصل کیں اور آخر میں انہیں ایری زونا کے صحراؤں میں پیاسا مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ ہیٹی سے تعلق رکھنے والے کتنے لوگ ایسے تھے جو گھر کے قریب پہنچ کر موت کے منہ میں چلے گئے کیونکہ خستہ حال یا گنجائش سے زیادہ بھری کشتیاں گہرے سمندر میں ڈوب گئیں یا پھر ایسے لوگوں کو بہاماس کے نزدیک کسی ویران علاقے میں یہ کہہ کر اتار دیا گیا ہو کہ یہ امریکا کا حصہ تھا اور وہ وہاں بھوکے پیاسے مر گئے۔

امریکا میں ایسے کیوبن باشندے بھی تھے جو اپنے ہم وطنوں کو اسمگل کر کے لاتے اور ان کا ریکارڈ دوسروں سے بہتر تھا لیکن اس کے باوجود ان کی بے پروائی کی وجہ سے کشتی خراب ہو سکتی تھی جس کی وجہ سے اس میں سوار لوگ جان سے ہاتھ دھو سکتے تھے۔ ولی جانتا تھا کہ مسٹر چو اسی وجہ سے پریشان ہے لیکن یہی وجہ اسے روک رہی تھی کہ وہ خود انسانی اسمگلنگ کے کام میں شامل نہ ہو۔

''میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے کہنا شروع کیا لیکن چو نے درمیان میں بات کاٹ دی۔

''مجھے یقین ہے کہ تم میری بات سمجھ جاؤ گے۔ تین افراد جن سے میرا خونی رشتہ ہے۔ سیاسی وجوہات کی بنا پر اپنے آپ کو چین میں غیر محفوظ سمجھتے ہیں۔ ان کی صرف ایک ہی خواہش ہے کہ وہ اس ملک کے جمہوری ماحول میں زندگی گزاریں۔ وہ کسی نہ کسی طرح پیورٹو ریکو پہنچ چکے ہیں اور اب ان کے سفر کا تھوڑا سا حصہ باقی رہ گیا ہے۔ کیوبا سے تعلق ہونے کے سبب تم سمجھ سکتے ہو کہ میں کتنی شدت سے ان کی آمد کا منتظر ہوں۔''

ولی کی بھویں تن گئیں۔ لگتا تھا کہ مسٹر چو نے اس کا ذہن پڑھ لیا ہے اور اسی لیے اس نے کیوبا کارڈ استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ کیوبا کے باشندے بھی کمیونسٹ حکومت

کی سختیوں سے تنگ آکر فلوریڈا میں آباد ہوگئے تھے۔ ولی خود بھی کیوبن امریکن تھا۔ مسٹر چو نے اس کے بارے میں مکمل ہوم ورک کیا تھا یا پھر وہ ولی کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ ولی کو واقعی ان لوگوں سے ہمدردی تھی جو تھوڑی سی آزادی کے سوا کچھ نہیں چاہتے تھے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ کسی ایسے کام میں شامل ہو جس کے نتیجے میں اسے جیل جانا پڑ جائے اور اس کا لائسنس بھی ضبط ہوجائے۔

''میں تم سے دوبارہ وعدہ کرتا ہوں کہ کسی ایسے کام کے لیے نہیں کہوں گا جس میں تمہیں گرفتار ہونے کا خطرہ ہو۔ اس کے علاوہ میں تمہیں پانچ دن کا معاوضہ پیشگی نقد کی صورت میں دینے کے لیے تیار ہوں اور اگر کسی مرحلے پر تم یہ محسوس کرو کہ معاہدے کی شرائط پر عمل نہیں ہورہا تو تم کام چھوڑ کر جانے کے لیے آزاد ہو۔''

ولی کی مالی حالت ان دنوں خاصی خراب تھی۔ اس لیے اسے پانچ دن کے ایڈوانس کی پیشکش کافی پُرکشش لگی۔ اس کے باوجود وہ خاصا محتاط تھا۔ اس موقع پر مسٹر چو نے اپنی جیب سے ایک سیل فون نکالا اور اس کے چند بٹن دبانے کے بعد ولی کو دے دیا۔ اسکرین پر ایک چالیس سالہ خوب صورت ایشیائی عورت دو بچوں کے ساتھ نظر آرہی تھی جن میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی۔ لڑکے کی عمر دس سال اور لڑکی کی آٹھ سال تھی۔ ولی کو لگا جیسے وہ کہہ رہے ہوں 'برائے کرم ہماری مدد کرو۔'

یہ خاندانی تصویر دکھا کر مسٹر چو نے ایک اور کارڈ کھیلا تھا۔ ولی کی مزاحمت دم توڑ گئی اور وہ انکار نہ کرسکا اور ایک منٹ بعد ہی ان کے درمیان معاملہ طے پا گیا۔ اس لمحے ولی نے اپنے آپ کو حوالات میں بند محسوس کیا لیکن اب اس کے پاس اتنی رقم تھی کہ وہ اپنی ضمانت کرواسکتا تھا۔ وہ مسٹر چو سے وعدہ کر کے روانہ ہوا کہ سہ پہر میں دوبارہ اس سے رابطہ کرے گا۔ اپنی کار سے اس نے ایک پرانے سراغ رساں دوست وکٹر ابویلا سے رابطہ کیا جو فیڈرل امیگریشن اینڈ کسٹمز انفورسمنٹ ایجنسی میں کام کرچکا تھا اور اب ریٹائر ہوچکا تھا۔ ولی کو پولیس کی نوکری کے دوران اس کے ساتھ دو کیسوں پر کام کرنے کا موقع ملا تھا۔

''میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں ولی؟'' وکٹر نے پُرجوش انداز میں کہا۔

ولی تھوڑا سا ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''میں تم سے ایک نازک سوال کرنا چاہ رہا ہوں۔''

''کیسا سوال؟''

''کیا تم مجھے کسی ایسے کشتی والے کا نام بتا سکتے ہو جو ان دنوں کیریبین جزائر سے جنوبی فلوریڈا کے ساحلوں تک لوگوں کو پہنچانے کا کام کرتا ہو؟''

جواب میں کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ ولی اچھی طرح جانتا تھا کہ وکٹر کیا سوچ رہا ہوگا یہی کہ ولی کسی ایسے شخص کے بارے میں پوچھ رہا ہے جو اس کے کچھ عزیزوں کو کیوبا سے اسمگل کرسکے۔ کچھ دیر بعد وکٹر نے کہا۔

''ہمارے درمیان پہلے کبھی اس طرح کی بات نہیں ہوئی۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ولی؟''

''ہاں، ہم نے کبھی اس موضوع پر بات نہیں کی۔''

''میں تمہیں اس کا پتا سمجھا دیتا ہوں۔ تمہیں جنوب کی جانب فلوریڈا کے ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرنا ہوگا اور کی ویسٹ سے بیس میل آگے جانے کے بعد تمہیں ایک چھوٹا پل عبور کرنا ہوگا۔ دو میل کے فاصلے پر ایک گیس اسٹیشن نظر آئے گا۔ وہاں سے تم بائیں جانب مشرق کی طرف مڑ جاؤ گے جہاں تمہیں ایک چھوٹا ریسٹورنٹ ملے گا۔ اندر جا کر گوٹی کے بارے میں پوچھنا۔ وہی اس ریسٹوران کا مالک ہے۔ اسے بتانا کہ تمہیں تو ماس سوسا نے بھیجا ہے۔''

''وہ کون ہے؟''

''وہ مجھے اسی نام سے جانتا ہے۔ اس کے بعد تمہارا کام ہے کہ تم اس سے کس طرح نمٹتے ہو۔ اب میں فون بند کررہا ہوں۔ یہ بات یاد رکھنا کہ ہمارے درمیان کبھی ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔''

ولی نے فون کر کے مسٹر چو کو بتادیا کہ وہ کل صبح سفر پر روانہ ہورہے ہیں۔ لہٰذا وہ اپنا مختصر سامان تیار کرلے۔ چو نے بتایا کہ وہ اگلی صبح ہوٹل کی لابی میں اس کا انتظار کرے گا۔ وہ اتنا خوش لگ رہا تھا جیسے چھٹیاں منانے جارہا ہو۔

اگلے روز صبح ساڑھے دس بجے وہ دونوں اپنے سفر پر روانہ ہوئے۔ اس موقع پر مسٹر چو نے ایک رنگین بنیان شرٹ کا انتخاب کیا تھا جس پر پام کے پتے بنے ہوئے تھے۔ ولی کو ہمیشہ سے ہی جزیروں کی طرف جانا اچھا لگتا تھا۔ زیادہ تر سڑک یک طرفہ تھی جو چھوٹے چھوٹے جزیروں کو آپس میں ملاتی تھی۔ راستے میں سڑک کے کنارے کئی ریسٹوران اور موٹیل نظر آئے۔ لیکن اس بار ولی پہلے کی طرح پُرسکون تھا۔ وہ بار بار بیک مرر میں دیکھتا کہ کہیں کوئی پولیس کار ان کا تعاقب تو نہیں کررہی۔

دوسری جانب مسٹر چو بالکل پُرسکون تھا۔ اس نے

راستے میں زیادہ بات نہیں کی اور نظاروں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ ایک طرح سے ولی کے لیے یہ اچھا ہی تھا لیکن اس نے اپنا تجسس دور کرنے کے لیے مسٹر چو سے کچھ سوالات کیے۔ ان میں سے پہلا اس کی انگریزی کے بارے میں تھا جو مختلف لہجہ ہونے کے باوجود بہت عمدہ تھی۔

''میں نے کیلی فورنیا کے کالج میں پڑھا ہے۔'' اس نے اسکول کا نام لیے بغیر بتایا۔

''اگر تم بُرا نہ مناؤ تو میں پوچھ سکتا ہوں کہ اب تم کیا کرتے ہو؟''

''میں ایک کاروباری شخص ہوں۔''

ولی سمجھ گیا کہ وہ مختصر گفتگو کرنے کا عادی ہے۔ چنانچہ اس نے ایک ایسا سوال کر دیا جس کے تفصیلی جواب کی اسے توقع تھی۔ ''تم یقیناً اپنے پیاروں کو بہت زیادہ یاد کر رہے ہوگے۔ بہت پیاری فیملی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم ان سے دوبارہ ملنے کے لیے بے چین ہو۔''

اس مرتبہ مسٹر چو نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا پھر کچھ لمحے توقف کرنے کے بعد وہ بولا۔ ''کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے؟''

''میں نے شادی کی تھی لیکن وہ ختم ہوگئی۔''

''بچے ہیں؟'' مسٹر چو نے پوچھا۔

''نہیں۔''

مسٹر چو نے سر ہلا دیا۔ پھر کافی دیر تک دونوں میں سے کوئی نہیں بولا۔ جب وہ سوگرلوف کے جزیرے سے آدھے فاصلے پر تھے۔ مسٹر چو نے اچانک ہی دوبارہ بولنا شروع کر دیا۔ ''گزشتہ شب میری پیورٹو ریکو میں ایک شخص سے بات ہوئی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ ایک خاص کشتی کے بارے میں ضرور معلوم کروں جو وہاں سے لوگوں کو فلوریڈا لے کر آتی ہے اور اس کشتی کا نام لاس اولاس ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کشتی کا مالک بھروسے کا آدمی ہے۔''

ولی نے سر ہلا دیا۔ حالانکہ وہ محسوس کر رہا تھا کہ پیورٹو ریکو میں رہنے والے کسی گمنام شخص کے مقابلے میں وکٹرا ویلا، اس بارے میں بہتر معلومات دے سکتا ہے۔ تاہم اس نے کہا۔ ''دیکھیں گے۔''

ولی اپنے دوست وکٹر کی ہدایات پر عمل کرتا ہوا کی زکلام شیک، نامی ریستوران تک پہنچ گیا۔ وہ ایک چھوٹی سی جگہ تھی جہاں کل بارہ میزیں رکھی ہوئی تھیں اور فضا میں مچھلی تلنے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ولی اور مسٹر چو نے ایک ایسی میز منتخب کی جہاں بیٹھ کر وہ اندر آنے والوں پر نظر رکھ سکتے تھے۔ ایک سنہرے بالوں والی ویٹرس آرڈر لینے آئی۔ دوپہر ہو چکی تھی اور مسٹر چو کو بھوک لگ رہی تھی چنانچہ ولی نے کھانے کا آرڈر دے دیا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ولی نے ویٹرس کو بلایا اور اس سے ریستوران کے مالک گوٹی کے بارے میں پوچھا۔ چند منٹوں بعد ایک دبلا پتلا ساٹھ سالہ شخص کچن سے نکل کر ان کی میز پر آیا۔ اس نے ایک لمبا سفید ایپرن پہن رکھا تھا جس پر جابجا تیل کے دھبے لگے ہوئے تھے۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ کچن میں کھانا بنا رہا

تھا۔

ولی نے اپنا تعارف کروایا اور ریستوران میں بھنی ہوئی مچھلی کی تعریف کرتے ہوئے بولا۔ ''میرے دوست توماس سوسا نے اس کے بارے میں جو کہا تھا، یہ ویسی ہی ہے۔''

سوسا کا نام سنتے ہی گوٹی کے کان کھڑے ہوگئے۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن دوسرے گاہک جاچکے تھے۔ وہ ولی کے برابر والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں سوسا نے بھیجا ہے؟''

ولی سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہاں، اس نے بتایا تھا کہ شاید تم اس مقصد میں ہماری مدد کرسکو جس کے لیے ہم یہاں آئے ہیں۔''

گوٹی کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ اس نے ولی سے نظریں ہٹا کر مسٹر چو کی جانب دیکھا۔ ایک ایشیائی شخص کی موجودگی اس کے لیے تشویش کا باعث تھی۔ ولی نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''ہم کسی ایسے شخص کی تلاش میں ہیں جو فوری طور پر پیورٹو ریکو جائے اور وہاں سے کچھ خاص سامان لے کر واپس آجائے۔''

گوٹی نے سمجھنے کے انداز میں سر ہلایا تو ولی بولا۔ ''کیا تم کسی ایسے شخص کو جانتے ہو جسے اس طرح کے خاص سفر کا تجربہ ہو؟''

ریستوران کا مالک اس سوال کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کررہا تھا لیکن مسٹر چو نے اسے موقع نہیں دیا اور میز کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم نے لاس اولاس کا نام سنا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس کشتی کا مالک انتہائی تجربہ کار ہے۔''

گوٹی نے اس سوال کو غور سے سنا اور کہنے لگا۔ ''ہاں، میں اس کشتی سے واقف ہوں۔ اس کا مالک رول کوریرا ہے اور وہ اس کشتی کو اس گودی پر رکھتا ہے جو شارک کی کو جانے والی سڑک پر ہے۔ یہ اس جزیرے پر واحد سڑک ہے۔ تم دس میل کا سفر طے کرکے دائیں جانب مڑو گے تو وہ تمہیں مل جائے گا لیکن میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا اور نہ ہی ہماری بھی کوئی بات ہوئی ہے۔''

یہ کہہ کر گوٹی اٹھا اور کچن میں چلا گیا۔ مسٹر چو نے میز پر پیسے رکھے جو کہ بل سے دگنے تھے اور دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ ولی چاہ رہا تھا کہ گوٹی بھی اپنی طرف سے کسی دوسرے کشتی راں کا نام تجویز کرے جو پیورٹو ریکو سے غیر قانونی مسافروں کو فلوریڈا پہنچانے کا کام کرتا ہو لیکن جب اس نے یہ بات مسٹر چو سے کہی تو وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں مسٹر کوستا لیکن مجھے لاس اولاس کشتی کے بارے میں بتایا گیا ہے وہی سب سے زیادہ قابلِ اعتبار ہے۔''

ولی نے کندھے اچکائے اور خاموش ہوگیا۔ اسے پانچ دن کا ایڈوانس معاوضہ مل چکا تھا اور اگر اس کے کلائنٹ کی یہی مرضی تھی تو اسے کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ اس کے علاوہ اسے مفت میں جزیروں کی سیر کرنے کا موقع بھی مل رہا تھا۔ لہٰذا اسے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے تھی۔

انہوں نے سوگرلوف چینل پار کیا جہاں کچھ لڑکے پل پر کھڑے مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ پھر وہ ایک اور چھوٹے جزیرے سے گزرتے ہوئے شارک کی پہنچ گئے۔ تقریباً ایک میل چلنے کے بعد وہ مغرب میں فلوریڈا کی خلیج تک پہنچ گئے جہاں دو سو گز کے فاصلے پر کئی کشتیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ انہی میں لاس اولاس بھی نظر آگئی۔ سفید رنگ کی وہ کشتی پینتیس فٹ طویل تھی۔ اس میں وہ تمام لوازمات موجود تھے جو کسی مچھلی پکڑنے والی کشتی کے لیے ضروری ہیں۔ تختوں پر مچھلیاں پکڑنے کا سامان رکھا ہوا تھا اور عرشے کے پچھلے حصے میں گھومنے والی کرسیاں لگائی گئی تھیں۔ اس کے برابر میں ایک بہت بڑا کنواں تھا جس میں پکڑی ہوئی مچھلیاں ذخیرہ کی جاتی تھیں اور ایک بہت بڑا کولر بھی نظر آرہا تھا جو غالباً بیئر اور دوسرے مشروبات کے لیے تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ کشتی مچھلیاں پکڑنے کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے۔

لیکن ولی کی عقابی نظریں دیکھ چکی تھیں کہ کس طرح اسے انسانی اسمگلنگ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کشتی کے دائیں جانب دو پورٹ ہول نظر آئے جس کا مطلب تھا کہ عرشے کے نیچے کئی کمرے ہیں جن میں لوگوں کو خفیہ طور پر رکھا جاتا ہے۔ عام طور پر اس طرح کی کشتیوں میں تین سو ہارس پاور کی موٹر لگائی جاتی ہے لیکن اسمگلرز اس میں تبدیلی کرکے موٹر کی ہارس پاور کو دگنا کرلیتے ہیں۔ اس طرح یہ کشتیاں کھلے سمندر میں زیادہ تیز رفتاری سے دوڑتی ہیں اور کوسٹ گارڈ کی گشتی کشتی ان تک نہیں پہنچ پاتی۔

وہ کشتی کے قریب پہنچ گئے تھے کہ اچانک مسٹر چو نے کہا۔ ''یہیں رک جاؤ مسٹر کوستا۔''

ولی نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ کیا تم کشتی کے مالک سے بات کرنا نہیں چاہتے؟''

''یہاں قریب ہی ایک موٹیل ہے۔ پہلے ہم وہاں جائیں گے اور میں ایک کمرا کرائے پر لے لوں گا۔ چاہتا ہوں کہ تم کیپٹن کوریرا سے رابطہ کر کے کہو کہ تمہارا ایک کلائنٹ مچھلیاں پکڑنا چاہتا ہے پھر تم اسے لے کر موٹیل پر آجاؤ۔''

''تم اس سے یہاں بات کرنا کیوں نہیں چاہتے؟''

''یہاں میں سب کی نظروں میں آجاؤں گا جبکہ تم پر کوئی شک نہیں کرے گا اور یہ ہمارے حق میں بہتر ہے کہ میں اس سے کسی دوسری جگہ بات کروں کیونکہ یہاں دوسری کشتیوں پر موجود لوگ ہمیں دیکھ سکتے ہیں۔ جب وہ مجھ سے ملنے آئے تو تم ہمیں تنہا چھوڑ دینا اور پھر میں اسے اصل کام کی نوعیت سے آگاہ کروں گا۔ تمہیں صرف اس سے اتنا کہنا ہے کہ مجھے مچھلیاں پکڑنے سے دلچسپی ہے اور یہ کوئی غیر قانونی بات نہیں ہے۔ تم ہر طرح سے محفوظ ہو گے جیسا میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔''

ولی کے پاس اعتراض کی گنجائش نہ تھی۔ وہ واپس مڑا اور دونوں تھوڑے فاصلے پر واقع کورل ریف موٹیل پہنچ گئے جو حجرہ نما کمروں پر مشتمل تھا۔ مسٹر چو نے موٹیل کے عقب میں واقع کمرا کرائے پر لیا جو تقریباً پام کے درختوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ولی نے اسے وہیں چھوڑا، اور واپس کشتی کی طرف چل دیا۔ اس نے لکڑی کی گودی پر کھڑے ہو کر آواز لگائی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ دوسری بار اس نے زیادہ اونچی آواز میں پکارا۔ پھر بھی کوئی جواب نہیں ملا تو وہ سوچنے لگا کہ شاید کشتی پر کوئی نہیں ہے۔ چند لمحوں بعد ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی نے اپنا سر باہر نکالا۔ اس کی عمر پچاس یا پچپن برس ہوگی۔ اس کا شیو بڑھا ہوا تھا اور بدن پر صرف سفید نیکر تھا البتہ سر پر اس نے نیلے رنگ کی کیپ پہن رکھی تھی جس پر کڑھائی سے سنہرے رنگ کا لنگر بنایا گیا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ سوتے سے اٹھ کر آیا ہے۔ اس نے خشمگیں نگاہوں سے ولی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا چاہتے ہو؟''

''میں کیپٹن کوریرا کو تلاش کر رہا ہوں۔''

''کس لیے؟''

''میرا ایک کلائنٹ مچھلیاں پکڑنے کے لیے جانا چاہتا ہے۔'' ولی نے کہا۔ ''کیا تم ہی کوریرا ہو؟''

''ہاں، لیکن آج تو بہت دیر ہو چکی ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔ ہم کل چلے جائیں گے۔ دراصل اسے بڑی شدت سے مچھلیاں پکڑنے کی خواہش ہو رہی ہے۔''

''کل بھی میں مصروف ہوں۔ تم اس سے کہو کہ کسی اور سے بات کر لے۔''

''لیکن اس نے سنا ہے کہ تم اس کام میں سب سے بہترین ہو اور وہ تمہیں بہت اچھا معاوضہ دینے پر آمادہ ہے۔''

کوریرا کئی لمحوں تک پیچھے مڑ کر دیکھتا رہا۔ پرکشش معاوضے کا سن کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھتا ہوا اپنی کرسی تک گیا اور دراز میں سے ایک سگار نکال کر سلگایا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ تھوڑا سا مشکوک ہو گیا ہے۔ شاید اب تک کسی نے اس طرح اس کی تعریف نہیں کی ہوگی۔ شاید وہ خود بھی جانتا ہو کہ یہ سچ نہیں ہے۔ وہ لوگ جو اپنے کام میں اچھے ہوں، کبھی بھی انسانی اسمگلنگ کا خطرہ مول نہیں لیتے۔ اس نے گہری نظروں سے ولی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ مچھلیاں کہاں ہیں جنہیں تمہارا کلائنٹ پکڑنا چاہتا ہے اور وہ ایک مچھلی کا کیا معاوضہ دے گا؟''

الفاظ خواہ کچھ بھی ہوں لیکن انہوں نے انسانی اسمگلنگ کے لیے جو کوڈ استعمال کیا تھا وہ بہت واضح تھا۔

''یہ مچھلیاں پیورٹوریکو سے پکڑی جائیں گی اور اسے جو تین مچھلیاں چاہئیں، ان کا وہ بہت اچھا معاوضہ دے گا؟''

''کتنا؟''

''تم خود اندازہ لگا سکتے ہو کہ وہ اس مقصد کی خاطر دور دراز کا سفر طے کر کے آیا ہے اور وہ مچھلیاں اس کے لیے بہت اہم ہیں۔''

کوریرا کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔ ''تمہارا کلائنٹ کہاں ہے؟ وہ مجھ سے ملنے کے لیے یہاں کیوں نہیں آیا؟''

''وہ تم سے کھلے عام گفتگو نہیں کرنا چاہتا لیکن وہ قریبی موٹیل میں موجود ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب تم اس مہم کے بارے میں گفتگو کر رہے ہو گے تو وہ تمہاری تواضع کے لیے ایک بوتل رم کا آرڈر ضرور دے گا۔''

اس آخری جملے نے کوریرا کا دل جیت لیا۔ اس نے نیچے جا کر ایک بغیر آستینوں والی ٹی شرٹ پہنی اور واپس آ گیا۔ پھر وہ دونوں پیدل چلتے ہوئے موٹیل تک پہنچے اور پام کے درختوں سے گزر کر ولی نے مسٹر چو کے دروازے پر دستک دی۔ چند لمحوں بعد دروازہ کھلا۔ وہ اور کوریرا جیسے ہی ائر کنڈیشنڈ کمرے میں داخل ہوئے، دروازہ تیزی سے بند ہوا۔ اس لمحے ولی نے دیکھا کہ وہاں مسٹر چو اکیلا نہیں بلکہ اس کے ساتھ دو نوجوان چینی بھی ہیں جن کی عمریں بمشکل بیس

سال ہوں گی۔ ولی نے موٹیل کے باہر ایک سیاہ رنگ کی ایس یو وی کار کھڑی دیکھی تھی اور اس کا اندازہ تھا کہ شاید یہ کسی دوسرے کمرے میں مقیم مہمان کی ہوگی لیکن اب وہ سمجھ گیا کہ وہ کار ان دونوں چینی لڑکوں کی ہے۔ شاید ولی کا اندازہ درست تھا۔ میامی سے یہاں تک آتے ہوئے اس کا تعاقب پولیس کار نے نہیں بلکہ ان دونوں لڑکوں نے کیا تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟

مسٹر چو جہازی سائز بستر کے کنارے پر بیٹھ گیا اور وہ دونوں لڑکے ولی اور کوریرا کے عقب میں دروازے پر اس طرح کھڑے ہو گئے کہ انہیں باہر جانے کا راستہ نہ مل سکے۔ کوریرا نے ان دونوں کو باری باری دیکھا اور ناراض ہو کے ولی سے بولا۔ ''تم نے یہ نہیں بتایا کہ یہ چینی ہیں۔''

ایک لمحے کے لیے ولی بھول گیا کہ وہ اسے یہاں کس مقصد کے تحت لے کر آیا تھا پھر سنبھلتے ہوئے بولا۔ ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اب بھی لوگ آزاد فضا میں سانس لینے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اور وہ اس کا معاوضہ دینے کے لیے بھی تیار ہیں۔''

مسٹر چو نے اپنا چشمہ اتار دیا تھا اور اس کی گہری سیاہ آنکھیں کوریرا پر جمی ہوئی تھیں پھر وہ بولا۔ ''تم نہیں سمجھتے مسٹر کوستا۔ تمہارا دوست سمجھتا ہے کہ چینی دوسرے لوگوں سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔''

ولی کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔ ''اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

''اسے یقین ہے کہ چینی لوگ واقعی مچھلیوں کی طرح ہوتے ہیں اور وہ سمندر میں طویل فاصلے تک تیر سکتے ہیں۔ انہیں ڈوبنے کا کوئی ڈر نہیں ہوتا۔''

ولی اب بھی کچھ نہیں سمجھا لیکن لگتا تھا کہ کوریرا اصل بات کی تہ تک پہنچ گیا ہے۔ وہ اچانک ہی دروازے کی طرف بڑھا لیکن دونوں لڑکوں نے اس کا راستہ روک لیا۔ جس کے نتیجے میں جدوجہد شروع ہوگئی جو زیادہ دیر جاری نہ رہ سکی کیونکہ ان میں سے ایک لڑکے نے کوریرا کے پیٹ میں زوردار مکا رسید کیا۔ کیپٹن کے حلق سے ایک غراہٹ برآمد ہوئی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا زمین پر جا گرا۔ تکلیف کی شدت سے اس نے اپنا پیٹ پکڑ رکھا تھا اور وہ گڑگڑا رہا تھا لیکن اس نے کوئی حرکت نہیں کی۔

ولی نے ان لڑکوں اور کوریرا کو الگ کرنے کی کوشش کی تو ان میں سے ایک ولی کی طرف بڑھا جیسے وہ اس کے ساتھ بھی یہی سلوک کرنے والا ہو لیکن چو نے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا اور اس لڑکے سے چینی زبان میں کچھ کہا جس کے بعد وہ لڑکا پیچھے ہٹ گیا۔

''مسٹر کوستا! میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔'' یہ کہہ کر چو نے اپنے پاس پڑے ہوئے بریف کیس میں سے ایک فولڈر نکالا جس میں کئی اخبارات کے تراشے لگے ہوئے تھے۔ ولی نے انہیں دیکھنا شروع کیا۔ وہ سب نیپلز کے ایک اخبار سے کاٹے گئے تھے اور ان سب میں ایک ہی کہانی شائع کی گئی تھی۔ یہ ایک سال پرانی خبر تھی جب کچھ چینیوں کو کیریبین کے کسی مقام سے امریکا لانچ کے ذریعے اسمگل کیا جا رہا تھا کہ وہ کشتی ہیلی کاپٹر میں سوار کوسٹ گارڈز کی نظروں میں آ گئی۔ کشتی میں سوار لوگوں کے پاس سمندر میں کودنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا یا انہیں کشتی کے عملے نے ایسا کرنے کا حکم دیا جب وہ ساحل سے ایک میل کے فاصلے پر تھے۔ کشتی کا نام نہیں پڑھا جا سکا کیونکہ اس پر ترپال ڈال دی گئی تھی۔ چند ہی لمحوں میں وہ کشتی گہرے سمندر میں غائب ہوگئی۔

کوسٹ گارڈ کے غوطہ خوروں کو فوراً ہی طلب کر لیا گیا لیکن وہ وقت پر نہ پہنچ سکے اور ڈوبنے والوں میں سے کسی کو بھی نہ بچایا جا سکا۔ اگلے روز نو لاشیں نکالی گئیں جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ ایک تصویر میں یہ لاشیں سفید کفن میں لپٹی ہوئی قطار سے ساحل پر رکھی ہوئی تھیں۔ ولی نے سرخیاں اور خبر کا ابتدائی حصہ پڑھا جس میں بتایا گیا تھا کہ گواہوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے کوسٹ گارڈ نے اسمگلروں کی تلاش ترک کر کے کیس بند کر دیا تھا۔

مسٹر چو نے ایک عورت اور دو بچوں کی تصویر نکالی جو ولی ایک روز پہلے اس کے سیل فون کی اسکرین پر دیکھ چکا تھا اور اسے اخبار میں شائع ہونے والی تصویروں کے ساتھ رکھ دیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ان میں سے تین لاشیں میری بیوی اور بچوں کی تھیں۔''

ولی نے تصویر کو غور سے دیکھا۔ اسے یاد آ گیا کہ مسٹر چو نے اس سے بیوی بچوں کے بارے میں پوچھا تھا۔ شاید وہ اس وقت ہی اپنے منصوبے کا اعتراف کر لیتا لیکن اس نے سوچا ہوگا کہ ولی اس بات کو نہیں سمجھ سکے گا۔ وہ مسٹر چو کے ساتھ ہونے والے حادثے اور اس کے درد کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ تصویر دیکھ کر اس کی زبان گنگ ہوگئی اور وہ ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا۔

مسٹر چو نے ایک اخباری تراشے پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ''اس خبر کے مطابق یہ ایک شخص ساحل تک پہنچنے اور جان بچانے میں کامیاب ہو گیا۔''

ولی نے اس پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''اور وہ حکام کے پاس نہیں گیا تاکہ وہ اسمگلروں کو پکڑ سکتے؟''

مسٹر چو نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ اس ملک میں غیر قانونی طور پر مقیم تھا۔ اسی لیے اس نے پولیس سے رابطہ نہیں کیا۔ اس کے بجائے اس نے میامی میں رشتے داروں کو فون کر کے اپنے بارے میں بتایا۔ انہوں نے اسے وہاں سے نکالا جہاں وہ چھپا ہوا تھا اور اپنے گھر میں پناہ دے دی پھر اس نے ہم لوگوں سے رابطہ کیا جن کے پیارے ان سے بچھڑ چکے تھے۔ اس نے ہمیں بتایا کہ کیپٹن نے خوف زدہ چینیوں کو سمندر میں چھلانگ لگانے پر مجبور کیا تھا پھر وہ انہیں ڈوبنے کے لیے چھوڑ کر چلا گیا۔''

یہ کہہ کر اس نے کوریرا کی طرف دیکھا جو اس وقت خود بھی ایک سمندری مخلوق کے مانند نظر آرہا تھا۔ ولی نے مسٹر چو پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''تو تم یہاں انتقام لینے آئے ہو؟''

مسٹر چو نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''صرف اپنا ہی نہیں بلکہ ان لوگوں کا بھی جو اپنے پیاروں کے بچھڑنے پر غم زدہ ہیں۔''

''تم مجھے فیڈرل امیگریشن پولیس کو بتانے کی اجازت کیوں نہیں دیتے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ اسے اس جرم کی سزا ضرور دیں گے۔''

مسٹر چو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس شخص نے جو کچھ کیا، اس کی صرف ایک ہی مناسب سزا ہے۔''

''تم جانتے ہو کہ میں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔''

''ہاں میں جانتا ہوں۔'' مسٹر چو نے کہا اور اپنے آدمیوں کو اشارہ کر دیا۔

ان میں سے ایک لڑکا ولی کی جانب بڑھا لیکن ولی نے لپک کر اس کی قمیص پکڑ لی اور پوری طاقت سے گھما کر اسے دور دھکیل دیا۔ وہ سنگھار میز سے جا کر ٹکرایا اور اس پر رکھا ہوا مصنوعی پھولوں کا گل دان زمین پر گر کر ٹوٹ گیا۔

اسی وقت دوسرا لڑکا اس کی جانب لپکا۔ ولی نے گھوم کر اسے ایک زوردار لات رسید کی اور وہ دروازے کی چوکھٹ سے جا کر ٹکرایا۔ اس ضرب نے اس کی ساری ہوا نکال دی اور وہ بھی فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اسی اثنا میں اس کا پہلا ساتھی دوبارہ کھڑا ہو گیا تھا۔ ولی اس پر حملہ کرنے ہی والا تھا کہ اس نے عقب میں مسٹر چو کو محسوس کیا۔ اس نے جیسے ہی اسے گھوم کر دیکھا۔ چو نے اپنی ننگی شرٹ کے نیچے سے ایک گن نکالی اور اس کی بائیں کنپٹی پر ضرب لگائی وہ سیدھا کوریرا کے پاس جا کر گرا۔

جب اس کے حواس بحال ہوئے تو اس کے دونوں ہاتھ پشت کی جانب بندھے ہوئے تھے اور منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔ اسے سیاہ کار تک لے جا کر پچھلی نشست پر دھکیل دیا گیا۔ کوریرا کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔ اسے ایک کمبل میں لپیٹ کر ولی کے عقب میں سامان رکھنے کی جگہ پر ٹھونس دیا گیا۔ مسٹر چو اور اس کے دونوں ساتھی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئے اور کار اس جانب روانہ ہو گئی جہاں کوریرا کی کشتی کھڑی ہوئی تھی۔

یہ دوپہر کا وقت تھا اور گرم ہوا چل رہی تھی اور گودی میں اس وقت کوئی شخص نظر نہیں آرہا تھا۔ لہٰذا ان چینیوں کو ولی اور کوریرا کو کشتی تک لے جانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ چند لمحوں بعد کشتی کی رسیاں کھول دی گئیں۔ مسٹر چو کے ایک نوجوان ساتھی نے کشتی کا کنٹرول سنبھالا۔ وہ گودی سے روانہ ہوئے اور شارک کی کے جنوب میں بنے ہوئے راستے سے گزر کر کھلے سمندر میں داخل ہو گئے۔

ولی کو کپتان کی کرسی کے پیچھے بٹھایا گیا جبکہ کوریرا کو کسی بوری کی طرح مچھلیوں کے خالی ٹینک میں ڈال دیا جیسے انہوں نے اس روز اسے شکار کیا ہو۔ جب وہ خشکی سے چند گز کے فاصلے پر آگئے تو مسٹر چو نے ولی کو اٹھایا اور ریلنگ کے پاس لگی ہوئی گھومنے والی کرسیوں پر بٹھا دیا پھر اس کے منہ سے کپڑا بھی نکال دیا، اس نے اپنے جبڑوں کو حرکت دی اور بولا۔ ''کیا ہم مچھلیاں پکڑنے جا رہے ہیں؟''

مسٹر چو نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں مسٹر کوستا۔ ہم کچھ نکالنے نہیں بلکہ سمندر کی آبادی میں اضافہ کرنے جا رہے ہیں۔''

بیس منٹ بعد کشتی کے نوجوان ڈرائیور نے اچانک ہی انجن بند کر دیا اور کشتی کی رفتار آہستہ ہونے لگی۔ اس نے تیز رفتاری سے یہ فاصلہ طے کیا تھا اور ولی نے اندازہ لگایا کہ وہ خشکی سے کم از کم دس میل دور نکل آئے ہیں۔ وہاں دور دور تک کوئی دوسری کشتی نظر نہیں آرہی تھی۔ ان دونوں لڑکوں نے کوریرا کو ٹینک سے باہر نکال کر سیدھا کھڑا کر دیا۔ اس کے دونوں ہاتھ اب بھی بندھے ہوئے تھے لیکن انہوں نے اس کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔

کوریرا نے چاروں طرف نظریں دوڑا کر دیکھا کہ کہیں کوئی خشکی کا ٹکڑا یا دوسری کشتی نظر آجائے لیکن وہاں کچھ نہیں ملتا۔ اس کی آنکھوں میں خوف اتر آیا۔ اس نے ولی کی طرف دیکھا جیسے وہ اسے ڈوبنے سے بچا لے گا۔

"تم انہیں ایسا نہیں کرنے دو گے۔" وہ چلاتے ہوئے بولا۔ "جو یہ کہہ رہا ہے، میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ میں بے گناہ ہوں۔"

ولی نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ "اس کا کہنا ہے کہ تم نے اس کی بیوی اور چار بچوں کو سمندر میں چھلانگ لگانے پر مجبور کیا اور انہیں ڈوبنے کے لیے چھوڑ کر چلے گئے۔"

کوریرا کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور وہ اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں کو آزاد کرانے کے لیے زور لگانے لگا۔

"چار!" وہ چلایا۔ "وہ صرف دو تھے، وہاں صرف..."

اس نے درمیان میں ہی جملہ نامکمل چھوڑ دیا لیکن دیر ہو چکی تھی اور اس کی زبان سے سچ ادا ہو گیا تھا۔ ایک گہری خاموشی نے ان سب کو اپنے حصار میں لے لیا۔ وہ اب بھی ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے اور ولی دیکھ سکتا تھا کہ کوریرا کی تمام امیدیں دم توڑتی جا رہی ہیں۔

مسٹر چو نے کوریرا کے سامنے کھڑے ہو کر وہ تصویر نکالی جو وہ اس سے پہلے ولی کو دکھا چکا تھا اور بولا۔

"کیا تمہیں یہ تین چہرے یاد ہیں کوریرا؟ تم نے آخری بار انہیں اس وقت دیکھا تھا جب وہ تمہارے سامنے مدد کے لیے التجائیں کر رہے تھے۔ اب تم بھی ان کے ساتھ دوسرے تمام لوگوں میں شامل ہونے جا رہے ہو جنہیں تم مرنے کے لیے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔"

کوریرا چلاتے ہوئے عرشے پر گر پڑا جیسے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہا ہو لیکن اس سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ دونوں لڑکوں نے اسے اٹھایا اور دھکیلتے ہوئے کشتی کے کنارے تک لے گئے۔ انہوں نے جلدی جلدی اس کے ہاتھ اور پیروں کو رسیوں سے آزاد کیا اور اسے سمندر میں دھکا دے دیا۔ گرتے وقت اس کی چیخ بلند ہوئی اور لمحوں میں دم توڑ گئی۔ اس کی کیپٹن والی ٹوپی نزدیک ہی تیر رہی تھی۔ اسی دوران ڈرائیور جلدی سے کرسی پر بیٹھا اور موٹر اسٹارٹ کر کے کشتی کو اس سے دس گز دور لے گیا۔ کوریرا نے پوری قوت سے تیرنے کی کوشش کی لیکن کشتی اس سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے آخری بار ولی کی طرف ملتجی نظروں سے دیکھا لیکن وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

چو نے کشتی کو ساحل کی طرف واپس لے جانے کا حکم دیا اور کوریرا کی چیخوں کی آواز موٹر کے شور میں دب گئی۔ ولی نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

جب وہ دوبارہ خشکی پر پہنچے تو وہ لوگ ولی کو اس کوارٹر میں لے گئے جہاں کشتی راں سویا کرتے تھے اور ایک بار پھر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا۔

"بدقسمتی سے ہم تمہیں یہاں چھوڑنے پر مجبور ہیں مسٹر کوستا۔" مسٹر چو نے اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "ایک دفعہ ہم یہاں سے بحفاظت نکلنے میں کامیاب ہو جائیں تو یہ میرا وعدہ ہے کہ میں خود حکام کو اطلاع دوں گا اور وہ تمہیں یہاں سے بحفاظت نکال لیں گے۔ تم نے ہماری جو مدد کی اس کے لیے میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ تم ایک اچھے آدمی ہو اور کئی برسوں سے تم لوگوں کی مدد کرتے رہے ہو لیکن انصاف کے کئی طریقے ہوتے ہیں اور اس مرتبہ تم کسی اور کے آلۂ کار بن گئے۔ امید ہے کہ تم مجھے معاف کر دو گے۔" یہ کہہ کر وہ لوگ وہاں سے چلے گئے۔

کئی گھنٹوں بعد مقامی پولیس کو ایک نامعلوم کال موصول ہوئی۔ ولی اس وقت غنودگی کے عالم میں تھا جب اس نے ڈیک پر لوگوں کے قدموں کی آواز سنی۔ جیسے ہی وہ آزاد ہوا اس نے پولیس کو پوری کہانی سنا دی۔ تاہم اس نے یہ بھی کہا کہ اسے کوریرا کے اسمگلر ہونے کے بارے میں علم نہیں تھا۔ کوسٹ گارڈ نے چوبیس گھنٹے تک کوریرا کو تلاش کیا لیکن وہ بہتا ہوا کہیں دور جا چکا تھا۔ پولیس نے میامی کے ہوٹل مینڈیرین اورینٹل سے معلومات لیں تو معلوم ہوا کہ کسی مسٹر چو نے اس نام سے کمرا بک نہیں کروایا تھا اور نہ ہی اس حلیے کا کوئی شخص وہاں آیا تھا۔ ولی اس سے ایک مرتبہ ہوٹل کے تالاب کے کنارے اور دوسری بار لابی میں ملا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسٹر چو اس ہوٹل میں کبھی نہیں ٹھہرا بلکہ اس نے محض ولی سے ملنے کے لیے اس ہوٹل کا انتخاب کیا تھا۔ ولی کو یہ بھی یقین ہو گیا کہ اس کا اصل نام چو نہیں تھا۔ وہ شخص حقیقت میں کون تھا، یہ ولی کبھی نہ جان سکا۔

دو ہفتے گزر جانے کے بعد ولی کو ایک لفافہ موصول ہوا جس پر بھیجنے والے کا نام اور پتا درج نہیں تھا۔ اس نے لفافہ کھول کر دیکھا۔ اس میں اخبار میں لپٹا ہوا ایک پیکٹ رکھا ہوا تھا۔ جب اس نے اخبار ہٹا کر دیکھا تو اس میں سے نوٹوں کی ایک گڈی برآمد ہوئی۔ یہ رقم اس ایڈوانس کے برابر تھی جو وہ چو سے پہلے روز وصول کر چکا تھا۔ اس رقم کے ساتھ کوئی خط نہیں تھا لیکن چینی اخبار میں لپٹے ہوئے نوٹوں کے بنڈل نے اسے وہ سب کچھ بتا دیا جو وہ جاننا چاہ رہا تھا۔ حالانکہ وہ چینی زبان نہیں پڑھ سکتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مسٹر چو کا فرضی نام اختیار کرنے والی شخصیت کو کس خانے میں فٹ کرے۔

نادیدہ قاتل
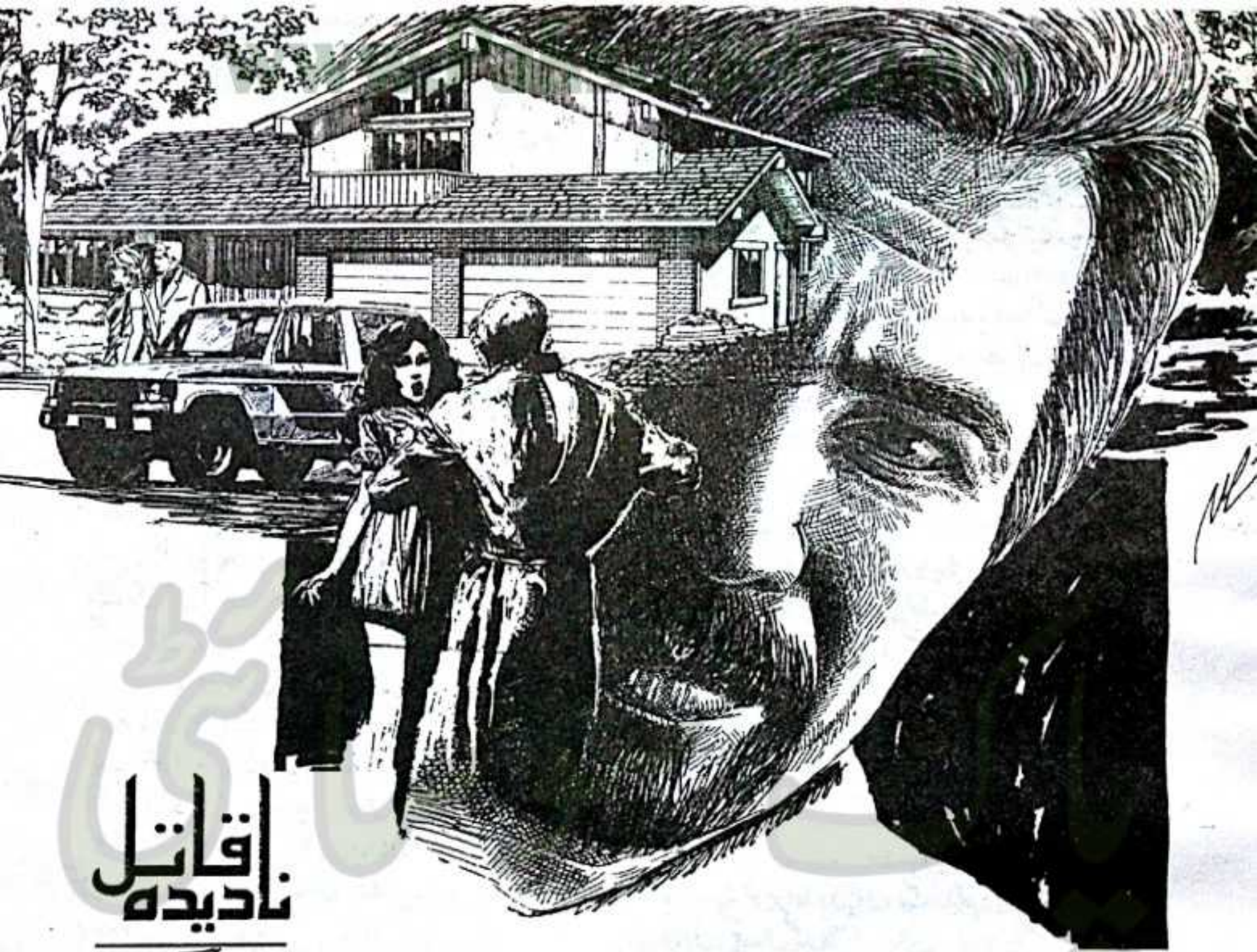
سلیم انور

میاں بیوی دراصل گاڑی کے دو پہیے ہیں... ایک خراب ہو جائے تو گاڑی کو ہر صورت روکنا پڑتا ہے... ورنہ یقینی حادثہ رونما ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا... ایک قصبے کے مہمان نواز اور خوش اطوار لوگوں کا حسنِ اخلاق... وہ ہر نئے آنے والے پڑوسی کو اپنے انداز میں خوش آمدید کہا کرتے تھے... مگر اچانک ہی ایک جوڑے کی آمد نے ان کے پُرسکون ماحول میں ہلچل بپا کردی...

آنکھوں سے اوجھل چہروں کے سامنے رہنے والے قاتل کی دیدہ دلیری...

اسے قتل کی اس واردات کے ارتکاب میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

اس نے سرجیکل دستانے ہاتھوں میں چڑھائے اور کورنیل ولکوکس کے مکان میں کچن کے عقبی دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ اس وقت رات کے سات بج کر بیس منٹ ہو رہے تھے اور ولکوکس فیملی نے سونے سے پیشتر تالے نہیں لگائے تھے۔

اسے علم تھا کہ اس وقت کورنیل اور اس کی فیملی ریکری

ایشن روم میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی ہوگی۔ کورنیل کئی روز قبل اسے بتا چکا تھا کہ وہ اس روز ٹی وی پر نشر ہونے والے میوزک شو ایوارڈ کی تقریب کو کبھی مس نہیں کرے گا۔ وہ کنٹری میوزک کا بے حد دلدادہ تھا۔

اس نے کاؤنٹر کے لکڑی کے بنے ہوئے ایک ہولڈر میں سے گوشت کاٹنے والا ایک تیز دھار چاقو اٹھالیا۔ یہ ہتھیار اس نے اس لیے منتخب کیا تھا کہ اس کے حوالے سے اس کا سراغ نہیں لگایا جاسکتا تھا کیونکہ یہ اسی گھر کے استعمال کی چیز تھی۔

پھر وہ اس چھوٹے سے کاؤنٹر کے پیچھے چلا گیا جو کچن کو ڈائننگ روم سے علیحدہ کر رہا تھا اور انتظار کرنے لگا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد کورنیل ایک اور بیئر کی بوتل لینے کچن میں آ گیا۔ اس نے کچن کی لائٹ جلانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

جب وہ بیئر کی بوتل کی کاگ کھول رہا تھا تو وہ شخص دبے پاؤں اس کے پیچھے آیا اور بجلی کی سی سرعت سے اپنا ایک ہاتھ کورنیل کے منہ پر رکھ کر دبا دیا تاکہ وہ شور نہ مچا سکے۔ ساتھ ہی تیز دھار چاقو کورنیل کے داہنے گردے میں گھونپ دیا۔ کورنیل کے حلق سے ایک کراہ بلند ہوئی اور منہ ہی منہ میں گھٹ کر رہ گئی۔ اس کے قدم بے جان سے ہوگئے اور وہ نیچے گرنے لگا۔

قاتل نے چاقو کھینچ کر دوبارہ اس پر وار کردیا۔ اس مرتبہ کورنیل کے حلق سے کوئی آواز بلند نہیں ہوئی۔ قاتل نے کورنیل کا بازو اٹھایا اور چاقو کے دستے سے کورنیل کی دستی گھڑی پر ضرب لگا کر اسے توڑ دیا۔ وہ پولیس کے لیے اس آسانی کی یقین دہانی چاہتا تھا کہ انہیں صحیح وقت کا پتا چل جائے کہ کورنیل پر حملہ کس وقت کیا گیا تھا۔ پھر اس نے چاقو پر لگا ہوا خون اپنی پتلون پر صاف کردیا اور چاقو وہیں چھوڑ دیا۔

وہ اس وقت تک کورنیل کے مکان سے نکل چکا تھا جب کورنیل کی بیوی جولیا کی چیخیں مکان میں گونجنے لگیں۔

وہ پتلی گلی کے راستے باہر آچکا تھا۔ تین مکانات کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے وہ خون آلودہ پتلون اتار دی جس سے اس نے چاقو پر لگا ہوا خون صاف کیا تھا۔ پتلون اتار کر اسے سکون محسوس ہوا تھا کیونکہ وہ حقیقت میں اس کے جسم پر تنگ تھی۔ اس نے وہ لباس وہیں چھپا دیا جہاں اس نے اپنے کپڑے ٹھونسے ہوئے تھے۔

جب وہ اپنے گیراج میں پہنچا تو اس نے اپنی قمیص، جوتے اور موزے بھی اتار دیے۔ پھر یہ چیزیں کوڑے کے پلاسٹک کے تھیلے میں ڈال دیں۔ ساتھ ہی سرجیکل دستانے بھی اتار کر اسی تھیلے میں رکھ دیے اور وہ تھیلا پڑوسی کے کوڑے کے تھیلے کے ساتھ رکھ دیا تاکہ صبح سویرے بلدیہ والے اسے اٹھا کر لے جائیں۔

وہ اپنے صحن میں عقبی دروازے سے داخل ہوا۔ اس نے وہ زنجیر اٹھالی جو اب بھی کتے کے گلے میں بندھی ہوئی تھی اور ٹہلتا ہوا اپنے گھر چلا گیا۔ چند ماہ قبل اگر اس کی بیوی گھر میں موجود ہوتی تو اس سے یہ سوال ضرور کرتی کہ کیا ان کا پالتو کتا رالف بھی اس واک سے لطف اندوز ہوا؟

لیکن ان میاں بیوی کے درمیان طلاق ہو چکی تھی اور اس کی بیوی نے ایری زونا چلے جانے کو ترجیح دی تھی اور وہ جانتا تھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا۔

اس لیے کہ تمام تر غلطی کورنیل ولکوکس کی تھی۔

☆☆☆

یہ کیس سراغ رساں جیک گرین اور مارک جونسن کے سپرد کیا گیا تھا۔ جب فارنسک کے لوگ اپنے کام میں مصروف تھے تو انہیں کورنیل ولکوکس کی بیوی سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔ ”سو جب یہ واقعہ پیش آیا تو اس وقت تم اپنے شوہر اور دو بچوں کے ساتھ ریکری ایشن روم میں ٹی وی دیکھ رہی تھیں؟“

”ہاں۔“

”تو پھر تم اپنے شوہر کو چیک کرنے کے لیے کچن میں کیوں گئی تھیں؟“

”اسے کچن سے واپس آنے میں خاصی دیر ہوگئی تھی تو مجھے تشویش ہوئی۔ اسی لیے میں ریکری ایشن روم سے اٹھ کر آ گئی تھی۔“ جولیا کورنیل نے ایک اور ٹشو اٹھایا اور ناک پونچھنے لگی۔

”آئی ایم سوری لیکن ہمیں یہ کارروائی اسی طرح کرنا ضروری ہوتا ہے مسز کورنیل۔ اس لیے کہ ہمیں تمام معلومات جتنی جلد از جلد حاصل ہوں گی ہم اس کیس کو اتنی ہی جلدی حل بھی کرسکتے ہیں۔“

”مجھے بھی امید ہے۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اب میں کیا کروں گی۔“ جولیا کورنیل نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

”تمہارے شوہر کے گزر اوقات کا ذریعہ کیا تھا؟“

”وہ فرگھم کریکسنل فیسی لٹی میں سیکیورٹی آفسر تھا۔“

''کیا اسے ان لوگوں میں سے کسی کے ساتھ کوئی مسئلہ درپیش تھا جن کے ساتھ وہ وہاں کام کرتا تھا؟''

''ایسا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا جس کے بارے میں اس نے کبھی کوئی بات کی ہو۔ کورنیل ہمیشہ اپنے کام سے متعلق باتوں کو وہیں چھوڑ کر گھر آتا تھا۔''

''کام کے علاوہ باہر کہیں کسی کے ساتھ کوئی مسئلہ درپیش تو نہیں تھا؟''

''نہیں، اس بارے میں بھی مجھے کوئی علم نہیں۔ البتہ چند ہفتوں قبل ایک عجیب سی بات ہوئی تھی۔''

''اوہ، کیا؟''

''... ہمارے محلے میں ایک نیا جوڑا رہنے کے لیے آیا تھا۔ ہمارے اس بلاک میں تمام لوگوں کا رویہ ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ ہے۔ جب کبھی بھی ہمارے اس بلاک میں نئے لوگ آتے ہیں جو کہ اکثر نہیں ہوتا، تو ہم سب اکٹھا ہوتے ہیں اور اس نو وارد جوڑے کے اعزاز میں پارٹی دیتے ہیں۔ اس طرح ہماری ان نئے لوگوں سے ملاقات بھی ہو جاتی ہے اور ہم انہیں خوش آمدید بھی کہتے ہیں۔ ہم اپنی اس تقریب کو 'اپنی دنیا کا چھوٹا سا گوشہ' کہتے ہیں۔''

''تو چند ہفتوں قبل کیا ہوا تھا؟''

''ایک نیا جوڑا محلے میں آیا تو ہم ان کی ویلکم پارٹی میں چلے گئے جو ویلر کے گھر پر منعقد ہوئی تھی۔ پتا یہ چلا کہ وہ شخص حال ہی میں جیل سے رہا ہوا تھا۔ وہ ان مکانات میں سے ایک میں قیام پذیر رہا تھا جن کا انچارج کورنیل تھا۔''

''مکانات؟''

''کورنیل ان قید خانوں کو مکانات ہی کہتا تھا۔''

''اس کے سبب تو بڑا مسئلہ رہا ہوگا؟''

''اس وقت تو نہیں ہوا لیکن اس کے بعد کیا ہوا ہوگا مجھے اس کا کوئی علم نہیں۔ کورنیل نے کہا تھا اس کا خیال ہے کہ اس کے مقابلے میں ایلکس اس بارے میں کچھ زیادہ ہی احساس کر رہا ہے۔''

''کیا تمہارے شوہر نے ان دونوں کے قید خانے کے تعلقات کے علاوہ کچھ اور بھی تمہیں بتایا تھا؟''

''نہیں۔ جیسا کہ میں نے کہا کورنیل اس قسم کی تمام باتیں اپنے کام پر ہی چھوڑ آتا تھا اور گھر میں کسی قسم کا کوئی تذکرہ نہیں کرتا تھا۔''

''اس نو وارد جوڑے کا نام کیا ہے؟''

''ایلکس ہیلی اور سارا ہیلی۔''

''اور وہ کہاں رہتے ہیں؟''

''جنوب کی سمت تین مکان بعد۔''

''او کے مسز کورنیل! تم نے ہمارے ساتھ بہت تعاون کیا۔ جیسے ہی ہمیں کچھ پتا چلا تو ہم تمہارے پاس آ جائیں گے۔''

سراغ رساں جیک گرین نے ایلکس ہیلی کے گھر کی تلاشی کا وارنٹ لینے کے لیے ایک پولیس افسر کو واپس پولیس اسٹیشن بھیج دیا۔

جب دونوں سراغ رساں تلاشی کا وارنٹ لے کر ایلکس کے گھر پہنچے تو وہ گھر پر موجود نہیں تھا۔ انہوں نے سارا ہیلی سے اپنا تعارف کراتے ہوئے اپنی آمد کا مقصد بیان کر دیا۔

''ہم تم سے چند سوالات پوچھنا چاہتے ہیں مسز ایلکس۔''

''اندر آ جائیں۔ ایلکس کسی بھی لمحے گھر پہنچنے والا ہو گا۔''

''وہ کہاں ہے؟''

''وہ ایک کام کی تلاش کے سلسلے میں گیا ہوا ہے۔''

''رات میں اس وقت؟''

''میں جانتی ہوں۔ ہم دونوں کو بھی تعجب ہوا تھا... لیکن آج سہ پہر اس کے پاس اس سلسلے میں ایک فون کال آئی تھی۔ وہ کام کی تلاش کے سلسلے میں اتنا فکر مند تھا کہ اس فون کال کو نظر انداز نہ کر سکا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ دونوں بھی جانتے ہوں گے کہ وہ جن حالات سے گزر کر آیا ہے تو اس کے بعد دوبارہ نئی زندگی کا آغاز کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔''

سارا ہیلی نے وضاحت سے بیان کرتے ہوئے کہا۔

''اسے کس قسم کے کام کی پیشکش ہوئی تھی؟''

''ٹرک چلانے کی۔ بتایا گیا تھا کہ ایک ہائی وے پروجیکٹ کے لیے سڑک بنانے کا اسفالٹ ٹرک میں لاد کر لے جانا ہوگا۔ یہ کام رات کی شفٹ کا تھا۔ لیکن اسے کچھ نہ کچھ کام درکار تھا، اس لیے وہ چلا گیا۔''

اتنے میں مکان کے عقبی دروازے کے کھلنے کی آواز آئی جو ان تینوں کو سنائی دی۔ ساتھ ہی آواز ابھری۔

''سارا، میں واپس آ گیا ہوں۔''

''لیونگ روم میں آ جاؤ۔'' سارا نے بلند آواز سے کہا۔

تعارف ہونے کے بعد سراغ رساں مارک جونسن نے ایلکس سے پوچھا۔ ''تمہارا انٹرویو کیسا رہا؟''

''انٹرویو نہیں ہو سکا۔ جنہوں نے انٹرویو لینا تھا وہ

آئے ہی نہیں۔‘‘ ایلکس نے جواب دیا۔

اس بات پر دونوں سراغ رسانوں نے فوراً ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ لیکن آپس میں کوئی بات نہیں کی۔

’’تمہیں اس کام کے بارے میں کس سے پتا چلا تھا؟‘‘

’’مجھے ایک دوست نے بتایا تھا۔ اس نے مجھے ایک فون نمبر دیا تھا کہ میں اس پر کال کرلوں۔ ویسے یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟‘‘ ایلکس نے جاننا چاہا۔

’’وہ دوست کون تھا؟‘‘

’’ایک پڑوسی ہے جس سے حال ہی میں ملاقات ہوئی تھی۔ پورا نام تو نہیں معلوم لیکن رچرڈ کے ساتھ کچھ بتایا تھا۔‘‘

’’تمہاری ابھی اس محلے میں آمد ہوئی ہے اور وہ اتنا مہربان ہوگیا کہ تمہاری مدد تک کرنے پر آگیا۔ ایسا ہی ہے نا؟‘‘

’’بعض لوگ ہر کسی کی مدد کرنے کو تیار بیٹھے ہوتے ہیں اور میں نے تو اپنی سزا مکمل کرلی تھی۔‘‘ ایلکس نے جواب دیا۔

’’تم مکان سے کس وقت وہاں کے لیے نکلے تھے؟‘‘

’’میں تقریباً پونے سات بجے نکلا تھا لیکن یہ ہو کیا رہا ہے؟‘‘

’’آج شب اس محلے میں ایک پرابلم پیش آگئی ہے۔‘‘ سراغ رساں جیک گرین نے کہا۔

یہ سن کر ایلکس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ ’’چونکہ میں ایک سزا یافتہ ہوں تو تم لوگ سب سے پہلے جس شخص کے پیچھے آئے ہو، وہ میں ہی ہوں؟‘‘

’’پرابلم کورنیل ولکوکس سے متعلق ہے۔‘‘

ایلکس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس نے اپنا سر ایک طرف لڑھکا دیا اور بولا۔ ’’کیا پرابلم ہے؟‘‘

’’اسے قتل کردیا گیا ہے۔‘‘

یہ سنتے ہی ایلکس نے اپنا گھونسا کرسی کے ہتھے پر مار دیا اور بولا۔ ’’چونکہ میں جیل میں ایک وقت تک اس کے کنٹرول میں رہا تھا تو تمہارا خیال ہے کہ اسے میں نے قتل کیا ہے؟‘‘

’’نرالی اور عجیب باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ میں تمہیں یہ لازمی بتادوں کہ ہم تمہارے دعوے کے مطابق کی گئی فون کالز کے لیے تمہارے فون کے ریکارڈ کو چیک کریں گے۔‘‘

ایلکس نے بے ساختہ اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور بولا۔ ’’یہ ممکن نہیں ہوگا۔‘‘

’’کیوں؟‘‘

’’میں اپنی زندگی نئے سرے سے شروع کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔ لیکن لوگ مدد کے لیے زیادہ رضامند نہیں ہیں۔ اس وقت ہمارے پاس ایک سیل فون ہے جو میں نے پری پیڈ خریدا ہے۔ کوئی بھی فی الوقت ہمیں کریڈٹ پر کچھ دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔‘‘

’’تو پھر میں سیدھی بات کرتا ہوں۔‘‘ سراغ رساں جیک گرین نے کہا۔ ’’تمہیں ایک فون کال موصول ہوئی جسے ہم ٹریس نہیں کرسکتے اور تم یہ بھی ثابت نہیں کرسکتے کہ آج رات تم کہاں تھے کیونکہ جس شخص سے تمہیں ملنا تھا وہ ملاقات کے لیے نہیں آیا۔ یہاں تک تو میں نے صحیح کہا نا؟‘‘

ایلکس کا سر لٹک گیا۔ ’’ہاں، صحیح کہا۔‘‘ اس نے جواب دیا۔

اتنے میں داخلی دروازے پر دستک ہوئی۔ باوردی پولیس افسران اور فارنسک کے لوگ مکان کی تلاشی لینے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ فارنسک کے لوگوں میں سے ایک نے سراغ رساں جیک گرین کو ایک تھیلا تھماتے ہوئے کہا۔ ’’یہ ہمیں مکان کے عقب میں سے ملا ہے۔ اسے کوڑے دانوں کے درمیان خالی جگہ میں ٹھونس کر چھپایا گیا تھا۔‘‘

سراغ رساں جیک گرین نے تھیلے میں سے کچھ باہر نکالا تو وہ نیلے رنگ کی ایک جینز تھی۔ ’’اس پر تو خون لگا ہوا ہے۔‘‘ جیک گرین نے کہا۔

’’ہاں۔‘‘

سراغ رساں جیک گرین نے ایلکس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ’’یہ تمہاری جینز ہے؟‘‘

ایلکس کے جواب دینے سے پہلے اس کی بیوی بول پڑی۔ ’’میرے خیال میں یہ اسی کی جینز ہے۔ ایک ہفتہ قبل یہ جینز ہماری الگنی سے چوری ہوگئی تھی۔‘‘

’’الگنی؟‘‘

سارا ایلکس سر ہلانے لگی۔ ’’ہم ابھی تک نئی ڈرائر مشین خریدنے کے متحمل نہیں ہوسکے ہیں۔ پرانی مشین ناکارہ ہوچکی ہے۔ اس لیے میں کپڑے باہر رسی پر خشک کرنے کے لیے ڈالتی ہوں۔‘‘

’’یہاں تو ڈھیروں اتفاقات سامنے آرہے ہیں۔ ہے ناں؟‘‘ سراغ رساں مارک جونسن نے کہا۔

’’میرا خیال ہے بہتر ہوگا کہ تم ہمارے ساتھ پولیس

اسٹیشن چلے چلو، ایلکس۔‘‘ سراغ رساں جیک گرین نے کہا۔

ایلکس کو دو باوردی پولیس افسران کے ہمراہ پولیس اسٹیشن لے جایا گیا۔

ایلکس کے گھر کی تلاشی لینے کے بعد کوئی نیا کلیو سامنے نہیں آیا۔ سراغ رساں جیک گرین اور اس کا ساتھی مارک جونسن باری باری پڑوس کے ہر گھر میں جاتے رہے تاکہ یہ معلوم کر سکیں کہ ایلکس کے پڑوسی انہیں کیا معلومات فراہم کر سکتے ہیں۔

جو واحد نئی بات انہیں پتا چل سکی وہ یہ تھی کہ چند پڑوسیوں نے یہ سنا تھا کہ کورنیل ولکوکس یہاں پر رہنے والی ایک عورت ایلس بیری سے افیئر چلا رہا تھا۔ انہیں یہ بھی پتا چلا کہ ایلس بیری نے اپنے شوہر کو طلاق دے دی تھی اور کہیں چلی گئی تھی۔

مزید انہیں یہ بھی پتا چلا کہ سارا ایلکس اپنے کپڑے سکھانے کے لیے باہر رسی پر لٹکایا کرتی ہے۔ بعض پڑوسی سارا کی اس حرکت پر برافروختہ بھی تھے۔

دونوں سراغ رساں مزید سوالات کرنے کے لیے جولیا ولکوکس کے پاس واپس پہنچ گئے۔

’’سوری مسز ولکوکس کہ ہمیں تم سے اس قسم کے سوالات کرنے پڑ رہے ہیں، لیکن ہمیں کچھ جوابات درکار ہیں۔ کیا تمہارے اور تمہارے شوہر کے درمیان ازدواجی مسائل تھے؟‘‘

’’کس قسم کے مسائل؟‘‘ جولیا نے سوال کیا۔

’’کسی بھی قسم کے؟‘‘

’’تمہارا خیال ہے کورنیل کو میں نے قتل کیا ہے؟‘‘ جولیا نے تلخ لہجے میں کہا۔

’’نہیں نہیں، ہم یہ نہیں سوچ رہے۔ ہم تو صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تم دونوں کے آپس میں تعلقات کیسے تھے؟‘‘ سراغ رساں جیک گرین نے وضاحت کی۔

جولیا ولکوکس تن کر بیٹھ گئی اور اپنے رخساروں کو پف کرتے ہوئے بولی۔ ’’نہایت عمدہ تھے۔‘‘

’’کیا کورنیل کا کوئی افیئر بھی تھا؟‘‘

’’یہ تو بڑا غلط سوال ہے۔‘‘

’’مجھے اس کا فوری جواب چاہیے مسز ولکوکس۔‘‘ سراغ رساں جیک گرین نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

جولیا نے سر نیچے جھکا لیا اور بولی۔ ’’میں ایسا بھی کچھ ثابت نہیں کر سکی۔‘‘

''لیکن تمہارا خیال تھا کہ وہ افیئر چلا رہا تھا؟''
''میں نے کچھ لوگوں کو یہ باتیں کرتے سنا تھا۔''
''کیا وہ ایلس بیری کے بارے میں باتیں کرتے تھے؟''
جولیا ولکوکس نے رونا شروع کر دیا۔ ''ہاں، پلیز اب آپ لوگ چلے جائیں۔''
جیک گرین اور مارک جونسن پولیس اسٹیشن واپس آگئے۔ وہ نیلی جینز کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے سیدھے فارنسک لیب میں چلے گئے۔
''جینز کا سائز ان دیگر ملبوسات سے مطابقت رکھتا ہے جو ہمیں ایلکس کے گھر سے ملے تھے۔ جینز پر لگا ہوا خون کورنیل ولکوکس کے خون سے مطابقت رکھتا ہے۔ جینز کے اندر بھی خون کے دھبے پائے گئے ہیں۔ اس شخص کے جوتوں پر بھی خون لگا ہوا تھا اور جب اس نے پتلون اتاری تو یہ دھبے اس کے جوتوں پر سے پتلون کے اندرونی حصے پر بھی آگئے۔'' انہیں بتایا گیا۔
جیک گرین اور مارک جونسن اپنی میزوں پر واپس آگئے۔
''ویل پارٹنر۔'' جیک گرین نے کہا۔ ''تم اب کیا کہتے ہو؟''
''ایلکس کے پاس ممکنہ جواز بھی تھا اور موقع بھی۔ اس بارے میں تو کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اور اس کا جائے واردات سے عدم موجودگی کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ آلۂ قتل کیا تھا لیکن حقیقت میں اسے کسی کے ساتھ منسلک نہیں کر سکتے۔'' مارک جونسن نے اپنا خیال ظاہر کرنے کے بعد کہا۔ ''تمہاری کیا رائے ہے؟''
''میں تمہارے ساتھ اتفاق کرتا ہوں۔ مجھے جو ایک بات کھٹک رہی ہے وہ اس نیلی جینز سے متعلق ہے۔ فارنسک والوں نے بتایا ہے کہ جینز میں اندر کی جانب پیر کے حصے میں خون کے دھبے تھے۔ جب اس نے جینز اتاری تو اس کے جوتوں پر لگا ہوا خون جینز کے اندرونی حصے میں لگ گیا۔ اس کا مطلب ہے کہ یقیناً خون اس کے موزوں اور قمیص پر بھی لگا ہوگا۔ تو پھر اس نے صرف پتلون ہی کیوں چھپائی؟ اس کا بقیہ لباس کیا ہوا جو اس نے پہنا ہوا تھا؟ فارنسک والوں کو اس کے گھر میں کسی بھی جگہ خون کے نشانات نہیں ملے۔''
وہ دونوں کچھ دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ پھر جیک بولا...... ''ایک اور چیز۔ یہ شخص لگ بھگ چار سال تک جیل میں رہا ہے۔ وہاں اس نے بہت کچھ سیکھا ہوگا۔ میرے خیال میں تو اسے جائے واردات سے عدم موجودگی کا کہیں زیادہ بہتر جواز پیش کرنا چاہیے تھا۔ یقیناً اسے معلوم ہوگا کہ ہم اس کی کہانی پر کبھی بھی یقین نہیں کریں گے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا پین میز پر رکھ دیا۔
''اب نیند آرہی ہے۔ فی الوقت یہیں تک اکتفا کرتے ہیں۔ ویسے بھی رات بہت ہو چکی ہے۔ اب مزید کچھ نہیں کیا جا سکتا۔'' مارک جونسن نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔
اگلے روز صبح جیک گرین اور مارک جونسن سیدھے ایلس بیری کے شوہر رچرڈ بیری کے گھر پہنچ گئے۔
''ہمیں تم سے کچھ سوالات پوچھنے کی ضرورت پیش آگئی ہے مسٹر رچرڈ۔'' جیک نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ ان میں چند سوالات تمہیں گراں گزریں گے لیکن ہمارے لیے ان کے جوابات جاننا ضروری ہیں۔''
''ویل، پوچھو۔ میں تمہاری مدد کے لیے ہر ممکن کوشش کروں گا۔ جس کسی نے بھی کورنیل کو قتل کیا ہے اس کو پکڑنا ضروری ہے۔''
''خوشی ہوئی کہ تم بھی یہ احساس رکھتے ہو۔ ہمیں یہ باور کرایا گیا ہے کہ کورنیل کا تمہاری بیوی کے ساتھ افیئر چل رہا تھا۔ کیا یہ درست ہے؟'' جیک نے پوچھا۔
رچرڈ فرش کو دیکھنے لگا۔ جواب دینے سے قبل وہ چند سیکنڈ تک انتظار کرتا رہا۔ ''میرا خیال ہے کچھ ایسا ہی تھا۔''
''کیا تمہاری بیوی کے چلے جانے کا سبب یہی تھا؟''
''اس کے سبب ہمارے درمیان اکثر جھگڑے رہے؟ تمہاری بات کا یہی مقصد ہے نا؟ ہاں، میرا خیال ہے کہ اسی کے سبب اس نے طلاق کا کیس دائر کیا تھا۔''
''وہ اپنی مرضی سے یہاں سے گئی تھی؟''
''کیا مطلب؟''
''وہ خود سے گئی تھی یا تم نے اسے گھر سے نکالا تھا؟''
''دونوں ہی باتیں کہہ سکتے ہیں۔''
''کورنیل کے بارے میں تمہارے احساسات کیا تھے؟''
رچرڈ کے حلق سے ایک غراہٹ سی بلند ہوئی۔ ''اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ مجھے اس سے رغبت رہی ہوگی تو یقیناً ایسا ہرگز نہیں تھا۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک بار پھر فرش پر نظریں جما دیں۔ ''میرے خیال میں اس معاملے میں میری غلطی بھی اتنی ہی تھی جتنی کہ ایلس کی تھی۔ تمہیں تو معلوم ہے طلاق دو

افراد کے درمیان ہی ہوتی ہے۔“

”تو پھر گزشتہ شب سات اور ساڑھے سات بجے کے درمیان تم کہاں تھے؟“

”یہیں پر تھا۔ ہوں.... میں سوچ کر بتاتا ہوں۔ ہاں یاد آگیا، میں اس وقت اپنے کتے کو ٹہلا رہا تھا۔“

”کسی نے تمہیں دیکھا تھا؟“

”میرے خیال میں نہیں ــ۔ ایک منٹ ٹھہر جاؤ۔ میں نے ایڈ برسکر کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا تھا۔ وہ ہر رات کی طرح اس وقت بھی اپنے پورچ پر بیٹھا ہوا تھا۔“ رچرڈ نے بتایا۔

”وہ کہاں رہتا ہے؟“

”اگلے بلاک میں۔“

ایڈ برسکر نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ اس نے گزشتہ شب رچرڈ کو تقریباً سوا سات بجے اپنے کتے کو ٹہلاتے ہوئے دیکھا تھا۔ البتہ ایڈ برسکر کی بیوی نے ان سے کہا کہ ہوسکتا ہے یہ بات گزشتہ شب کی نہ ہو۔ اس لیے کہ ایڈ برسکر کی یادداشت صحیح کام نہیں کرتی۔ یہ بات اس سے پہلے کی شب کی بھی ہوسکتی ہے۔

”کیا رچرڈ ڈیبری ہمیشہ رک کر ایڈ سے باتیں کیا کرتا ہے؟“ سراغ رساں نے ایڈ برسکر کی بیوی سے پوچھا۔

”بالکل ایسا ہی ہے۔ وہ تو موقع کی تلاش میں رہتا ہے۔ ایڈ کو یہ اچھا لگتا ہے اور مجھے بھی یہ پسند ہے۔ اس طرح ایڈ کو کچھ نہ کچھ کرنے کو مل جاتا ہے اور جب رچرڈ اس کے پاس ہوتا ہے تو مجھے ایڈ کی طرف سے کسی قسم کی فکر نہیں ہوتی۔“

جب دونوں سراغ رساں واپس اپنی کار تک پہنچے تو جیک گرین پہلے گویا ہوا۔ ”ویل!“

”اگر رچرڈ اکثر ایڈ برسکر سے باتیں کیا کرتا ہے تو یقیناً اس بات سے بھی باخبر ہوگا کہ ایڈ کو یادداشت کا پرابلم ہے۔“

”ہاں لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہی واحد فرد تھا جس سے اس کی ملاقات ہوئی تھی اور جو اس کی بات کی تصدیق کر سکتا ہے۔“ جیک گرین نے کہا۔

”ہوسکتا ہے۔ لیکن میں ابھی اس طرف سے مایوس نہیں ہوا ہوں۔“

”تمہارے خیال میں کیا ہمیں رچرڈ کو مشتبہ افراد کی فہرست میں شامل کر لینا چاہیے؟“ جیک گرین نے پوچھا۔

”میرا بھی یہی خیال ہے۔ اگر یہ واردات ایلکس ہیلی نے کی ہے تو اس سے بہت سی احمقانہ غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اس سے کہیں زیادہ چالاک اور اسمارٹ ہے۔“

”میرے خیال میں ہمیں رچرڈ ڈیبری کے گھر کی تلاشی کے لیے وارنٹ نکلوانا ہوگا۔“

”میں تائید کرتا ہوں۔“

☆☆☆

رچرڈ ڈیبری کے گھر کی تلاشی کے دوران کوئی ٹھوس ثبوت سامنے نہیں آیا۔ جیک گرین کو ایک ویزا کارڈ کا بل ہاتھ لگ گیا۔ اس بل کے چارجز میں سے ایک اس کی دلچسپی کا باعث تھا۔ یہ چارجز بلز ہاؤس آف الیکٹرانکس کے حوالے سے تھے۔ جب انہوں نے اس اسٹور کو فون کیا تو یہ دریافت ہوا کہ جو آئٹم وہاں سے خریدا گیا تھا وہ ایک پری پیڈ سیل فون تھا۔

لیکن یہ سیل فون انہیں رچرڈ کے گھر میں نہیں ملا۔

”اگر اس نے یہ فون اس کام کے لیے استعمال کیا ہوگا جو ہمارے خیال کے مطابق اس نے استعمال کیا ہے تو میں بھی اس کی جگہ ہوتا تو اسے اپنے پاس کبھی نہ رکھتا۔“ جیک گرین نے کہا۔

”دیکھتے ہیں کہ ایلکس ہیلی اس معاملے میں ہماری کیا مدد کرسکتا ہے۔ شاید وہ ہمارے لیے اس پورے معاملے کی اصلی حقیقت کھلوانے میں کامیاب ہوجائے۔“

پھر اسی رات ایلکس ہیلی، رچرڈ ڈیبری کے گھر پہنچ گیا۔ جیک گرین اور مارک جونسن نے اسے رچرڈ کی شیخی خوری کے حوالے سے ہدایات دی تھیں کہ جب وہ اس کی تعریفیں کرنا شروع کرے گا تو رچرڈ خود ہی کھلتا چلا جائے گا۔ انہوں نے ایلکس کی قمیص کے کالر کے اندر جدید ترین سسٹم کا مائیک چھپا دیا تھا جو اس کے اطراف میں ہونے والی تمام گفتگو کو باہر موجود پولیس کے ٹیپ ریکارڈر میں ریکارڈ کرسکتا تھا۔

”تم .... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ رچرڈ اسے دیکھ کر بوکھلا سا گیا۔

”مجھے تم سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔“ ایلکس نے کہا۔

”میں تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔“

”اوہ .... لیکن میرے خیال سے تم بات کرنا چاہتے ہو۔“

”تم یہاں سے چلے جاؤ۔ ورنہ میں پولیس کو بلالوں گا۔“ رچرڈ نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

''پولیس کو بلالو، رچرڈ۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہاری باتیں سن کر واقعی خوش ہوں گے اور یہ بھی یقین ہے کہ انہیں اس بات سے بھی گہری دلچسپی ہوگی کہ تم نے مجھے کس طرح سے پھنسایا ہے۔''

''تمہیں پھنسایا ہے؟ میں نہیں جانتا کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' رچرڈ نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

''جالی کا دروازہ کھول دو اور مجھے اندر آنے دو۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''ویل، تو پھر ٹھیک ہے۔ میں یہیں رک کر تم سے بات کرتا ہوں۔ اگر تم نے دروازہ بند کر دیا تو میں چیخ چیخ کر اس طرح بولنا شروع کروں گا کہ تمہارے تمام پڑوسی سب کچھ سن لیں۔''

یہ سن کر رچرڈ نے جالی دار دروازہ کھول دیا۔ ''مر جاؤ! اندر آجاؤ۔''

ایلکس اندر داخل ہو گیا۔ رچرڈ چند سیکنڈ تک اسے گھورتا رہا پھر بولا۔ ''اپنی قمیص اتار دو۔''

''کیا؟''

''اپنی قمیص اتار دو۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم نے کوئی ٹرانسمیٹر مائیک تو نہیں پہنا ہوا۔''

ایلکس نے قمیص اتار دی۔ رچرڈ نے اطمینان کر لیا کہ ایلکس نے کسی قسم کا مائیک نہیں پہنا ہوا۔

''تم نے نہایت چالاکی سے یہ سب کام کیا ہے۔ جب میں جیل میں تھا تو میں نے ایسی بہت سی داستانیں سنی تھیں لیکن یہ ان سب میں سب سے بہترین رہی۔'' ایلکس نے ستائشی لہجے میں کہا۔ ''یہ نہایت خوبی، ذہانت اور ہوشیاری سے اختراع کی گئی تھی۔''

یہ سن کر رچرڈ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اور وہ فخر سے اکڑ سا گیا۔ ''میرا بھی خیال تھا کہ یہ واقعی زبردست کام ہوا ہے۔ لیکن تم نے اندازہ کیوں کر لگا لیا؟''

''اس کام کے حوالے سے جس کام کے لیے تم نے مجھے بھیجا تھا لیکن جب میں وہاں پہنچا تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ تم نے بندہ مار دیا اور میرے پاس جائے واردات سے عدم موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں تھا اور حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے اولڈ کورنیل کے چلے جانے کا اتنا افسوس بھی نہیں ہے۔ میرا واسطہ جیل میں جن گارڈز سے پڑا تھا، وہ ان تمام میں اتنا اچھا ہرگز نہیں تھا۔'' ایلکس نے کہا۔

''اوہ واقعی؟''

''ہاں، شاید تم نے مجھ پر ایک طریقے سے احسان کیا ہے۔ انہوں نے مجھے رہا کر دیا کیونکہ ان کے پاس میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا۔ میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کے پاس تمہارے خلاف بھی کوئی ثبوت نہیں ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

''تمہیں اس چالاکی کے ساتھ اس کی منصوبہ بندی کرنے میں کئی مہینے لگ گئے ہوں گے۔'' ایلکس نے کہا۔

''اوہ نہیں۔ صرف چند دن لگے۔ جب تم اس پڑوس میں آکر بسے تب مجھے اس کا دھیان آیا۔ میں نے سوچا کہ میرے پاس بس یہی موقع ہے۔'' رچرڈ نے متکبرانہ لہجے میں کہا۔

ایلکس لیونگ روم کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''سو میری نیلی جینز حقیقت میں تم ہی نے چوری کی تھی اور پھر چھپا کر مجھے ملوث کرنے کے لیے استعمال کی۔ ایسا ہی ہوا تھا نا؟''

''یقیناً۔''

''اور تمہیں یہ بات معلوم تھی کہ وہ میرے پیچھے آئیں گے کیونکہ میں حال ہی میں جیل سے رہا ہوا تھا؟''

''خاص طور پر اس وجہ سے کہ کورنیل اس جیل میں گارڈ تھا۔ یقیناً وہ اسی کا مستحق تھا جو اس کے ساتھ ہوا۔ یہ وہی تھا جو میری بیوی کے ساتھ گل چھرے اڑا رہا تھا۔''

''میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ اسے قتل کرتے ہوئے تم واقعی لطف اندوز ہوئے ہوگے؟'' ایلکس نے کہا۔

''میں چاہتا ہوں کہ اسے دوبارہ زندگی مل جائے تاکہ میں ایک بار پھر اس کے ساتھ یہی سلوک کر سکوں۔'' رچرڈ نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

عین اسی لمحے مکان کے داخلی اور عقبی دروازے دھڑام سے کھل گئے۔ سراغ رساں جیک گرین اور ایک باوردی پولیس افسر اپنے اپنے ریوالور تانے دندناتے ہوئے داخلی دروازے سے اندر آ گئے جبکہ سراغ رساں مارک جونسن بھی ایک باوردی پولیس افسر کے ہمراہ عقبی دروازے سے گھس آیا۔ وہ دونوں بھی مسلح تھے۔

تب ایلکس کے ہونٹوں پر ایک اطمینان بخش مسکراہٹ ابھر آئی جبکہ رچرڈ کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

اس نے ہار مانتے ہوئے بے بسی سے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیے اور ایک پولیس افسر نے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دیں۔

اعتراف

بشریٰ امجد

ستم گر... ستم پیشہ... پاگل یا دیوانہ... وہ ذہنی مریض تو تھا... مگر خطرناک ذہنی مریض... جس نے جرم کی خونی شاہراہ پر قدم رکھ دیا تھا... تاہم اس کا دماغ خوب کام کرتا تھا... اچانک اس نے ایک ایسا فیصلہ کر ڈالا... جو اس کی رسّی کو اور دراز کر سکتا تھا...

اعتراف جرم کرنے والے شخص کا ماجرائے حیرت...

اس سے پہلے کے حلق سے چیخ برآمد ہوتی، اس نے اپنے شکار کو دیوار سے لگاتے ہوئے مضبوطی سے منہ پر ہاتھ جما دیا۔ برآمد ہونے والی چیخ حلق میں گھٹ کے رہ گئی۔ فوراً ہی اس نے بے رحمی سے پیٹ میں گھٹنے کی ضرب لگائی۔ وہ دہری ہو کر فرش پر لوٹ پوٹ ہو گئی۔

وہ دانت نکالے دلچسپی سے اسے گھور رہا تھا۔ منہ کھلا ہوا تھا، عالمِ اذیت میں وہ سانس لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ بالکل ماہیِ بے آب کے مانند۔

قاتل نے نیلے رنگ کی سروس کیپ اتار دی۔ اس سے اپنی پیشانی خشک کی۔ ”دلچسپ...... بہت خوب......“ وہ بڑبڑایا۔ کرسی پر رکھا اپنا چرمی ٹول بیگ اٹھا کر کھولا۔

”تمہارے لیے۔“ وہ شکار کے سر پر کھڑا ہو کے مسکرایا۔ ”صرف تمہارے لیے۔“ اس نے بیگ میں سے لمبے پھل والا ایک شکاری چاقو منتخب کر کے خاتون کی آنکھوں کے سامنے نچایا۔

وہ کھلے منہ کے ساتھ چھوٹے چھوٹے سانس لے رہی تھی۔ آنکھیں دہشت سے اُبل پڑی تھیں۔

”تم خوب صورت نہیں ہو۔ بہتر ہو... لیکن خوب صورت نہیں۔“ قاتل نے سرگوشی کی۔ ”خوب صورت خواتین کو مرنا نہیں چاہیے۔ کبھی کبھی وہ بھی ماری جاتی ہیں لیکن خوب صورتی کو مرتے دیکھنا افسوسناک ہے اور تم...... تم تو خوب صورت بھی نہیں ہو ورنہ میں معذرت کر کے دوسرے اپارٹمنٹ کا رخ کرتا۔“ وہ گھٹنوں کے بَل بیٹھ گیا۔

”گھبراؤ مت، میں اپنا کام بہت نرمی اور تیزی سے کرتا ہوں۔ تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا۔“ اس نے گردن کی پشت سے بالوں کو مٹھی میں جکڑا۔ دائیں ہاتھ میں موجود شکاری چاقو ماہرانہ انداز میں سرعت کے ساتھ حرکت میں آیا۔ بائیں سے دائیں...... وہ مسکرا رہا تھا۔

☆☆☆

”کوئی پرائن نامی آدمی ہے سر، کہتا ہے کہ سلون کیس کے سلسلے میں ملنا چاہتا ہے۔“

”اندر بھیج دو۔“ نارمن بینڈکس نے کہا اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر تھکے ہوئے انداز میں کرسی کے ساتھ پشت لگا دی۔

’لعنت ہے، ایک اور دیوانہ۔‘ بینڈکس نے سوچا۔ میرا چار سال کا بیٹا، ان پاگلوں سے بہتر کہانیاں سنا سکتا ہے۔

بینڈکس کو اپنے شعبے میں پندرہ سال ہو چکے تھے۔ اس دوران میں بارہا اسے جھوٹے اعترافات اور کہانیاں سننے کو ملی تھیں۔ خاص طور پر ان مقتولین کے بارے میں جہاں قاتل نے کوئی اشارہ نہ چھوڑا ہو۔ ایسے کیسز کے بارے میں اخبار پڑھ کر سر پھرے چلے آتے تھے۔

ماریا سلون کیس میں تو حد ہو گئی تھی۔ پہلے ہی پانچ افراد قاتل بن کر آ چکے تھے۔ بینڈکس کو کہانی سن کر تصدیق کرنی پڑتی تھی۔ ہر بار حسبِ توقع، قاتل کا روپ دھارنے والے جھوٹے ثابت ہوتے۔ وہ ان ڈراموں سے اکتا گیا تھا تاہم اسے ڈیوٹی کے مطابق کام کرنا تھا۔ اب یہ پرائن نامی کوئی صاحب تشریف لے آئے تھے۔

بینڈکس کو یقین تھا کہ موصوف بھی کوئی کہانی سنائیں گے یا اعتراف کریں گے کہ پُراسرار قاتل میں ہی ہوں۔ اس کے تجربے کے مطابق جنونی قاتل خود کو پولیس کے حوالے نہیں کرتے، ان کو قابو کرنے کے لیے تگ و دو کرنی پڑتی ہے۔ جھوٹی کہانیاں لے کر آنے والے ”کھسکے“ ہوئے افراد یا نخطی حضرات ہوتے ہیں جن کی اپنی ناقابلِ فہم تصوراتی دنیا ہوتی ہے۔

بینڈکس کو حیرت اس بات پر تھی کہ ماریا سلون کیس میں ایک کے بعد ایک چلا آ رہا تھا۔ ستائیس سالہ ماریا سلون دن دہاڑے اپنے اپارٹمنٹ میں مردہ پائی گئی تھی۔ گلا تیز دھار چھری سے کاٹا گیا تھا۔ نہ کوئی مقصد، نہ کوئی کلیو...... شوہر کام پر گیا ہوا تھا۔ کسی نے کچھ نہیں دیکھا۔ جائے واردات سے کوئی اشارہ نہیں ملا۔ مختلف لوگوں کے انٹرویو سے بھی کوئی بات سامنے نہ آئی۔ اب تک کی کارروائی اور تفتیش کا حاصل ”صفر“ تھا۔ لاش پر گلے سے نیچے قاتل نے اکیس کٹ لگائے تھے۔ پیٹ میں قاتل نے چھری چلانے سے پہلے شدید ضرب لگائی تھی۔ غالباً لات چلائی تھی یا پھر گھٹنا آزمایا تھا۔

اخبارات کے اولین صفحے پر بھیانک قتل کی لرزہ خیز جزئیات شائع ہوئی تھیں۔ میڈیا نے اپنا روایتی انداز اپنایا تھا۔ حقیقی چند ایک نکات کا علم بینڈکس کو ہی تھا یا اس کی ٹیم کے گنے چنے افراد کو...... یا پھر اصلی قاتل ہی جانتا تھا۔

بینڈکس نے سگریٹ سلگائی اور دروازے کی طرف متوجہ ہوا۔

”وہ آ گیا ہے سر۔“

”آنے دو۔“ بینڈکس سیدھا ہو گیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر میز کی سطح پر رکھ دیے۔

ایک ہونق سا پستہ قد اور گنجا آدمی آفس میں داخل ہوا۔ وہ کچھ بدحواس بھی تھا اور مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سرمئی رنگ کا فیلٹ ہیٹ تھا۔ آنکھوں پر موٹے فریم کا چشمہ تھا۔ وہ قدرے تیزی سے پلکیں جھپکا رہا تھا۔

بینڈکس نے اندازہ لگایا کہ اس کی عمر تیس کے لگ بھگ تھی۔ بینڈکس کو خاصی مایوسی ہوئی۔ وہ ایک اور فضول کہانی سننے کے لیے تیار ہو گیا۔

”آیئے، مسٹر پرائن۔“ بینڈکس نے اشارہ کیا۔

”کیا میں یقین کروں کہ قتل کرنے کے بعد میں صحیح آدمی کے پاس آ گیا ہوں۔“ پستہ قد گنجے پرائن نے براہِ راست کہا۔ تاہم وہ کچھ نروس تھا۔

"ہاں، تم ٹھیک آدمی کے پاس پہنچے ہو۔ بیٹھ جاؤ۔"

"میں امید کرتا ہوں کہ ایسا ہی ہے۔ اپنی بات دہرانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔" وہ بیٹھ گیا۔ "مجھے اس بات سے نفرت ہے کہ میں کوئی بات بار بار کہوں۔"

بینڈکس خاموش رہا۔

"میرا پورا نام ایمری ٹی پرائن ہے۔" وہ پلکیں جھپکا کر پھر گویا ہوا۔ "شناسا اکثر میرا نام ٹھیک طرح نہیں لیتے۔"

"مسٹر پرائن آگے بڑھو۔ مدعا بیان کرو۔" بینڈکس نے تحمل سے کام لیا۔

"سلون کیس جناب کے پاس ہے؟"

"ہاں، یقین کرو۔ تم صحیح آدمی سے ملاقات کر رہے ہو۔ برائے مہربانی اصل بات شروع کرو۔" بینڈکس نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا اور گنجے پرائن کو سگریٹ پیش کی۔

"اوہ نو، شکریہ۔ میں تمبا کو نوشی نہیں کرتا۔"

"اور قتل بھی نہیں کرتا۔" بینڈکس نے دل ہی دل میں کہا۔ "اخبار پڑھ کر چلا آیا ہوں۔"

پرائن، نشست پر کسمسایا۔ "کیا یہ درست ہے کہ پولیس اب تک بالکل اندھیرے میں ہے؟"

"ایسا ہی ہے، مسٹر پرائن، میڈیا میں یہ اطلاع موجود ہے۔" بینڈکس نے کش لیا۔

"مجھے تجسس تھا۔ یہ قدرتی امر ہے۔ میں خوش ہوں کہ میں نے مہارت اور صفائی سے یہ کام کیا تھا۔" پرائن نے ناک پر چشمہ درست کیا۔ "خیر...... میں جناب کو یقین دلاتا ہوں کہ میں ہی وہ آدمی ہوں جس نے یہ کارنامہ سرانجام دیا۔ میرا مطلب ہے، یہ قتل میرے ہاتھوں کی کاریگری ہے۔"

بینڈکس نے سر ہلایا۔ "او کے میں متاثر ہو گیا ہوں، مسٹر پرائن۔" بینڈکس نے تاثرات نارمل رکھتے ہوئے دل میں کہا۔

"جناب، کیا میرا بیان ریکارڈ ہو رہا ہے؟ میں اپنی بات کو دہراؤں گا نہیں۔" پرائن نے تیزی سے پلکیں جھپکائیں۔

"غم نہ کرو۔ تمہاری کہانی محفوظ ہو رہی ہے۔" بینڈکس نے اس مرتبہ مسکرا کر لب کشائی کی۔ "آفیسر برن ہارٹ اپنے کام میں ماہر ہے۔" بینڈکس نے اشارہ کیا۔

پرائن نے مڑ کر دوسرے آفیسر کی جانب دیکھا اور بولا۔ "مجھے لفظ "کہانی" پر اعتراض ہے، جناب۔"

"میرا مطلب تھا، تمہارا بیان...... آگے چلو۔"

پرائن پھر مڑا۔ وہ کچھ نروس ہو گیا۔

اجنبی

ایک اُمیدوار ووٹ مانگنے جب ایک گھر پہنچا تو اسے دیکھتے ہوئے صحن میں لیٹا ہوا کتا بھونکنے لگا۔ گھر کا مالک جب باہر آیا تو امیدوار نے کہا: "جناب! آپ کا یہ کتا تو مجھے دیکھتے ہی بھونکنے لگا، میں کوئی اجنبی تو نہیں ہوں۔ اس سے قبل بھی میں اس حلقے سے منتخب ہوا تھا۔"

"جناب، یہ کتا آپ پر بھونک نہیں رہا ہے بلکہ آپ سے یہ پوچھ رہا ہے کہ پچھلے پانچ سال سے آپ کہاں تھے۔ ایک بار بھی یہاں نہیں آئے اور نہ ہی ہماری خبر لی۔" گھر کے مالک نے جواب دیا۔

ظہیر الحق، حیدر آباد کی جرأت

"میں سمجھا تھا کہ ہم دونوں کمرے میں اکیلے ہیں۔ مطلب بس، ہم دو ہیں۔"

"کیا فرق پڑتا ہے؟ آفیسر ہارٹ ضرورت کے وقت ہی بولتا ہے۔ تم بیان جاری رکھو۔" بینڈکس نے لمبا کش لے کر دھواں خارج کیا۔

"ہاں، ہاں کیوں نہیں۔ مجھے پتا ہے کہ میں حلیے سے کوئی مجرم یا قاتل دکھائی نہیں دیتا۔ ممکن ہے تم مجھے سنجیدہ نہ لو لیکن......" وہ چپ ہو کر مناسب الفاظ تلاش کرنے لگا۔

"میں بہت سنجیدہ ہوں، حضرت۔" بینڈکس نے خود سے کہا۔

"لیکن حلیے سے قطع نظر، قاتل کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ بعض اوقات کوئی اسکول اسٹوڈنٹ بھی قاتل کا روپ دھار لیتا ہے۔" پرائن نے کہا۔

بینڈکس نے جماہی کو بمشکل روکا۔ موصوف کو بھی یہی وقت ملا تھا، داستان گوئی کا۔ بینڈکس نے سوچا۔ اسے بھوک لگ رہی تھی۔ یہ اپنی بات جلد ختم کرے تو میں چند بنیادی سوالات کر کے اس کا بھانڈ پن ختم کروں۔

"مسٹر، ادھر ادھر کی باتیں مت کرو۔ تم بار بار موضوع سے ہٹ جاتے ہو۔" بینڈکس نے اعتراض کر ہی ڈالا۔

پرائن نے ہیٹ کا کنارہ مسلتے ہوئے بینڈکس کو گھورا۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ تم اپارٹمنٹ میں کیسے داخل ہوئے تھے؟" بینڈکس نے پہلا سوال کیا۔

"بھیس بدل کر۔" پرائن شرمیلے انداز میں مسکرایا۔

"میں ٹیلی ویژن کمپنی کا نمائندہ بن کر گیا تھا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ کمپنی کی جانب سے ٹی وی ٹھیک کرنے والا؟"

"اوہ نہیں، اس طرح میں اندر نہیں جا سکتا تھا۔ کیونکہ مجھے پتا نہیں تھا کہ خاتون کا ٹی وی خراب ہے یا اس نے کوئی شکایت درج کرائی ہے۔ میں نے دوسرا کردار ادا کیا تھا۔"

"کیسا کردار؟"

"میں نے اسے بتایا کہ کمپنی نے خفیہ قرعہ اندازی کے ذریعے چھ کسٹمر منتخب کیے تھے۔ ان چھ خوش نصیبوں میں اس کا نام بھی ہے۔ ان چھ افراد کو کمپنی کے جدید فیچرز مفت میں دیے جائیں گے۔ ان افراد کے ٹی وی سیٹ مفت میں اپ ٹو ڈیٹ کردیے جائیں گے۔ مذکورہ قرعہ اندازی کمپنی کی نئی پروموشن اسکیم کا حصہ ہے۔ وہ یہ اطلاع سن کر خوش ہوئی تھی اور میں بہ آسانی اندر چلا گیا۔" پرائن نے سینہ پھلا کر داد طلب نظروں سے بینڈکس کو دیکھا۔ بینڈکس نے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"خاتون نے مجھے بتایا کہ اس کے شوہر کے لیے بھی یہ سرپرائز ہوگا اور وہ شام میں آئے گا تو یہ خبر سن کر خوش ہوگا۔" پرائن مسکرایا۔ "میں اپنا بیگ لے کر اندر چلا گیا۔ میں نے نیلے رنگ کا اوورآل اور ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ یہ لباس اور ٹوپی میں نے اسی دن خریدی تھی۔ اگر تصدیق کرنا ہے تو میں اسٹور کا پتا فراہم کردیتا ہوں۔ جناب بہ آسانی وہاں سے......"

"فی الحال اس کی ضرورت نہیں ہے۔" بینڈکس نے اس کی بات کاٹی۔ "کافی وقت ہے۔ یہ کام بعد میں ہو جائے گا۔ تم بیان جاری رکھو۔"

"اوہ، ٹھیک ہے۔ ویری گڈ...... میں نے اپنا بیگ ایک طرف رکھا اور......"

"بیگ میں کیا تھا؟" بینڈکس نے پھر قطع کلامی کی۔

"میرے اوزار۔ رینچ، پانے، پیچ کش، ہتھوڑا، چھری وغیرہ۔"

"کس لیے؟"

"دراصل میں موقع پر اپنا ہتھیار منتخب کرتا ہوں۔ یہ شخصیت پر منحصر ہے۔ ہر ایک کی شخصیت مختلف ہوتی ہے۔ شخصیت کے حساب سے میں ہتھیار منتخب کرتا ہوں۔" پرائن نے گویا سمجھانے والے انداز میں وضاحت کی۔

"یعنی تم پہلے بھی قتل کرتے رہے ہو؟"

"یقیناً...... جناب، ایسا ہی ہے۔ سلون کیس سے پہلے پانچ مرتبہ۔" پرائن کا لہجہ فخر آمیز تھا۔

"تم اعترافِ جرم کرنے پہلے کہیں نہیں گئے، تو اب کیوں آئے ہو؟"

"میں پہلے اعتراف نہیں کرسکتا تھا کیونکہ میرا ایک ٹارگٹ تھا۔ چھ خواتین کو قتل کرنے کے بعد میں حاضر ہو گیا۔" پرائن نے سادگی سے کہا۔ "ہر آدمی کی زندگی میں کوئی ٹارگٹ ہونا چاہیے۔ میرا ہدف چھ عدد بے عیب قتل کی وارداتیں تھیں۔ یہ ہدف میں نے حاصل کرلیا۔"

"خوب، بہت اچھے...... کیا ٹارگٹ تھا۔ خیر واپس آؤ۔ بتاؤ پھر تم نے کیا کیا؟" بینڈکس نے طنزیہ تعریف کے ساتھ سوال کیا۔

"ہاں...... میں بیگ رکھ کر خاتون کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ کمرے کے وسط میں کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی۔ دوستانہ انداز میں مسکرا رہی تھی۔ وہ ٹی وی کے نئے اور جدید فیچرز کے متعلق سوال کررہی تھی...... اسے بالکل شبہ نہ ہوا۔ لیکن کب تک؟ جلد ہی اس کی مسکراہٹ تحلیل ہونا شروع ہوگئی۔ کیونکہ میں ٹی وی کھولنے کے بجائے اسے دیکھ رہا تھا اور میں نے اس کے کسی سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ نروس نظر آنے لگی۔ اس نے آخری سوال کیا کہ میں ٹی وی پر کام کیوں نہیں کررہا...... میں اب بھی خاموش رہا۔ اور اس کے بدلتے ہوئے تاثرات کا مشاہدہ کرتا رہا۔ اف، کتنا پُرلطف تھا، خوف کو دیکھنا۔ خوف...... جو اس کی آنکھوں میں سر اٹھا رہا تھا۔" پرائن نے آنکھیں بند کر کے غالباً "خوف" کے منظر کا تصور میں اعادہ کیا۔

بینڈکس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مَسل دی۔

"کسی خاتون کی آنکھوں میں خوف کو نمودار ہوتے دیکھنا اور پھر خوف کا بڑھ کر دہشت میں تبدیل ہونا...... ناقابلِ بیان، ناقابلِ وضاحت اور...... اور ناقابلِ فراموش...... میں دیکھتا رہا، پھر وہ لمحہ آگیا جب وہ شور مچانے والی تھی۔ عین اسی وقت میں نے بڑھ کر اس کے پیٹ میں گھٹنے کی شدید ضرب لگائی۔ واہ، کیا ٹائمنگ تھی...... بہت دلچسپ، بہت مزیدار...... سُرور ہی سُرور......" پرائن نے پھر آنکھیں بند کر کے چسکا لیا۔

پیٹ میں ضرب والی بات نے بینڈکس کو چونکا دیا۔ شاید...... شاید یہی ہے۔ کیا یہ بے ڈھنگا، کریک گنجا ہی قاتل ہے؟ ہوسکتا ہے...... ممکن ہے لیکن محض پیٹ میں ضرب والی بات ناکافی تھی۔ "سنتے رہو۔" بینڈکس نے دل میں کہا۔

پرائن آنکھیں بند کیے جھومنے والے انداز میں ہل رہا تھا۔ پھر یکایک اس نے آنکھیں کھولیں۔ چشمہ اوپر کیا۔

"بس یا کچھ اور؟" بینڈکس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور سوچا اگر یہ چھری کے اکیس گھاؤ کی بات کرتا ہے تو

پھر یقیناً یہی قاتل ہے۔

''یقیناً جناب، میں بتاتا ہوں، وہ گر گر بل کھا رہی تھی۔ جب میں نے بیگ سے لمبے پھل والی چھری نکالی۔ جب تک اس کی سانس بحال ہوتی، میں اس کا گلا تراش چکا تھا۔ پھر میں نے اسے پلٹ کر پشت پر اپنا ٹریڈ مارک ثبت کر دیا۔ میں نے اپنا ٹارگٹ حاصل کر لیا تھا۔'' پرائن نے اپنا ہیٹ میز پر رکھ دیا۔

گلا کاٹا گیا تھا، یہ تو اس نے اخبار میں پڑھ لیا ہوگا۔ بینڈکس نے خود سے کہا۔ میڈیا کو اکیس عدد چھری کے گھاؤ کی صحیح گنتی نہیں معلوم۔ کیا یہ نیم پاگل شخص اکیس عدد زخموں سے باخبر ہے؟ بینڈکس نے تناؤ محسوس کیا۔

''کیسا ٹریڈ مارک؟'' بینڈکس نے بے چین ہو کر سوال کیا۔

پرائن نے دانتوں کی نمائش کی۔ ''مارک آف زورو (Zorro) کے مانند میرا ذاتی نشان۔ میں اس معاملے میں سادہ ہوں۔ ای۔ ٹی۔ پی۔ ایمری کے بجائے میں صرف ٹی پرائن لکھ دیتا ہوں۔''

بینڈکس نے گہری سانس لے کر پشت کرسی کے ساتھ لگا دی اور تازہ سگریٹ سلگائی۔

''پھر میں نے اس کے دونوں کان کاٹ کر محفوظ کر لیے۔'' پرائن نے فخریہ انداز میں کہا۔ ''اب میرے پاس کانوں کی چھ جوڑیاں جمع ہو گئی ہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ تمہیں یہ جوڑیاں ساتھ لانی چاہیے تھیں۔'' بینڈکس نے سگریٹ کا دھواں فضا میں چھوڑا۔

''اوہ نہیں جناب بارہ عدد کان میں نے گھر پر ایک چاندی کے ڈبے میں حفاظت سے رکھے ہیں۔ آگے سنیے، اختتام قریب ہے۔''

''ہاں، کیوں نہیں۔'' بینڈکس نے سر بھی عقب میں کرسی سے لگا دیا اور دھواں چھت کی طرف پھینکا۔

''آخر میں، میں نے مسز سلون کے زیرِ استعمال پرفیوم کی چاروں شیشیاں سنک میں الٹا کر خالی کر دیں۔''

''کیوں؟'' بینڈکس نے بیزاری سے استفسار کیا۔

اسے یاد تھا کہ ڈریسنگ ٹیبل پر موجود گلابی شیشیاں، تین چوتھائی بھری ہوئی اور چار عدد نہیں تھیں۔

''سستی اور گھٹیا پرفیومز مجھے بُری لگتی ہیں۔ میں نے ایک ایک قطرہ سنک میں الٹ دیا تھا۔ بعدازاں میں نے اس کے لباس کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے جلا دیا اور گھر چلا گیا۔''

''ختم؟ یا کچھ اور؟''

''ختم سمجھیں، جناب۔ یہ چار دن پہلے کی بات ہے۔ کانوں کی جوڑی گھر پر رکھی۔ تین دن میں کچھ ضروری کام نمٹائے اور سیدھا یہاں آ گیا۔ اب میں تیار ہوں۔ کون سی کوٹھری میں رکھنا ہے مجھے۔ شاید ابھی لاک اَپ میں یا کہیں بھی۔ میں تیار ہوں۔''

''مسٹر پرائن، تم جیسے خبطیوں کے لیے ہمارے پاس فالتو جگہ نہیں ہے۔'' بینڈکس سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''کیا مطلب جناب۔'' پرائن کا نچلا ہونٹ لرزنے لگا۔ ''میں سمجھا نہیں...... کک...... کیا کہہ رہے ہیں آپ؟''

''وہی کہہ رہا ہوں، جو سن رہے ہو۔ چلو نکلو، گھر جا کر آرام کرو۔ تسلی نہ ہو تو کل صبح آ جانا۔'' بینڈکس نے باہر کی طرف اشارہ کیا۔

''لیکن...... ن......''

''کچھ نہیں۔ چلو شاباش، نکل چلو...... آفیسر ہارٹ، موصوف کو باہر کا راستہ دکھاؤ۔''

بینڈکس دونوں کو باہر جاتے دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ یہ گنجا سب سے مختلف تھا۔ بالکل مختلف اور عجیب۔

☆☆☆

ایمری پرائن نے پولیس پارکنگ سے اپنی گاڑی نکالی اور شام کے ٹریفک کا حصہ بن گیا۔ لبوں پر اسرار بھری مسکراہٹ تھی۔ کتنا آسان اور ساتھ ہی کتنا خطرناک، ونڈرفل...... پرائن نے خود کو داد دی۔ لطف وسُرور اور ہیجان ایسا ہی تھا جیسا اس نے مسز پرائن کے گلے پر چھری چلاتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ پرائن، شیر کی کچھار میں گھس کر صحیح سلامت نکل آیا تھا۔ وہ بینڈکس کی شہرت سے واقف تھا۔

اس کی ٹائمنگ بھی زبردست رہی۔ پرائن نے سوچا اور اداکاری بھی شاندار...... جب اس نے اپنی کہانی میں گھٹنا، پیٹ میں مارنے کا ذکر کیا تھا۔ خطرناک لیکن شاندار، بہت شاندار...... گھٹنے کے ذکر پر بینڈکس چونکا تھا۔ ماسٹر پرفارمنس...... ماسٹر پیس پرائن گاڑی دوڑاتے ہوئے حظ اٹھا رہا تھا۔ لطف ولذت کی حد ہو گئی۔ اس نے زبان ہونٹوں پر پھیری۔ مزید لذت اور ہیجان آگے ملے گا۔ جلد، بہت جلد...... اگلی واردات میں، سلون کیس سے بڑھ کر۔

اس نے سگنل پر گاڑی روکی اور سیٹ کے ساتھ فلور پر رکھے بیگ پر نظر ماری۔

''ماسٹر پیس۔'' پرائن بڑبڑایا۔ ''آرٹ۔''

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط نمبر:17

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی، اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو قابلِ نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہرنا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پُتلا نہیں تھا جوان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگارنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ

کار میں نصب ریڈیو سے وہ چیختی چلاتی خبر نہیں، گویا لفظوں کے کھولتے لاوے اُگلے جا رہے تھے جو میرے وجود کیا روح تک کو بھسم کیے دے رہے تھے۔

میری حالت غیر ہونے لگی۔ سرتا پا جیسے ایک جنونِ ناگہاں کی سی کیفیت طاری ہونے لگی، جی چاہتا تھا ایک ہی ہلے میں سب کچھ ختم کر ڈالوں اور خود کو بھی۔

یہ سب کیا تھا؟ خود مجھے بھی یقین کرنے میں تامل ہو رہا تھا۔ ایک دُھواں سا میرے اندر اُٹھا تھا کہ جس نے میرے پورے وجود کو بے دم سا کر کے رکھ دیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جس نے مجھے ایک خوفناک ہراس میں مبتلا کیا تھا۔

شش... شہزی! کک... کیا... واقعی ایسا ہوا ہے؟''

ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان بیگم صاحبہ کی لڑکھڑاتی آواز اُبھری تھی۔ میری طرح شاید انہیں بھی اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''یہ ریڈیو ہے... اور بین الاقوامی نشریات پر ایسی اہم خبر جھوٹ نہیں ہو سکتی۔'' میرے ساتھ بیٹھے زخمی ہرکارے نے گویا ہماری کیفیات کو محسوس کرتے ہوئے استہزائیہ انداز میں کہا۔ وہ اب تک اندازہ لگا چکا تھا کہ ان خبروں سے ہمارا ہی تعلق ہو سکتا تھا۔

جان ایف کینیڈی ائرپورٹ پر ایف بی آئی کے اہلکاروں نے سرمد بابا، عابدہ اور عارفہ کو عین اس وقت اپنی تحویل میں لے لیا تھا جب وہ تینوں امریکا سے واپس پاکستان لوٹ رہے تھے۔ جہاز میں سوار ہونے سے پہلے چیکنگ اور ''اسکیننگ'' کے دوران یہ چونکا دینے والا انکشاف ہوا تھا کہ عارفہ کے جسم کے اندر وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والا ایک بم فٹ کیا گیا تھا۔ مبینہ طور پر اسے امریکن طیارہ پین ایم اُڑانے کی ایک بھیانک سازش قرار دیا گیا تھا۔ یہ ایک ریموٹ کنٹرول ڈیوائس بم تھا۔ جبکہ انہی دنوں ورلڈ ٹریڈ سینٹر، نائن الیون کا واقعہ جسے امریکی سانحے سے تعبیر کیا جاتا ہے، تازہ تازہ رونما ہو چکا تھا۔

ریڈیو سی این این کے مطابق مذکورہ تینوں افراد کو ''عالمی دہشت گردوں'' کا ساتھی سمجھا جا رہا تھا۔ جبکہ اس سلسلے میں سرمد بابا نے ائرپورٹ پر چلا چلا کر اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی بھی کوشش چاہی تھی کہ انہیں عالمی دہشت گردوں نے نہیں بلکہ ان کے اپنے ہی (امریکی) لوگوں نے ایک سوچی سمجھی سازش میں پھانسنے کی کوشش کی ہے۔

کیونکہ اس ضمن میں ثبوت کے طور پر انہوں نے وہاں کے میڈیا کو واضح بتایا کہ یہ بات آن دی ریکارڈ ہے کہ میری بیوہ بہو عارفہ ایک بیمار خاتون تھی اور پچھلے کئی روز سے وہ یہاں کے ایک بڑے اسپتال میں جگر کی پیوندکاری کے سلسلے میں ایڈمٹ تھی۔ نیز ثبوت کے طور پر اس کی پوری میڈیکل ہسٹری کا ریکارڈ مذکورہ مقامی اسپتال میں اب بھی موجود ہے۔ جہاں عارفہ کے جگر کی پیوندکاری کے سلسلے میں ڈاکٹرز نے دوبارہ آپریشن کیا کہ پہلے آپریشن میں پیچیدگی کی وجہ سے ایسا کیا گیا ہے اور یہ سوچی سمجھی سازش یقیناً اس دوسری بار کیے گئے آپریشن کے دوران ہی تیار کی گئی ہوگی۔

اس دوران ایک امریکی نژاد مسلم لیڈی رپورٹر آنسہ خالدہ نے بھی سرمد بابا وغیرہ کے کیس کی حمایت کرتے ہوئے اعلیٰ امریکی حکام سے درخواست کی تھی کہ انہیں اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے لوئر (وکیل) فراہم کیا جائے۔

مجھے آج عابدہ کے سارے انجانے وسوسے اور خدشات یاد آنے لگے، جن کا اظہار وہ اکثر و بیشتر ٹیلی فون پر مجھ سے کرتی رہتی تھی، بالخصوص باسکل ہولارڈ کے حوالے سے وہ کچھ زیادہ ہی خوف زدہ سی رہتی تھی جبکہ میں اس بیچاری کو تسلیاں ہی دیتا رہ گیا تھا کہ یہ محض اس کا وہم تھا۔

میرے ہونٹ سوکھنے لگے تھے اور حلق میں کانٹے چبھنے لگے تھے۔ سچی بات یہ تھی کہ مجھ سے شدید صدمے کے باعث بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

اگلی سیٹ پر براجمان بیگم صاحبہ نے بیک ویو مرر پر میری کیفیات بھانپتے ہوئے مجھے تسلی دینا چاہی تھی مگر وہ خود بھی پریشان تھیں۔

میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے، کون سا قدم پہلے اٹھایا جائے؟ دل و دماغ بالکل ماؤف ہو رہے تھے۔

ایسے میں بیگم صاحبہ نے تشفی آمیز اور حوصلہ دیتے لفظوں میں کہا۔ ''شہزی! خود کو سنبھالو، ہم اس وقت خود ایک اہم مشن میں مصروف ہیں جو ایک خطرناک نہج پر ہے، ہماری ذرا سی غفلت اور عدم توجہی خدانخواستہ ماں کی جان کو خطرے میں ڈال سکتی ہے۔ میں اب گاڑی آگے بڑھا رہی ہوں۔'' کہتے ہوئے کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

ان کی بات بھی صحیح تھی۔ ہم خود اس وقت ایک خطرناک اور جان لیوا سچویشن کا شکار تھے۔ وزیر جان کے تین ہرکارے میرے ہاتھوں ہلاک ہو چکے تھے۔ چوتھا

ہمارے قبضے میں تھا۔ یرغمال ہرکارے کے ذریعے ہماری وزیر جان کو یہی باور کرانے کی سعی تھی کہ اب تک سب کچھ اس کی مرضی اور حسب منشا ہورہا ہے۔ لیکن بقول اس کے ہرکارے کے، چیف (وزیر جان) کو اب تک شبہ ہوچکا ہوگا۔ یوں بھی یہ زیادہ دیر تک چھپنے والی بات نہیں تھی۔

ابھی میں اسی ذہنی اُکھاڑ پچھاڑ اور ژولیدگی کا شکار تھا کہ وزیر جان کی دوبارہ کال موصول ہوئی۔ تب تک میرے دل و دماغ نے بیگم صاحبہ کی نصیحت کا اثر قبول کرلیا تھا اور اب میں موجودہ مخدوش سچویشن کے بارے میں غور بھی کرنے لگا تھا۔

ہرکارے نے فوراً وزیر جان سے میری بات کرا دی۔ ''ہوں۔ تو تم نے آخرو ہی کچھ کیا، جس کی میں نے تمہیں سختی سے ممانعت کی تھی۔ ایسا کیوں کیا تم نے شہزی؟ کیا تم نہیں جانتے تھے کہ تمہاری ماں اس وقت ہمارے قبضے میں ہے... اور... اور... میرے تین ساتھیوں کو بھی تم نے ہلاک کرڈالا... کیوں؟''

اس کے تہدیدی اندازِ تخاطب نے مجھے ایک لمحے کو دہلا دیا تھا۔ تاہم میں نے پورے اعتماد اور متانت سے کہا۔ ''اپنے ساتھی سے پوچھ لو حقیقت کیا ہے۔ میں اَب تک من و عن تمہاری نصیحت پر ہی عمل کررہا تھا۔ جس کا ثبوت میرا بیگم ولا جانا اور وہاں سے بیگم صاحبہ کو اپنے ساتھ لانا تھا۔ وہ اس وقت بھی میرے ساتھ موجود ہیں مگر تمہارے ساتھیوں نے خود ہی معاہدے کی خلاف ورزی کی کوشش چاہی تھی، جس میں یقیناً تمہاری ہی ہدایت شامل رہی ہوگی، جو کچھ ہمارے بیچ پہلے سے طے تھا اُسے اچانک بعد میں کیوں بدلا گیا؟ جس کے نتیجے میں مجھے حرکت میں آنا پڑا۔'' میں نے بڑی چالاکی سے بات کی ذمے داری اسی پر ڈال دی۔

''اچھا!'' دوسری جانب سے اس کی استہزائیہ آواز اُبھری۔ ''اور... تم میرے اتنے ہی فرمانبردار نکلے کہ تم نے اب تک بالکل ویسا ہی کیا جیسا کہ میں نے تمہیں ہدایت کی تھی اور مزید یہ کہ بیگم صاحبہ تمہارے ساتھ اتنی آسانی سے گویا کچے دھاگے سے بندھی چلی آئی؟''

''وزیر جان! مجھے تمہارے لہجے سے منافقت اور دوغلے پن کی بو آرہی ہے اور تم اپنے تئیں اس طرح کے لغو اور بے محل اندازے قائم کرکے مزید کیا گل کھلانا چاہتے ہو؟ صاف اور سیدھی بات ہے، تمہیں ہم سے غرض ہے اور ہم تمہاری طرف ہی آرہے ہیں۔ بدلے میں میری ماں کو اور بیگم صاحبہ کے آدمی کو تمہیں ہمارے حوالے کرنا ہوگا۔''

اس بار گفتگو واچ ٹرانسمیٹر کے بجائے سیل فون پر ہو رہی تھی۔ اور یہ اس کے ہرکارے کا ہی سیل فون تھا۔

''واٹ؟'' دوسری جانب سے اس کی چونکتی ہوئی آواز اُبھری، جس نے مجھے بھی ایک لمحے کو ٹھٹکا سا دیا تھا۔ ''کون سا آدمی؟ کیسا آدمی؟''

''وہی آدمی جسے تم نے یرغمال بنا رکھا ہے۔'' میں نے اُسے یاد دلایا۔ کہتے ہوئے میری نظر ونڈ اسکرین کے اُوپر لگے بیک ویو مرر پر پڑی، جہاں مجھے گا ہے بہ گا ہے اپنی جانب تکتا ہوا بیگم صاحبہ کا چہرہ صاف نظر آرہا تھا۔ وہاں مجھے کچھ پریشان کن بے چینی کے آثار نمودار ہوتے محسوس ہوئے۔ اسی لمحے وزیر جان کی آواز اُبھری۔

''میں نہیں جانتا کہ تم کس آدمی کی بات کررہے ہو؟ یقیناً اس عورت نے تمہیں دھوکا دینے کی کوشش کی ہے۔ مگر اتنا یاد رکھنا شہزی! میرے ساتھ کسی قسم کے دھوکے اور چال بازی کا سوچنا بھی نہیں، اور یہ بھی مت بھولنا کہ تمہاری ماں اس وقت میرے قبضے میں ہے۔ میں بہرحال تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کردیا۔ اور میں اُلجھن آمیز حیرت کا شکار ہوکر بیک ویو مرر میں بیگم صاحبہ کا چہرہ تکنے لگا۔ میری گھورتی ہوئی تیز اور سوالیہ نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے بیگم صاحبہ نے اٹکتے ہوئے لہجے میں مجھ سے کہا۔

''ش... شہزی! ابھی اس بات کو چھوڑو، پلیز۔''

''لیکن بیگم صاحبہ! آپ تو کہہ رہی تھیں کہ وزیر جان نے آپ کے کسی اہم ساتھی کو یرغمال...''

''پلیز! فار گاڈ سیک شہزی، ابھی ان باتوں کا وقت نہیں۔'' وہ اس بار قدرے جھلائی ہوئی آواز میں بولیں۔

میں پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ کر چپ ہو رہا۔

ایک دوراہے موڑ کے قریب پہنچ کر بیگم صاحبہ نے کار کی رفتار دھیمی کرلی اور اُکھڑی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''گاڑی کس طرف موڑنی ہے؟''

''دائیں جانب موڑ کاٹ لو۔'' ہرکارے نے فوراً بتایا۔ میرے اندر ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ میں بری طرح اُلجھا ہوا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر یہ کیا پُراسرار معاملہ ہے؟ بیگم صاحبہ میرے ساتھ کیا کرنا چاہ رہی تھیں؟ انہوں نے مجھ سے آخر جھوٹ کیوں بولا تھا کہ وہ اس لیے میرے ساتھ جانے پر رضامند تھیں کہ وہ وزیر جان کے قبضے سے اپنا کوئی اہم آدمی چھڑانے کا ارادہ رکھتی تھیں۔

دفعتاً میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ کیا اس طرح مجھ سے جھوٹ بول کر وہ میری کوئی مشکل آسان کرنے کا ارادہ رکھتی تھیں یا میری مدد کرنا چاہتی تھیں؟ مگر سوال تو یہ پیدا ہوتا تھا کہ انہیں کیسے میری مشکل کا علم ہوا؟ میں نے تو انہیں اس سلسلے میں ابھی کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ جبکہ بیگم صاحبہ نے خود مجھ سے فون پر عین آخری وقت پر رابطہ کیا تھا۔

انہوں نے مجھ سے مدد چاہی تھی، تو کیا وہ درحقیقت میری مدد کرنا چاہتی تھیں؟ مگر کیوں اور کیسے؟

''گاڑی روکیے بیگم صاحبہ!'' دفعتاً ہی میں چلا اُٹھا اور بیگم صاحبہ نے فوراً بریک لگا دیے۔ کار ایک جھٹکے سے رک گئی۔ بیگم صاحبہ نے میری جانب گردن موڑ کر کچھ عجیب سی نگاہوں سے دیکھا تو میں نے بھی ان کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

''بیگم صاحبہ! آپ کو مجھے حقیقت بتانا ہوگی۔ یہ سب کیا ہے؟ کیا آپ کو پہلے ہی سے میری اس مشکل کا علم تھا؟ مگر کیسے؟''

''شہزی! ماں جی کی جان خطرے میں ہے۔ میں پھر کہہ رہی ہوں یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔'' وہ بڑے رسان سے بولیں۔

''زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے بیگم صاحبہ! مگر میں اپنی ذاتی غرض کی خاطر کبھی یہ نہیں چاہوں گا کہ آپ کی جان کو بھی خطرے میں ڈالوں۔ آپ نے یہ اچھا نہیں کیا لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا ہے کہ آخر آپ کو میری پریشانی کا علم کیسے ہوا؟''

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ یکلخت میرے ذہن رسا میں ایک خیال کلک ہوا۔ اور پھر جیسے خود ہی ساری بات میری سمجھ میں آتی چلی گئی۔ میرا چہرہ جوش سے یک دم سرخ ہوگیا۔ اور پھر میں نے بیگم صاحبہ کی طرف دیکھ کر سرسراتے لہجے میں پوچھا۔

''کک... کہیں... اول خیر یا شکیلہ نے میرے علم میں لائے بغیر آپ سے اس سلسلے میں کوئی رابطہ تو نہیں کیا تھا؟'' میں نے دیکھا، میری بات پر ان کا شہابی رنگت چہرہ دھواں دھواں ہونے لگا۔

''شہزی! کبھی کبھی تم بہت اذیت پسند ہونے لگتے ہو۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولیں۔ ''جو بات مخفی ہے اُسے چھپا کیوں نہیں رہنے دیتے۔ کیوں اس طرح بال کی کھال نکالنے پر تُلے رہتے ہو؟''

''بیگم صاحبہ! یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔''

میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''آپ کو بتانا پڑے گا کہ کیا اول خیر نے آپ سے فون پر کوئی رابطہ کیا تھا؟''

''نہیں۔''

''جھوٹ مت بولیں۔''

''میں سچ کہہ رہی ہوں۔ مگر اول خیر کے ایما پر شکیلہ نے مجھ سے ٹیلی فون پر رابطہ کیا تھا اور تمہاری پریشانی سے متعلق آگاہ کیا تھا۔ بعد میں اول خیر نے بھی مجھ سے بات کی تھی۔ تب میں نے تمہیں فون کیا تھا۔ میں جانتی تھی کہ تم اس طرح ہرگز نہیں مانو گے اس لیے تم سے یہ جھوٹ بولنا پڑا کہ تمہاری مشکل میری مشکل ہے۔''

میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ یہ سب اول خیر کا ہی کیا دھرا تھا۔ جب وزیر جان نے بیگم صاحبہ کو لانے کی شرط رکھی تھی تو میں بڑی پریشانی کا شکار ہوگیا تھا۔

ظاہر ہے میں وزیر جان کی یہ شرط کبھی نہیں مان سکتا تھا، اور یہ بات اول خیر بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ مگر اُسے اُمید تھی کہ اگر وہ بیگم صاحبہ کے سامنے یہ نازک مسئلہ رکھے تو وہ کچھ مدد کرسکتی تھیں۔ اول خیر جانتا تھا کہ میں اسے ایسا کرنے سے منع کردوں گا۔ اس لیے مجھے بتائے بغیر ہی یہ قدم اُٹھایا تھا مگر اب حقیقت آشکارا ہوتے ہی میں ایک اُلجھن آمیز پریشانی کا شکار ہوگیا تھا۔

''پہنچنے میں تاخیر مت کرو مسٹر شہزاد! چیف ہر بات کی ایک حد تک پروا کرتا ہے، اس کے بعد وہی کرتا ہے جس کا وہ ارادہ کیے ہوئے ہو۔''

ہمیں آپس میں اُلجھا ہوا پاکر ہرکارے نے مداخلت کرڈالی۔ شاید اُسے بھی ڈر تھا کہ تاخیر کے باعث وزیر خان خدانخواستہ کوئی ایسا ویسا قدم نہ اُٹھالے اور نتیجے میں وہ، یعنی ہرکارہ، ہمارے جوابی انتقام کے زیر عتاب نہ آجائے۔

بیگم صاحبہ نے فوراً کار آگے بڑھادی۔ اَب میرے پاس بھی شاید اس سلسلے میں کوئی دوسرا قدم اُٹھانے کا وقت نہ رہا تھا۔ ہم کافی دور نکل آئے تھے۔ اسی دوران ہرکارے کو وزیر جان کی ہدایت نما کال موصول ہوئی۔ اس بار یہ کال واچ ٹرانسمیٹر پر وصول ہوئی۔ جس کے مطابق ہمیں ایک ویران اور نیم جنگلاتی مقام پر رُکنے کا کہا گیا تھا۔ وہاں سے ہمیں وزیر جان کے ساتھی اس کے خفیہ ٹھکانے کی طرف لے جاتے۔

مطلوبہ مقام پر پہنچ کر بیگم صاحبہ نے کار روک دی۔ تب تک میں اپنے تئیں ایک خوفناک فیصلے پر عمل کرنے کے بارے میں سوچ چکا تھا۔

یہ ایک خطرناک چال تھی۔ جو چال کم اور جوا زیادہ تھی، مگر اب اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا جبکہ اب بیگم صاحبہ کی زندگی بھی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔

کار رک گئی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا اور پُرہیبت سی خاموشی کا راج۔ ہر سو تاریکی پھیلنے لگی تھی۔

مجھے کرنا وہی تھا جو میرے دل میں تھا۔ میں گردوپیش پر ایک گہری نظر ڈالنے کے بعد یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہم اس وقت کہاں ہو سکتے تھے۔

مجھے یہ ساہیوال کے کسی قریبی دیہاتی علاقے کا اندازہ ہو رہا تھا۔ مگر یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہم ساہیوال سے کتنی دوری پر تھے؟ تاہم کچھ تو اندازہ ہوتا تھا کہ یہ وہ قریبی مقام ہو سکتا ہے جہاں ''اسپیکٹرم'' کی اسٹیشن فور نامی عمارت واقع تھی، جسے بعد میں کسی بین الاقوامی این جی او کا دفتر ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

اس اندازے پر میرا ماتھا ٹھنکنا لازمی تھا۔ تو گویا وزیر جان کی موجودہ ''کچھار'' اب بھی اسٹیشن فور کی وہی خفیہ عمارت ہی ہو سکتی تھی، جہاں تھوڑے دنوں پہلے میری اس سے مڈبھیڑ ہو چکی تھی؟ اس کا مطلب تھا زیرو ہاؤس کی میرے ہاتھوں تباہی اور اسپیکٹرم کے ''ہینڈلر'' ایجنٹ آرک لوچن کے جہنم واصل ہونے کے بعد میں نے ان کے اسٹیشن چیف وزیر جان کو بھی اپنے پرانے ٹھکانوں تک ہی محدود رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اچانک تاریکی میں جہاں کیکر اور سرس کے مشترکہ جھنڈ تھے، کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دکھائی دی۔ میں ٹھٹک گیا۔ اپنے مطلوبہ منصوبے پر عمل پیرا ہونے کا وقت آ چکا تھا۔ وزیر جان کے ساتھی پہنچ رہے تھے۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی دیکھ کر مغلوب ہرکارہ بھی کافی مطمئن نظر آنے لگا تھا۔

مگر اس کی طمانیت اس وقت کافور ہو گئی جب میں نے اپنی جیب سے پستول نکال کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری اس حرکت کو گھورتے ہوئے ہرکارے کی کنپٹی پہ اس کا دستہ زور سے ''وجا'' دیا۔ وہ اپنے حلق سے اوغ کی آواز خارج کر کے ڈھے گیا۔

''یہ کیا... کیا تم نے شہزی؟ اس کے ساتھی آ رہے ہیں۔'' بیگم صاحبہ نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ ایسے وقت میں میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہونے لگی تھی۔ میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بیگم صاحبہ! جو ہو رہا ہے ہونے دیں۔ آپ گاڑی کی تمام لائٹس گل کر دیں۔ جلدی۔'' انہوں نے فوراً ہی کیا۔ اب قرب وجوار میں گہری تاریکی کا راج تھا۔

میں دروازہ کھول کر کار سے اُتر گیا۔ میری نظریں ہنوز قریب آتی روشنی پر مرکوز تھیں، پھر میں نے بیگم صاحبہ کو بھی نیچے اُترنے کا کہا اور برق سرعت کے ساتھ قریبی جھاڑیوں کی سمت بڑھ گیا، میرے خفیف اشارے پر بیگم صاحبہ نے بھی میری تقلید کی تھی۔

میری نظریں سامنے مرکوز تھیں۔ وہ کار تھی جو ہماری کار کے قریب آن رکی تھی۔ اس میں سے دو افراد برآمد ہوئے۔ مجھے ان کی کار کی ہیڈ لائٹس میں ان پستولوں کی چمک صاف دکھائی دے گئی جو اُن کے ہاتھوں میں دبے ہوئے تھے۔

دونوں چوکس انداز میں کار کی طرف بڑھے۔ میں نے دھیمی سرگوشی میں بیگم صاحبہ کو اپنی جگہ دُبکے رہنے کا کہا اور خود تیزی کے ساتھ تاریکی میں ایک طرف رینگ گیا۔ ساتھ ہی میری نظریں بدستور ان دونوں پر بھی مرکوز تھیں۔

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ یہ دونوں وزیر جان کے ہی بھیجے ہوئے آدمی تھے مگر اس وقت وہ کار میں ہمارے ''غیاب'' پر اور اپنے زخمی ساتھی کو بے ہوش پڑے دیکھ کر اپنے گردوپیش سے بہت زیادہ محتاط نظر آ رہے تھے۔ پھر ایک کو میں نے اپنی کلائی منہ کے قریب کرتے اور دوسرے کو جیب سے ایک ٹارچ نکال کر روشن کرتے دیکھا۔ وہ چھوٹی مگر روشنی کا وسیع دائرہ رکھنے والی ایک طاقتور ٹارچ تھی۔ جس کی روشنی وہ گردوپیش میں پھینک رہا تھا، اور پھر دفعتاً ہی میں نے اُسے چونک کر اپنے ساتھی سے کہتے سنا جو اپنی واچ ٹرانسمیٹر پر غالباً اپنے چیف وزیر جان کو موجودہ صورتِ حال سے آگاہ کرنے میں مصروف تھا۔

''وہاں کوئی ہے۔''

اس کی بات پر خود میں بُری طرح ٹھٹک گیا، ضرور اسے قریبی جھنڈ میں دبکی ہوئی بیگم صاحبہ کی جھلک نظر آ گئی تھی۔ تب میں جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا نہایت ہوشیاری کے ساتھ رینگ کر ان کی کار کے عقب میں آ گیا۔

ٹرانسمیٹر والے نے اپنے ٹارچ والے ساتھی سے کہا۔ ''تم جا کر دیکھو، کون ہے وہاں۔ میں تمہیں کور کرتا ہوں۔ خطرہ محسوس کرتے ہی بے شک گولی چلا دینا۔''

ٹارچ والا اپنے دوسرے ہاتھ میں پستول تھامے مذکورہ جھنڈ کی طرف بڑھ گیا۔

بیگم صاحبہ خطرے میں تھیں۔ یقیناً انہوں نے بھی خطرہ محسوس کر لیا ہوگا۔ وہ اپنے بچاؤ کے لیے کچھ بھی

کر جانے کی اہلیت رکھتی تھیں لیکن ادھر میرے بھی حرکت میں آنے کا وقت آن پہنچا تھا اور پھر میں نہیں رکا۔

کسی چیتے کی طرح میں نے ٹرانسمیٹر والے پر جست لگا دی۔ حالات کا تقاضا تھا کہ دشمن کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر زیر کر لیا جائے اور میں نے یہی کیا۔ اس پر جست لگاتے ہی میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کا دستہ اس کی گردن کے پچھلے حصے پر رسید کر دیا۔ وہ تیورا کر گرا اور بے حس و حرکت ہو گیا۔ اِدھر آگے بڑھتے ہوئے اس کے ساتھی کو پیچھے گڑبڑ کا احساس ہوا اور وہ یکدم پلٹا۔ تب تک میں بہ سرعت ایک بار پھر کار کے عقب میں رینگ گیا تھا۔

وہ غیر ارادی طور پر اپنے ساتھی کی خبر چار لینے کے لیے پستول تانے تقریباً دوڑتا ہوا پلٹا تو میں جھکا جھکا کار کی دوسری طرف کی آڑ لیے اچانک ہی اس کے عقب میں نمودار ہوا، وہ عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس پا کر یکدم پلٹا تھا کہ میں نے بلا تاخیر اس کے پستول والے ہاتھ پر گولی چلا دی۔

فاصلہ قریب ہونے کے باعث میرا نشانہ نہیں چوکا تھا۔ نتیجتاً اس کا پستول والا ہاتھ بری طرح چِیج گیا۔ اُس کے پستول سے محروم ہوتے ہی میں نے اُسے جالیا۔ اس نے مجھے بھٹکانے کے لیے اپنے دوسرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹارچ کی روشنی میرے چہرے پر ڈالی۔ چند ثانیے کے لیے تو میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ لیکن باوجود اس کے میں نے اسے دبوچ لیا۔ مگر اس نے بھی موقع پاتے ہی زخمی ہونے کے باوجود میرے پیٹ پر ایک گھٹنا رسید کر دیا۔ درد کی ایک جاں کش لہر نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا۔

بلاشبہ وہ اسپیکٹرم کا ایک تربیت یافتہ ایجنٹ تھا، اس نے مجھے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اپنے بائیں ہاتھ کی کہنی میری ٹھوڑی پہ جڑ دی مگر یہ ضرب کچھ زیادہ کاری ثابت نہیں ہوئی۔ میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے اپنے سر کی ایک بھرپور ٹکر اس کے سینے پر رسید کر دی۔ جس سے وہ چند قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑا گیا اور پھر مجھے اس پر پستول تاننے کا موقع مل گیا، مگر میں اسے ابھی واصلِ جہنم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ورنہ میں اسے اب تک گولی کا نشانہ بنا چکا ہوتا۔

”خبردار! اب اگر تم نے کوئی غلط حرکت کی تو بھیجا اُڑا دوں گا تمہارا۔“ میں نے وحشت ناک لہجے میں کہا تو وہ بلا خوف ایک وحشیانہ غراہٹ سے بولا۔

”بہت برا پچھتاؤ گے تم۔ چیف پہلے ہی تم پر بُری طرح بگڑا ہوا ہے۔ تم نے ہمارے تین ساتھی جان سے مار ڈالے اور...“

اسی وقت میرے پستول کی نال سے ایک شعلہ چمکا۔ گولی اس کے بازو پر لگی۔ وہ چیخا۔ میری نال نے دوسرا شعلہ اُگلا۔ اس کا دایاں گھٹنا چِیج گیا۔ تیسرے شعلے کے دھماکے نے اس کی دوسری ٹانگ کی ران کو چھید ڈالا۔

”بب... بب... بس کرو، خ... خدا کے لیے... بب... بس کرو اب...“ وہ دھڑام سے گر کر فریاد کرنے لگا۔ طاقت اور برتری کے گھمنڈ میں مبتلا اس ہرکارے کی ساری اکڑفوں ہوا ہونے لگی تھی۔

اس دوران بیگم صاحبہ بھی اپنی پناہ گاہ سے نکل آئی تھیں۔ پستول اب ان کے ہاتھ میں بھی چمک رہا تھا۔ کار کی ہیڈ لائٹس میں وہ شاید یہ سارا تماشائے خوں رنگ دیکھ رہی تھیں، پھر مجھے غالب پا کر وہ قریب آگئیں۔

میں ہونٹ بھینچتا ہوا زمین بوس زخمی ہرکارے کی طرف بڑھا اور اکڑوں بیٹھ کر اپنا ایک گھٹنا اس کے سینے پر ٹکا دیا جبکہ پستول کی نال اس کے منہ میں گھسیڑ دی اور غراہٹ سے مُشابہ آواز میں بولا۔ ”جب میں خود ہی تمہارے چیف کا شکار لے کر اسٹیشن فور آرہا تھا تو پھر وزیر جان نے میرے ساتھ کیوں بددیانتی کی... بولو؟“

میری اس ساری رسک بھری کاوش کا نتیجہ خیز نچوڑ اس جملے میں پوشیدہ تھا، جو میں نے اس پر نفسیاتی داؤ کھیلتے ہوئے ادا کیا تھا۔

میری بات پر وہ ایک لمحے کو ٹھٹک گیا اور بالآخر غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے بوکھلاہٹ میں وہی کچھ... برآمد ہوا جو میں اُگلوانا چاہتا تھا۔

”تت... تت... تمہیں کیسے پتا چلا کہ چیف اس وقت اسٹیشن فور...“ پھر دفعتاً ہی جیسے اسے میری چال کا احساس ہوا اور وہ بولتے بولتے رُکا تو میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

”میری کار کے اندر موجود تمہارے ساتھی نے مجھے سب بتا دیا تھا اور چیف نے بھی اُسے یہی ہدایت دی تھی کہ وہ ہمیں اسٹیشن فور کی عمارت لے کر پہنچے۔“

”تت... تو پھر یہ سارا کھڑاگ پیدا کرنے کی تمہیں کیا ضرورت تھی... آہ...“ وہ آخر میں کراہ کے رہ گیا۔ اس کے زخموں سے اب بھل بھل خون بہنے لگا تھا۔ اس پر نیم بے ہوشی طاری ہونے لگی تھی۔ میرا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ میں نے بیگم صاحبہ کو اشارہ کیا اور اپنی کار کی طرف لپکا۔ عقبی دروازہ کھولا اور پہلے والے ہرکارے کو، جو ہنوز

بے سُدھ تھا، گھسیٹ کر باہر پھینکا اور بیگم صاحبہ کو کار کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کا کہا۔

''بیگم صاحبہ! آپ اسی وقت اور فوراً واپس بیگم ولا لوٹ جائیں۔ میرا میدان اب صاف ہے۔''

''وکل... لیکن... تم؟'' انہوں نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر میں ان کی بات کاٹ کر تیزی سے بولا۔

''خدا کے لیے بیگم صاحبہ! میری محنت پر پانی نہ پھیریں۔ میں نے آپ کی جان بچانے اور اپنا میدان صاف کرنے کے لیے جو جوا کھیلا ہے، اس کی متوقع جیت اب زیادہ دور نہیں ہے۔ آپ جلدی سے واپس اپنے ٹھکانے کی طرف لوٹ جائیں۔ میرے پاس وقت کم ہے اور... یہ سارا کھیل ہی بروقت حرکت کرنے کا ہے، ورنہ... ورنہ میں ہار جاؤں گا۔''

اُنہیں میری بات سمجھ آگئی۔ ان کی کشادہ آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ انہوں نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور ہولے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں پھر نہیں رُکا۔ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت میں آیا۔ دُشمن کی کار سنبھالی۔ حسب توقع اگنیشن سوئچ میں چابی لگی ہوئی تھی۔ انجن بھی اسٹارٹ تھا۔

اگلے چند سیکنڈوں میں کار فراٹے بھر رہی تھی۔

☆☆☆

میں اپنی غیر معمولی ذہنی فراست اور بروقت قوتِ فیصلہ کے بل بوتے پر ایک پینتھ دو کاج نمٹانے میں کسی حد تک کامیاب رہا تھا۔ میں نے بیگم صاحبہ کو کسی خطرے میں گھرنے سے بچا کے اُنہیں واپس اپنے محفوظ ٹھکانے کی طرف لوٹا دیا تھا، دوسرے میں وزیر جان کی ''متوقع دستیابی'' ... کا ٹھکانا بھی معلوم کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

جانے پہچانے گردوپیش کے مقامات سے بہت جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں ٹھیک سمت پر گامزن تھا اور اسٹیشن فور کی عمارت اب زیادہ دوری پر نہیں رہی تھی۔

اگلے چند منٹوں کی تیز رفتار ڈرائیونگ کے بعد میں بالآخر اسٹیشن فور کی عمارت سے ذرا فاصلے پر پہنچ کر رک گیا۔

کار کا انجن بند کیا اور باہر نکل آیا۔ پستول میری جیب میں تھا۔ میں نے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ چونکہ یہ مین شاہراہ سے الگ تھلگ اور دیہاتی مضافاتی علاقہ تھا، رقبہ بھی کچھ زیادہ نہ تھا۔ اس لیے ہر طرف گہرے سناٹے کا راج تھا۔ دور کہیں آوارہ جانوروں کے بولنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ اسٹیشن فور کی عمارت میں باہر اور اطراف کی لوکیشن دیکھنے کے لیے اندر خفیہ کیمرے نصب تھے۔ اسی لیے میں زیادہ محتاط روی اختیار کیے ہوئے تھا۔ لہٰذا تاریکی اور اریب قریب بنے پختہ و نیم پختہ مکانوں کی دیواروں کی آڑ لیے آگے بڑھ رہا تھا۔ ایک جگہ پر مجھے رُکنا پڑا۔ میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔

وہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں سے میرا گزرنا لازمی تھا۔ اور کوئی متبادل راستہ بھی نہیں تھا۔ مگر اسی راستے سے میں خفیہ کیمروں کی زد میں آسکتا تھا۔ ابھی میں ہونٹ بھینچے کسی تدبیر پر غور کر ہی رہا تھا کہ اچانک ایک آواز پر میں چونکا۔

اسی راستے پر ایک بیل گاڑی آتی دکھائی دی۔ اس کے چوبی تختے کے نیچے لالٹین جھول رہی تھی، فوراً ہی میرے ذہن میں ایک تدبیر سمائی۔ میں اپنی جگہ ہوشیاری سے دبک گیا۔ بیل گاڑی قریب آرہی تھی۔ جس کے جوئے میں دو بیل جتے ہوئے تھے اور اس پر ایک بڑا سا ڈھیر پرال (پیال) کا دھرا پڑا تھا، جو ایک پہاڑ کی صورت ہی نظر آتا تھا، بیرونی جگہ پر ایک چوبی پھٹے پر ایک بوڑھا دیہاتی پتلی شاخ نما چابک ہاتھ میں تھامے ہوئے بیلوں کو مخصوص آواز میں ''ٹچکار'' رہا تھا۔

بیل گاڑی کے قریب آتے ہی میں نے اپنی جگہ چھوڑی اور گاڑی بان کی نظروں میں آئے بغیر میں جھکا جھکا اس کی آڑ لیتا ہوا۔ یہ مشکل راستہ پاٹنے لگا۔ مجھے چونکہ بیل گاڑی کی بلکہ اس پر ایک پہاڑ کی صورت لدے ہوئے پیال کی ڈھال میسر تھی اس لیے میں سمجھتا تھا کہ خفیہ کیمرے کی زد میں نہیں آسکتا تھا۔

بوڑھے گاڑی بان کو مجھ پر شبہ نہیں ہو سکا تھا۔ یوں بھی ہر طرف تاریکی کا ہی راج تھا۔ کہیں کسی گھر کے صحن میں لگے بلب کی مقدور بھر روشنی ٹمٹماتی نظر آجاتی تھی۔ آسمان صاف اور روشن تھا۔

میں بیل گاڑی کی آڑ لیے مطلوبہ عمارت کے نزدیک پہنچا یکدم اس کے احاطے میں قدم رکھ دیا۔ فوراً ہی اس کی بغلی دیوار کی آڑ لیتا ہوا سیدھے ہاتھ کی طرف کھسکتا ہوا بالآخر ایک ایسے دروازے کے قریب پہنچ کر رک گیا جسے ''چور دروازہ'' کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ وہ ایک سنگل پٹ کا دروازہ تھا۔ جو ظاہر ہے اندر سے بند تھا۔ اُسے کھولنے کی سر دست مجھے کوئی تدبیر سجھائی نہیں دے رہی تھی۔

اچانک ایک آہٹ پر میں چونک پڑا، جو بیرونی دروازے سے اُبھری تھی۔ میں اُلٹے پاؤں گربہ قدمی سے سرکا اور دیوار کی آڑ سے ذرا سر اُبھار کر دیکھا۔

دروازے سے خاصی عجلت میں چار، پانچ افراد نمودار ہو رہے تھے۔ وہاں فقط ایک جیپ کھڑی تھی۔ وہ سب اس میں سوار ہو رہے تھے۔ مجھے ایک ذرا موقع ملا تو میں بیرونی دیوار میں بنی کیاریوں اور پھلواریوں کی آڑ لیتا ہوا آگے بیرونی دروازے تک پہنچا تو یکلخت میرے اندر مسرت چمکی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ مجھے حیرت بھی ہوئی۔ لیکن پھر جلد ہی اس کی وجہ بھی میری سمجھ میں آگئی۔ جیپ کے قریب ایک ایسا آدمی کھڑا نظر آرہا تھا، جو اپنے جیپ سوار ساتھیوں کو کچھ ہدایات دینے میں مصروف تھا۔ یقیناً یہی اس دروازے سے نمودار ہوا ہوگا اور اس نے چونکہ اسی وقت واپس لوٹنا تھا اسی لیے اس نے دروازہ بند کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ یقیناً اس نے ذرا ہی دیر بعد واپس لوٹنا تھا۔

اسٹیشن فور کی عمارت کو بظاہر عام ہی رکھا گیا تھا۔ مطلب باہر کوئی پہرا نہیں تھا۔ لیکن اندر خفیہ کیمرے ضرور نصب تھے۔ اندر بیٹھے مسلح افراد گردوجوار کی مانیٹرنگ ضرور کررہے ہوں گے۔ عمارت کو عام مقامی لوگوں کی نظروں میں غیر اہم دکھانے کے لیے ہی ایسا کیا ہوگا کہ اس کی بیرونی ساخت عام انداز ہی کی رہنے دی گئی تھی، جو بادی النظر میں کسی دفتر یا سرکاری اقامت گاہ کا منظر پیش کرتی تھی۔

بہرحال قسمت میرا ساتھ دینے پر تلی ہوئی تھی۔ وہ شخص کسی بھی وقت مذکورہ کھلے دروازے کی طرف پلٹنے والا تھا، مجھے خوش قسمتی سے پودوں اور گملوں کی آڑ ملی ہوئی تھی۔ ورنہ ان لوگوں کی مجھ پر نظر پڑسکتی تھی۔ پھر بھی میں نے بے احتیاطی یا غیر ضروری عجلت کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ ان پر ایک محتاط سی نگاہ رکھتے ہوئے میں بیرونی دروازے کی طرف کھسکنے لگا۔ قریب پہنچا تو مجھے چوکھٹ خالی نظر آئی۔ البتہ روشنی تھی اور دروازہ اَدھ کھلا تھا۔ میں لپک کر اندر داخل ہو گیا۔

یہ ایک مختصر سی راہداری تھی۔ اندر کسی گوشے میں کسی کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ کہیں روشنی تھی کہیں تاریکی۔ میں نسبتاً تاریکی والے گوشے میں جا چھپا، کیونکہ اسی وقت مجھے دروازے کے باہر آہٹ سنائی دی تھی۔ وہ آدمی اندر داخل ہو رہا تھا، اور پھر دروازہ بند کرنے کے دوران ہی میں نے اُسے ٹھٹکتے ہوئے محسوس کیا۔ میرا دل یک لخت کنپٹیوں پہ دھڑکنے لگا۔ وہ اب فرش پر جھک کر کچھ جانچنے کی کوشش کررہا تھا۔ اور پھر اگلے ہی لمحے میری دھڑکتی نظروں نے دیکھا کہ اس کی گردن کا زاویہ بدلا اور اس طرف گھورنے لگا جہاں میں ایک نیم تاریک گوشے میں چھپا کھڑا تھا۔ میرے پورے وجود میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ کیونکہ اس کے چونکنے کی وجہ بڑی معقول تھی۔

چکنے اور شفاف فرش پر میرے جوتوں کے خاک زدہ نشان اُس کے نہ صرف چونکنے کا باعث بنے تھے بلکہ اس کی میری طرف توجہ اور راہنمائی کا بھی سبب بنے تھے، اور پھر یوں لگا جیسے میری اَب تک کی ساری محنت اَکارت چلی گئی۔ لیکن مایوس ہونا اور حالات سے ہار مان لینا تو میں نے بھی کب سیکھا تھا؟

بچپن سے لے کر اب تک اِنہی نامساعد اور حالاتِ دگرگوں کی گود میں تقدیر نے مجھے اُچھال اُچھال کر سکھایا تھا۔ جب میں بالکل بچہ تھا۔

وہ میری طرف پستول تھامے لپکا۔ مجھے چونکہ اندھیرے کی آڑ میسّر تھی، اسی لیے میں نے بھی موقع سے پورا فائدہ اُٹھایا اور وہ جیسے ہی اپنی جھونک میں میری پہنچ میں آیا، میں چیتے کی طرح اس پر جھپٹا۔ تربیت یافتہ وہ بھی تھا، مگر گھات میرے حصے میں تھی اسی لیے مات اس کے حصے میں آئی۔

میں نے سب سے پہلے اس کے پستول والے ہاتھ پر جھپٹا مارا تھا۔ اور دوسرے ہاتھ سے، رینجرز ٹریننگ سینٹر سے سیکھا ہوا ایک ''اسپائی'' داؤ کھیلا یعنی اس کی گردن کی رگِ حساس مسل ڈالی۔

یہ ایک گوریلا طرز کی ٹرک تھی۔ جو میں نے اپنی تازہ ترین مگر مختصر ٹریننگ کے دوران سیکھی تھی۔ تکنیکی اعتبار سے اس ٹرک کا پس منظر چینی میڈیکل سائنس ''آکو پنکچر'' سے ملتا تھا جو مریض کے جسم میں سوئیاں چبھو کر کیا کرتے تھے۔ اس میں رگوں اور نسوں حتیٰ کہ دھاگے جیسی شریانوں اور کیپلریز کے علم میں ماہر ہونا ضروری ہوتا ہے کہ کس جگہ کون سی رگ کو ایک مخصوص انداز میں چھیڑیں گے تو جسم کے کون سے حصے پر اس کا کیا اثر ہوگا۔

اپنے شکار کو ''اتنا'' غفیل کرنے کے بعد میں نے بڑی احتیاط سے اس کے گرتے بے سُدھ وجود کو تھام لیا کہ اس کے گرنے کی ''دھمک'' نہ گونجنے پائے۔ پھر بڑے آرام سے اُسے ایک طرف تاریکی میں ڈال کر میں نے اُبھی اندرونی سمت ایک کوریڈور کی جانب قدم بڑھایا ہی تھا کہ اُچانک مجھے ایک تیز چیخ کی آواز سنائی دی۔

چیخ کی یہ آواز بڑی ہولناک اور لرزہ دینے والی تھی۔ خود میں بھی ایک لمحے کو تھرا سا گیا۔ یہ کسی عورت کی چیخ تھی۔ میرا وجود سرتاپا جیسے سماعت بن گیا۔ اس چیخ کے فوراً ہی بعد

اب اس کے سسکنے کی آوازیں آنے لگیں۔

میں آواز کی سمت بڑھ گیا۔ ایک دو راہداریاں عبور کر کے میں ایک کمرے کے دروازے کی جھلک دیکھ کر رک گیا۔ رکنے کی وجہ تھی، کیوں کہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔

باہر راہداری میں روشنی تھی۔ وہ کمرا راہداری سے ہٹ کر نسبتاً الگ تھلگ مقام پر بنا ہوا تھا۔ اندر مجھے ایک سے زائد افراد کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ اندر سے اَب بھی کسی بدنصیب عورت کے رونے اور سسکنے کی آوازیں آرہی تھیں، آہنگ اور الفاظ اب اس عورت کے واضح طور مجھے بھی سنائی دے رہے تھے۔

''شدّے! لے لے میری جان۔ مار ڈال مجھ بدنصیب بوڑھی کو۔ پپ... پر... خ... خدا کا واسطہ ہے تجھے... میرے بچھڑے لعل کی جان مت... لے، اس کا پیچھا چھوڑ دے۔ مجھے ایک بار اپنے لختِ جگر سے مل لینے دے۔'' اس عورت کے داد و فریاد کرنے کی آواز اُبھری۔

''تیری جان کا کیا کروں گا میں؟ یہ تو نہ اس وقت میرے کام کی تھی جب تُو میرے نکاح میں آئی تھی اور نہ اب ہے۔'' وزیر جان کی بے رحم اور بے حس آواز اُبھری۔ وہ اسی لہجے میں آگے بولا۔

''ہاں! ایک فاش غلطی مجھ سے ضرور ہوئی تھی کہ تیرے سنپولیے بیٹے کو میں دودھ پلاتا رہا۔ کیا معلوم تھا مجھے کہ وہ ایک دن مجھے ہی ڈسنے کے لیے میری راہ تلے کانٹے بچھائے گا۔ کاش... میں اُسے اطفال گھر پھینکنے کے بجائے اس کا گلا ہی دبا دیتا مگر تو نے مجھے بھی دھوکے میں رکھا نویدہ بیگم! تُو نے... اَب انتظار کر... بہت جلد میرے آدمی تیرے بچھڑے لعل کی لاش کاندھوں پہ اُٹھائے یہاں آرہے ہوں گے۔''

''تیرے منہ میں خاک... شدے! میرا شہزی ایک بہادر اور غیور باپ کا بیٹا ہے۔ اس باپ کا بیٹا جو وطن پرست تھا۔ تیری طرح وطن فروش نہیں۔ آہ... تُو نے دھوکے اور میری مجبوری سے فائدہ اُٹھا کر مجھ سے شادی کی... اور... پھر...''

''بکواس بند کر اپنی!'' مجھے وزیر جان کی دہاڑ سنائی دی۔ اور میں یعنی شہزاد احمد خان المعروف شہزی کا کا! جس نے حالات دگرگوں کی گود میں راندۂ درگاں ہو کر پرورش پائی اور اپنی شناخت میں آج تک محو گرداں تھا، ایک دم سُن اور بے کل ہو کے رہ گیا۔

آج تک میں خود کو بڑا آہنی اَعصاب والا انسان سمجھتا تھا، مگر جانے کیا بات تھی کہ اپنے ماضی اور اپنے بچھڑے والدین کے حوالے سے کوئی بات کوئی واقعہ رونما ہوتا دیکھتا یا محسوس کرتا تھا تو جیسے میں ڈھنے لگتا تھا۔ جذبات کی ایسی یلغار سی اَعصاب اور حواس پر چھاتی چلی جاتی تھی کہ پھر میرا اپنے آپے میں رہنا محال ہو جاتا تھا۔

سماعتوں کو چھلنی کر دینے والی ان باتوں سے مجھے خوب اندازہ ہو گیا تھا کہ اندر میری اپنی سگی ماں مغلوب و مصلوب ہونے کے باوجود اپنے شوہر کو للکار رہی تھی اور اس سے میری زندگی کی بھیک بھی مانگ رہی تھی۔

میرے دل و دماغ میں دھواں سا بھرنے لگا۔ جی چاہا ابھی دہاڑتا چنگھاڑتا ہوا اندر کمرے میں جا گھسوں اور رزیل صفت وزیر جان کی گردن دبوچ کر اپنی بچھڑی ماں کے قدموں تلے رگڑ ڈالوں۔ مگر مصلحت اندیشی سے حالات کی نزاکت کچھ اور تقاضا کرتی تھی، میں اس وقت اپنے ایک بڑے دُشمن کی کچھار میں تھا۔ اور دُشمن بھی ایسا جس نے رشتوں کی پاکیزگی کو اپنی ذاتی غرض کا گھن لگا رکھا تھا۔

دیکھا جاتا تو بڑا ہی عجیب رشتہ تھا میرا اور وزیر جان کا۔ پتا نہیں وہ میرا کیا لگتا تھا؟ باپ تھا یا سوتیلا؟ کیا تھا وہ میرا؟ مگر اب میری سگی ماں کے ملنے پر مجھے اسی کا ایک آخری سہارا اور اُمید تھی کہ وہی میرے اصل باپ کے بارے میں بتا سکتی تھی، ابھی کچھ دیر پہلے ماں نے اسے للکارتے ہوئے کہا تھا کہ میرا باپ اس کی طرح وطن فروش نہیں بلکہ وطن کا وفادار تھا۔ تو گویا میری ماں ہی جانتی تھی کہ میرا اصل باپ کون تھا؟ اور کہاں تھا جبکہ باپ کے حوالے سے مجھے میرے دُشمن اور وزیر جان بھی جذباتی طور پر ٹھیس لگا چکے تھے۔ ابھی میری زندگی کے کئی گوشے مخفی تھے مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ اب ان کے آشکار ہونے کا وقت بھی شاید آن پہنچا تھا۔

میں نے سرِدست ان اُلجھنوں کو اپنے دل و دماغ سے جھٹکا۔ میں نے پستول ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ ساتھ ہی احتیاط کے پیشِ نظر میں نے بے ہوش ہرکارے کا پستول بھی اُچک لیا تھا۔

میں دیوار کے ساتھ چپکا ہوا بہت دھیرے دھیرے کھلے دروازے کی طرف کھسکنے لگا۔ اپنی ماں کو دیکھنے، ان سے ملنے کی آرزو میں عجیب کیفیات کا شکار ہو رہا تھا۔

اب پتا نہیں میں اسے اپنی بدقسمتی کہوں یا خوش نصیبی کہ کن حالات میں میرا اپنی ماں سے سامنا ہونے والا تھا۔ میں اسی طرح کھسکتا ہوا دروازے کے بالکل نزدیک آکے

رکا اور دھڑکتے دل کے ساتھ اندر جھانکا۔

یہ ایک بلند چھت والا بڑا کمرا تھا۔ ابھی میں اس کا نصف گوشہ ہی دیکھ سکتا تھا، اور جتنا مجھے نظر آیا تھا اس میں مجھے وزیر جان کی پشت اور اس کے دو آدمی دکھائی دیے تھے۔ اپنی ماں کو میں ابھی بھی نہیں دیکھ پایا تھا۔ شاید اس کی طرف وزیر جان کی پشت کی آڑ تھی۔ اور تب اچانک ہی اس کے ایک ساتھی کی نظر دروازے کی طرف اُٹھی تھی۔

وہ چونک کر حلق کے بل زور سے چلّایا۔ ”کون ہے وہاں؟“

یکلخت جیسے بم پھٹا۔ اب میرا پیچھے ہٹنا عبث تھا۔ میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت کی اور پستول لہراتا ہوا درانہ وار اندر داخل ہو گیا.... جب تک وزیر جان کے آدمی حرکت میں آتے، میں وزیر جان کو گن پوائنٹ پر لے چکا تھا۔

”خبردار! میں گولی چلا دوں گا اگر کسی نے ذرا بھی اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش کی تو..“

میری دھاڑتی آواز ہال کمرے میں گونجی۔ اندر چار افراد موجود تھے۔ اُنہیں اسلحہ نکالنے کا بھی موقع نہیں مل سکا، اور پھر وزیر جان دھیرے دھیرے میری جانب پلٹنے لگا۔

یہ بڑی عجیب سچویشن تھی اور سنگین بھی۔ ایک طرف میرے سینے میں لاوا بھرا ہوا تھا تو دوسری طرف میں ایک رقت آمیز جذباتی کیفیات سے بھی دوچار تھا۔ کیونکہ میری ترسی ہوئی متلاشی، بے چین اور ممتا کی ماری نظریں اپنی مغلوب و معلوب ماں کو دیکھنے کے لیے بے چین تھیں، کیونکہ جیسے جیسے وزیر جان، بالکل میکانیکی انداز میں میری جانب گھوم رہا تھا مجھے اس کی دوسری طرف فرش رسیدہ ایک عورت کی جھلک بھی نظر آنے لگی تھی۔

وزیر جان میری جانب پورا گھوم چکا تھا۔ مگر اس طرح کہ اس کی آنکھیں شعلہ بار اور چہرہ قہر آلود نظر آ رہا تھا۔ میں اس کے عقب میں اپنی ماں کو دیکھنے کے لیے بے چین تھا اور شاید انہی جذباتی کیفیات کی وجہ سے میں اپنے عقب سے بے خبر ہو گیا تھا اور اسی وقت کسی نے میری پشت پر زوردار ٹھوکر رسید کر دی۔ یہی وہ وقت تھا جب وزیر جان بھی پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا اور میں لڑکھڑاتا ہوا سیدھا اس عورت کے پاس جا پڑا جو فرش پر مجبور اور دل گرفتہ سی بیٹھی تھی۔ عجیب اتفاق تھا کہ میں سیدھا اس بدنصیب عورت کے پاس جا گرا تھا اور میرا سر اس کی گود میں تھا۔

پھر دو مہربان، محبت بھرے ہاتھوں کی آغوش نے کسی ٹھنڈی چھاؤں کی طرح مجھے جیسے اپنے اندر سمو لیا۔ پھر یوں ہوا جیسے میں کئی ثانیوں کے لیے دُنیا و مافیہا سے بے خبر سا ہو گیا۔ میری بے چھایا، دھوپ بھری، تپتی بلکتی اور دوڑتی بھاگتی بے قرار و بے سکون زندگی کو جیسے ایک ٹھنڈی میٹھی، محبت بھری و سکون آور ممتا کی ٹھنڈی چھاؤں میسر آ گئی ہو۔ میں جیسے دنیاوی غم و آلام سے بے فکر ہو گیا۔ چھ فٹ قد کاٹھ کا شہزاد احمد خان شہزی جیسے اس گود میں آ کے ایک معصوم بچہ بن کر رہ گیا۔ روح کیا ہوتی ہے اور روحانی سکون کسے کہتے ہیں، اس کا اندازہ مجھے آج ہو رہا تھا۔ قدرت نے ماں کی گود کو کیسی الوہیت عطا کی تھی، اس کا اندازہ مجھے آج ہو رہا تھا۔ اپنے یارِ بے بدل۔ اوّل خیر کو میں نے اکثر کہتے سنا تھا کہ ”شہزی کا کے! اے ماواں ٹھنڈیاں چھاواں ہوندیاں نیں۔“

آج اس کی بات مجھے کتنی سچی لگ رہی تھی۔

”پپ... پُتر... شش... شہزی!“ ایک یاس زدہ، تڑپتی اور درد سے کپکپاتی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی جس نے مجھے بھی تڑپا کر رکھ دیا۔ اس نرم میٹھی آواز نے تو خود ہی ثابت کر دیا کہ میں اس وقت سب سے زیادہ اور اس دنیا میں بے غرض محبت کرنے والی جس ہستی کی گود میں ہوں، وہ میری ماں ہی تھی۔ ظاہر ہے یہ خون ہی کی کشش تھی کہ وہ مجھے اور میں اُسے پہچان رہا تھا۔ تاہم وزیر جان کی زبانی تو میری ماں کو پتا ہی تھا کہ میں یہاں لایا جا رہا تھا (یرغمال بنا کر)

”ہا... ہا... ہا... کیسا فلمی سین ہے یہ... مزہ آیا۔“ اسی لمحے مجھے وزیر جان کے طنز سے بھرپور ایک شیطانی قہقہے کی گونج سنائی دی۔

”سالوں سے بچھڑے ماں بیٹے... آج ملے بھی تو کہاں۔ جب موت ان سے محض چند قدموں کے فاصلے پر ان کی منتظر ہے۔“

اس ابلیس صفت کی پُرغرور یاوہ گوئی نے ماں کو سسکا کر رکھ دیا۔ ماں کی اس سسکاری میں مجھے ایک غم آگیں اور بے بسی و حسرت زدہ سی آہ محسوس ہوئی۔ اور تب میں نے بہت دھیرے سے ماں کے دونوں ہاتھوں کو تھام کر چوما، پھر اُسے بھی آہستگی سے تھام کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے اُس شخص پر ایک نظر ڈالی تھی جس نے میری پشت پر وار کیا تھا۔ اس کے چہرے پہ عیارانہ مسکراہٹ تھی۔ وہ اچانک ہی کسی اندرونی گوشے سے نمودار ہوا تھا۔

ماں اَب میرے سہارے کھڑی تھی۔ ابھی تو مجھے اُس

کا پُرنور چہرہ اچھی طرح سے دیکھنے کا بھی وقت نہ ملا تھا۔

اب میری شعلہ بار نظریں، گھمنڈ سے گردن اکڑائے کھڑے وزیر جان پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے اس کی طرف بدستور گھورتے ہوئے کہا۔ ''وزیر جان! میں آ گیا ہوں۔ اب میری ماں کو یہاں سے جانے دے۔''

''اچھا!'' وہ رذیل بھویں اُچکا کر طنزیہ بولا۔ ''اُونٹ تو اب پہاڑ تلے آیا ہے۔ تمہاری کون کون سی دُکھتی رگ بتاؤں جو اس وقت میرے قبضے میں ہے۔ تمہاری ماں۔ تمہاری محبوبہ عابدہ۔ اور عنقریب تمہارا باپ۔ تم... تیسرے درجے کے گینگسٹرز کے آلۂ کار بن کر خود کو کیا سمجھنے لگے تھے؟ ہمیں زیر کر ڈالو گے۔ ہاں؟ تم نے ہمارا ٹھکانا زیرو ہاؤس اُڑا دیا۔ آرک ..... جیسے ہمارے اہم آدمی کو بھی بے دردی سے ہلاک کیا۔ اور... میری بیوی سعیدہ... اُس کے قتل میں بھی یقیناً تمہارا ہی ہاتھ ہوگا۔''

وہ بپھرے ہوئے لب و لہجے میں بولے جا رہا تھا۔ مارے جوشِ غیظ کے وہ ہانپ بھی رہا تھا۔

''تمہاری ماں کو میں کیسے جانے دوں... شہزی؟ جبکہ تم نے اس معاہدے کی بھی خلاف ورزی کی ہے کہ تمہیں یہاں زہرہ بانو کو بھی ساتھ لانا تھا۔ یہی نہیں تم نے میرے ساتھیوں...''

''معاہدے کی خلاف ورزی کی شروعات تمہاری طرف سے ہوئی تھی وزیر جان!'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''مجھے پتا تھا کہ تم اپنی فطرت کے عین مطابق کہیں نہ کہیں بلف ضرور کرو گے۔'' وہ عیاری سے بولا تو میں نے بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زہریلے لہجے میں کہا۔

''خود تمہاری اس لنگڑی لولی دلیل سے فریب کی بو آ رہی ہے، وزیر جان! رہی بات زہرہ بانو کی تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے کہ میں اس کا آلۂ کار ہوں، ایسا میری سرشت میں ہی نہیں ہے کہ میں کسی کا زرخرید بن کر زندگی گزاروں۔ ہاں! تم اسے دوستی کہہ سکتے ہو۔ اور سچ یہ ہے کہ جب اُسے تمہاری اس بزدلانہ شرط کا پتا چلا تو وہ اسی دوستی کی خاطر مجھے بھی ایک دوستانہ ''دھوکے'' میں رکھ کر میرے ساتھ چلی آئی تھی، لیکن راہ میں تمہارے بھیجے ہوئے زرخرید کتوں کی مداخلت نے سارا معاملہ ہی اُلٹا دیا۔''

''اپنی فضول بکواس اب بند کرو۔'' وہ چیخا۔ صاف نظر آتا تھا کہ وہ زچ ہو رہا تھا مگر طاقت کے نشے میں اس وقت وہ فرعون بنا ہوا تھا۔ ''میں اب تم سے ذرا بھی رعایت نہیں برتوں گا اور بہت جلد تمہارے ساتھیوں کا انجام بھی اب دور نہیں۔''

''میری ماں کو چھوڑ دو وزیر جان۔'' میں نے اس کی یاوہ گوئی پر دھیان دیے بغیر بظاہر سپاٹ لہجے میں کہا، تو وہ زہریلی مسکراہٹ سے بولا۔

''بس! ابھی سے منت سماجتوں پہ اُتر آئے؟ ابھی تو میں نے یہاں تمہارے سارے پیاروں کا جمگھٹا لگانا ہے شہزی۔''

''تم بے شک اپنا یہ شوق پورا کر کے دیکھ لینا۔ لیکن ابھی میری ماں کو چھوڑ دو۔'' میں نے بدستور اس کی طرف گھورتے ہوئے کہا تو اس بار ماں کی درد بھری آواز اُبھری۔

''شدے! تُو نے مجھے بہت دُکھ دیے ہیں، میں کون کون سے گنواؤں؟ مگر تیرے ایک ہی دُکھ نے آج تک میری کمر توڑے رکھی ہے، ایک ناسور کی طرح وہ دُکھ میرے وجود میں زہر بن کر اُتر رہا ہے۔ قرض تو میرا ابھی تجھ پر بہت ہے، میں تجھے معاف کر دوں گی، تو میرے بچے کو چھوڑ دے، میں نے اپنوں کی بہت جدائیاں سہی ہیں، اب مجھ میں مزید اس کی تاب نہیں رہی۔''

میری ماں کے ان جگر پاش الفاظ نے مجھے رُلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ وزیر جان کے سامنے میری زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی اور اپنی زندگی کی اُسے پروا نہیں تھی، یہی حال میرا تھا۔ مگر میں زندہ رہنا چاہتا تھا، ابھی تو میں نے بہت سی باتوں سے، بہت سے رازوں سے پردہ ہٹانا تھا۔ بس ایک بار، صرف ایک بار مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ آخر میرا اور وزیر جان کا رشتہ کیا تھا؟

میری ماں کی فریاد پر وہ ایک پُرغرور قہقہہ لگا کر زہریلے لہجے میں بولا۔ ''تو نے بھی تو مجھے اب تک دھوکے میں رکھا... بلکہ نہیں... تو نے تو مجھے ایک دھوکے سے بھی بڑے عذاب میں مبتلا کیے رکھا۔ کبھی اس سپنولیے کو میرا بیٹا کہتی رہی، پھر مکر گئی۔ کیا تو نہیں جانتی کہ خونی رشتوں کے سلسلے میں اس طرح کا تذبذب کس قدر جاں گسل عذاب میں مبتلا رکھتا ہے؟''

''مگر دھوکے کی ابتدا تیری طرف سے ہوئی تھی۔ میرا تجھ سے دل کھٹا ہو چکا تھا۔'' ماں نے اس سے کہا۔

میں دانستہ ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کو خاموشی سے سن رہا تھا۔ اس لیے کہ ان کے ماضی کا ایک

کردار میں بھی تھا۔ اور میرا اس میں کیا ''رول پلے'' تھا، وہ مجھے جاننا تھا۔

''بس! اب ان باتوں کو دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں تجھے اپنی زندگی سے نکال چکا ہوں۔ تیرے اور میرے بیچ جو رشتہ تھا، اُسے میں بہت پہلے ختم کرچکا ہوں۔ اب میں تیری صورت تک دیکھنا گوارا نہیں کرتا مگر شہزی والے معاملے کی وجہ سے مجھے یہ کرنا پڑا۔''

وہ بات ختم کر کے مڑا اور اپنے ایک آدمی کو مخصوص اشارہ کیا۔ وہ چابی بھرے کھلونے کی طرح حرکت میں آیا اور ماں کو مجھ سے الگ کر کے لے جانے لگا تو میں پھٹ پڑا اور حلق کے بل چیخا۔

''وزیر جان! میری ماں کو میرے ساتھ رہنے دو۔ تمہیں کیا ڈر ہے، ہم ابھی تمہاری قید میں ہیں۔''

ماں کو لے جانے والا آدمی رُکا نہیں تھا۔ البتہ وزیر جان میری جانب زہر خند نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

''ابھی تو میں یہاں تمہارے پیاروں کا جمگھٹا لگاؤں گا۔''

کہتے ہوئے اس نے اپنے آدمیوں کی طرف دیکھا ... وہ اس کی نظروں کا مطلب بھانپ کر میری جانب بڑھے۔ یہ تین تھے، ان کے ہاتھوں میں گنز تھیں۔ ایک نے اپنی گن کی نال سے مجھے ہلکا ٹہوکا دیا اور میں خونیں نظروں سے وزیر جان کو گھورتا ہوا ان کے ساتھ ہولیا۔

میں چاہتا تو گڑبڑ پیدا کرسکتا تھا مگر میری ماں اس رذیل کے قبضے ...... میں تھی۔ میری جارحانہ کارروائی، مشتعل وزیر جان کو کسی بزدلانہ حرکت پر اُکسا سکتی تھی۔

بہتر وقت اور موقع محل کی آس میں، میں ابھی اس کا ہر حکم بجالانے پر مجبور تھا اس لیے ان تینوں ہرکاروں کے ساتھ ہولیا۔

یہ تینوں میرے پیچھے چوکس انداز میں چلتے رہے اور ایک دو مختصر سی راہداریوں سے گزرنے کے بعد اس دروازے کی طرف بڑھے جو آخری سرے پر واقع تھا اور کھلا پڑا تھا۔

بلند چھت کا یہ کمرا دس بائی بارہ کا تھا، کھڑکی کے نام پر فقط ایک جھت سی تھی۔ دروازہ اب بند کردیا گیا تھا۔ باقی میرے علاوہ کمرا ہر شے سے عاری تھا اور صاف ستھرا بھی۔ میں ایک کونے میں جا کر دیوار سے پشت ٹکائے بیٹھ گیا۔

بات حقیقت تھی کہ اس وقت میرا دل و دماغ ماؤف سا تھا، ذہن بھانت بھانت کی سوچوں کے باعث شدید اُلجھاؤ کا شکار تھا۔

میری ماں کا دیدار مجھے نصیب ہوچکا تھا، وزیر جان میرے حقیقی باپ کے زندہ ہونے کی اُمید (چاہے دھمکی دینے کے زُمرے میں سہی) دلا چکا تھا مگر وہ کہاں تھا اور کس حال میں تھا؟ یہ ابھی مجھے نہیں معلوم تھا مگر کیا یہ کم تھا کہ ماں میرے سامنے تھی اور باپ کے زندہ ہونے کی نوید تھی، وزیر جان اور ماں کے درمیان ہونے والی گفتگو کی بازگشت ابھی تک میری سماعتوں میں گونج رہی تھی۔

اگرچہ ابھی میرے ماضی کے چند اہم گوشے اس گفتگو میں وا نہیں ہوئے تھے کہ جس کا مجھے ابھی تھوڑی دیر پہلے دیدار نصیب ہوا تھا، میری اصل ماں تھی مگر وزیر جان کا ماضی میں اس سے کس نوعیت کا تعلق تھا، وہ بلاشبہ میاں بیوی کا ہی تھا، لیکن پھر ایسا کیا ہوا تھا کہ ان دونوں کے بیچ کوئی دراڑ پڑ گئی؟ نیز پھر میرا حقیقی باپ یہاں کہاں فٹ ہوتا تھا؟ جبکہ بقول وزیر جان کے وہ زندہ بھی تھا، اور پھر وہ دھوکے والی بات کیا تھی جس نے ماں کا دل وزیر جان سے کھٹا کردیا تھا؟

ایسے کئی لاینحل قسم کے سوالات اور بعض خود ساختہ جواب میرے اُلجھے ذہن میں گڈمڈ ہوکر مجھے ایک شکست و ریخت کے عمل سے دوچار کررہے تھے۔ ماں سے مجھے بہت سی باتوں کا پتا چل سکتا تھا۔ وہ سب جانتی تھی۔ مگر میرا باپ اس وقت کہاں اور کس حال میں تھا، یہ صرف وزیر جان جانتا تھا۔ دل و دماغ عجیب سی کیفیت کا شکار تھا۔ یہ خوشی اپنی جگہ تھی کہ میں یتیم نہ تھا۔ میری ماں بھی تھی اور باپ بھی دنیا میں موجود تھا۔ لیکن مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ میں اسے اپنی بدقسمتی کہوں یا پھر خوش نصیبی کہ یہ ساری جان کاری ایسے نامساعد حالات میں ہورہی تھی۔

عابدہ کی طرف سے مجھے جس نئی پریشانی نے آن گھیرا تھا۔ اس نے تو مجھے جیسے اندر سے توڑ کر ہی رکھ دیا تھا۔ پرائے دیس میں وہ معصوم نجانے کون سی سازش کا شکار ہو چکی تھی۔

کیا یہ واقعی میرے دشمنوں کی ہی کارستانی تھی؟ کیا وہ اتنے اثرورسوخ والے تھے کہ یہاں بیٹھے انہوں نے جیسے ایک بٹن دبادیا اور عابدہ دیارِ غیر میں کسی نادیدہ جال میں پھنس گئی؟ شاید ایسا ہی تھا۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی ممتاز خان اور وزیر جان کی طرف سے مجھے اس طرح کی دھمکیاں ملتی رہی تھیں۔ جس میں وہ بڑے گھمنڈ کے ساتھ عابدہ کی طرف سے تہدید کیا کرتے رہتے تھے کہ وہ بہت جلد میرے پیاروں پر بھی اپنا شکنجہ تنگ کرنے والے ہیں اور ان کا پہلا شکار میری دُکھتی رگ یعنی عابدہ ہوگی۔

میں پہلے ان کی دھمکیوں کو گیدڑ بھبکیوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ لیکن آج ریڈیو پر چلنے والی بی بی سی اور سی این این کی خبروں نے میرے تو جیسے ہوش ہی اُڑا دیے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ میری جب بھی عابدہ سے ٹیلی فون پر بات ہوتی تھی تو وہ بھی اشاروں کنایوں میں انہی خدشات کا ذکر مجھ سے کرتی رہتی تھی مگر میں اسے معمول اور وہاں کے تازہ کار حالات (نائن الیون کے واقع سے پیدا ہونے والے حالات) پر محمول کرتا تھا۔ میرے تو سان گمان میں بھی نہ تھا کہ اس سازش کے تانے بانے میرے دُشمن کہاں سے کہاں ملا دیں گے۔

بلاشبہ مجھے اس سے اب اپنے دُشمنوں کے اثر و رسوخ اور طاقت کا اندازہ ہونے لگا تھا۔ بے شک اس وقت میں جن حالاتِ دگرگوں سے گزر رہا تھا، وہ ایک اچھے بھلے انسان کے حوصلے ڈھا دینے کے لیے کافی تھے مگر میں نے بھی ہمت ہارنا نہیں سیکھا تھا۔ اگر میرے دُشمن اور میری تقدیر مجھے اتنی دور تک لے جانے پر تلی بیٹھی تھی تو پھر میرے حوصلوں کے بادبان بھی بلند تھے۔

اسی کمرے میں اور انہی سوچوں میں کچھ وقت بیتا تو میرے ساتھ ایک عجیب اور حیرت انگیز واقعہ رونما ہوا۔ جس سے ایک بہتری کی اُمید پیدا ہوئی تھی لیکن میں ایک اُلجھن آمیز پریشانی کا شکار ہونے لگا تھا۔ پتا نہیں قسمت کو کیا منظور تھا؟ بس ایک حالات دگرگوں کا دھارا تھا جو مجھے بہائے.... چلا جا رہا تھا۔ یہاں سے وہاں اور اب جانے کہاں کہاں۔

مجھے جو تین افراد کمرے میں چھوڑ کر گئے تھے، تو ان کا تیسرا ساتھی سب سے آخر میں کمرے سے نکلا تھا۔ مجھے جانے کیوں اس کی یہ حرکت ''دانستہ'' سی محسوس ہوئی تھی یا پھر شاید یہ میرا وہم تھا۔ مگر جب وہ کمرے سے نکلنے لگا تو اس نے کمرے کا دروازہ بند کرنے کے دوران ایک عجیب سی نظر مجھ پر ڈالی تھی۔

شاید یہ اس کی طرف سے کوئی اشارہ تھا میرے لیے۔ پھر وہ دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی دروازہ دوبارہ وا ہوا تھا۔ میں چونک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

مجھے اسی مذکورہ آدمی کی باہر سے ایک ذرا جھلک نظر آئی تھی اور ابھی میں دروازے سے صرف چند قدموں کے فاصلے پر تھا کہ اچانک وہ غائب ہو گیا مگر جانے سے پہلے وہ کوئی شے اندر پھینک گیا۔

دروازہ لاک کرنے کی آواز اُبھری تو میں نے پُرسوچ انداز میں وہ شے اُٹھا لی جو کاغذ کا مڑا تڑا ٹکڑا تھا۔ میں اُسے کھول کے پڑھنے لگا۔

''مجھے اپنا گمنام ہمدرد سمجھو۔ پیغام پڑھ کر اسے پھاڑ کے ٹکڑے جیب میں رکھ لینا۔ آج رات تمہیں یہ گمنام ہمدرد لینے آئے گا۔ یاد رکھنا، صرف آج ہی کی رات یہ موقع ہے۔''

میرے چہرے پر شکنوں کا جال سا پھیل گیا۔ یہ کون میرا گمنام ہمدرد یہاں پیدا ہو گیا تھا؟

ذہن پر بہت زور دیا۔ مگر سمجھ نہ سکا نہ ہی کسی قسم کا اندازہ قائم کر سکا۔ یہ کون تھا، جو مجھے وزیر جان کی قید سے چھڑا لے جانا چاہتا تھا؟ مگر صرف میں کیوں؟ میری ماں بھی تھی۔ میں اس کے بغیر بھلا کیسے یہاں سے نکل سکتا تھا؟

مجھے وقت کا ٹھیک سے اندازہ نہیں ہو رہا تھا، تاہم لگتا تھا کہ دن کا ہی وقت اب ہو چلا تھا۔ میرے گمنام ہمدرد نے رات میں آنے کا مجھے اشارہ دیا تھا۔ لیکن وہ خلافِ توقع ڈیڑھ دو گھنٹے بعد ہی آ گیا۔

دروازے پر اچانک ہلکی کھڑ بڑ کی آواز اُبھری۔ میں پہلے یہی سمجھا کہ کوئی ہر کارہ ہو گا مگر یہ وہی تھا، میرا گمنام ہمدرد، مجھے اس کے وقت سے پہلے آنے پر حیرت ہوئی تھی، اگر یہ سچ تھا کہ یہ مجھے یہاں سے نکالنا چاہتا تھا تو پھر یہ اپنی جان پر کھیل کر ایک خطرناک رسک لے رہا تھا۔ مگر یہ تھا کون؟ ساتھی تو یہ وزیر جان کا تھا، تب پھر اچانک میرے ذہن میں ایک خیال کلک ہوا۔ کہیں یہ ثریا کے اس گنے چنے ٹولے سے تو تعلق نہیں رکھتا تھا، جنہوں نے ''اسپیکٹرم'' میں رہتے ہوئے اس کی بیخ کنی کی ٹھان رکھی تھی اور کسی موقع کے منتظر تھے؟ کیونکہ ثریا نے مجھے اپنی موت سے قبل اتنا ضرور بتایا تھا کہ مذکورہ تنظیم کی اصلیت اور اس کے خفیہ مکروہ عزائم جاننے کے بعد اس کے چند اور قریبی ساتھی اسپیکٹرم سے متنفر ہو چکے تھے۔ مگر خوف زدہ بھی تھے اور خود کو ایک نادیدہ تارِ عنکبوت میں پھنسا ہوا محسوس کرنے لگے تھے۔ ممکن ہے میرا یہ ''گمنام ہمدرد'' انہی میں سے ایک ہو؟

وہ اندر آ گیا، اس کا انداز چوروں کا سا تھا۔ میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ سرگوشی میں بول پڑا۔ ''زیادہ باتیں مناسب نہیں ہوں گی ہمارے لیے۔ تم تیار ہو ناں؟''

''میں تیار ہوں۔ مگر اپنی ماں کے بغیر میں یہاں سے کیسے نکل سکتا ہوں؟'' میں نے یہ غور اس کے چہرے پہ نظریں جماتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا تو وہ بھنچی بھنچی آواز

میں بولا۔

"ابھی اپنی تو فکر کرو پہلے۔ تم یہاں سے نکلو گے تو تمہاری ری ماں بھی نکال لی جائے گی یہاں سے۔" مجھے اس کی بات سے سخت اختلاف تھا۔

"نہیں، میں ماں کے بغیر یہاں سے ایک قدم بھی باہر نہیں نکالوں گا۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ میں خود یہاں سے نہیں نکل سکتا؟ میں تو ماں کی وجہ سے مجبور ہو کے چپ ہوں، مگر موقع کے انتظار میں ہوں۔"

"لیکن تم یہ موقع خود ضائع کر رہے ہو۔"

"تم ہو کون؟" میں نے بالآخر اس سے پوچھ لیا۔

"تمہارا ایک ہمدرد۔" وہ مختصراً بولا۔

"یہاں ایک بھیڑیے کی کچھار میں میرا ایسا کون ہمدرد آ گیا؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تم وقت ضائع کر رہے ہو۔"

"میں ماں کے بغیر یہاں سے نہیں نکلوں گا۔ اگر تم میرے اتنے ہی خیر خواہ ہو تو میرے ساتھ میری ماں کو بھی یہاں سے..."

"مجھے بات کرنا پڑے گی۔" وہ میری بات کاٹ کر بولا اور پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ چلا گیا۔ پل کے پل مجھے کسی گہری سازش کی بو محسوس ہونے لگی۔ جانے کیوں میری چھٹی حس مجھے خبردار کرنے لگی۔ "شہزی کا کے! تیرے ساتھ ڈبل گیم کھیلنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ہوشیار اور چوکنے رہنا۔"

اس سرزمین پر فی الوقت میرے دو اہم دُشمن تھے۔ ایک چوہدری ممتاز خان اور دوسرا وزیر جان۔ اور سچی بات تھی کہ مجھے ممتاز خان سے زیادہ وزیر جان سے چوکنا رہنا پڑتا تھا، اس کی وجہ یہ بھی کہ یہ میرا مکار اور شاطر ترین دُشمن تھا۔ بقول میرے یار اول خیر کے۔

"شہزی کا کے! مکار اور عیار دُشمن زبردست نہ ہوتے ... ہوئے بھی اس دُشمن سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے جو زبردست ہو۔"

سچ بھی یہی تھا کہ چوہدری ممتاز کی کیٹیگری الگ تھی اور وزیر جان دوسری طرح کا آدمی تھا۔

میرا وہ گمنام ہمدرد شاید میرے سلسلے میں کسی سے "ڈکٹیشن" لینے گیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اب شام ہو چلی تھی۔ دروازے میں پھر کھڑبڑ ہوئی۔ میں یہی سمجھا کہ میرا وہ گمنام ہمدرد "ڈکٹیشن" لے کر آ چکا ہے۔ مگر اندر آنے والے کسی اور ہرکارے کو دیکھ کر میں تھوڑا چونکا تھا۔ اس کے ہمراہ وہ خبیث بھی تھا، جس نے میری پشت پر لات مار کر گویا میری ساری مہم جوئی پر لات مار دی تھی۔ اس وقت بھی اس کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔ اس کا فتح سے مسکراتا چہرہ دیکھ کر صاف اندازہ ہوتا تھا کہ اُس بدبخت کو اپنی کامیاب "کارگزاری" پر وزیر جان کی طرف تگڑا انعام ملا ہے، نہیں تو شاباشی تو ضرور ہی ملی ہوگی۔

اس کے ہاتھ میں گن تھی، جو اس نے مجھ پر تانی ہوئی تھی، جبکہ اس کے دوسرے ساتھی کے ہاتھ میں کھانے پینے کا کوئی برتن تھا۔ وہ غیر مسلح تھا۔ گن بردار تو مجھ پر نال سیدھی کیے وہیں دروازے پر ہی چوکس کھڑا رہ گیا جبکہ اس کا غیر مسلح ساتھی میرے بالکل قریب آ گیا تھا اور کھانے کے برتن میری طرف بڑھا دیے۔

یہی وہ وقت تھا جب میری اس سے نظریں چار ہوئیں اور مجھے ایسا لگا جیسے یہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی پیغام دینا چاہ رہا ہو۔ میں اندر سے متحیر تو ہوا تھا مگر ظاہر نہ ہونے دیا کیونکہ میری مہم جوئی کو "سبوتاژ" کرنے والا مجھے اپنی تیکھی اور غصیلی نظروں میں لیے ہوئے تھا، میں چاہتا تو اس پر قابو پانے کی کوشش کر سکتا تھا مگر کچھ سوچ کر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

ٹھیک اسی وقت جب وہ مجھے کھانے کے برتن تھما رہا تھا تو اس نے اپنے ہاتھ کی ہتھیلی سیدھی کی، مقصد مجھے کچھ دکھانا تھا۔

"آج رات جاگتے رہنا۔ میں آؤں گا، ثریا۔"

میں دنگ رہ گیا۔ وہ واپس لوٹ گئے اور میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ مجھے تو یہ ساری گنگا ہی اُلٹی بہتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ یہ کوئی اور تھا۔ یہ بھی ہمدرد قسم کا ہی لگا تھا۔

مگر اس نے ثریا کا نام استعمال کیا تھا۔ کیا یہ میری تسلی کے لیے ایک اشارہ تھا کہ میں اس پر بھروسا کروں؟ ذہن پر تھوڑا زور دینے کے بعد مجھے یہی لگا تھا کہ یقیناً اس کا تعلق آنجہانی ثریا کے اُن گنے چنے افراد پر مشتمل متنفر گروپ سے تھا، جس کی خاطر ثریا نے اپنی جان، اسپیکٹرم کے درندوں کے سفاک ہاتھوں میں بڑی جان کنی کے عالم میں گنوا دی تھی۔ اور اس بے چاری کو مجھے بھی بتانے کا کچھ موقع نہ مل سکا تھا۔

حالانکہ وہ خود بھی مجھ سے مدد کی خواہاں تھی اور اب اس کے ساتھی بھیڑیوں کے درمیان رہتے ہوئے اپنی جان کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ ذرا سے شبے پر اسپیکٹرم کے

سفاک درندے اُن کا بھی ثریا جیسا بھیانک حشر کر ڈالتے۔

وہ شاید ثریا کے حوالے سے میری مدد کے منتظر تھے اور اگر ایسا تھا تو ممتاز خان سمیت وزیر جان کی بھی جڑیں ہلا کر رکھ دیتا۔ لیکن سوچنے کی بات یہ تھی کہ یہ تو ثریا کے گروپ کا تھا تو پھر میرا وہ ''گمنام ہمدرد'' کس خانے میں فٹ ہوتا تھا؟ کیا وہ بھی اسی کا ساتھی تھا؟ اس میں مجھے جانے کیوں ابہام محسوس ہوتا تھا۔ یہ دونوں ہی میرے ہمدرد تھے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ اس میں میرا اصل اور سچا ''ہمدرد'' کون تھا؟

سوچ سوچ کر میرا دماغ پاگل ہونے لگا۔ گویا آج کی رات بڑی پُراسرار اور بھیدوں بھری تھی۔ میں کس ہمدرد کی اُنگلی پکڑوں؟ میرا آخری فیصلہ ثریا کا حوالہ دینے والے ہمدرد کے حق میں ہی ہوا۔

کھانے کو میرا جی نہیں چاہا تھا۔ میں نے کھانے کے برتن ایک طرف کر دیے اور آنے والے اس وقت کا انتظار کرنے لگا جسے سر پہ آنے سے قبل ہی میں ایک خطرہ سا محسوس کرنے لگا تھا... یعنی اگر میرے یہ دونوں ہمدرد الگ الگ ہوئے تو معاملہ سنسنی خیز ہی نہیں بلکہ گمبھیر بھی ہو سکتا تھا۔ اور مجھے نہیں لگتا تھا کہ ان دونوں ہمدردوں کے بیچ کوئی ایسا تعلق ہوگا۔ صورت حال پریشان کن ہوگئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے اگلا قدم کون سا اُٹھانا چاہیے؟

وقت انہی پریشان کن سوچوں میں گزرتا رہا۔ حتیٰ کہ شام سرک آئی۔ اس وقت تو جیسے میری نظریں بھی ساعت ہی بنی ہوئی تھیں کہ دروازے پر ہلکی سی آہٹ اُبھری۔ میرے دل کی دھڑکن، شاید کسی انجانے خطرے کو محسوس کر کے یکلخت تیز ہوگئیں۔ دروازہ آہستگی سے کھلا۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا اور یک ٹک دروازے کی طرف دیکھنے لگا کہ آخر میرا کون سا ہمدرد پہلے نمودار ہوتا ہے؟

پہلے وہی آیا تھا، جس کے لیے میرا دل گواہی دیتا تھا کہ یہ میرا سچا ہمدرد ہے۔ یہ وہی تھا، جس نے ثریا کا حوالہ استعمال کیا تھا۔

''جلدی نکل چلو۔'' اس نے آتے ہی سرگوشی میں کہا۔ میں اپنے اعصابی ارتعاش پر قابو پاتے ہوئے اسی کی طرح دھیمی آواز میں بولا۔

''تمہیں اپنی شناخت کروانا ہوگی پہلے۔'' میری بات سُن کر اس کے چہرے پہ حیرت کے آثار نمودار ہوئے، وہ شاید یہ سمجھے ہوئے تھا کہ میں اس موقع سے فائدہ اُٹھاؤں گا اور خوشی خوشی اس کی اُنگلی تھامے اس کے ساتھ چل پڑوں گا۔

''کیا تم نہیں جانتے کہ میں کس قدر خطرناک رسک لیے تمہیں اور تمہاری ماں کو یہاں سے نکالنے کا بندوبست کیے ہوئے ہوں اور تم... کیا ثریا کا حوالہ کافی نہیں تھا؟''

اس کی ''ماں'' والی بات پر میں چونکے بنا نہ رہ سکا تھا۔ یہی سچا ہمدرد تھا میرا۔ میں نے کہا۔ ''یہ تمہارا مجھ پر احسان عظیم ہوگا، لیکن پہلے ذرا غور اور سکون سے میری بات سنو... اور صرف میرے ایک سوال کا جواب دے دو۔'' میں نے اس سے پہلے والے ہمدرد کے بارے میں ذکر کیا اور پوچھا کہ کیا وہ بھی تمہارا ساتھی ہے؟ تو اسے میری بات پر نہ صرف حیرت کا جھٹکا لگا بلکہ اُس کے چہرے پہ گہری تشویش کے آثار نمودار ہوتے چلے گئے۔ جس سے خود مجھے بھی خطرے کی بو آنے لگی اور تھوڑی دیر پہلے میں جس سنسنی خیز معرکے کی توقع کیے بیٹھا تھا، لگا کہ وہ اب تب میں ہونے ہی والا تھا۔ کیونکہ جس سے اب ہم دونوں کو ہی خطرہ محسوس ہونے لگا۔ وہ بھی کسی وقت یہاں پہنچنے والا تھا۔ اور پھر ٹھیک اسی وقت دروازہ ہولے سے چرچرایا۔ ہم دونوں نے بیک وقت دروازے کی طرف دیکھا تھا۔

☆☆☆

وہ وہی تھا۔ ہم دونوں کے لیے خطرناک مگر اس وقت وہ خود بھی خطرے سے دوچار تھا اس لیے مجھے نہیں لگتا تھا کہ ہم سے کسی قسم کا ''پنگا'' لینے کی کوشش کرتا۔ ممکن ہے کہ وہ ہمارا راستہ کھوٹا کرنے کی کوشش کرتا، گویا اس وقت صورتِ حال، نازک، پیچیدہ ہوگئی تھی۔

تاہم میرے ساتھ اسے دیکھ کر وہ بھی چونکا تھا۔ لامحالہ وہ میرے اصل اور سچے ہمدرد کو دیکھ کر یہی سمجھا ہوگا کہ یہ کوئی ہرکارہ ہی ہے۔

''تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟''

میرے متوقع طور پر ''ڈمی'' ہمدرد نے قدرے تحکمانہ... دُرشتی کے ساتھ اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ اور مجھے یہ اندازہ لگانے میں چنداں دیر نہ لگی کہ میرے ڈمی ہمدرد کو میرے سچے ہمدرد پر یقیناً ''تنظیمی'' فوقیت حاصل تھی، اس نے اپنی جیب سے پستول بھی نکال لیا تھا۔ اور اس کا رُخ بھی اُسی کی طرف تھا۔ پستول کی نال پر سائلنسر چڑھا ہوا تھا۔ کسی ممکنہ خوں ریزی کے تصور سے ہی رگوں میں میرے خون کی گردش تیز ہوگئی تھی۔

میں نے جارحانہ حرکت کا سوچا اور اسی وقت میرے اصل ہمدرد نے ایک ایسی دانشمندانہ چال چلی کہ میں خود اس کی ذہانت پر حیران رہ گیا، یہ تو شکر ہوا کہ میں اسے اس کے

بارے میں بتا چکا تھا۔ ورنہ صورتِ حال مختلف ہوتی۔ اس نے خود کو ظاہر کیے بغیر مؤدبانہ کہا۔

”سر! میں باس کے حکم سے ہی یہاں آیا تھا۔“

”ایسا باس کا کیا حکم تھا کہ تمہیں اس طرح نہتے ایک خطرناک قیدی کے پاس آنا پڑا؟“

”یہ میں آپ کو اس کے سامنے تو نہیں بتا سکتا سر! مگر کیا آپ بھی باس کے کسی ایسے ہی حکم...“ اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ اسی وقت کمرے کے دم بہ خود ماحول میں ہلکی ”چز“ کی آواز اُبھری اور میرا اصل ہمدرد، یعنی ثریا کا ساتھی بغیر کوئی آواز نکالے وہیں ڈھیر ہو گیا۔ میرے ظالم، ڈمی ہمدرد نے اس بے چارے کی پیشانی پر روشندان بنا دیا تھا۔ اس ہلاکت سے صاف ظاہر ہو چکا تھا کہ ان دونوں کا آپس میں ایسا کوئی تعلق نہ تھا سوائے تنظیمی حوالے کے۔

مجھے اس پر صد افسوس ہوا۔ مگر اب اصل کھیل شروع ہونے والا تھا۔ آتشی اسلحے کا نہیں بلکہ دماغ کا۔

”یہ کیا کہنے آیا تھا تم سے؟“ میرے ڈمی ہمدرد نے تشکیک بھرے لہجے میں پوچھا۔

اس عجیب مگر حساس صورتِ حال پر وہ بھی مجھے خاصا اُلجھا ہوا سا دکھائی دینے لگا تھا۔ بہرحال ان سنگین اور مخدوش لمحات میں مجھے بھی اس سفاک انسان سے ڈر محسوس ہوا کہ یہ کسی بھی وقت مجھے بھی اپنے ”خاموش“ پستول کی گولی... کا نشانہ بنا سکتا ہے۔ لہٰذا مجھے بھی وہی چال چلنا پڑی۔ جواباً بولا۔

”یہ مجھ سے کوئی خفیہ ڈیل کرنے آیا تھا۔“

”کیسی ڈیل؟“ وہ بہ دستور میری طرف اشتباہ انگیز نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔ میں نے پُرسکون اور بظاہر بے پروا نظر آتے ہوئے کاندھے اُچکا کر کہا۔

”بس! یہی کہہ رہا تھا کہ اگر میں باس کی بات مان لوں تو فائدے میں رہوں گا۔“

”کون سی بات؟“

”وہ بتانے لگا تھا، مگر تم آ گئے، اور...“ میں نے دانستہ اپنا جملہ اُدھورا چھوڑ دیا۔

وہ چند ثانیے اپنے ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔

”ٹھیک ہے، چلو اب، میں تمہیں یہاں سے نکال لے جانے کے لیے آیا ہوں۔“

مجھے اس پر بُری طرح طیش آ رہا تھا۔ یہ میرے کسی دُشمن کا ٹاؤٹ ہی لگتا تھا اور کسی خفیہ ٹاسک پر عمل پیرا تھا۔ کوئی بعید نہ تھا کہ یہ میرے (ثریا والے) ہمدرد کا معاملہ سمجھ

چکا ہو۔ اس لیے اس نے اس سلسلے میں زیادہ پوچھ تاچھ سے کام نہیں لیا تھا۔

میں نے پل کے پل سوچا۔ اگر یہ میرے دشمنوں کا آدمی ہے تو ایسا ہی سہی۔ مجھے محتاط رہتے ہوئے اس موقع سے فائدہ اُٹھالینا چاہیے۔ پتا تو چلے یہ کیا کرتا ہے اور کہاں تک جاتا ہے؟

''میں تمہارے ساتھ جانے پر تیار ہوں۔''

''گڈ! اب کی نا عقلمندوں والی بات۔ آجاؤ میرے ساتھ۔'' وہ بولا۔

مجھے اس سے یہ بھی خدشہ تھا کہ مجھے یہ گن پوائنٹ پر بھی لے جاسکتا تھا۔ تاہم اس میں رسک ہوتا اس کے لیے۔

میں اس کے عقب میں چلتا ہوا کمرے سے نکلا۔ اس دوران میرے اندر دھکڑ پکڑ مچی ہوئی تھی۔ میں اس کے عقب میں چلتا بہ غور اس کی حرکات وسکنات کا بھی اندازہ لگانے کی کوشش کررہا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر اچنبھا ہوا کہ وہ اس طرح چلا جارہا تھا جیسے اُسے کسی قسم کا کوئی ڈر یا خوف تھا ہی نہیں۔

میرے اندر جو کھٹک پیدا ہوئی تھی وہ اب پہلے سے زیادہ قوی ہوگئی تھی۔ مجھے ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے سب کچھ سوچی سمجھی اسکیم کے تحت کیا جارہا ہو یا پھر یہ میرا وہم تھا، کیونکہ اس عمارت کا محل ووقوع اس کا دیکھا بھالا تھا۔

''ایسے، تو ایسے ہی سہی۔'' میں نے اندر ہی اندر ایک جارحانہ فیصلہ کیا اور اس کے ساتھ چلتا ہوا کسی خفیہ دروازے سے باہر آگیا۔

باہر رات کی تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ روشنی بھی تھی۔ سامنے ایک کار کھڑی تھی۔ باہر آکر میں اپنے گردو پیش سے مزید چوکنا ہوگیا۔ میری یہی محتاطی میرے کام آگئی۔ کیونکہ اسی وقت دائیں جانب مجھے ہلکی سرسراہٹ کا احساس ہوا اور عقب میں بھی مجھے کسی کی آہٹ سنائی دی۔ تب ہی دو... سایوں کو میں نے خود پر جھپٹتے ہوئے دیکھا، میں نے بھی پھرتی کے ساتھ بروقت جھکائی دی تھی۔ دونوں نے کسی کند آہنی شے سے مجھ پر وار کرنے کی کوشش چاہی تھی اور وار ایک دوسرے پر کرڈالا۔ ان کی کراہ آمیز چیخ اُبھری تھی۔ ڈمی ہمدرد پھرتی سے پلٹا تھا۔ میں نے ان دونوں کو کاندھے کی ٹکریں رسید کرکے پرے دھکیلا ہی تھا کہ میرے ڈمی ہمدرد نے مجھ پر وہی سائلنسر لگا پستول تان لیا اور غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔

''اب کوئی حرکت مت کرنا۔ شور پڑ گیا تو ہم سمیت تمہارا معاملہ بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔''

''معاملہ تو میرا اب بھی خطرے میں ہے۔ تم میرے ہمدرد نہیں ہوسکتے۔ کون ہو تم؟''

میں بھی اس کی طرف دیکھتے ہوئے ترکی بہ ترکی جواباً بولا۔ اس اثنا میں اس کے دونوں ناکام گھات لگائے ساتھیوں نے بھی پستول نکال لیے تھے۔ ان کی چالا کی مجھے کچھ کچھ سمجھ آرہی تھی کہ یہ لوگ مجھے کسی مقصد کے تحت اتنا غفیل کرکے ہی یہاں سے لے جانا چاہتے تھے۔

''ہم تمہارے ہمدرد ہی ہیں۔ مگر تم غلط فہمی میں پڑ گئے ہو۔ اب چلو۔ اس سے پہلے کہ وزیر جان کے کسی آدمی کی ہم پر نظر پڑ جائے۔''

''ہمدرد اس طرح تاریکی میں اپنے ساتھیوں کو چھپا کر حملہ نہیں کیا کرتے۔'' میں نے بلاخوف کہا۔ ''اگر تم میرے اتنے ہی ہمدرد ہو تو میری ماں کو بھی یہاں سے نکالنے کا بندوبست کرو۔''

میری بات پر وہ جیسے زچ ہوکر اپنے دانت پیسنے لگا۔ بالآخر اس نے اپنے پستول کا سیفٹی کیچ ہٹالیا۔ میرا دل یکبارگی ....زور سے دھڑکا۔

''اب ہاں یا ناں میں جواب دینا ہوگا تمہیں شہزی! ہم خود پر زیادہ رسک نہیں لے سکتے۔ ہمارے ساتھ چلتے ہو یا پھر میں تمہیں ادھر ہی گولی مار کے چلتا بنوں؟''

میں نے پل کے پل کچھ سوچا۔ مجھے گولی مارنے کا مقصد تو بہرحال ان کا نہیں ہوسکتا تھا۔ تاہم خطرے میں ان سے کچھ بعید بھی نہ تھا۔

''چلو، میں چلتا ہوں۔'' میں نے کہا اور ان کے ساتھ چل پڑا۔ میں دانستہ ڈمی ہمدرد کے قریب ہوگیا تھا۔ اس کے دونوں ساتھی بھی میرے دائیں بائیں چل رہے تھے، میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور اسی سرعت کے ساتھ میرا ذہن بھی کام کررہا تھا۔

کار کے قریب پہنچ کر جیسے ہی اس کے ایک ساتھی نے کار کا دروازہ کھولا۔ میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اسے ایک لات رسید کی اور اس کے دوسرے ساتھی کے پیٹ میں کہنی رسید کردی۔ اس کے حلق سے کراہ سے مشابہ آواز اُبھری تھی۔

مجھے ڈمی ہمدرد کی غصیلی غراہٹ سنائی دی، وہ شاید مجھ پر حملے کے لیے پر تول رہا تھا، تب تک میں نے تکلیف سے دہرے ہوتے اس کے ساتھی کو دبوچ کر اس کی طرف زور سے دھکیل دیا۔ وہ اپنے ہاتھ میں پکڑا سائلنسر لگا

پستول تو لتا ہی رہ گیا۔ ہم دونوں کی ہی کمزوری یہ تھی کہ رات کی خاموشی میں بغیر شور شرابے کے ''کام'' چلالیا جائے۔

شاید اسی سبب مجھے ان کے مقابلے میں زیادہ مواقع مل رہے تھے کیونکہ قیاس سے اب تک یہ بات طے ہو چکی تھی کہ ان کا مقصد مجھے ہلاک کرنا بہرحال نہ تھا۔ میں بھی ایک کے بعد ایک ان مواقع سے فائدہ اُٹھاتا چلا گیا۔

کار کا دروازہ کھولنے والا ساتھی جب تک سنبھلا، میری داہنی لات حرکت میں آچکی تھی جو اس کے پستول والے ہاتھ پر لگی۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کار کے کھلے دروازے سے اندر جا گرا۔

وہ اسی جانب لپکا کہ اپنا پستول اُٹھا سکے، میری رگوں میں اس وقت جیسے پارا دوڑ رہا تھا۔ ڈمی ہمدرد اپنے اُوپر پڑے ساتھی کو سنبھال کر اپنے خاموش پستول سے مجھے نشانہ بنانے لگا۔ مجھے اس سے زیادہ موقع نہیں مل سکا۔ ''چز'' کی ہلکی آواز اُبھری اور یکلخت مجھے یوں لگا جیسے میرے دائیں بازو میں کسی نے گرم تپتی ہوئی سلاخ گھونپ دی ہو۔ میں بازو کی تکلیف کو دانتوں تلے بھینچ کر اپنی دائیں ٹانگ کی ایڑی پر پھرکی کی طرح گھوم گیا اور میری بائیں ٹانگ ڈمی کی تھوڑی پر لگی، اس کا جبڑا بری طرح متاثر ہو گیا۔ یہ ''انٹر سرکل کک'' تھی۔ تنگ جگہ پر بھی اس کا استعمال سودمند رہتا ہے۔ رینجرز ٹریننگ سینٹر میں مجھے اس میں خاصا ماہر کر دیا گیا تھا۔

ڈمی ہمدرد کا پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا۔ میں اُسے اُٹھانے کو لپکا، عقب سے اس کے دونوں ساتھی مجھ پر پل پڑے۔ اور مجھ سمیت ہی احاطے کی گھاس پر رگید گئے۔ ایک نے تو میرے مضروب بازو کے زخم کو چھیل کر رکھ دیا۔ اذیت کی شدت تلے میرے منہ سے پہلی بار ایک تیز کراہ خارج ہوئی۔ یہ لوگ بھی لڑائی بھڑائی میں کم نہیں تھے۔ لیکن ابھی تک میں یہ اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ یہ تھے کون لوگ؟ وزیر جان کے ہاں ان کی دوستانہ انداز کی موجودگی سے فقط یہی پتا لگتا تھا کہ ان کا کسی نہ کسی حوالے سے یہاں تعلق بنتا تھا۔

میں ایک بار پھر زخم کی تکلیف پی گیا اور ایک فُل پنچ مدِمقابل کی ناک پر رسید کر دیا۔ وار بھرپور تھا۔ وہ آواز نکالے بغیر وہیں ڈھیر ہو گیا۔

میرے زخم کی دہری تکلیف نے مجھے ایک جنونی طیش میں مبتلا کر کے رکھ دیا تھا۔ میں بپھر گیا تھا، ایک کو ناکارہ کرنے کے بعد میں نے دوسرے کے پیٹ اور سینے کے بیچ کی نازک جگہ پر اپنا گھٹنا رسید کر دیا۔ وہ تکلیف کی شدت سے دُہرا تہرا ہو کر گیند بن گیا، میں نے اُسے ٹھوکر مار کے پرے کر دیا۔ میں ڈمی کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کا چہرہ میری لفٹ کک پڑنے کے باعث خون سے لتھڑا ہوا نظر آنے لگا تھا اور وہ جلد سے جلد اپنا پستول تلاشنا چاہتا تھا، جو اسے مل نہیں رہا تھا۔ مجھے ''فارغ'' دیکھ کر وہ کار کی ڈرائیونگ سیٹ کی جانب بھاگا۔

گویا میرے ہاتھوں اپنے ساتھیوں کا انجام دیکھ کر وہ خوف زدہ ہو گیا تھا۔ میں بھی جوشِ غیظ سے غراتا ہوا اس کی طرف دوڑا۔ وہ دروازہ کھولنے والا تھا کہ میں نے اُسے چھاپ لیا۔

مجھ پر جوشِ جنوں طاری تھا، میں نے اُسے گردن سے دبوچ کر کار کے اندر ہی گھسیڑ دیا اور زخمی ہونے کے باوجود اسے ساتھ والی سیٹ پر دھکیلا۔ اگنیشن میں چابی تھی۔ میں نے کار اسٹارٹ کر دی۔ ڈمی نے مچلنے کی کوشش چاہی، میں نے اس کا سر بالوں سے پکڑ کر زور سے ڈیش بورڈ پر دے مارا۔ اس کے حلق سے بھیانک چیخ نکلی، وہ تڑپا، میں نے اس کے بال نہیں چھوڑے اور پہلے سے بھی زیادہ زور سے اس کا سر ڈیش بورڈ پر مارا، اس کا چہرہ لہولہان ہو گیا، جب اس نے اپنے ہاتھ پیر چھوڑ دیے تو میں نے کار آگے بڑھا دی۔ عمارت سے چند فرلانگ آگے جا کر کار ایک جگہ روک دی اور اس کی گردن دبوچ لی۔ پھر وحشتِ لہو رنگ لہجے میں بولا۔

''تمہارا کھیل ختم ہو گیا۔ میری ماں کی زندگی داؤ پہ لگی ہوئی ہے اور میں یہاں سے زیادہ دور نہیں جا سکتا۔ میں صرف سچ سنوں گا۔ کون ہو تم؟ اور کس کے ایما پر مجھے یوں یرغمال بنا کر لے جا رہے تھے۔''

وہ جواب دینے کے بجائے اپنے حلق سے غوں غاں کی آواز نکالنے لگا۔ میں سمجھ گیا وہ شدید زخمی ہونے کی مکاری... کر رہا تھا۔ میں نے دوبارہ اس کا لہولہان چہرہ ڈیش بورڈ پر رسید کر دیا اور غراہٹ سے مُشابہ آواز میں بولا۔

''بس اب میں آزاد ہو چکا۔ یہی میرے لیے کافی ہے، یہ تو تم بھی جانتے ہو گے کہ یہ اتنا موقع بھی میرے لیے بہت ہے۔ نہ ہی میرے پاس وقت ہے کہ تم پر ضائع کروں۔ زندہ بھی نہیں چھوڑوں گا۔ ہاں سچ بولو گے تو تمہیں ہلاک نہیں کروں گا، یہ میرا وعدہ ہے۔ آخری موقع دیتا ہوں۔ بتاؤ تم کس کے آدمی ہو؟''

''مم... مم مم... ممتاز خان کا۔'' بالآخر اس نے

بتایا۔

"جھوٹ۔ سچ بتاؤ۔"

"مم...مم میں... سچ بتا رہا ہوں۔"

"ممتاز خان اور وزیر جان میں کیا فرق ہے۔ دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ میں تو پہلے ہی ان کے قبضے میں تھا۔ اُسے یہ حرکت کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟"

"وتھی ضرورت۔" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ "بب... بے شک وزیر جان اور ممتاز خان ساتھی ہیں لیکن... تمہارے... معاملے میں ان دونوں کے درمیان واضح اختلاف ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے پُرسوچ انداز میں بھویں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

"تم ان دونوں کا ہی شکار ہو لیکن... اس کی نوعیت مختلف ہے۔ ممتاز خان تمہیں یرغمال بنا کے زہرہ بیگم (بیگم صاحبہ) کو جھکانا چاہتا ہے۔ وہ اس کی ساری جائیداد اپنے نام لکھوانا چاہتا ہے۔"

"وہ یہ کام وزیر جان کے پاس بھی بہ آسانی انجام دے سکتا تھا۔ بھلا اُسے یہ فریب کھیلنے کی کیا ضرورت تھی۔ پہیلیوں کے بجائے پوری تفصیل بتاؤ مجھے؟"

"اسپیکٹرم میں ان دونوں کے درمیان ایک عرصے سے اسٹیشن چیف کے عہدے پر ایک سرد جنگ جاری ہے۔ مگر وزیر جان کو یہ اہم عہدہ سونپا گیا جبکہ چوہدری ممتاز خان کو "کیشا" ایجنٹ بنا دیا گیا۔ جس کے انڈر تنظیم کے دس ٹاپ... ایجنٹ کام کرتے ہیں۔ کم بڑا عہدہ تو یہ بھی نہیں ہے مگر اسٹیشن چیف کی بات اور ہے۔ اسی لیے کئی اہم معاملات میں وزیر جان کا ہی حکم چلتا ہے۔ زہرہ بیگم کو ساتھ لانے کی شرط اسی نے رکھوائی تھی۔ مگر وہ ناکام گئی۔ وزیر جان نے اس معاملے میں زیادہ دلچسپی نہ لی تو چوہدری ممتاز نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر اپنے ہی ساتھی عہدے دار وزیر جان کے منہ سے نوالہ چھیننے کی کوشش کی تاکہ... آگے تو تم خود ہی سمجھ گئے ہو گے۔ آہ... میرا خون بہا جا رہا ہے۔" وہ کراہ کے بولا۔ "گاڑی میں فرسٹ ایڈ کا سامان موجود ہے۔ مم میری مرہم پٹی... آہ..."

مارے تکلیف اور نقاہت کے وہ پھر نڈھال ہونے لگا۔ خود میرے اپنے زخمی بازو سے خون رس رہا تھا۔ شکر ہے کہ گولی نے ہڈی کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ "چھاؤ" ہو کر گوشت پھاڑتی نکل گئی تھی۔ میں نے اس پر رومال باندھ دیا تھا۔

اس نے جو کچھ بتایا۔ قرائن بھی انہی عوامل کے غماض محسوس ہوتے تھے۔

میں نے کار کی ڈگی سے فرسٹ ایڈ کا سامان نکالا۔ اپنی اور اس کی مرہم پٹی کی۔ پھر ڈگی کے اندر سے ہی مجھے ایک نائیلون کی رسی مل گئی۔

میں نے اس کے ہاتھ پیر باندھ کر کار کی عقبی نشست پہ لٹا دیا۔ میں بعد میں اسے پی ایس ایس کے حوالے کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس نے چوں چراں کی مگر میں نے اس کی بات پر کان نہیں دھرے، اس کی جامہ تلاشی لینے کے بعد میں نے اس کا سیل فون اُچک لیا۔

دل میں خیال آیا کہ اول خیر سے رابطہ کرلوں، جانے وہ بے چارہ کہاں میری تلاش میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہوگا، مجھے اندازہ تھا کہ نچلا وہ بھی نہیں بیٹھا ہوگا، لیکن وزیر جان کی شرط کے آگے وہ بھی میری طرح شاید کسی خطرناک رسک لینے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ لیکن باوجود اس کے وہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے نہیں بیٹھا ہوگا' اس کی پریشانی دور کرنے کے لیے اور کچھ سوچ کر میں نے اس سے رابطہ کر ہی لیا۔

"او خیر۔ کا کے! تیری آواز سن کر تو میرے اندر جان آگئی، تو ٹھیک تو ہے ناں؟ ماں جی کیسی ہیں؟" رابطہ ہونے پر وہ تڑپ کر بولا۔ میں نے اُسے مختصراً صراحت میں اب تک کے بارے میں آگاہی دی، تو وہ تُرنت بولا۔

"تو نے مجھ سے رابطہ کر کے بہت اچھا کیا کا کے! دیکھ میرا انتظار کر... تو نے جو لوکیشن بتائی ہے، وہاں سے میں زیادہ دور نہیں ہوں... ایک کام اور کر... بیگم صاحبہ کو بھی خبر کردے۔ معاملہ حساس اور سنگین ہے، ماں جی کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔"

اول خیر کے اس مشورے پر میری طبیعت مکدر سی ہونے لگی، میں نے کہا۔ "نہیں، اُنہیں بتانے کی ضرورت نہیں، تمہیں بھی میں نے صرف اس لیے ہی آگاہ کرنا ضروری سمجھا کہ مجھے یقین تھا کہ تم میرے لیے نہ صرف پریشان ہو گے، بلکہ میری تلاش میں بھٹک بھی رہے ہو گے۔ خیر، میرے پاس وقت کم ہے۔ یہ نمبر میرا نہیں ہے۔ میں اندر جا رہا ہوں، سیل سائلنٹ پر لگا دوں گا۔"

"نہیں کا کا! مجھے آلینے دے۔ میں دیر نہیں لگاؤں گا۔" وہ بے چینی سے بولا۔

"آجاؤ، میدان صاف ہے مگر میں تب تک آدھی مہم نمٹا دوں گا، کیونکہ ابھی تک عمارت کے اندر میری ڈھنڈیا نہیں پڑی۔ رب راکھا۔" کہتے ہوئے میں نے رابطہ منقطع

کر دیا۔

وقت کم تھا۔ سیل فون کو وائبریٹ پر لگا کر میں آگے بڑھا اور پیدل عمارت کی طرف چل دیا۔ جہاں میرا اور ڈمی اور اس کے ساتھیوں سے خوں ریز معرکہ ہوا تھا، وہاں سے میں نے ڈمی کا سائلنسر لگا پستول اُٹھالیا اور اس کے ایک ساتھی کا اضافی پستول بھی لے لیا۔

جس راستے سے مجھے ڈمی باہر لایا تھا، میں اسی راستے سے عمارت میں دوبارہ داخل ہو گیا۔ اندر ہنوز خاموشی کا راج تھا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہو۔ گویا میرے پاس ابھی بہت کچھ کرنے کے لیے سنہری موقع تھا۔ وقت کی کمی اپنی جگہ مگر موقع سہل تھا۔ میں نے سب سے پہلے اسی کمرے کا رُخ کیا، جہاں مجھے قیدی بنا کر رکھا گیا تھا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آیا ابھی تک وہاں کا کسی نے رُخ کیا تھا یا نہیں؟ وہاں پہنچا تو کچھ ایسا اشارہ مجھے نہیں ملا جس سے اندازہ ہوتا ہو کہ وہاں میری غیر موجودہ میں وزیر جان کا کوئی ساتھی آیا گیا ہو۔ کیونکہ دروازہ ایسے بھڑا ہوا ملا تھا، جیسا چھوڑ کر میں ڈمی کے ساتھ نکلا تھا۔ یہ خوش آئند بات تھی۔ گویا مجھے قید کر کے وہ سب خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔

میں پلٹا اور... اور اریب قریب کے جتنے بھی کمرے تھے میں ان کی سن گن لینے کی کوشش کرتا رہا، مجھے یقین تھا کہ ماں کو بھی ادھر ہی کہیں موجود ہونا چاہیے تھا۔

ساتھ والی مختصر راہداری کے سرے میں ہی مجھے ایک کمرے کی مُن گُن لینے کے دوران اندر سے کسی کی سسکیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ میرا دل بے طرح دھڑ دھڑانے لگا۔ یہ میری ماں کی آواز تھی۔ میں نے تصور میں اس الم نصیب کو گھٹنوں میں سر دیے روتے دیکھا اور پھر میرے اندر جوالا مکھی بھڑک اُٹھا۔

دروازے کے نیچے سے روشنی کی باریک لکیر نظر آ رہی تھی۔ میں نے ایک نگاہ اپنے گرد و پیش پر ڈالنے کے بعد دروازے پر زور آزمائی شروع کر دی۔ دروازہ بند تھا، مگر تالا عام سا تھا۔

میں نے اپنی جیب سے ایک باریک کالنگ کارڈ نکالا اور اُسے دروازے کی درز کے اندر ڈال کر ہلکا جھٹکا دیا تو لاک کھل گیا۔ میں آہستگی سے دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔

سامنے میری ماں واقعی دیوار سے اپنی پشت ٹکائے، گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔

''ماں۔'' میں نے اُسے ہولے سے پکارا۔ میری آواز پر بے اختیار اس نے اپنا سر اُٹھا لیا اور اُس کے جھریوں بھرے چہرے پہ ایکا ایکی جیسے خوشی و مسرت پھوٹ پڑی، اندر ہلکی روشنی تھی، میں آگے بڑھا۔ وہ ضعیف و نزار ہونے کے باوجود۔ ''شہزی پتر'' کہتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میں رقیق دل کے ساتھ ماں کی طرف بڑھا۔ اور جیسے اس کے قدموں میں جھک گیا۔ اس کی ٹھنڈی میٹھی چھاؤں میں آ گیا۔ آہ! اللہ نے بھی ماں جیسی کیا ہستی پیدا کی ہے۔ ایسے ہی تو نہیں اللہ نے ماں کے قدموں میں جنت رکھی ہے کہ انسان سارے دکھوں اور غموں سے خود کو یک لخت آزاد محسوس کرتا ہے اور ایک روحانی سکون سا دل و دماغ میں جاگزیں ہونے لگتا ہے۔

میں اپنا سر جھکا کے اپنی ماں سے لپٹ گیا تھا، اس کا وجود ہولے ہولے کپکپا رہا تھا۔

''شہزی پتر! تت... تو نکل جا... چچ... چلا جا یہاں سے... یہ... یہ شیدا بڑا خطرناک آدمی ہے۔ کک... کہیں یہ تجھے مار نہ ڈالے۔ مم... میں نے بہت دُکھ سہے ہیں پتر! اب مجھ میں تاب نہیں۔''

میں دردسے پھٹ پڑا۔ اُسے اپنی نہیں میری فکر ہو رہی تھی۔ میں نے ماں کے سر کی چادر دُرست کی اور بولا۔

''ماں۔ تُو کیوں فکر کرتی ہے؟ اپنے پتر پہ بھروسا رکھ۔ اب دنیا کی کوئی طاقت ہم ماں بیٹے کو جدا نہیں کر سکتی۔ وقت کم ہے ماں! آ جا میرے ساتھ۔''

وہ بے چاری حیران و پریشان سی ہو کر کبھی میرا چہرہ تکنے لگتی اور کبھی میرے ہاتھ میں پکڑے سائلنسر لگے پستول کو۔ تب ہی اُس کی نگاہ میرے زخمی بازو پر پڑی اور وہ پریشان سی ہو گئی۔

''تت... تیرے بازو کو کیا ہوا پتر! تُو زخمی ہے۔''

''میں ٹھیک ہوں ماں! یہ معمولی سا زخم ہے۔''

وہ معصومانہ حیرانی سے بولی۔

''تت تُو پستول چلا لیتا ہے؟'' ماں کی بات پر میں اندر ہی اندر مسکرا دیا۔ اب بھلا میں اُسے کیا بتاتا کہ مجھے اور کیا کیا کچھ آتا ہے۔ مجھے خاموش پا کر وہ اس بار کچھ گومگو سے لہجے میں بولی۔

''تُو پورا اپنے باپ پر گیا ہے۔ وہی ناک نقشہ ویسا ہی اُونچا لمبا اور نڈر دلیر۔ پتا نہیں وہ بے چارہ خود کہاں ہو گا۔ اور... اور... تیرا اوڈا بھرا۔ آہ تقدیر نے بڑے ستم ڈھائے ہیں مجھ حرماں نصیب پہ۔''

میں ماں کی بات پر چونکے بنا نہ رہ سکا مگر یہ ساری

باتیں کسی اور وقت کے لیے اُٹھا کر میں ماں کو تھامے دروازے کی طرف بڑھا۔

ماں میرے ساتھ تھی اور مجھے یہاں سے ہر صورت نکلنا تھا۔ ماں کو صحیح سلامت یہاں سے نکال لے جانے کی مجھے اب زیادہ فکر ہونے لگی تھی۔

میں نے ابھی وزیر جان پر ہاتھ ڈالنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ میں ماں کو لیے کمرے سے باہر آ گیا۔ راہداری ہنوز سنسان پڑی تھی۔ مدھم روشنی میں، ماں کو لیے آگے بڑھتے ہوئے میں اپنے گرد و پیش سے بھی حد درجہ محتاط تھا۔ لیکن ابھی میں نے مذکورہ کمرے کے سامنے والی راہداری عبور کی تھی کہ اچانک مجھے جیب میں رکھے سیل کی تھرتھراہٹ محسوس ہوئی۔

میں نے راہداری کے سرے والی دیوار کی آڑ لی اور سیل نکال لیا۔ کال اول خیر کی تھی۔ وہ آ چکا تھا۔ میں نے اُسے باہر ہی ٹھہرے رہنے کا کہا اور آگے بڑھا۔ ایسے ہی وقت میں مجھے اپنے سیدھے ہاتھ والے لاؤنج میں کسی کے زور زور سے بولنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں ادھر ہی رُک گیا۔ مگر یہی وہ وقت تھا جب ان دونوں کی نظریں بھی مجھ پر پڑیں۔ ایک چلّایا۔

”رُک جاؤ ورنہ...“ آواز اس کے حلق میں دبی رہ گئی۔ میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے پستول کا رُخ اُسے دیکھتے ہی گھما دیا تھا۔ پستول کی لمبی نال سے ہلکی زنانٹے دار ”سرگوشی“ اُبھری جس میں دُشمن ہرکارے کی کراہ سے مُشابہ چیخ بھی شامل تھی۔

دوسرا کسی دیوار کی آڑ لینے کو حرکت میں آیا۔ میں نے اس پر بھی گولی چلا دی۔ اس کی چیخ سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ اُسے زیادہ مہلک نقصان نہیں پہنچا تھا۔ وہ کہیں چھپ گیا تھا اور ہمارے لیے مصیبت کھڑی کر سکتا تھا۔ میں ماں کے آگے ڈھال بنا اُسے لیے نکاسی کی راہ پہ ہولیا...اور ساتھ ہی میری عقابی نظریں اُسی سمت..... جمی ہوئی تھیں جہاں میری گولی سے زخمی ہونے والا ہرکارہ چھپا بیٹھا تھا۔ وہ موقع تاک کر مجھ پر گولی چلا سکتا تھا۔ لیکن اس کی طرف سے خاموشی پا کر یہ سمجھ لینا کچھ مشکل نہ تھا کہ وہ یقیناً کسی خفیہ ڈیوائس پر اپنے ساتھیوں کو اطلاع کر رہا ہوگا۔

میں نے اپنی سی کوشش تیز کر دی، اس سے پہلے کہ دُشمن ہرکاروں کا یہاں جمگھٹا جمع ہو جاتا۔

اول خیر باہر میرا منتظر تھا۔ میں ماں کو لیے نکاسی والے راستے پہ ہولیا تھا۔۔ اسی وقت جب میں ماں کے ساتھ ایک بیرونی کمرے کی دیوار سے اُبھر رہا تھا اور حفظِ ماتقدم کے تحت میں نے اسی سمت آخری نگاہ ڈالی تو وہاں دبی دبی روشنی میں مجھے اُسی ہرکارے کا ڈولتا لڑکھڑاتا ہوا ہیولا دکھائی دے گیا، گویا اپنے ساتھیوں کو خبردار کرنے اور ان کے بروقت پہنچنے سے پہلے وہ آخر تک نمک حلالی کا حق ادا کرنے کی تگ و دو میں تھا کہ میں نے اس پر ایک اور ”خاموش“ فائر کر دیا۔

میں نے اُسے اُچھلتے اور پھر چیخ مار کر گرتے دیکھا۔ پھر میں نہیں رُکا اور ماں کو تھامے جتنا تیز چل سکتا تھا، چلتا ہوا عمارت کے اُسی خفیہ دروازے سے باہر آ گیا، مگر اسی لمحے جیسے پوری عمارت جاگ پڑی۔ ایک دو گولیاں بھی چلائی گئیں۔ ایک برسٹ بھی عین اسی جگہ داغا گیا تھا، جہاں ہم نے پیش قدمی کرنا چاہی تھی۔ ہم بال بال بچے۔ عمارت سے آگے جانے کا مطلب پیش قدمی توڑنے والے اندھے برسٹ کی زد میں آنا تھا۔

میں ماں کو لیے اسی سرعت کے ساتھ واپس پلٹا جیسے وہ خفیہ دروازہ ہمیں پکار رہا ہو۔ یہی ایک پناہ فوری طور پہ میری دانست میں آئی تھی، بے شک یہ درِ دُشمن سہی۔ میں ماں کو لیے اسی دروازے سے اندر آ گیا۔ اگرچہ یہاں بھی دُشمن ہرکاروں کی آمد غیر متوقع نہیں تھی، تاہم باہر اندھے فائر کرنے والوں سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہماری بلکہ اپنی بھی اس خفیہ ”گزرگاہ“ سے واقفیت رکھے ہوئے تھے۔

میرا خاموش پستول واقعی خاموش ہو گیا تھا، یعنی خالی ہو گیا تھا، شکر ہے کہ میں نے حفظِ ماتقدم کے تحت دوسرا ساتھ رکھ لیا تھا۔ اس کا سائلنسر بدلنے کے بجائے میں نے کلپ بدل لیا۔

مجھے اول خیر کی بھی فکر ہوئی، وہ باہر ہی کہیں عمارت کے آس پاس موجود تھا اور یقیناً اس نئی صورتِ حال پر تشویش کا شکار بھی ہوگا۔ اس ڈر سے کہ کہیں وہ بھی بے خطر اس آتشِ نمرود میں نہ کود پڑے، میں نے اسے کال کرنے کی غرض سے اپنی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اسی وقت مجھے اس کی تھرتھراہٹ محسوس ہوئی، میں یہی سمجھا کہ مجھ سے پہلے اس نے رابطہ کر لیا ہے، خیر بات تو ایک ہی تھی، مگر ڈسپلے پر نمبر اول خیر کا نہ پا کر میں چونکا تھا، یہ بیگم صاحبہ کا بھی نمبر نہ تھا۔ ایک سنسنی خیز خیال یہ اُبھرا کہ کسی دُشمن کی کال تھی جس نے ڈی سے ہی رابطہ کیا ہوگا، کیونکہ بہرحال یہ سیٹ اسی کا تھا۔

میں نے دھڑکتے دل سے کال ریسیو کی تو دوسری

طرف سے اپنے غنیم دیرینہ کی آواز میرے لیے متوقع تھی۔
"جابر! کیا ہوا؟ اتنی دیر کیوں لگادی تم نے؟"
گویا میرے ڈمی کا نام جابر تھا۔ میں نے حلق کے "غوے" کو ٹیڑھا میڑھا کر کے آواز بدلنے کی کوشش کی اور ذرا کراہتی آواز میں بولا۔
"چوہدری جی! میں کامیاب تو ہوگیا تھا، مگر..." میں نے دانستہ اپنا جملہ اُدھورا چھوڑا تو دوسری طرف سے اس کی چونکتی ہوئی آواز اُبھری۔
"چوہدری جی؟ کون ہو تم؟"
ایک ہی لفظ نے میرا بھانڈا پھوڑ ڈالا تھا، میرا ڈمی یا جابر شاید چوہدری ممتاز کو کسی اور "عنوان" سے مخاطب کرتا ہوگا۔ پھر بھی میں نے بات بنانے کی کوشش چاہی۔
"وہ چوہدری جی..." میری آواز حلق میں ہی اٹک گئی۔ دوسری طرف سے فوراً رابطہ منقطع ہوگیا تھا۔ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ اُس شاطر آدمی کو کسی گڑبڑ کا احساس ہوگیا تھا۔
میں نے بھی اس پر لعنت بھیج دی۔ اسی وقت اول خیر کی کال آرہی تھی۔ میں نے اس سے بات کی۔ گڑبڑ کا اُسے بھی احساس ہو چکا تھا۔
"کاکے! تُو اندر ہی رہ۔ باہر مت نکلنا، چالاک دشمن نے سب سے پہلے عمارت کی بیرونی طرف کی ناکا بندی کر دی ہے۔"
"ہاں! میں اندر ہی ہوں اور فی الحال محفوظ بھی مگر ایسا تادیر نہیں چلے گا۔" میں نے کہا۔ ماں ایک بار پھر بُری طرح ہراساں نظر آنے لگی تھی۔ میں نے اُسے تسلی دی اور پھر کچھ اور اندر کی جانب کھسکا تو مجھے دوڑتے ہوئے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ میرا دل تیزی سے دھڑ دھڑ ارہا تھا اور نظریں گردوپیش کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ اور پھر دفعتاً ہی مجھے اپنے ذرا عقب میں بائیں جانب ایک تنگ سا زینہ اُوپر کی جانب جاتا دکھائی دیا۔ میں ماں کو لیے اسی جانب بڑھ گیا۔ اور ٹھیک اسی وقت ہم پر پورا برسٹ فائر ہوا، ماں کے حلق سے چیخ خارج ہوگئی، میں دہل کر رہ گیا مگر شکر ہے کہ کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہوئی تھی۔
دشمن ہرکاروں کی ہم پر نگاہ پڑ چکی تھی۔ میں ماں کو تھامے.... جتنی تیزی کے ساتھ زینے طے کر سکتا تھا وہ طے کرتا چلا گیا۔ ماں کو بھی خطرے کا پوری طرح احساس تھا۔ یہی وجہ تھی وہ بے چاری بھی حوصلے سے کام لے رہی تھی۔
جیسے ہی میں نے زینے طے کیے، نیچے سے مجھے کسی ہرکارے کے غصیلے انداز میں چلانے کی آواز سنائی دی۔
میں پروا کیے بغیر اسی سمت کو بڑھا جو اُوپری منزل کی بالکونی ہی کہلاتی تھی۔
یہاں مجھے کچھ سناٹے کا احساس ہوا۔ کمرے یہاں بھی بنے ہوئے تھے۔ میں ماں کو لے کر آگے بڑھا اور ایک کمرے کی عقبی گیلری میں آگیا۔
یہاں کسی کمرے کا دروازہ مجھے ادھ بھڑا دکھائی دیا تو میں اس میں داخل ہوگیا۔ کمرا آرام دہ اور کشادہ تھا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا اور دوسرے دروازے کی طرف بڑھا، اسی وقت باہر سے مجھے دوڑتے قدموں اور کسی کے اُونچے اور غصیلے لہجے میں باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں تو میرا ماتھا ٹھنکا۔
میں اس آواز کو پہچان گیا تھا۔ یہ وزیر جان تھا۔ میں تو اس وقت خود شکار ہونے کی پوزیشن میں تھا مگر وزیر جان بھی مجھے اپنا شکار ہی نظر آرہا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا اور ابھی میں کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے میں کھٹر بڑ کی آواز اُبھری۔ میں ماں کو لے کر فوراً ہی ایک قریب دھرے بڑے سے خوب صورت ڈیوائیڈر کے پیچھے جا چھپا۔ پھر ذرا سر اُبھار کر کمرے کے بیرونی دروازے کی طرف دیکھا تو یک لخت میرے ٹھٹکے ہوئے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں، اندر داخل ہونے والا شخص وزیر جان ہی تھا۔ وہ اکیلا نہیں تھا اس کے ہمراہ ایک اور شخص بھی تھا، یہ شاید اس کا کوئی قریبی ساتھی تھا، جسے وہ مختلف ہدایتیں دے رہا تھا۔
"وہ دونوں یہاں سے فرار ہو چکے ہیں۔ شہزی بہت خطرناک ہو چکا ہے ہمارے لیے۔ اس کی وجہ سے ہمیں بار بار اپنے ٹھکانے بدلنے پڑتے ہیں۔ تم سب نکمے اور بے کار ہو چکے ہو میرے لیے۔ تم سے ایک لڑکا نہیں سنبھل پایا ہے، تُف ہے تم سب پر۔"
وہ اپنے ساتھی پر گرم ہو رہا تھا۔ ساتھی دبے دبے خوف سے مؤدبانہ بولا۔
"ایسی بات نہیں باس! ہم سب محتاط تھے۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا باس کہ ہمارے درمیان کوئی غدار موجود تھا۔ اسی نے شہزی کو فرار کروایا ہے۔"
"غدار؟" وزیر جان کی چونکتی ہوئی آواز اُبھری۔
"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تم ہوش میں تو ہو؟"
"باس! شہزی اگر خود فرار ہوا ہوتا تو اس کے کمرے کا دروازہ ٹوٹا ہوا یا کم از کم تالا تو ٹوٹا ہوتا۔ مگر میں نے خود

جائزہ لیا تھا دونوں کمروں کا۔ شہزی کے کمرے کا دروازہ بالکل صحیح سلامت تھا، لاک بھی ٹھیک تھا۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کمرے کا دروازہ کسی اپنے آدمی نے ہی باہر سے چابی لگا کر کھولا ہے۔'' اس کی بات پر وزیر جان سوچ میں پڑ گیا۔ دفعتاً اس کے ساتھی کے سیل فون پر کسی کی کال آئی، اس نے وہ سنی اور اس بار پُرجوش لہجے میں بولا۔

''میری بات ٹھیک نکلی باس! ان غداروں کا پتا چل گیا ہے۔ عمارت سے باہر چند قدموں کے فاصلے پر ہمارے غدار ساتھی زخمی حالت میں پڑے مل گئے ہیں۔ لگتا ہے شہزادا انہیں چکمادے کر نکل گیا ہے۔''

''مائی فٹ۔'' وزیر جان غیظ و غضب کے مارے اپنے دائیں ہاتھ کا مکا بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر مار کے غرایا۔ پھر اپنے ساتھی کو تحکمانہ ہدایت دیتے ہوئے بولا۔ ''سنو جمی! شہزاد یہاں سے فرار ہوتے ہی سب سے پہلے پاور والوں کو یہاں کی خبر دے گا، میں اسی وقت کنال لاج کی طرف نکل رہا ہوں اور اسٹیشن فور کو سنبھالنے کی ذمے داری تمہیں سونپتا ہوں، اسے عارضی طور پر بند کر ڈالو۔ اور تینوں غداروں کی مرہم پٹی کر کے انہیں گرین پیلس پہنچا دو۔''

''یس باس! سب ہو جائے گا آپ فکر نہ کریں۔'' مؤدبانہ انداز میں کہتا ہوا اس کا ساتھی کمرے سے نکل گیا۔ میرے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن میں ایک خیال کلک ہوا۔ میں نے ابھی وزیر جان پر ہاتھ ڈالنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ یہ لوگ یہی سمجھے ہوئے تھے کہ میں فرار ہو چکا ہوں۔

وزیر جان اپنی کچھ ضروری تیاریوں میں مصروف رہا اس کے تھوڑی دیر بعد وہ کمرے سے نکل گیا۔ میں نے فوراً اول خیر سے رابطہ کرنا چاہا تو بُری طرح ٹھٹکا۔ سیل کام نہیں کر رہا تھا۔ بے اختیار میں ایک گہری ہمکاری خارج کر کے رہ گیا۔ یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ ممتاز خان کو اس بات پر شُبہ ہوتے ہی کہ اس کے ساتھی کا سیل فون کسی اور کے قبضے میں چلا گیا تھا، اس نے فوراً ہی سم بلاک کرادی تھی۔ وہ بہت چالاک .... اور شاطر انسان تھا، کسی ایسے ہی مواقعوں کے لیے اس نے اپنے کچھ مخصوص ساتھیوں کی سموں کا ''کنٹرول'' اپنے ہاتھ .... میں ہی رکھا ہوگا، تا کہ بہ وقتِ ضرورت اسے بلاک کروا سکے۔

میں دراصل فون کر کے اول خیر کو بتانا چاہتا تھا کہ وہ جہاں ہے وہیں رہتے ہوئے میرے یہاں سے نکلنے کا منتظر رہے۔ ورنہ وہ نظروں میں آگیا تو دُشمنوں کا یہ گمان فرو ہو جائے گا کہ میں یہاں سے فرار ہو چکا ہوں۔

میں اسی کمرے کے عقبی دروازے سے دوبارہ بالکونی ... میں آگیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اول خیر عمارت کے باہر تھا یا چوری چھپے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

زینے طے کرتا ہوا میں محتاط روی کے ساتھ نیچے آیا تو میں نے وزیر جان کو دو آدمیوں کے ساتھ تیزی سے باہر نکلتے دیکھا۔ باقی اس کے ساتھی اِدھر اُدھر مصروف ہو گئے۔

ہر سو خاموشی چھا گئی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ میں بھی موقع تاک کر اسی خفیہ دروازے سے باہر نکلا تو سامنے احاطے کا منظر دیکھ کر بُری طرح ٹھٹک گیا۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔

اول خیر، وزیر جان پر پستول تانے کھڑا تھا، جبکہ وزیر جان کے دونوں ساتھی بے چینی سے دکھائی دے رہے تھے۔ اول خیر کی یہ حرکت خود اس کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ کیونکہ ایک ڈیلٹا کمانڈو ایجنٹ کی حیثیت سے میں اس کی خطرناکی سمجھ سکتا تھا کہ اول خیر کو اسٹیشن فور کی عمارت سے وزیر جان کا کوئی ساتھی اسے گولی کا نشانہ بنا سکتا تھا۔ اب میرا چھپے رہنا بے سود تھا۔

میں ماں کو لیے اس کی طرف بڑھا اور اسی وقت میری محتاط نظروں نے اسٹیشن فور کی عمارت کی ایک کھڑکی سے مہیب نال کی جھلک دیکھ لی، میں نے تلے اُوپر اس طرف دو تین فائر جھونک مارے۔

صورتِ حال ایک دم بگڑ کر خطرناک ہونے لگی تھی۔ کھڑکی چٹخنے اور کسی کے کریہہ انداز میں چیخنے کی آواز پر دھیان دیے بغیر میں پھرتی کے ساتھ آگے بڑھا۔ اول خیر کی مجھ پر نظر پڑی، اور یہی اس کی غلطی ثابت ہوئی۔ بے شک اس کا یہ ردِعمل فطری تھا۔ تاہم کچا کھلاڑی وہ بھی نہ تھا لیکن اس طرح مجھے ماں سمیت اچانک اپنی جانب آتے دیکھنا بہر حال اس کے لیے غیر متوقع تھا۔ جیسے ہی اس نے میری جانب دیکھا، وزیر جان کے قریب کھڑے اس کے دونوں ساتھی حرکت میں آئے، ایک نے اول خیر کے پستول والے ہاتھ پر لات رسید کر دی۔ دوسرا اُسے دبوچنے کے لیے جھپٹا، میں نے راہ میں ہی دوڑتے ہوئے لات مارنے والے پر گولی چلا دی، وہ چیخ کر گرا۔ اول خیر نے خود پر جھپٹنے والے کو اپنے بھاری کاندھے کی ٹکر رسید کر دی، اثنائے راہ وزیر جان اپنی کار کا دروازہ کھول کر بیٹھ چکا تھا۔ عمارت کے اندر سے بھی چار پانچ مسلح افراد نکل آئے۔ اول خیر نہتا تھا۔ اب اُسے وزیر جان کی ڈھال میسر نہ تھی، دُشمن کسی بھی وقت

اُسے گولیوں سے چھلنی کر سکتے تھے، ماں میرے ساتھ تھی۔ میں بھی تب تک کافی قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے کار کے قریب والے ہرکارے کی پروا نہ کی کیونکہ اُس کے ساتھ اول خیر بھڑا ہوا تھا۔ مجھے ان مسلح ہرکاروں کی طرف سے تشویش ہوئی تھی جو اپنے باس کی جان کو خطرے میں دیکھ کر عمارت سے باہر نکل آئے تھے۔

ان میں سے دو نے مجھے اور ماں کو اپنے پستولوں کی زد میں لینے کا ارادہ کیا۔ میں نے ان پر پہلے ہی یکے بعد دیگرے دو فائر جھونک مارے، وہ لڑکھڑا کر گرے۔ باقی تین اول خیر کی طرف متوجہ رہے۔ وہ ابھی اول خیر پر کم از کم ... اندھا دھند گولیاں داغنے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ مگر اپنے دو ساتھیوں کی چیخ اور فائرنگ پر وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ تب تک میں احاطے کی ایک بغلی دیوار کی آڑ میں آچکا تھا، مگر اول خیر کی طرف سے مجھے تشویش تھی۔ وہ ان کی زد میں تھا۔

ماں کو اس دیوار کی آڑ میں چھوڑ کر میں پھر ان تینوں ہرکاروں کی طرف متوجہ ہوا، ادھر اول خیر نے بھی اس تیزی سے بدلنے والی صورتِ حال کی خطرناکی کو بھانپتے ہوئے نہ صرف اپنے مدِمقابل کے ساتھ زور آزمائی کرتے ہوئے اُسے اپنی ڈھال بنائے رکھا تھا بلکہ وہ کھسک کر وزیر جان کی کار کے آگے بھی آ گیا تھا۔ مگر ایسا زیادہ دیر نہیں چل سکتا تھا۔

وزیر جان کار اسٹارٹ کر چکا تھا۔ اس نے تیزی سے کار ریورس کی تھی۔ اس اثنا میں، میں نے اس کے تینوں ساتھیوں پر گولیاں داغیں۔ مگر کوئی زخمی نہیں ہوا، وہ بھی میری طرف سے خطرناکی کو بھانپ کر فوراً احاطے میں ایک جانب کھڑی ڈبل کیبن جیپ کی آڑ میں جا چکے تھے اور سمجھ گئے تھے کہ میں اپنے ساتھی اول خیر کو کسی بھی قیمت پر ان تینوں کی بھینٹ چڑھنے نہیں دینا چاہتا تھا اسی لیے میں نے بھی اپنی جان کی بازی لگا رکھی تھی۔ پل کے پل ایک خیال میرے ذہن میں اُبھرا... اور دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے آپ کو نیچے گرا لیا اور جس بھاری بھرکم جیپ کی آڑ لیے وہ تینوں ہرکارے چھپے ہوئے تھے، اس کے فیول ٹینک کا نشانہ لے کر میں نے گولی چلا دی۔

فیول ٹینک نے کم از کم اس وقت تو کسی بلاسٹنگ بم کا ہی کام دیا تھا اور ایک دھماکے سے پھٹا، جیپ کئی فٹ اُوپر اُچھلی اور ساتھ ہی انسانی چیخیں بھی اُبھریں۔ ادھر میں نے راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے وزیر جان کی کار کے ٹائر کا نشانہ لیا۔ ایک ہی گولی چلی تھی، وہ بھی خالی گئی۔ وہ تیزی سے کار بھگا لے گیا۔ میں اول خیر کی طرف متوجہ ہوا، وہ ابھی تک اپنے مدِمقابل پر قابو پانے میں ناکام رہا تھا۔ تاہم اس کے لیے وہ بھی ناک کا چنا ہی ثابت ہو رہا تھا۔ وقت کم تھا، عمارت کے اندر سے نجانے کب کون برآمد ہو جاتا، عمارت کے اندر چند ایک ہی ہو سکتے تھے، جن کے لیے اب شاید یہ سب بے سود ہی تھا اور چاہتے تھے کہ جلد سے جلد یہ جنگ نمٹے تو وہ پولیس کے آنے سے قبل یہاں سے نکل جائیں۔

باہر موجود آخری ہرکارے نے بھی میرے ہاتھوں اپنے دیگر ساتھیوں کا انجام دیکھ لیا تھا، لہٰذا وہ بھی نہ ٹکا اور ایک طرف کو دوڑ پڑا۔

میں پلٹا اور ماں کو لیے احاطے کی دیوار پھلانگ کر سڑک پر آ گیا۔ اول خیر میرے ساتھ تھا، میرے دائیں بازو پر بندھی پٹی کو دیکھ کر وہ بھی فکر مند سا ہو گیا۔ ہماری کار وہیں موجود تھی، جہاں میں نے چھوڑی تھی۔ اور پھر بلا تاخیر ہم اس میں سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

کار اول خیر چلا رہا تھا۔ میں، ماں کے ساتھ عقبی نشست پر بیٹھا تھا۔ ہمارا رُخ سرید بابا کی کوٹھی کی طرف تھا۔ رات اپنے آخری پہر میں تھی۔ مین روڈ پر آتے ہی اول خیر نے ماں کو سلام کیا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ میری طرح وہ بھی ماں جی کی طرف سے زیادہ فکر و تشویش کا شکار رہا تھا۔

سکون کے لمحات میسر آتے ہی میں نے ماں سے مسکرا کر پوچھا۔ ”ماں جی! آپ ٹھیک ہو ناں؟“

”ہاں میرے لعل! میں بالکل ٹھیک ہوں، پر تُو بہت زخمی ہے، تیرا بازو بھی۔“ ماں نے ممتا بھرے لہجے میں فکر مندی سے کہا تو میں مسکرا کر بولا۔

”آپ فکر نہ کریں ماں جی! یہ معمولی زخم ہے، ابھی گھر جا کے خود ہی مرہم پٹی کر لوں گا۔“

میں نے اول خیر کے بارے میں ماں جی کو بتایا، ماں جی اُسے دعائیں دینے لگیں تو اول خیر نے ایک حسرت زدہ سی آہ خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”او خیر، ماں جی! بہت عرصے بعد اس سسرے اول خیر کو بھی کسی ماں نے دعا دی ہے۔ اوئے کاکے! یقین کر دل، کلیجا سب ٹھنڈا ٹھار ہو گیا۔“ وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا تو میں اور ماں جی بے اختیار مسکرا دیے۔

''تُو فکر نہ کر میرے یار! اب یہ دعائیں ماں جی سے ہم دونوں کو ہر روز اور مفت ملا کریں گی۔''

''ہاں کاکے! ماں کی دعاؤں میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ تو بہت خوش قسمت ہے کہ تجھے ماں کی چھاؤں مل گئی۔''

''خیرے پتر! تُو بڑا دُکھی معلوم ہوتا ہے۔ ماں کی نگاہ ہر بیٹے کے لیے ایک ہی ہوتی ہے۔ تو بھی میرے پتروں جیسا ہی تو ہے۔'' یہ کہتے ہوئے ماں کا لہجہ رُندھ گیا۔ پتا نہیں اُسے کیا یاد آ گیا تھا؟ ماں جی کا اول خیر کو ''خیرے پتر'' کہنا مجھے بہت اچھا لگا تھا، لیکن ان کی بات پر چونکا میں بھی تھا، انہوں نے پتر کے بجائے ''میرے پتروں جیسا'' لفظ استعمال کیا تھا۔ میں اس وقت اس پر زیادہ توجہ نہ دے سکا۔ نہ ہی اپنی ماں کے اچانک غم ناک ہوتے لہجے کی وجہ سمجھ پایا تھا۔

اول خیر نے بڑے جذبات انگیز لہجے میں ماں جی سے کہا۔ ''او جیئو ماں جی! تُو تو واقعی میری ماں ہی ہے۔'' میرے ہونٹوں پہ مسکراہٹ تھی۔ مگر دل و دماغ میرا ایک عجیب سی بے چینی کا شکار تھا۔ ماں میرے ساتھ تھی باپ میرا دور تھا، مگر بقول وزیر جان کے وہ بھی زندہ تھا، مگر کہاں تھا؟ یہ نہ میں جانتا تھا نہ ہی ماں۔ مگر ماں کا وزیر جان سے ماضی کے حوالے سے تعلق اور دھوکا۔ یہ سب اور بہت سی باتیں میں جاننے کے لیے بے چین تھا۔

میں ابھی تک ان اُلجھنوں میں پھنسا ہوا تھا، تاہم کچھ اُمید تو ہو چلی تھی کہ ماں کی زبانی اب بہت سی حقیقتیں بھی آشکارا ہونے والی تھیں۔ ابھی بہت سی کہی ان کہی باتیں تھیں، جو سوالات کی شکل میں میرے ہی نہیں ماں جی کے دل میں بھی موجود تھیں۔

مجھے اس خوں ریز معرکے میں وزیر جان کا بچ نکلنا بے چین کر گیا تھا، حالانکہ ایک موقع بھی ہاتھ آیا تھا مگر بدقسمتی سے وہ ہاتھوں نکل گیا۔ تاہم مجھے تسلی تھی کہ وہ بھلا اب کہاں بچ کر جا سکتا تھا؟ تھا تو اسی علاقے اور اسی شہر میں، پھر میں اس کی جی سے ہونے والی باتیں بھی سن چکا تھا کہ اس نے اسٹیشن فوراً سے سیدھا اپنی ساہیوال والی رہائش گاہ ''کنال لاج'' کا رُخ کیا ہوگا۔

ہم سرمد بابا کی کوٹھی پہنچ گئے۔

شکیلہ بے چینی سے ہماری منتظر تھی، ہمیں دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی تھی۔ اُس بے چاری کا بھی اللہ اور ہمارے سوا کون تھا۔ ایک بھائی تھا، وہ بھی اس دنیا میں اب نہیں رہا تھا۔ دُکھی وہ بھی بہت تھی۔ ہمارے ساتھ ماں جی کو دیکھ کر اُسے پہلے تو حیرت ہوئی اور پھر حقیقت جاننے کے بعد وہ مسرت سے کھل اُٹھی۔ ہمارا دُکھی لوگوں کا، اپنوں سے بچھڑے ہوؤں کا ایک ٹولا تھا، جہاں کہیں کسی کا کوئی ماضی کا گم گشتہ کردار مل جاتا، سب کی خوشیاں پھر سانجھی ہو جاتیں، یہی حال اول خیر اور شکیلہ کا بھی تھا۔ ماں جی کو بھی وہ اپنی ماں کے تصور میں ہی دیکھ رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا ابھی تو عابدہ کو بھی یہ خوش خبری سنانا تھی، وہ بھی بہت خوش ہوگی۔ آخر کو وہ ماں جی کی ہونے والی بہو تھی۔ خوشی کے اس موقع پر میں سرمد بابا کو کیسے بھول سکتا تھا۔ یقیناً وہ بھی اتنے ہی خوش ہوں گے جتنے کہ ہم سب تھے۔

ماں جی بڑی حیرت سے سرمد بابا کی عالیشان کوٹھی کو دیکھ رہی تھیں۔

''شہزی پتر! یہ گھر تیرا ہے؟'' میں ماں جی کی بات پر بڑی محبت سے مسکرا دیا اور بولا۔

''سب معلوم ہو جائے گا اور مجھے بھی تو آپ سے بہت کچھ پوچھنا ہے۔ آپ اب آرام کریں۔''

شکیلہ میرے بازو کا زخم دیکھ کر پریشان سی ہو گئی۔ اس نے میری مرہم پٹی شروع کر دی۔ ماں اُسے مرہم پٹی کرتے ہوئے بغور دیکھ رہی تھیں۔ یقیناً ان کے دل میں شکیلہ سے متعلق بھی سوال اُبھرا ہوگا۔ مگر وہ خاموش رہیں۔ شکیلہ نے ماں جی کے لیے کھانے پینے کا بندوبست کیا انہیں ان کے کمرے تک چھوڑ آئی۔

ہم بھی تھکے ہوئے تھے۔ اول خیر نے مجھے آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ اور باہر گیٹ پر متعین گارڈز کو کچھ ضروری ہدایات بھی دیں۔ میں اُسے بتا چکا تھا کہ کس طرح پہلے ایک ڈمی ہمدرد نے میرا نجات دہندہ بننے کی کوشش کر کے مجھے یرغمال بنانا چاہا تھا اور اسی دوران ثریا (مرحوم) کے ایک ساتھی نے مجھے وہاں سے نکالنے کی سعی بھی چاہی تھی مگر بدقسمتی سے وہ بے چارہ میرے ڈمی ہمدرد کے ہاتھوں مارا گیا تھا، جو درحقیقت، چوہدری ممتاز خان کا آدمی تھا۔

''او خیر کاکے! لگتا ہے۔ ممتاز خان اور وزیر جان کے درمیان بھی کوئی کھیڈ پڑنے والی ہے۔'' ساری بات سننے کے بعد وہ بولا۔

''ہاں! مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن یار! میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ان دونوں کی سرد جنگ سے ہم کیا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں؟''

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ شکیلہ اُٹھی اور کارڈلیس

مجھے لاکر تھماتے ہوئے بولی۔ ''بیگم صاحبہ کا فون لگتا ہے۔''

میں چونکا اور ایک نظر سامنے بیٹھے اول خیر پہ ڈالنے کے بعد ریسیور اپنے کان سے لگا کر ہیلو کہا۔

''شہزی! تت... تم... آگئے؟ کیسے ہو؟ تم نے مجھے اپنی خیریت سے مطلع کرنا بھی ضروری نہ سمجھا۔ ماں جی کا کیا بنا؟'' وہ حسبِ توقع شکوہ کرتے ہوئے بولیں تو میں نے کہا۔

''ہم بالکل ابھی پہنچے ہیں۔ ماں جی بھی ساتھ ہیں ہمارے، وہ بھی ٹھیک ہیں۔''

''کک... کیا... مم... ماں جی ساتھ ہیں۔ تت... تم اُنہیں بہ خیریت...'' ان کی آواز حلق میں اٹکنے لگی۔ میں نے درمیان کہا۔

''ہاں! میں اور اول خیر اُنہیں بہ حفاظت وزیر جان کے چنگل سے چھڑا لائے ہیں۔''

''میں ابھی پہنچتی ہوں۔'' وہ بے چینی سے بولیں تو میں نے منع کر دیا۔

''نہیں زہرہ صاحبہ! اس وقت آپ کا نکلنا مناسب نہیں ہوگا۔ صبح ہونے پر میں خود آپ سے رابطہ کرلوں گا۔ اور آپ بھی ذرا ممتاز خان سے محتاط رہیں۔ وہ آپ کی جائداد ہتھیانے کے لیے اب ہر حد سے گزرنے کو تیار بیٹھا ہے، یہاں تک کے اپنے لوگوں سے بھی دُشمنی مول لینے میں عار محسوس نہیں کر رہا ہے۔''

''میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں شہزاد!'' وہ بے نیازی سے بولیں۔ ''ممتاز خان لالچی فطرت انسان ہی نہیں بلکہ ضدی اور کینہ پرور بھی ہے۔ اس نے اس بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنا رکھا ہے۔ جائداد کی میری نظروں میں کوئی حیثیت نہیں، لیکن اگر ایسا ہے تو ایسا ہی سہی۔ پھر مجھے بھی اس سے ضد ہوگئی ہے، وہ میری ماں کا قاتل بھی ہے۔ میں بھی اس کے سینے پر مونگ دلتی رہوں گی۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ یہ بتاؤ، کل ماں جی کو لے کر میرے پاس آؤ گے؟'' انہوں نے آخر میں بڑے اشتیاق بھرے لہجے میں کہا تو میں کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''ابھی آپ کی طرف آنے کا تو میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ کوشش کروں گا۔ حالات دوسرا رُخ اختیار کر رہے ہیں اور ہمیں ابھی بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ پھر میں کل کسی وقت آجاؤں گی۔'' وہ بولیں اور تھوڑے توقف کے بعد ہولے سے پوچھا۔ ''عابدہ کی کوئی خیر خبر؟ کب تک لوٹ رہی ہے وہ؟''

ان کے اس اچانک اور بے محل سوال پر میں ذرا چونکا۔ پھر ایک گہری ہنکاری خارج کر کے بولا۔ ''وہ ٹھیک ہے۔ عارفہ کا آپریشن کامیاب ہو چکا ہے۔ انشاء اللہ وہ دونوں سرمد بابا کے ساتھ بہت جلد پاکستان لوٹنے والی ہیں۔''

میں نے دانستہ ان سے جھوٹ بولا اور رات والی تشویش ناک خبر سے متعلق کچھ نہیں بتایا۔

اول خیر والے معاملے کے بعد میں خود اب زہرہ بانو سے کھنچا کھنچا سا رہنے لگا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ یہ بات انہوں نے بھی محسوس کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کا جب بھی فون آتا، وہ پہلے مجھ سے بے مروتی کا شکوہ کرتیں اور پھر اصل گفتگو کی طرف آتیں۔ میں بھی دانستہ طرح دے جاتا۔

اول خیر سے میں نے اس بات کا شکوہ کیا تھا کہ اس نے مجھے لاعلم رکھتے ہوئے بیگم صاحبہ کو میرے ساتھ کیوں روانہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا؟

وہ بے چارہ شرمندہ تو ہوا مگر کوئی جواب نہیں دے سکا۔

''دیکھو اول خیر! جب تک تمہاری حیثیت بیگم صاحبہ کی نظروں میں پہلے جیسی نہیں ہو جاتی، میں نہ ان کا کوئی احسان لینا چاہتا ہوں اور نہ ہی ان کے ساتھ کسی قسم کے رابطوں کو طول دینا پسند کروں گا۔'' وہ چپ رہا۔

میں نے عابدہ والی اہم خبر سے اُسے آگاہ کیا تو پہلے تو اُسے بھی میری طرح اس بات پر یقین نہ آیا مگر میرے چہرے سے مترشح ہونے والی افسردگی اور گہری تشویش نے اُسے باور کرادیا کہ یہ خبر جھوٹی یا محض افواہ نہیں تھی۔

اس دوران ٹی وی بھی آن تھا۔ مگر ابھی تک جان ایف کینیڈی ائرپورٹ والے اس ناخوشگوار واقعے کی کوئی رپورٹ نہیں آرہی تھی۔ لیکن جب اول خیر نے مختلف چینلز باری باری آن کر کے دیکھے تو ایک پر اس اہم خبر سے متعلق باقاعدہ ایک پروگرام نشر ہو رہا تھا۔ وہ ہم غور سے دیکھنے لگے۔

سب کچھ وہی تھا، جو میں کار کے ریڈیو میں سُن چکا تھا۔ ابھی کوئی نئی خبر نہیں آئی تھی۔ لیکن مبصرین، تجزیہ نگاروں اور اینکر پرسن سمیت سب کا خیال تھا کہ نئے انکشافات منظر عام پر آنے کی توقع تھی۔

ایک سینئر صحافی اور تجزیہ نگار نے اس خدشے کا بھی اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''چونکہ ان تینوں افراد (عابدہ، عارفہ اور سیٹھ منظور وڑائچ) کا تعلق پاکستان سے ہے۔ تو عین ممکن ہے امریکا پاکستان کی وزارت خارجہ سے رابطہ کر کے ان تینوں مذکورہ افراد کے پاکستان میں مقیم خاندانوں کو

بھی دائرۂ تفتیش میں لانے کا کہہ سکتا ہے۔''

''کاکے! مجھے بہت جلد اس سلسلے میں میجر باجوہ صاحب کو آگاہ کرنا پڑے گا۔ یہ معاملہ مجھے گمبھیر لگتا ہے۔ اللہ رحم کرے۔''

مجھے اول خیر کی پُرتشویش آواز نے محویت سے چونکا دیا۔ اس کی بات پر میں نے اپنے سر کو ہولے سے تفہیمی جنبش دی۔

اس کے بعد ہم بھی آرام کرنے کے لیے ذرا دیر کو لیٹ گئے مگر خاصی دیر تک اسی سلسلے میں تبادلۂ خیال بھی کرتے رہے۔ پھر جانے کب ہماری آنکھ لگ گئی۔

☆☆☆

شکیلہ صبح سویرے جاگ گئی تھی۔ ماں جی کی وہ بڑی تندہی کے ساتھ خدمت کررہی تھی۔

ماں جی کے نہانے اور کپڑوں کا انتظام۔ پھر ناشتا اسی نے کروایا تھا۔ روایتی ماؤں کی طرح ماں جی نے بھی اُسے جانے میرے حوالے سے کیا سمجھ لیا تھا۔ ابھی ماں جی کو عابدہ کی حقیقت کا علم نہ تھا۔ ناشتا خاموشی سے ہوتا رہا۔ اس دوران شکیلہ نے مجھے بے چین کردینے والی اطلاع دی کہ آج صبح بیگم صاحبہ کا فون آیا تھا۔ کہہ رہی تھیں کہ جب سب بیدار ہوجائیں تو فون کرکے انہیں بتادیا جائے۔ لہٰذا اب شکیلہ مجھ سے اجازت لینا چاہتی تھی کہ وہ فون کرکے بیگم صاحبہ کو بتادے؟

میں کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ کوئی بہانہ مجھے اس وقت نہیں سوجھ رہا تھا۔ میں ابھی کسی سے ملنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ناشتے کے بعد مجھے... ماں سے بھی بہت ساری باتیں کرنا تھیں۔ میں نے شکیلہ کو کوئی جواب نہ دیا اور ناشتے میں مصروف رہا۔

ابھی ہم نے ناشتا ختم کیا ہی تھا کہ گیٹ پر موجود ایک گارڈ نے انٹرکام پر بیگم صاحبہ کی آمد کی اطلاع دے ڈالی۔ میں اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا اور اول خیر کی طرف دیکھنے لگا تو اس نے ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی۔ میں اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ یوں بھی اب وہ یہاں آہی چکی تھیں تو اُنہیں ملے بغیر یہاں سے لوٹانا نامناسب ہی ہوتا۔ لہٰذا میں نے گارڈ سے کہہ دیا کہ اُنہیں اندر آنے دیا جائے اور ملازم سے کہا کہ زہرہ بیگم کو ڈرائنگ روم میں ہی بٹھائے۔

میں ان سے ابھی اکیلے ہی ملنا چاہتا تھا۔

بیگم صاحبہ کو ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے چند منٹوں بعد میں وہاں پہنچا تو زہرہ بانو کے ساتھ کبیل دادا کو دیکھ کر جانے کیوں میرے حلق میں کڑواہٹ گھلنے لگی۔

طوعاً و کرہاً مجھے کبیل دادا سے بھی ملنا پڑا۔ جب سے اس نے اول خیر والا معاملہ خراب کیا تھا، مجھے یہ بھی ناپسند لگا تھا۔

''بہت بے مروت ہوتے جارہے ہو تم شہزی!'' حسبِ عادت زہرہ بانو مجھ سے شکایت کرتے ہوئے بولیں۔ ''دیکھ لو، ہم بھی بغیر بتائے آگئے یہاں۔ یہ تمہارا بازو؟'' ان کی نگاہ اچانک ہی میرے پٹی بندھے زخمی بازو پر پڑی۔

''ہاں معمولی زخم آگیا تھا۔ اب قدرے بہتر ہے۔'' میں نے کہا۔

''ماں جی کیسی ہیں؟ مجھے بہت خوشی ہورہی ہے شہزاد! پلیز مجھے بھی ملواؤ ناں ماں جی سے؟''

میں نے کہا۔ ''وہ آرام کررہی ہیں۔ ان کی کچھ طبیعت ٹھیک نہیں۔'' میں نے ہلکا سا جھوٹ بولنا مناسب سمجھا تھا۔

''کیا بات ہے شہزی؟ تم کچھ رُوکھے رُوکھے سے ہو رہے ہو؟''

''اس کی وجہ آپ جانتی ہیں زہرہ صاحبہ!'' میں نے بھی صاف گوئی سے کہہ ڈالا۔

''جانتی ہوں اس کی وجہ اول خیر ہے۔'' وہ بھی بہ یک تُرنت بولیں۔ کبیل دادا، جو بظاہر خاموش مگر بہ دستور میرے چہرے کی طرف گھورنے کے انداز میں تکے جارہا تھا۔ زہرہ بانو سے میرا اس طرح کا رویہ اُسے کھلتا تھا۔ وہ چپ نہ رہ سکا اور بول پڑا۔

''کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں کہ اول خیر اس وقت تمہارے ساتھ موجود ہے؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں نے بھی گرم ہوتی نظروں سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''بیگم صاحبہ اس کے بارے میں کوئی سخت حکم بھی دے سکتی تھیں۔'' وہ بولا۔

''مثلاً؟'' میں نے زہریلے طنز سے اس کی طرف گھور کر دیکھا۔

''تمہیں بیگم صاحبہ کا ممنون ہونا چاہیے کہ انہوں نے کوئی ایسا حکم جاری نہیں کیا کہ اول خیر اس علاقے بلکہ اس شہر میں ہی دوبارہ نظر نہ آئے نہ ہی تمہارے ساتھ بھی۔''

مجھے اس کی بات پر طیش آگیا۔

''میں بھی کسی ایسے حکم کو اپنے یار پر مسلط ہوتے کبھی بھی برداشت نہیں کرسکتا اور مجھ پر تو کم از کم بالکل بھی نہیں۔''

''شہزاد! اپنی اوقات میں رہو سمجھے تم۔'' میری جوابی

کارروائی پر کبیل دادا عادتاً بھتے سے اُکھڑنے لگا وہ چلا کر بولا تو بیگم صاحبہ نے یکدم مداخلت کرتے ہوئے کبیل دادا سے کہا۔

''دادا! تم خاموش رہو۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ تم شہزی سے نہیں اُلجھو گے۔'' وہ ناک بھوں چڑھاتے ہوئے میری طرف شعلہ بار نظروں سے تکنے لگا۔ پھر اپنا سر جھکالیا۔

زہرہ بانو کی اس تنبیہ کے بعد اُسے مزید کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوسکی۔ میں نے بھی اس گرما گرمی کو طول دینا مناسب نہ سمجھا۔ وہ بہرحال ہمارے مہمان کی حیثیت سے آئے تھے۔

اسی دوران شریفاں کھانے پینے کی نفیس سی ٹرالی دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہوئی اور چائے بنانے میں مصروف ہوگئی۔ پھر چائے کا ایک کپ اس نے زہرہ بانو کو تھمایا اور دوسرا کبیل دادا کو تھمانے لگی تو اس نے زہرہ بانو کو دیکھتے ہوئے طوعاً و کرہاً چائے کا کپ تھام تو لیا مگر اُسے اپنے سامنے دھری پڑی تپائی پر رکھ دیا۔ میں بھی اس کی طرف سے اپنی توجہ ہٹا چکا تھا۔ زہرہ بانو البتہ چائے کے گھونٹ بھرنے کے دوران میری طرف تکنے لگیں۔

خاموشی کا ایک طویل وقفہ درمیان میں آنے سے کمرے کی فضا مکدر سی محسوس ہونے لگی۔ جیسے ایک کھنچاؤ سا طاری ہوگیا تھا۔ ایسے میں، میں نے اول خیر کا موضوع بدلنے کی غرض سے زہرہ بانو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''حالات کا تقاضا ہے کہ آپ بھی اب حد سے زیادہ محتاط رہیں زہرہ صاحبہ!''

''ہم حالات سے بے خبر نہیں رہتے۔ بابا جانی (الف خان) جب تک زندہ رہے ہمیں کئی باتوں کا لحاظ رہتا تھا لیکن لئیق شاہ کے قتل اور قانون کی طرف سے انصاف نہ ملنے کی صورت بھی اب تمام ہوتی نظر آرہی ہے ہمیں۔ اب ممتاز خان کو بہت جلد ہمارا شکار بننا پڑے گا۔''

میں نے آج پہلی بار زہرہ بانو کے لہجے سے چوہدری ممتاز کے لیے آتشِ انتقام کے شعلے لپکتے ہوئے محسوس کیے تھے۔ ان کی کشادہ آنکھوں سے ایک ایسی نفرت مترشح ہوتی دیکھی جاسکتی تھی، جس کی تہ میں غم کی راکھ بھی دبی ہوئی تھی جو اب کسی بھی لمحے بھڑکتی ہوئی آگ کی صورت اختیار کرنے والی ہو۔ وہ شاید اب ممتاز خان کا کوئی لحاظ کیے بغیر اُسے کیفرِ کردار تک پہنچا کر جیسے جلد سے جلد اپنے انتقام کی آگ کو سرد کرنا چاہتی تھیں، جس نے انہیں اب بے سکون کرنا شروع کردیا تھا۔

''میں آج تک اس خوش فہمی میں تھی کہ میں ممتاز خان کے ساتھ قانونی جنگ کررہی ہوں اور ایک دن فتح میری ہوگی۔ مگر وہ اپنے اُوچھے ہتھکنڈوں سے باز نہ آیا اور بدستور مجرمانہ روش اختیار کیے رہا ہمارے ساتھ۔ شاید وہ نہیں جانتا ہے کہ جب کوئی امن پسند اور شریف، بدمعاش بنتا ہے تو اُس سے بڑھ کر پھر اور کوئی بدمعاش نہیں ہوتا۔''

وہ اپنے دل کا غبار نکالتی رہیں میں خاموشی سے سُنتا رہا۔ وہ چپ ہوئیں تو میں نے منہ بجھائے بیٹھے کبیل دادا کو مخاطب کرکے کہا۔ ''کبیل! اپنی چائے تو پی لو۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔'' اس نے کوئی رُخ نہیں دیا مجھے۔ میں نے بھی محض آدابِ میزبانی کو ہی ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کہا تھا۔

چائے ختم کرنے کے بعد وہ رُخصت ہونے لگیں تو انہوں نے کبیل دادا کو کوئی اشارہ کیا، جسے سمجھ کر اس نے ایک چبھتی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی اور باہر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد زہرہ بانو میری طرف بڑی گہری نگاہوں سے تکتے ہوئے بولیں۔ ''شہزی! تم خود کو ہم سے بھی الگ مت سمجھنا۔ تم اپنے دروازے شاید زہرہ بانو کے لیے بند کررہے ہو۔ لیکن بیگم ولا اور زہرہ بانو کے دروازے تمہارے لیے کبھی بند نہیں ہوسکتے، مرتے دم تک نہیں۔ تم جس طرح میری طرف سے تشویش میں رہتے ہو یہ عین اسی طرح میں بھی اسی تفکر میں مبتلا رہتی ہوں کہ خدارا چوہدری ممتاز خان کو آسان چارا مت سمجھنا اور اس سے محتاط رہنے کی کوشش کرنا۔ کیونکہ تم سے اس کی دُشمنی کی وجہ میں ہی ہوں۔ اگر تمہیں اس کے ہاتھوں خدانخواستہ کوئی نقصان پہنچا تو میں یہ برداشت نہ کرسکوں گی۔'' کہتے کہتے ان کی آواز ڈبڈبانے لگی تھی۔ ممکن ہے اُنہیں ایسے میں لئیق شاہ کی یاد آگئی ہو جو ممتاز خان کی بربریت کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔ میرا خیال ٹھیک نکلا جب وہ لمحہ بھر کے توقف کے بعد آگے بولنا شروع ہوئیں۔

''لئیق شاہ والا واقعہ میں کبھی نہیں بھول پاؤں گی۔ وہ دردناک منظر میری آنکھوں سے آج تک محو نہیں ہوسکا ہے شہزی!'' وہ پھر اسی طرح رُندھے ہوئے اور دل گیر لہجے میں بولیں۔ میں بھی اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

پھر وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے سوگوار چہرے کے سامنے لاتے ہوئے آبدیدہ پڑتی آنکھوں سے اُنہیں دیکھنے لگیں۔ ''ان ہاتھوں کی حنا بھی ماند نہیں پڑی تھی کہ انہیں اپنے محبوب شوہر لئیق شاہ کی لاش کو تھامنا پڑ گیا۔ میں بھلا وہ

منظر فراموش کر سکتی ہوں شہزی؟ ہرگز نہیں۔''

وہ سسک کر واپس جانے لگیں تو میں نے یک دم آگے بڑھ کر ان کا راستہ روک لیا۔ وہ سر اُٹھا کر اور قدرے چونکنے کے انداز میں اشکبار چہرے سے مجھے تکنے لگیں۔ میں نے ہولے سے مُسکرا کر کہا۔

''زہرہ صاحبہ! آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میرے لیے آپ کے دروازے بند ہو گئے؟ ہرگز نہیں۔ بس ذرا ممکن ہو سکے تو اول خیر کے بارے میں ایک بار سوچ لیجیے گا۔ وہ اب بھی آپ کا بہت اچھا، سچا اور جاں نثار ساتھی ہے، اُسے اس بات کا ابھی تک بے حد قلق ہے کہ اُسے آپ نے خود سے، بیگم ولا سے بے دخل کر دیا ہے۔''

زہرہ بانو کچھ سیکنڈ میرے چہرے کی طرف دیکھتی رہ گئیں پھر کوئی جواب دیے بغیر چلی گئیں۔

میں نے واپس آ کر اول خیر کو اس ملاقات کے بارے میں بتایا۔ وہ بھی کچھ افسردہ سا نظر آنے لگا۔ پھر بولا۔

''تم نے بیگم صاحبہ کو عابدہ کے بارے میں کچھ بتایا؟'' پتا نہیں اس نے کیا سوچ کر مجھ سے یہ سوال پوچھا تھا۔ میں نے جواباً نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''نہیں، انہیں بھلا میں کیا بتاتا اور کیوں؟''

''کاکے! ایک سے دو بھلے۔ کسی سے مشورہ کر لینا اچھا ہی ہوتا ہے۔ عابدہ جس صورتِ حال میں پھنس گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ مسئلہ معمولی نوعیت کا نہیں ہے۔''

''وہ بھلا مجھے اس گمبھیر مسئلے میں کیا اچھا مشورہ دے سکتی ہیں، میں صرف میجر باجوہ صاحب سے ہی اس سلسلے میں بات کرنا بہتر اور ضروری سمجھتا ہوں۔'' میں نے گہری متانت سے کہا تو اُس نے خاموشی اختیار کر لی۔

ماں جی سے مجھے بہت تفصیلی اور طویل گفتگو کرنا تھی مگر اس سے پہلے میں میجر صاحب سے ایک ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اکیلا رینجرز ہیڈ کوارٹر جا پہنچا۔

''شہزاد احمد خان کیسے ہو؟'' مجھے دیکھتے ہی انہوں نے اپنے مخصوص اور مضبوط لہجے میں کہا اور ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ میں ان سے مصافحہ کر کے ان کے سامنے والی کرسی پر براجمان ہو گیا اور چند رسمی کلمات کے بعد میں نے انہیں گزشتہ شب کی معرکہ آرائی کی رپورٹ دے دی۔ نیز ماں جی کے بارے میں بھی انہیں بتا دیا اور یہ بھی کہ بقول وزیر جان کے میرا باپ بھی زندہ ہے۔

یہ سن کر باجوہ صاحب نے سب سے پہلے تو مجھے ماں جی کے ملنے کی مبارکباد دی۔ ابھی میں نے اُن سے دانستہ عابدہ والی بات نہیں چھیڑی تھی۔ کیونکہ وہ ایک بہت طویل اور اہم موضوع تھا۔ پہلے میں ان کے ساتھ عمومی نوعیت کے معاملات پر گفتگو کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

وہ چند ثانیے کے لیے کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو گئے۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولے۔

''جنٹلمین! وزیر جان پر ہاتھ ڈالنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہماری اتنی معرکہ آرائی کے باوجود بدقسمتی سے اس کے خلاف اب تک کوئی ٹھوس ثبوت ہمارے ہاتھ نہیں لگ سکا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ ہم سے بدک چکا ہے اور تمہاری اصلیت بھی جان گیا ہے۔ اسے خوب اندازہ ہے کہ وہ پاور والوں کی نظروں میں آ چکا ہے اور ہم سے حد درجہ محتاط رہنے لگا ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ اب سیاسی حلقوں میں بھی اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے لگا ہے۔ تاکہ اُسے عوامی شیلٹر حاصل ہو سکے۔ خیر، مجھے تمہاری اس کے ساتھ جاری جنگ میں کچھ ایسا لگتا ضرور ہے کہ وہ کبھی نہ کبھی ہماری گرفت میں آئے گا۔''

باجوہ صاحب کی اس بات سے مجھے بھی پورا اتفاق تھا۔

''جی ہاں باجوہ صاحب! کیونکہ ماں جی کے ملنے کے بعد مجھے اپنا اور وزیر جان کا یہ معاملہ بہت دور تک جاتا دکھائی دیتا ہے۔ بہرحال آپ فکر نہ کریں، میں بہت جلد اس کی جڑیں کاٹنے والا ہوں۔ بلکہ لوہے کو لوہے سے کاٹنے والا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اُنہیں ممتاز خان کے بارے میں بھی بتا دیا۔ جو اپنے ذاتی عناد کی خاطر اپنے ہی ساتھی وزیر جان کے منہ سے اس کا شکار چھیننے کے لیے کوشاں تھا مگر میں نے اس کی یہ چال ناکام بنا دی تھی۔

میری اس بات پر وہ معنی خیز مسکراہٹ سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''جنٹلمین! ہم نے اسی لیے تمہیں اسپیکٹرم کے ان دونوں مقامی عہدے داروں کے سلسلے میں فری ہینڈ دے رکھا ہے۔ جیسے ہی تمہارے ہاتھ میں ان دونوں کی جڑیں آ جائیں گی تمہاری طرف سے گرین سگنل ملتے ہی ہم حرکت میں آ جائیں گے اور بین الاقوامی شہرت کے حامل اس نام نہاد ادارے کا پول کھول کر رکھ دیں گے۔ کیونکہ کچھ سیاسی اور ملکی مصلحتوں کے باعث ابھی ہم ان پر ہاتھ ڈالنے سے اجتناب برتتے ہوئے ہیں۔'' میں نے ان کی بات پر اپنے سر کو ہولے سے تفہیمی جنبش دی۔ پھر اس دوران ثریا اور اسپیکٹرم میں موجود اس کے اُن چند گنے چنے ساتھیوں کے بارے میں بھی بتایا جو درونِ خانہ ہی ثریا مرحوم کے مشن کو آگے بڑھائے ہوئے ہیں۔ لیکن ان

حالات میں اُنہیں بھی بے حد محتاط رہتے ہوئے یہ کام کرنا پڑ رہا ہے۔ اس لیے کہ وہ کچھار کے اندر ہی محبوس ہو کے رہ گئے ہیں۔ ثریا کا راز آشکارا ہونے اور اسے عبرت ناک سزا دینے کے بعد سے وہ بھی محتاط ہو گئے ہیں۔ ایک نے مجھ سے نجانے کیسے رابطہ کر لیا تھا مگر بدقسمتی سے وہ میرے ڈمی ہمدرد جو ممتاز خان کا ساتھی تھا، اس کے ہاتھوں مارا گیا جس کا مجھے ابھی تک قلق ہے۔ اس سے ہمیں کافی مفید معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔''

''یقیناً وہ ہمارے لیے کام کا آدمی ثابت ہو سکتا تھا۔ لیکن اب کیا معلوم کہ ثریا کے ایسے اور ہم خیال ساتھی وہاں کتنے رہ گئے ہیں؟'' وہ میری طرف اُلجھی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے تو میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔

''میں ان میں سے کسی ایک کو رابطے میں لانے کی پوری کوشش کروں گا۔'' اس کے بعد میں ذرا توقف سے اصل بات کی طرف آیا۔

''میں دراصل آپ کے پاس ایک اور گمبھیر مسئلے کے بارے میں ڈسکشن کرنے آیا تھا میجر صاحب!''

''ہاں، ہاں بولو۔ میں سن رہا ہوں۔''

''شاید آپ کے علم میں گزشتہ شب ٹی وی اور ریڈیو پر چلنے والی ایک بین الاقوامی خبر رساں ادارے کی وہ خبر نہیں آئی جس کے مطابق...'' اور پھر میں نے انہیں عابدہ اور عارفہ سے متعلق وہ اہم بات بھی گوش گزار کر ڈالی۔

انہوں نے اعتراف کیا کہ اپنی گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے وہ اتنی اہم خبر سے محروم رہ گئے تھے حالانکہ اُنہیں عابدہ اور عارفہ کے کیس کا اچھی طرح علم تھا۔

باجوہ صاحب یہ سن کر واقعی کچھ فکرمند اور پریشان سے نظر آنے لگے اور کئی ثانیوں تک کسی گہری سوچ میں مستغرق بھی رہے۔ بالآخر ایک لمبی سانس خارج کر کے بولے۔

''اس کا مطلب ہے ان لوگوں نے تمہیں جو دھمکی دی تھی، وہ محض دھمکی نہ تھی۔ اس سے ایک بات تو طے ہوئی کہ ان کے روابط واقعی بین الاقوامی سطح تک رسائی رکھتے ہیں اور ہماری معلومات کے مطابق، جو میں گزشتہ دنوں تمہارے علم میں بھی لا چکا ہوں کہ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش ہی یہ سب کر سکتا ہے اور اس کی سپاری دینے والے ہیں یہ دونوں خاص مہرے یعنی ممتاز خان اور وزیر جان۔''

میں بہ غور ان کی بات سن رہا تھا، بولا۔ ''سر! اب مجھے ایسا ہی لگتا ہے کہ یہ لوگ اس کی آڑ لے کر یہاں مجھے بھی خطرناک جرائم پیشہ مجرموں کا ساتھی گردان کر، کسی قانونی گرفت میں لانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔''

''ابھی یہ سب اتنی جلدی ممکن نہیں ہو شاید۔ مگر یہ سب وہاں کی غیر جانبدارانہ اور شفاف تفتیش پر ہی منحصر ہے۔ کیونکہ عارفہ کا میڈیکل پرابلم ایک جینوئن حقیقت ہے، یہ انہیں جھٹلا نہیں سکتے۔''

''اس سلسلے میں پُرامید تو میں بھی ہوں سر! کیونکہ سرمد بابا بھی ساتھ ہیں اور وہ اپنا پورا پورا دفاع کرنے کی کوشش کریں گے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں! لیکن تم اس سلسلے میں ابھی کوئی فکر نہ کرو۔ میں کچھ کرتا ہوں۔ تم اپنی توجہ صرف ممتاز خان اور بالخصوص وزیر جان پر مرکوز رکھو۔ اللہ بہتر کرے گا۔''

''انشاءاللہ!'' میں نے زیرِ لب دعائیہ کہا۔

باجوہ صاحب سے اس گمبھیر معاملے پر تفصیلی گفتگو کرنے کے بعد مجھے کچھ تسلی تو ہو گئی تھی۔ مگر ان سے رُخصت ہونے کے بعد میں واپسی کے سفر تک یہی سوچتا رہا کہ یہ معاملہ اتنا آسان بھی نہیں ہے اور مجھے اس کے حل کے لیے نئے کیل کانٹوں اور مربوط منصوبہ بندی سے لیس ہونا پڑے گا۔

میں بری طرح اُلجھ گیا تھا۔ پتا نہیں میری تقدیر کو کیا منظور تھا۔ ابھی نجانے اور کتنے امتحان مقصود تھے میرے؟ مجھے تو اپنے سارے ہی معاملات اُلجھے اور بکھرے ہوئے نظر آنے لگے تھے۔

میرا حقیقی اور سگا باپ زندہ تھا۔ مگر کہاں اور کس حال میں تھا، یہ مجھے نہیں پتا تھا۔ ماں جی میرے پاس تھیں۔ ابھی ان سے بھی بہت سی باتوں کا انکشاف ہونا باقی تھا۔ عابدہ امریکا میں اسمگلنگ کے ہاتھوں پھنس چکی تھی۔ اُدھر وزیر جان اور ممتاز خان میرے لیے کڑا امتحان بنے ہوئے تھے۔

میں انہی اُلجھی ہوئی سوچوں کے درمیان سرمد بابا کی کوٹھی پہنچا تو وہاں ایک چونکا دینے والی خبر میری منتظر تھی۔ خبر ٹیلی فون کے ذریعے ملی تھی جبکہ فون شکیلہ نے اٹینڈ کیا تھا۔ اور اطلاع امریکا سے ہی آئی تھی۔

میری اُلجھنوں میں جیسے ایک اور اُلجھن کا اضافہ ہونے لگا تھا۔ لیکن مجھے اس نئی اُلجھن کے پیچھے بھی ایک مکروہ سازش کا گماں ہوا تھا۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

ٹارزن

سرور اکرام

زندگی کی حقیقت کیا ہے... یہ بات سمجھ میں آجائے تو پھر یہ فسادات... نسلی تعصب اور طاقت کی بے رحم حکمرانی ہمیشہ کے لیے ختم نہ ہو جائے... امن و سکون... پیار و آشتی بانٹنے والے ایک پُراسرار کردار کی راجدھانی... جہاں صرف اس کی حکمرانی تھی... اس کی محبت... چاہ نے اسے اپنے آشیانے کا سردار بنا رکھا تھا... ہر ذی روح اس کا تابع تھا... مگر اچانک ہی اس کی سرداری خطرے میں پڑ گئی...

سوچوں کے در وا کر دینے اور حساس دلوں کے ساز چھیڑ دینے والی کہانی...

گاڑی چلتے چلتے رک گئی تھی۔

حالانکہ میرے اندازے کے مطابق اس میں اچھا خاصا پیٹرول ہونا چاہیے تھا پھر بھی وہ رک گئی تھی۔ اب کیا کیا جائے۔ مشین کا کیا بھروسا۔

لیکن پرابلم یہ تھی کہ میں کسی شہر میں نہیں تھا کہ جہاں اس قسم کے پرابلم کی اہمیت نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک جنگل تھا۔ بہت دور تک پھیلا ہوا اور بہت گھنا جنگل۔

ایک تو پرابلم تھی۔ دوسری پریشانی یہ تھی کہ ہر طرف

گھنے بادل چھائے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی بجلی بھی کوند رہی تھی۔ موسم ایسا ہو رہا تھا کہ بس کسی بھی وقت بارش شروع ہو جائے گی۔

اور اگر ایسا ہوتا تو ...... میں بری طرح پھنس کر رہ جاتا۔ ایک تو گاڑی خراب، پھر جنگل اور بارش۔ اس کے علاوہ میں نے یہ بھی سنا تھا کہ اس جنگل میں خطرناک قسم کے جانور بھی پائے جاتے ہیں۔ شیر اور چیتے بھی ہیں۔

میری شامت ہی آئی تھی کہ میں نے شارٹ کٹ کے چکر میں اس راستے کا انتخاب کیا تھا۔ حالانکہ میرے جاننے والے منع بھی کر رہے تھے لیکن مجھ پر نہ جانے کیا دھن سوار ہوگئی تھی کہ میں نے اس راستے کا انتخاب کرلیا۔

لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔ اب تو واپسی بھی مشکل تھی اور آگے بھی نہیں جاسکتا تھا۔ ایک دفعہ بہت زور سے بجلی چمکی اور اس کے ساتھ ہی بادلوں کی کڑک سنائی دی۔ خدا خیر کرے۔ بارش شروع ہونے والی تھی اور بارش شروع بھی ہوگئی۔

میرے خدا، پہلی بار پتا چل رہا تھا کہ جنگل کی بارش کیا ہوتی ہے۔ اتنی تیز دھار اور اتنے تواتر کے ساتھ کہ کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بادلوں کی گرج اور بجلی کی کوند۔ حالانکہ میں نے گاڑی کے سارے شیشے بند کر رکھے تھے لیکن اس سے کیا فرق پڑنے والا تھا۔

پھر اچانک کسی کی آواز سنائی دی۔

یہ انسانی آواز نہیں تھی بلکہ کسی جانور کی آواز تھی۔ بلند خرخراہٹ۔ وہ ایک بہت توی ہیکل ریچھ تھا جو بارش سے بچنے کے لیے بھاگ رہا تھا اور جب اسے میری گاڑی دکھائی دی تو وہ میری گاڑی کے پاس آگیا۔

اب اس کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح گاڑی کے اندر داخل ہوجائے۔ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ اس وقت جو کچھ مجھ پر گزر رہی تھی، وہ صرف میں ہی جانتا ہوں۔ بے پناہ خوف... مجھے اپنی موت قریب دکھائی دے رہی تھی۔ بالکل سامنے۔ ایک خطرناک ریچھ کی صورت میں۔

وہ کم بخت گاڑی کی ونڈ اسکرین کو اپنے مضبوط اور خطرناک ہاتھوں سے توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

خدا نہ کرے۔ اگر وہ شیشہ ٹوٹ جاتا تو پھر کیا ہوتا۔

وہ ریچھ غصے میں غرائے چلا جا رہا تھا۔ بارش نے اسے بوکھلا دیا تھا اس لیے وہ گاڑی کے اندر آنے کی جان توڑ کوشش کر رہا تھا۔

میں نے بلند آواز سے کلمہ پڑھنا شروع کردیا۔ شاید یہ میری زندگی کے آخری لمحات تھے۔ ونڈ اسکرین کسی بھی وقت ٹوٹ سکتی تھی۔ اس کے بعد جو بھی ہوتا، وہ بس موت ہی ہوتی۔

پھر اچانک ایک اور آواز سنائی دی۔ یہ آواز کسی جنگلی جانور کی آواز سے بالکل مختلف تھی۔ یہ ایک زوردار چیخ تھی۔ انسانی آواز تھی۔

آپ میں سے بہت سوں نے ٹارزن کی فلمیں دیکھی ہوں گی۔ ٹارزن ایک خاص قسم کی آواز نکالتا تھا۔ یہ آوازیں بھی ویسی ہی تھیں جیسے ٹارزن ہی چیختا ہو۔

اس آواز کو سن کر وہ خونخوار ریچھ بھی جیسے ہراساں ہو گیا تھا پھر وہ میری گاڑی سے نیچے اترا اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ بھی بری طرح خوف زدہ ہوگیا ہو پھر اس نے ایک طرف دوڑ لگا دی۔

اس کا دھیان مجھ سے یا میری گاڑی سے بالکل ہٹ چکا تھا۔ وہ بس دوڑا چلا جا رہا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے گھنے درختوں کے درمیان کہیں غائب ہوگیا۔

پھر ایک آدمی درختوں کے درمیان سے نکل کر سامنے آگیا۔ وہ بالکل ٹارزن ہی تھا۔ ویسا ہی بلند قد، ویسا ہی سڈول اور ورزشی جسم، ویسا ہی ایک کا چھا باندھے ہوئے۔ جس سے ایک بڑا سا خنجر بندھا ہوا تھا۔ لانبے لانبے بال۔

وہ بالکل ٹارزن تھا۔ جیسے ٹارزن کی فلم اسکرین پر چل رہی ہو اور وہ اسکرین سے باہر نکل کر سامنے آگیا ہو۔

میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے کچھ کہا۔ لیکن چونکہ شیشے بھی بند تھے اور بارش کا بے پناہ شور بھی تھا اس لیے کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

پھر اس نے شیشہ کھولنے کا اشارہ کیا۔ وہ حیرت انگیز تو تھا لیکن کسی جنگلی جانور کی طرح نہیں تھا۔ ایک انسان ہی تھا۔

میں نے خدا کا نام لے کر کھڑکی کا شیشہ نیچے گرا دیا۔ اس نے کھڑکی کے پاس آکر پوچھا۔ ''کیا بات ہے۔ اس جنگل میں کیوں آگئے ہو؟''

خدا کا شکر تھا کہ وہ میری ہی زبان بول رہا تھا۔

''بھائی! میری گاڑی خراب ہوگئی ہے۔'' میں نے بتایا۔

''آؤ میرے ساتھ چلو'' اس نے کہا۔ ''یہاں رکے رہے تو مر جاؤ گے۔ اس جنگل میں ہاتھی بھی ہیں۔ تمہاری گاڑی کے ٹکڑے کردیں گے۔''

''بھائی تم کون ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ سب باتیں بعد میں کرلینا۔ ابھی یہاں سے نکلو۔ گاڑی یہیں کھڑی رہے گی۔''

''میں بارش بند ہونے کا انتظار کروں گا۔''

''پاگل مت بنو۔ جنگل کی بارش ایک دو گھنٹوں میں بند نہیں ہوتی۔ چار پانچ دنوں تک چلتی ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔ میں تمہیں نقصان نہیں پہنچاؤں گا، آؤ میرے ساتھ۔''

وہ بہت ہی صاف زبان بول رہا تھا۔ اپنے حلیے اور لباس سے ٹارزن نظر آنے کے باوجود ایک مہذب شخص دکھائی دے رہا تھا۔

اسی لیے میں نے گاڑی سے اپنا بیگ اٹھایا۔ جس میں ضروری چیزیں بھری ہوئی تھی اور گاڑی کے شیشے وغیرہ بند کر کے گاڑی سے نیچے آگیا۔

بارش کے تیز تھپیڑوں نے بوکھلا کر رکھ دیا۔ اتنی تیز بارش۔ اس نے بڑی آہستگی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''آؤ میرے ساتھ ساتھ۔ اس وقت بھی بہت سے جنگلی جانور تمہیں دیکھ رہے ہیں۔''

میں خوف زدہ ہو کر اس کے ساتھ چل پڑا۔ ایک بات تو یقینی تھی کہ وہ ایک مہذب انسان تھا۔ اور کوئی بھوت وغیرہ بھی نہیں تھا۔ ورنہ اس کے ہاتھ کا لمس مجھے محسوس نہیں ہوتا۔

وہ مجھے گھنے درختوں کے درمیان لے آیا۔ اسے سارے راستے معلوم تھے۔ بہت ہی دشوار جنگل تھا۔ شاید صدیوں پرانے درخت ہوں گے اور وہ پُراسرار شخص مجھے ان ہی درختوں کے درمیان سے کسی نامعلوم منزل کی طرف لیے جا رہا تھا۔

بارش رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اب بہت سے جانوروں کے غرانے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ بہت قریب سے کسی شیر کے دہاڑنے کی آواز سنائی دی۔

میں خوف زدہ ہو کر اس سے تقریباً لپٹ گیا۔ ''گھبراؤ نہیں۔'' اس نے مجھے تسلی دی۔ ''جب تک میں تمہارے ساتھ ہوں، کوئی شیر قریب نہیں آئے گا بلکہ میں تمہیں کچھ دکھاتا ہوں۔''

اس نے ایک چیخ ماری۔ اپنے دونوں ہاتھ کا بھونپو بنا کر۔ بالکل وہی چیخ۔ ٹارزن والی لیکن اس چیخ میں اتار چڑھاؤ بھی تھا۔ ایک ہی لے میں نہیں تھی۔

''اب دیکھو، کیا ہوتا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن گھبرانا نہیں۔''

سامنے کی جھاڑیاں ہلیں اور اچانک ایک شیر اور دو چیتے دہاڑتے ہوئے سامنے آگئے۔ میرا یہ حال تھا کہ میں بے ہوش ہونے والا تھا لیکن اس شخص نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

''میں نے کہا تھا نا کہ گھبرانا نہیں، یہ کچھ نہیں کریں گے۔''

''ارے بھائی، یہ... یہ درندے ہیں۔'' میری آواز بری طرح کانپ رہی تھی۔

''کچھ نہیں ہوگا، یہ دیکھو۔''

وہ تینوں درندے خرخر کرتے ہوئے اس آدمی کے اردگرد گھوم رہے تھے۔ وہ ان کو تھپکیاں دے رہا تھا۔ ان کے کان سہلا رہا تھا۔

وہ درندے میری طرف توجہ بھی نہیں دے رہے تھے۔ جیسے یا تو میں انہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا یا شاید وہ آدمی میرے ساتھ ہی کھڑا تھا، اسی لیے اس کے خوف سے وہ کچھ نہیں کر رہے تھے۔ اس آدمی کے سامنے تو ان کی فطرت ہی بدل گئی تھی۔

پھر اس نے ان شیروں سے کچھ کہا۔ پتا نہیں کون سی زبان تھی۔ مجھے تو ایسا لگا جیسے بندر خوخیا رہے ہوں۔ وہ تینوں درندے جس طرح جھاڑیوں کے پیچھے سے نمودار ہوئے تھے، اسی طرح واپس بھی چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک میں اپنے ہوش و حواس میں نہیں آ سکا تھا۔

''چلو اب آگے چلو۔'' اس نے کہا۔ ''تم نے دیکھ لیا نا کہ جب تک میں تمہارے ساتھ ہوں، یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔''

خدا جانے وہ کون تھا۔ ایسے سین تو میں نے فلموں میں دیکھے ہوں گے اور اب میرے ساتھ ہو رہا تھا۔

ہم گھنے جنگلوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ایک ایسی جگہ آگئے جہاں ایک چھوٹا سا میدان تھا اور اس میدان میں لکڑی کا ایک کیبن بنا ہوا تھا۔

اس جنگل میں کیبن... شاید میں کوئی خواب ہی دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ اول تو خود اس شخص کا وجود حیران کر رہا تھا۔ پھر اس کے آس پاس خونخوار درندوں کا گھومنا اور اس کا ان جانوروں پر حکم چلانا اور اب یہ کیبن۔

خدا جانے یہ سب کیا تھا۔ میں نے اتنے حیران کن حالات پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

''یہ میرا کیبن ہے۔'' اس نے کیبن کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں یہیں رہتا ہوں۔''

''بھائی! میں حیرت سے پاگل ہوا جا رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''کیا ہے یہ سب؟ کون ہو تم؟ اس جنگل میں کیسے رہتے ہو؟''

وہ ہنس پڑا۔ ''آؤ، آؤ، پہلے اندر آجاؤ پھر سب کچھ بتادوں گا۔''

کیبن میں داخل ہوتے ہی راحت کا احساس ہوا۔ ایک تو اس کیبن میں بارش سے نجات مل گئی تھی۔ دوسرے اس میں ہلکی ہلکی حرارت بھی تھی۔

کیبن اچھا خاصا بڑا تھا اور بہت خوبی سے بنایا گیا تھا۔ اتنی موسلا دھار بارش کے باوجود کیبن کے اندر پانی کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔

کیبن کے فرش پر جانوروں کی کھال بچھی ہوئی تھی جو قالین کا کام دیتی تھی۔ غرضیکہ سب کچھ انتہائی حیران کر دینے والا تھا۔

''دیکھو، تم بھیگے ہوئے ہو۔'' اس نے کہا۔ ''میرے پاس دو چار جوڑے رکھے ہوئے ہیں۔ اپنے جسم کو خشک کر کے کپڑے بدل لو، ورنہ بیمار پڑ جاؤ گے۔''

''بھائی! تم نے تو کچھ بھی نہیں پہن رکھا ہے اور بری طرح بھیگے ہوئے ہو۔'' میں نے کہا۔

''میری بات اور ہے۔'' وہ مسکرا دیا۔ ''لیکن تم برداشت نہیں کر سکو گے۔ جلدی کرو، میں جب تک تمہارے لیے چائے بناتا ہوں۔''

''کیا مطلب؟ کیا تمہارے پاس چائے کا انتظام بھی ہے۔''

''سب کچھ ہے میرے پاس۔'' اس نے کہا۔ ''پہلے کپڑے بدلو پھر چائے پیتے ہوئے میں اپنے بارے میں سب کچھ بتادوں گا۔''

اس نے مجھے ایک بڑا تولیا اور شلوار قمیص کا ایک جوڑا لاکر دیا اور خود کیبن کی دیوار کے پاس بنے ہوئے ایک چولھے کی طرف چلا گیا۔

کچھ دیر بعد میں بالکل ریلیکس ہو کر اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ میں اس کے بارے میں جاننے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ میں تمہیں کس طرح کا لگتا ہوں؟'' اس نے پوچھا۔

''تم بالکل روایتی ٹارزن کی طرح لگتے ہو۔'' میں نے بتایا۔

''تو پھر یہ سن لو کہ میں وہی ٹارزن ہوں۔'' اس نے کہا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو ایک فرضی کردار تھا۔'' میں جلدی سے بولا۔ ''ایک ذہین رائٹر کے ذہن کا کمال۔ پھر وہ تم کیسے ہو گئے؟ دوسری بات یہ ہے کہ وہ کردار اب سے 80، 90 سال پرانا ہے اور تم آج کے آدمی ہو۔ اس کے علاوہ اس ٹارزن کو اردو کہاں سے آتی تھی جبکہ تم اردو ہی بول رہے ہو۔''

''تمہاری ہر بات درست ہے لیکن میں بھی جو کہہ رہا ہوں، وہ غلط نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں وہی ٹارزن ہوں۔ تم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ جنگلی درندے کس طرح میرا حکم مانتے ہیں۔''

''لیکن بھائی، یہ کیسے ممکن ہے؟''

''وہ اس طرح ممکن ہے کہ قدرت نے ہم سب کرداروں کو ایک جگہ جمع کیا۔ خاص طور پر وہ کردار جو اچھے ہوتے تھے۔ جنہوں نے نیکیاں کی تھیں، ان سے پوچھا گیا کہ کیا وہ اپنی اصل حیثیت میں رہیں گے تو میں نے ہاں کر دی اور میں ٹارزن بن کر تمہارے علاقے میں آگیا۔''

''ٹارزن بھائی یہ تو تم مجھے عجیب کہانی سنا رہے ہو؟''

''یہ کہانی نہیں، حقیقت ہے۔ کیا تم نے اپنی زندگی میں مجھ جیسا کوئی آدمی دیکھا ہوگا۔''

''نہیں، بالکل نہیں۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''اور یہ زبان۔ یہ تمہیں کس نے سکھائی؟''

''اسی قدرت نے۔'' اس نے بتایا۔ ''مجھے جس علاقے میں بھیجا گیا، اس علاقے کی زبان بھی سکھا دی گئی۔''

''میں تو حیرت سے پاگل ہوا جا رہا ہوں۔''

''قدرت کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔

''ٹارزن بھائی! اب ایک بات بتاؤ۔ ہم انسانوں کا تو ایک ماضی، حال اور مستقبل ہوتا ہے۔ یعنی ہم پیدا ہوتے ہیں، اپنی زندگی گزارتے ہیں اور مر جاتے ہیں لیکن تمہارے ساتھ کیا ہوگا۔ تم تو ایک کردار ہو۔''

''کردار بھی فراموش کر دیے جاتے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن اب شاید میں کردار نہیں رہا۔ بلکہ حقیقی وجود کی طرح تمہارے سامنے ہوں۔ اس لیے شاید مجھے بھی موت آجائے۔ جس طرح میرے ساتھی کو آگئی تھی۔''

''تمہارا ساتھی، وہ کون تھا؟''

''زمبا۔ ایک شیر۔ تم نے شاید میری کہانیوں میں اس شیر کے بارے میں پڑھا ہوگا۔ وہ میرا دوست تھا۔ میرا ساتھی تھا۔ اسے بھی میرے ساتھ یہاں بھیج دیا گیا تھا۔ لیکن ایک شخص نے اسے گولی ماردی اور وہ بے چارہ مر گیا۔''

''اوہ، یہ تو بہت برا ہوا۔'' میں نے افسوس کا اظہار کیا۔

''ہاں بہت برا۔ نہ جانے تمہارے زمانے کے

ہتھیار اتنے خوفناک اور خطرناک کیوں ہیں۔ ان ہتھیاروں نے انسان کو بزدل اور بے رحم بنا دیا ہے۔ یاد رکھو کہ جو شخص بہادر ہوتا ہے، وہ بے رحم اور ظالم نہیں ہوتا۔ بزدلی اور بے حسی ایک ساتھ ہوا کرتی ہے۔''

''ٹارزن بھائی۔'' اب میں اسے ٹارزن بھائی کہنے لگا تھا۔ ''اتنی عقل مندی تم نے کہاں سے سیکھی؟''

''جانوروں سے۔'' اس نے بتایا۔ ''ان میں اتنی خوبیاں ہوتی ہیں کہ تم سوچ نہیں سکتے۔ بہرحال اب سونے کی تیاری کرو۔ رات ہوگئی ہے صبح تمہیں واپس بھی جانا ہوگا۔''

''لیکن کیسے جاؤں، میری گاڑی تو خراب پڑی ہے۔ اس کو دھکا کون لگائے گا؟ شہر بھی بہت دور ہے۔''

''اس کی فکرمت کرو۔ میں صرف نام کا ٹارزن نہیں ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میں دھکا لگاؤں گا اور میرے ساتھ ساتھ میرے جنگلی دوست جانور بھی دھکا لگائیں گے۔ تم صرف تماشا دیکھتے رہنا۔''

مجھے اب حیرت نہیں ہو رہی تھی۔ میں سمجھ چکا تھا کہ یہاں سب کچھ ممکن ہے۔ یہ دنیا ہی حیران کر دینے والی ہے۔

بہرحال ہمارے درمیان کچھ دیر اور باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے اسے اپنے بارے میں بتاتے ہوئے پوچھا۔ ''ٹارزن بھائی! اگر کبھی تم سے ملنا ہوا تو کیسے ملوں گا؟''

''جب بھی تم اس جنگل میں داخل ہو گے مجھے پتا چل جائے گا۔''

''وہ کیسے؟''

''اس جنگل میں چلنے والی ہوائیں تک میری دوست ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''تم اس کی فکرمت کرو۔ بس اب سو جاؤ۔ مجھے تو بہت صبح اٹھنا پڑتا ہے۔ ہم جنگل میں رہنے والے صبح بہت جلدی اٹھتے ہیں۔''

حالانکہ ساری سچویشن کتنی حیران کر دینے والی تھی۔ اس کے باوجود نیند آگئی تھی۔ صبح اٹھا تو ٹارزن نے میرے لیے ناشتے کا بندوبست کر رکھا تھا اور ناشتا بھی کیا زبردست تھا۔ طاقت اور توانائی سے بھرا ہوا۔ کیلے اور تازہ ناریل کا پانی۔ واہ کیا بات تھی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے اس سے کہا۔ ''چلیں بھائی، اب بارش بھی رک گئی ہے، مجھے شہر بھی پہنچنا ہے۔''

''چلو، لیکن وعدہ کرو کہ تم شہر جا کر کسی کو میرے بارے میں نہیں بتاؤ گے۔'' اس نے کہا۔ ''اس سے ایک تو یہ ہوگا کہ لوگ تمہاری بات نہیں مانیں گے اور دوسرے یہ کہ میرا اپنا سکون ختم ہو جائے گا۔ لوگ مجھے دیکھنے کے لیے آیا کریں گے۔''

''ٹارزن بھائی، کم از کم میں تو آ سکتا ہوں۔''

''ہاں، تم جب جی چاہے آ جانا۔''

میری گاڑی اسی جگہ کھڑی ہوئی تھی جہاں ہم اسے چھوڑ گئے تھے۔ ٹارزن نے گاڑی کے پاس پہنچ کر پھر ایک آواز نکالی اور ایک گینڈا جھاڑیوں سے نکل کر ہماری طرف آ گیا۔ اس کو بھی دیکھ کر مجھ پر خوف طاری ہو گیا۔

''گھبراؤ نہیں۔ یہ کچھ نہیں کہے گا۔'' ٹارزن نے کہا۔ ''یہ تمہاری گاڑی کو دھکا لگائے گا۔''

''ٹارزن بھائی! میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ یہ سب کیسے ہو رہا ہے۔ اس علاقے میں گینڈے تو نہیں پائے جاتے۔''

''ہاں نہیں پائے جاتے لیکن جب قدرت نے مجھے یہاں بھیجا تو میرے ساتھ ان جانوروں کو بھی بھیج دیا تھا جو اس کردار میں میرے ساتھی ہوا کرتے تھے تاکہ مجھے ماحول جانا پہچانا لگے۔ چلو، اب گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔''

میں نے اسٹیرنگ سیٹ سنبھال لی پھر ٹارزن اور گینڈے نے گاڑی کو دھکا لگانا شروع کر دیا اور بہت جلدی ان دو طاقت ور عناصر نے میری گاڑی کو روڈ تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد ٹارزن گینڈے کو لے کر رخصت ہو گیا۔

بعد کے مرحلے آسان تھے۔ روڈ پر گاڑی کو کھینچ کر لے جانے والی ایک دوسری گاڑی مل گئی اور میں گاڑی کو ایک مکینک کے پاس لے آیا۔ میری گاڑی ٹھیک ہو گئی اور میں شہر واپس آ گیا۔

اس کے بعد بھی بہت دنوں تک میں یہی سوچتا رہا کہ خدایا جو کچھ بھی ہوا تھا، وہ خواب تھا یا واقعی ٹارزن مجھے ملا تھا۔ دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ اگر وہ حقیقت ہے تو میں اس کے بارے میں سب کو بتا دوں، ایک پریس کانفرنس کر دوں لیکن پھر ٹارزن سے کیا ہوا وعدہ یاد آ جاتا۔ ایک دن جب میرا دل نہیں مانا تو میں اپنی گاڑی لے کر اسی جنگل کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ میں ٹارزن کو کسی طرح راضی کر کے شہر لے آؤں گا اور پھر دنیا کے سامنے پیش کر دوں گا۔ مجھے امید تھی کہ ٹارزن میری بات مان لے گا۔ ذرا سلیقے سے سمجھانا تھا اُس کو۔

میں نے اپنی گاڑی اسی جگہ کھڑی کی جہاں پہلے خراب ہو کر کھڑی ہوئی تھی۔ کچھ دیر گزر گئی۔ ٹارزن کا کوئی پتا نہیں تھا۔ اس نے تو کہا تھا کہ میں جیسے ہی جنگل میں داخل ہوں گا وہ مجھے لینے کے لیے آ جائے گا لیکن وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔

بہت دیر ہو رہی تھی۔ پھر میں نے یہی مناسب سمجھا کہ خود ہی اس کیبن تک پہنچ جاؤں جہاں وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

راستے میں ملنے والے جانوروں کا خوف تو تھا۔ اس کے باوجود میں نے اپنی گاڑی ایک کنارے لگائی اور اس راستے کی طرف چل پڑا۔ یہ راستہ درختوں کے درمیان سے ہوتا ہوا ٹارزن کے کیبن تک جاتا تھا۔

مجھے یہاں تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ راستے میں کوئی جانور نہیں ملا تھا بلکہ اب یہ جنگل بھی بہت عام سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس طرح کے ہزاروں جنگل پورے ملک میں موجود ہیں۔ ورنہ پہلے تو یہ دور تک پھیلا ہوا دکھائی دے رہا تھا، سب کچھ بدلا بدلا سا تھا لیکن وہ کیبن اپنی جگہ موجود تھا۔ اس کیبن کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

میں دوڑتا ہوا کیبن میں داخل ہو گیا۔ ٹارزن کیبن ہی میں تھا۔ لیکن ایک طرف لیٹا ہوا۔ اس کے جسم پر زخموں کے نشان تھے۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ میں جلدی سے اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔

"ارے، کیا ہوا تمہیں۔ تم ٹھیک تو ہو نا؟" میں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"میرے جانے کا وقت ہو گیا ہے۔" وہ دھیرے سے بولا۔

"کہاں، کہاں جا رہے ہو؟"

"جہاں سے آیا تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "معدوم ہونے جا رہا ہوں۔ دنیا کی ہر شے کو معدوم ہونا ہے۔ چاہے وہ تم جیسا جیتا جاگتا انسان ہو یا مجھ جیسا کردار۔ ہم سب نسلوں کے تصور اور یادوں میں رہ جانے والے ہیں۔ کل تم بھی صرف ایک تصور رہ جاؤ گے۔ کیونکہ ازل سے یہیں ہوتا آیا ہے۔"

"ٹارزن تم سچ کہہ رہے ہو لیکن تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے؟"

"وہی بتانے جا رہا ہوں۔" وہ دھیرے سے بولا۔ "تم نے یہ کیا ہے کہ اپنی نئی نسل کے ہاتھوں میں آگ اگلنے والے اور موت برسانے والا ہتھیار دے دیے ہیں۔ تم نے یہ دیکھ لیا ہوگا کہ میں کتنا بہادر ہوا کرتا تھا لیکن ہوا یہ کہ ایک نوجوان نے مجھے اس حال کو پہنچا دیا۔"

"نوجوان نے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، ایک گاڑی اِدھر سے گزر رہی تھی۔ اس میں کچھ عورتیں اور ایک مرد تھا جو گاڑی چلا رہا تھا۔ ایک اور گاڑی پیچھے تھی جس میں ڈاکو تھے۔ انہوں نے اگلی گاڑی کو روک کر لوٹ مار شروع کر دی۔ ان سبھوں کے پاس وہی آگ اگلنے والے ہتھیار تھے۔ اتفاق سے میں وہاں پہنچ گیا اور ان ڈاکوؤں میں سے ایک نے مجھ پر گولیاں برسا دیں۔ میں زخمی ہو کر ایک طرف گر پڑا اور جب ہوش آیا تو وہ سب جا چکے تھے پھر میں کسی نہ کسی طرح اپنے کیبن میں واپس آ کر تمہارا انتظار کرنے لگا تو یہ ہے کہانی۔"

"بہت افسوس ہوا ٹارزن بھائی۔"

"اب تم افسوس مجھ پر مت کرو، اپنے آپ پر کرو۔ اپنے معاشرے پر کرو جس نے آتشیں ہتھیار عام کر کے ڈاکو اور درندے پیدا کر دیے۔ اب بہادری نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ اب صرف بزدلی ہے اور ہتھیار ہیں جو ہر ایک کے پاس ہیں۔ تم میں سے ہر شخص دوسرے کا خون کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس کو اتنی طاقت دے دی گئی ہے، وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ہتھیار کے زور پر مردوں کو لوٹ سکتا ہے اور عورتوں کی عزتیں برباد کر سکتا ہے۔ یہ سب بہت آسان ہو گیا ہے۔ جاؤ اپنے معاشرے میں واپس جا کر میرا یہ پیام پہنچا دو کہ جب تک لوگوں کے ہاتھوں میں ہتھیار ہیں، وہ بھلائی کی توقع نہ کریں۔ ہو سکتا ہے کہ امن پسند لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہو لیکن ایک ہتھیار اٹھانے والا شخص ان تمام امن پسندوں کو ایک لائن میں کھڑا کر کے ان کی دھجیاں اُڑا سکتا ہے۔ میرا کیا ہے..... میں تو کردار تھا اور کردار ہی رہوں گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری پوری تہذیب افسانہ بن کر رہ جائے۔"

ٹارزن نے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک لمحے کے لیے اس کا جسم تھرتھرایا اور وہ غائب ہو گیا۔ بالکل غائب۔ جس طرح سینما کے اسکرین پر کوئی کردار اچانک Dessolve ہو جاتا ہے۔ وہ بھی Dessolve ہو گیا۔

میں بہت دیر تک اسی کیبن میں بیٹھا رہا پھر اپنی گاڑی تک آیا اور شہر واپس آ گیا۔ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا، فسانہ تھا۔

لیکن ایک بات ذرا ایمانداری سے اور اپنے اردگرد کے ماحول کو دیکھتے ہوئے بتا دیں کہ اس نے جو کچھ کہا تھا، وہ بھی ایک خواب ہی تھا یا ہمارے معاشرے کی وہی حالت ہونے جا رہی ہے۔

ہمارا کیا ہے۔ ہم تو ٹارزن کی طرح Dessolve ہونے جا رہے ہیں لیکن جو نسل ابھی Dessolve نہیں ہوئی ہے۔ جسے ابھی زندگی کا بہت سفر طے کرنا ہے... اس کا کیا ہوگا؟

نئے لکھاری کی پہلی کاوش

شک بے شک

سونیا محبت گل

زندگی اور موت ایک اٹل حقیقت ہے... موت آتی ہے تو زندگی ختم ہو جاتی ہے اور جب تک زندگی باقی ہے، موت دور رہتی ہے... دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ ایک دوسرے کی ضد ہیں... اسی طرح جھوٹ اور سچ ہے. جو کبھی ایک ساتھ نہیں چلتے... جھوٹ بزدلی کی علامت ہے اور سچ... جرأت وہمت کی... ایسے ہی شرمناک اور قابلِ نفرت جھوٹ بولنے والوں کا قصہ... جو اپنے مفاد کی خاطر انسانی جانوں سے کھیل رہے تھے...

وہ جون کے مہینے کی ایک گرم لیکن ابر آلود صبح تھی۔ میں یعنی انسپکٹر ذیشان علی خان، اے ایس آئی کامران، حوالدار احسان اور دیگر عملہ پولیس موبائل میں بیٹھے جائے وقوعہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد موبائل راولپنڈی میں صدر کے علاقے میں واقع آشیانہ نامی گرلز ہاسٹل میں داخل ہوئی۔ عمارت کے باہر صبح کے ساڑھے آٹھ بجے بھی خاصا سناٹا تھا۔ یہ ایک تین منزلہ درمیانے درجے کا ہاسٹل تھا۔ عمارت کے سامنے اور پیچھے کی طرف بھی خاصا بڑا

احاطہ تھا جس کے گرد تقریباً سات فٹ اونچی چار دیواری تھی۔ داخلی دروازے پر ایک مسکین صورت کمزور سا پریشان حال شخص ہماری راہنمائی کے لیے موجود تھا۔

''آیئے سر... اوپر دوسری منزل پر۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

ہم سب تیز رفتاری سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دوسری منزل پر پہنچے تو کمرا نمبر چھ کے سامنے لڑکیوں کا ایک ہجوم تھا۔ سب کے چہروں پر خوف نمایاں تھا اور ان کی سرگوشیوں سے مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسا شور پیدا ہو رہا تھا۔ پولیس کو دیکھ کر وہ سب ایک طرف ہٹ گئیں۔ سب سے پہلے میں کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے کا دلخراش منظر تھا۔ ایک لڑکی کمرے کے وسط میں لگے پنکھے سے جھول رہی تھی۔ اس نے ہلکے گلابی رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ زندگی میں وہ کافی خوب صورت رہی ہو گی لیکن اب موت کی تکلیف اس کے چہرے پر ثبت ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے پاؤں کے نیچے ایک اسٹول الٹا پڑا تھا۔ اس اسٹول کے علاوہ کمرے میں ایک بیڈ، الماری اور میز تھی جس پر چند کتابیں رکھی تھیں۔ کمرے میں باہر کی طرف کھلنے والی ایک کھڑکی تھی جو اس وقت کھلی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ آمدورفت کے لیے ایک دروازہ تھا جسے توڑ کر اندر داخل ہوا گیا تھا۔ کمرے میں سبز رنگ کی ساڑی میں ملبوس ایک عورت موجود تھی۔ پہلی نظر میں وہ مجھے عورت ہی لگی لیکن جب میں نے غور کیا تو مجھ پر آشکار ہوا کہ وہ عورت نہیں بلکہ خواجہ سرا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر پینتالیس سال کے قریب رہی ہو گی۔ وہ قدرے بھاری وجود کی مالک تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ جنہیں اس نے ایک کلپ سے سمیٹنے کی ناکام کوشش کر رکھی تھی۔ اپنے بالوں کی طرح وہ خود بھی خاصی پریشان نظر آتی تھی۔

لاش اور کمرے کا جائزہ لینے اور اپنے ماتحتوں کو ضروری ہدایات دینے کے بعد میں کمرے میں موجود خواجہ سرا کی طرف متوجہ ہوا۔ ''آپ کی تعریف؟'' میں نے سپاٹ لہجے میں دریافت کیا۔

''سرکار اس ہاسٹل کی مالکہ ہوں۔ میڈم جانی کہتے ہیں مجھے۔''

''حادثے کا پتا سب سے پہلے کسے اور کیسے چلا اور کسی چیز کو چھیڑا تو نہیں گیا؟'' میں نے خالص پیشہ ورانہ لہجے میں سوال کیا۔

''نہیں سرکار ہم نے کسی چیز کو نہیں چھیڑا، سب کچھ ویسے کا ویسا ہے اور پتا ایسے چلا کہ شازیہ، ہائے بے چاری لڑکی۔'' اس نے لاش کی طرف اشارہ کیا۔ ''صبح صبح اٹھ جاتی تھی۔ پہلے تھوڑی ورزش کرتی تھی پھر ٹھیک پونے سات بجے ناشتا کرتی تھی۔ یہ اس کا روز معمول تھا جس میں سوائے اتوار کے کبھی فرق نہیں آیا تھا لیکن آج جب وہ نہیں اٹھی تو میری ملازمہ رابعہ اسے ناشتا دینے گئی۔ کافی دیر تک دروازہ بجانے کے بعد بھی جب اس نے دروازہ نہیں کھولا تو رابعہ نے مجھے بتایا۔ ہم نے یہ سوچ کر کہ کہیں وہ گر کر بے ہوش نہ ہو گئی ہو، دروازہ توڑ دیا اور پھر سرکار ہائے کچھ نہ پوچھیں... میرے دل پر کیا گزری۔'' اس نے نم آنکھوں کے ساتھ بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس سے بات کر کے مجھے اندازہ ہوا کہ حالات خواہ کیسے بھی ہوں خواجہ سراؤں کے بات کرنے کے ڈھنگ میں کوئی خاص فرق نہیں آتا۔

''سر، ضروری اقدامات ہو گئے ہیں۔'' کامران نے مجھے مطلع کیا۔

''ٹھیک ہے۔ کیا اس کے گھر والوں کو مطلع کر دیا گیا ہے؟'' میں نے میڈم جانی سے سوال کیا۔

''نہیں سرکار، اس کا تو ہوش ہی نہیں رہا۔'' اس نے کہا۔

''کامران اس کے گھر والوں کو اطلاع دو اور لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دو۔''

کمرے میں کوئی خودکشی سے متعلق رقعہ نہیں تھا۔ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجنے کے بعد میں نے کمرا سیل کر دیا۔

''آپ کے خیال میں اس خودکشی کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟'' میں نے ہاسٹل کے آرام دہ کمرے میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے میڈم جانی سے سوال کیا۔

''ائے ہائے سرکار وجہ کیا پوچھتے ہو، ویسے تو وجہ اللہ پاک ہی بہتر جانتا ہے لیکن جہاں تک میرا خیال ہے اس خودکشی کے پیچھے بھی وہی وجہ ہے جو اس ملک میں ہونے والی زیادہ تر خودکشیوں کے پیچھے ہوتی ہے۔''

''آپ کچھ وضاحت کرنا پسند کریں گی؟'' میں نے کہا۔ وہ شاید ان لوگوں میں سے تھی جنہیں بات کو گھما کر کرنے کی عادت ہوتی ہے۔

''سرکار غربت، پیسے کی تنگی وغیرہ وغیرہ۔ سرکار دراصل یہ جو بدنصیب لڑکی شازیہ تھی نا، ہائے کیا بتاؤں اس کے حالات بہت خراب تھے۔'' اس نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بوڑھے ماں باپ پنجاب کے کسی دور دراز

گاؤں میں رہتے ہیں۔ ان کی صرف ایک ہی بیٹی تھی اس لیے باوجود غربت کے انہوں نے یہاں پڑھنے کے لیے اسے اس کے رشتے کی خالہ کے گھر بھیج دیا۔ کچھ عرصے وہ بے چاری خالہ کے پاس رہی لیکن پھر اس کے خالو کا تبادلہ لاہور ہوگیا تو اسے وہ گھر چھوڑنا پڑا۔ جب وہ میرے پاس آئی اور اپنی مجبوری بیان کی تو میرا دل پگھل گیا۔ میں نے نہ صرف اسے شام کے اوقات میں ایک ویمن این جی او میں جاب دلوا دی بلکہ اس سے یہ بھی کہہ دیا کہ جب تک اسے پہلی تنخواہ نہیں مل جاتی، وہ بغیر کسی ادائیگی کے رہ سکتی ہے۔ وہ معاشیات میں ایم اے کر رہی تھی۔ پڑھائی کے اخراجات الگ اور دیگر اخراجات الگ، ایک شام کی جاب سے یہ سب پورا... ہونا بہت مشکل ہے اس لیے وہ اکثر پریشان رہتی تھی۔ میرے خیال میں مسلسل پریشانیوں سے تنگ آکر اس نے اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا۔'' اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

''یعنی آپ کے خیال میں اس خودکشی کا محرک غربت ہے۔ خیر، میں شازیہ کی دوستوں سے بھی بات کرنا چاہوں گا۔''

''اس ہاسٹل میں تو اس کی کسی کے ساتھ کوئی خاص دوستی نہیں تھی پھر بھی آپ بات کرنا چاہتے ہیں تو ضرور کریں۔''

میں نے ہاسٹل کی کچھ لڑکیوں سے بات کی لیکن اس سے کوئی قابلِ ذکر بات نہ معلوم ہوسکی۔

احسان کو میڈم جانی اور دیگر لوگوں کا بیان قلم بند کرنے کی ہدایت دے کر اور چند اور اقدامات کرنے کے بعد میں آفس واپس آگیا۔ کیونکہ مجھے کئی اور کیسز کو بھی دیکھنا تھا۔ ملک کے حالات اس قدر خراب ہوگئے ہیں کہ پولیس والوں کے لیے فارغ بیٹھنا خواب ہی ہوگیا ہے۔

اگلے روز میں آفس میں بیٹھا کچھ فائلیں دیکھ رہا تھا کہ کامران میرے کمرے میں داخل ہوا۔

''سر! شازیہ کیس کی پوسٹ مارٹم رپورٹ آگئی ہے۔'' اس نے لفافہ دیتے ہوئے کہا۔

میں اس کے ہاتھ سے لفافہ لے کر رپورٹ پڑھنے لگا۔ ابھی تک ہم اسے خودکشی کا سیدھا سادہ کیس سمجھ رہے تھے لیکن جوں جوں میں اس رپورٹ کو پڑھتا گیا، میرے ماتھے کی شکنوں میں اضافہ ہوتا گیا۔

''سر! کوئی مسئلہ ہے؟'' کامران نے میرے تاثرات کو بھانپتے ہوئے سوال کیا۔

''اس رپورٹ کے مطابق جب اسے پھندے سے لٹکایا گئی تو وہ مر چکی تھی۔''

''وہ کیسے سر؟'' کامران نے سوال کیا۔

''وہ ایسے کہ زندہ انسان کا خون [illegible] ہوتا ہے۔ اس لیے رسی کا حلقہ جب گردن کے گرد کھنچ جاتا ہے تو خون کی گردش متاثر ہوتی ہے۔ [illegible] جب کسی چیز کے ساتھ لٹک کر خودکشی کرتا ہے تو [illegible] سے اس کی گردن کی ہڈی جس طرح متاثر ہوتی ہے یہاں وہ بات نہیں پائی گئی۔ حالانکہ اس کی موت دم گھٹنے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ پہلے اس کے منہ پر تکیہ وغیرہ رکھ کر اسے مارا گیا۔ اس کے بعد پھندے سے لٹکا کر پولیس کو گمراہ کرنا چاہا۔''

''لیکن سر مقتولہ کی زبان باہر لٹکی ہوئی تھی [illegible] کر مارنے سے تو نہیں ہوتا؟''

''لیکن تم نے ایک اور بات نوٹ نہیں کی [illegible] زبان تو باہر لٹکی ہوئی تھی لیکن...... آنکھیں [illegible] میں تھیں کیونکہ آنکھوں کو کھینچ کر باہر نہیں [illegible] جاسکتا۔''

''یعنی سر، آپ کا مطلب ہے کہ زبان کو کھینچ کر باہر نکالا گیا ہے؟ اس قدر درندگی۔'' کامران نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

''رپورٹ سے یہ بھی پتا چلا ہے کہ شازیہ تین ماہ کے حمل سے تھی۔ ممکنہ طور پر اس کے بچے کا باپ اس کا قاتل ہو سکتا ہے۔''

''یقیناً شازیہ نے اس سے شادی کے لیے کہا ہوگا اور نہ ماننے پر دھمکی دی ہوگی اس لیے اس نے اسے قتل کردیا ہو گا۔'' کامران نے قیاس آرائی کی۔

''ہاں ایسا ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ ہمیں ہر امکان پر نظر رکھنا ہوگی۔ تم فوری طور پر بچے کا ڈی این اے محفوظ کرواؤ، یہ قاتل تک پہنچنے میں ہمارے لیے بہت مددگار ثابت ہوسکتا ہے اور موبائل ریڈی کرواؤ ہمیں جائے وقوعہ کا نئے سرے سے جائزہ لینا ہوگا۔''

کچھ دیر بعد ہم آشیانہ ہاسٹل میں شازیہ کے کمرے میں موجود تھے۔ ''قاتل کے آنے کا واحد راستہ یہ کھڑکی ہی ہے۔'' کامران نے کہا۔

''ہاں، یہاں سے اندر داخل ہونا بے حد آسان ہے۔'' میں نے کھڑکی سے جھانکتے ہوئے کہا۔ کھڑکی کے نیچے ایک آگے کو نکلا ہوا چھجا سا بنا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ لوہے کا پائپ تھا جو نیچے تک جا رہا تھا۔ یہ عمارت کی بیک

سائڈ تھی۔ چار دیواری سے مین بلڈنگ تک خاصا بڑا خالی احاطہ تھا جہاں پھول پودے وغیرہ لگائے گئے تھے۔ اس کے بعد ہم نے پیچھے کا جائزہ لیا۔ زمین خشک تھی لہٰذا قدموں کے نشان تو مل نہیں سکتے تھے۔ چار دیواری پر کوئی حفاظتی نظام نہیں تھا۔ ایک جگہ دیوار پر اوپر کے کنارے کا تھوڑا سا پلاسٹر اکھڑا ہوا تھا۔ میں نے زمین پر پڑا ہوا ٹکڑا اٹھایا۔ ''یہ تازہ اکھڑا ہوا ہے۔'' میں نے ٹکڑے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ قاتل یہاں سے اندر داخل ہوا ہے۔'' کامران نے کہا۔

''ہاں... ہو سکتا ہے۔'' میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

میں نے پائپ اور کھڑکی پر فنگر پرنٹ تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔

''میڈم جانی! ایک شخص آپ کے ہاسٹل میں داخل ہوتا ہے۔ ایک لڑکی کو قتل کرتا ہے اور پولیس کو دھوکا دینے کا سارا سامان پیدا کرتا ہے اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی؟'' میں نے تند لہجے میں کہا۔

''سرکار! مم... میں کیا کروں، میں خود بہت پریشان ہوں۔ لڑکیوں میں خوف و ہراس پھیل گیا ہے۔ میرے ہاسٹل کی شہرت کو الگ نقصان پہنچا ہے۔ ایسا واقعہ کیا... یہاں کبھی معمولی سی چوری تک کا واقعہ نہیں ہوا۔ میں نے چوکیدار بھی رکھا ہوا ہے مگر وہ کم بخت نہ جانے کہاں سویا پڑا تھا۔''

''خیر اس ہاسٹل میں کتنے ملازم ہیں، خاص طور پر مرد؟'' میں نے سوال کیا۔

''سرکار مرد تو تین ہی ہیں دو چوکیدار ایک رات اور دوسرا صبح کے لیے اور ایک جمیل ہے اس کے علاوہ صفائی کے لیے تین عورتیں اور کھانا پکانے کے لیے بھی تین عورتیں ہیں۔''

''چوکیدار تو عمارت کے باہر ہی رہتے ہوں گے؟''

''جی سرکار وہ نکھٹو باہر ہی رہتے ہیں۔''

''اور آپ کا جمیل، وہ کیا یہیں رہتا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''جی سرکار وہ چوبیس گھنٹے یہیں رہتا ہے۔ کبھی کبھار چھٹی لے کر اپنے گاؤں ہو آتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، اسے بُلائیں۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے بھوؤں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد جمیل میرے سامنے تھا وہ وہی تھا جس سے وقوعے کے روز سب سے پہلے ہمارا سامنا ہوا تھا۔

اس نے سفید شرٹ کے ساتھ کالی پتلون پہن رکھی تھی۔ وہ جسمانی طور پر کافی کمزور تھا اور شکل سے بلا کا مسکین نظر آتا تھا۔

''تم کب سے میڈم جانی کے ساتھ ہو؟'' میں نے جمیل کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جناب میں تقریباً سات سال سے میڈم جانی کے ساتھ ہوں۔''

''ہاسٹل کے معاملات تم ہی دیکھتے ہو تو کبھی ایسا ہوا کہ شازیہ کسی رات ہاسٹل نہ آئی ہو یا دیر سے آئی ہو؟''

''ایک دو بار اس نے آنے میں تھوڑی دیر کی لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ وہ رات آئی ہی نہ ہو۔'' اس نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا کبھی کوئی شازیہ سے ملنے آیا ہو یا تم اس کے کسی دوست کو جانتے ہو؟'' میں نے جمیل سے سوال کیا۔

''نہیں، اس سے ملنے کبھی کوئی نہیں آیا نہ ہی میں اس کے کسی دوست کو جانتا ہوں۔'' اس نے دوست پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔

''اچھا تمہارے ساتھ اس کے تعلقات کیسے تھے؟'' میں نے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال داغا۔

''میرے ساتھ تو کیا اس کے تعلقات سب کے ساتھ بہت اچھے تھے، وہ بے حد اچھی لڑکی تھی۔ مجھے اس کی موت کا بہت افسوس ہے۔ مجھے تو حیرت ہے کہ کوئی اسے کیونکر قتل کر سکتا ہے۔''

''مسٹر جمیل، مس شازیہ حاملہ تھی۔ کیا تم کوئی اندازہ قائم کر سکتے ہو کہ وہ بچہ کس کا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ تم چوبیس گھنٹے یہیں ہوتے ہیں تو شاید بہتر طور پر اندازہ لگا سکو۔'' میں نے یہیں ہونے پر زور دیتے ہوئے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا حاملہ...؟'' اس نے حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو بے حد شریف لڑکی تھی۔ اس معاملے میں میری عقل حیران ہے۔ میں کوئی اندازہ لگانے سے قاصر ہوں۔''

''ٹھیک ہے، تم جا سکتے ہو۔'' میں نے کامران سے کہا۔ کہ وہ ڈی این اے کے لیے اس کا سیمپل لے لے۔ میں شازیہ کے گرد پائے جانے والے تمام افراد کا ڈی این اے چیک کروانا چاہتا تھا۔

''سر بچے کا ڈی این اے محفوظ کرلیا گیا ہے۔ کیا اب لاش ورثا کے حوالے کر دی جائے؟'' کامران نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

''میں شازیہ کے والدین سے ملنا چاہوں گا ممکن ہے وہ اس قتل کی وجوہات پر کوئی روشنی ڈال سکیں۔ گاڑی لے چلو۔'' میں نے حکم دیا۔

ان بوڑھے ماں باپ کو دیکھ کر مجھے دلی رنج پہنچا۔ ماں کا تو رو رو کر بُرا حال تھا اور وہ پنجابی زبان میں نہ جانے کیا کیا بڑبڑا رہی تھی۔ باپ البتہ کسی قدر بات کرنے کی حالت میں تھا۔ اگرچہ بات کرتے کرتے اس کی آنکھوں میں بھی بار بار آنسو امڈ آتے۔ جنہیں وہ اپنے کندھے پر رکھی چادر سے صاف کرتا۔ اس کا جھریوں بھرا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ اس کی عمر ستر سال کے قریب رہی ہوگی۔ اس نے سفید رنگ کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ سر پر سفید رنگ کی سادہ سی پگڑی تھی جو سفید کپڑے کو سادہ انداز میں بل دے کر بنائی گئی تھی۔ بوڑھی عورت غم و اندوہ کی تصویر نظر آتی تھی۔ اس نے کالے رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے جن پر چھوٹے چھوٹے سفید پھول بنے ہوئے تھے۔ اس کی عمر بھی ساٹھ کے قریب رہی ہوگی۔ اس عمر میں بھی اس کے نقش و نگار گواہی دے رہے تھے کہ جوانی میں وہ کافی خوب صورت رہی ہوگی۔ اس کی صورت کافی حد تک شازیہ سے مشابہ تھی۔

''بابا جی، کیا آپ کو کسی پر اپنی بیٹی کے قاتل ہونے کا شبہ ہے؟ میرا مطلب ہے کہ کبھی اس نے اپنی ذات کو لاحق کسی خطرے کے بارے میں ذکر کیا ہو؟''

''قتل...؟'' اس نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ ''پر سانوں تے پتا لگا سی کہ اس نے اپنے آپ نو خود ہی مار دتا اے۔''

''بابا جی، ابتدائی طور پر یہی لگ رہا تھا کہ یہ خودکشی کا کیس ہے لیکن پوسٹ مارٹم کے بعد پتا چلا ہے کہ یہ قتل کا کیس ہے۔''

''میری پھولوں جیسی دھی کو کوئی کیوں قتل کرے گا... یہ کیسے ہو سکتا ہے...'' اس نے بے یقینی سے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''بابا جی... میں آپ سے یہ پوچھنا چاہ رہا ہوں کہ آپ کی کسی خاندانی دشمنی کا نتیجہ تو نہیں؟''

''تھانے دار جی ہمارا کسی سے کوئی جھگڑا نہیں۔ پنڈ میں ہمارا کوئی رشتے دار نہیں۔ میری دھی کو کس نے قتل کر دیا۔'' اس نے روتے بلکتے فریاد کی۔

میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ میری پوری زندگی میں اس سے مشکل لمحہ میرے اوپر کوئی نہیں آیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار میرے پاس بات کرنے کے لیے الفاظ نہیں تھے۔ زندگی میں پہلی بار میں نے خود کو اس قدر بے بس محسوس کیا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ میرے الفاظ سننے والے دکھی اور کمزور باپ کی سماعت پر بم بن کر گریں گے اور اس کے دل کی دنیا تہ و بالا کر دیں گے۔ رہتی زندگی کے لیے اس کے جسم کو یہ الفاظ ایک مسلسل رِستا ہوا ناسور بنا دیں گے۔ شاید رونے کے لیے اسے لہو کے آنسو بھی کم پڑ جائیں۔ لیکن سب کچھ جانتے ہوئے بھی مجھے ان الفاظ کے دہکتے انگارے اس مسکین کے دل میں اتارنے پڑے۔ جب میں بولا تو مجھے اپنی آواز بھی اجنبی لگی۔

''ب... بابا جی مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ کیسے کہوں، میں جانتا بھی ہوں کہ آپ کو ایک کبھی نہ ختم ہونے والا دکھ دینے جا رہا ہوں لیکن یہ دنیا ہے۔ حقیقت سے فرار ممکن نہیں، آپ کو بتانا ضروری ہے۔ آ... آپ کی بیٹی تین ماہ کے حمل سے تھی۔'' میں نے اذیت کی نہ جانے کتنی منازل طے کرتے ہوئے بالآخر کہہ دیا جبکہ میں جانتا تھا کہ سننے والے اس باپ کے لیے جس نے زندگی میں صرف عزت ہی کمائی ہو، اس کی اذیت کو دنیا کا کوئی آلہ نہیں ناپ سکتا۔ کوئی اچھے سے اچھا لکھاری بھی اس کی اذیت کو الفاظ کا جامہ نہیں پہنا سکتا۔

اس کا رنگ اس طرح پیلا پڑ گیا جیسے کاٹو تو لہو نہیں، وہ زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ وہ مجھے ایسے خالی خالی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے اسے اپنی سماعت پر یقین نہ آ رہا ہو کہ جو اس نے سنا ہے میں نے وہی کہا ہے۔

''اے نہیں ہو سکدا... اے نہیں ہو سکدا۔'' اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ''یہ جھوٹ ہے... ایسا نہیں ہو سکدا اے۔'' اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''بابا جی سچ اکثر تلخ ہی ہوتا ہے لیکن تمام تر تلخی کے باوجود اس کی حیثیت کو کوئی نہیں بدل سکتا، وہ سچ ہی رہتا ہے۔ انسان جتنی جلدی اسے قبول کرے، اتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔''

اب وہ ابتدائی جھٹکے سے نکل چکا تھا۔ اس نے دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ کچھ بے ربط جملے اس کے منہ سے نکل رہے تھے۔ شازیہ کی ماں اس بے رحم حقیقت سے بے خبر راہداری کے آخر میں بیٹھی اپنی

بیٹی کی موت پر آنسو بہا رہی تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ کچھ ایسی بے رحم سچائیاں اس کی منتظر ہیں جن کو جاننے سے کئی زیادہ سہل مر جانا ہوتا۔ کچھ دیر بعد جب شازیہ کے باپ کی حالت کچھ بہتر ہوئی تو میں نے اس سے پوچھا۔ ''باباجی اگر آپ لاش گاؤں لے جانا چاہیں تو میں انتظامات کروا دوں گا۔'' مجھے اس شخص سے دلی ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔

''پُتر زندگی میں، میں نے عزت ہی کمائی ہے۔ میں لاش وہاں لے جا کے بے عزت نہیں ہونا چاہتا... میری دھی کو ادھر ہی دفنا دو...'' اس نے روتے ہوئے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے حوالدار احسان تم ان کی تدفین کے سلسلے میں مدد کرو اور ان کے رہنے کا بھی مناسب انتظام کرو۔'' میں نے احسان کو پیسے دیتے ہوئے کہا۔

میرا ذہن بے حد بوجھل ہو چکا تھا۔ اب میں جلد از جلد شازیہ کے قاتل کو پکڑنا چاہتا تھا۔ شاید اس سے ان دکھی ماں باپ کو کچھ قرار آ جاتا۔

''کامران، تم ایسا کرو کل شازیہ کے یونیورسٹی کے تمام دوستوں کو بلاؤ میں خود ان سے بات کرنا چاہوں گا۔ اگر شازیہ کا قاتل اس کے بچے کا باپ نہ بھی ہو تو یہ کسی ایسے شخص ہی کا کام ہے جسے وہ اچھی طرح جانتی تھی۔''

☆☆☆

اگلے روز میں نے اپنے آفس میں شازیہ کے دوستوں سے ایک ایک کر کے ملاقات کی۔ اس دوران کامران بھی میرے ساتھ تھا اور ساتھ ہی ان کا بیان ریکارڈ بھی کیا جا رہا تھا۔

سب سے پہلے آنے والا ایک تقریباً پچیس چھبیس سال کا لڑکا تھا۔ اس نے سفید شرٹ اور نیلی جینز پہن رکھی تھی۔

''ہاں تو مسٹر جنید آپ کے مقتولہ شازیہ سے تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟'' کامران نے سوال کیا۔ میں بغور اس کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کے تاثرات معمول پر ہی رہے۔

''شازیہ میری بہت اچھی دوست تھی۔'' جنید نے جواب دیا۔

صرف دوست... ہی تھی یا اس سے کچھ بڑھ کر بھی؟'' میں نے دوست پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''دوست سے بڑھ کر مطلب...'' اس نے الجھن سے کہا۔ ''اوہ جیسا آپ سوچ رہے ہیں ویسا کچھ بھی نہیں ہے۔ میری منگنی ہو چکی ہے اور شازیہ صرف میری دوست نہیں تھی بلکہ میری اور میری منگیتر نورین کی مشترکہ دوست بھی تھی۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''منگنی شدہ ہونے سے انسان پر شرافت کا ٹھپا نہیں لگ جاتا۔ میں تمہاری معلومات میں اضافہ کر دوں کہ شازیہ تین ماہ کے حمل سے تھی اور قوی امکان ہے کہ اس کے بچے کا باپ ہی اس کا قاتل ہو سکتا ہے۔''

''کیا... شازیہ حاملہ... نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔'' اس نے کرسی سے کھڑے ہو کر بے یقینی سے کہا۔

''تو کیا ہم یہاں تم سے مذاق کر رہے ہیں۔'' کامران نے خالص پولیس والوں کے لہجے میں کہا۔

''نہیں، میرا یہ مطلب نہیں تھا... میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ شازیہ ایسی ویسی لڑکی بالکل نہیں تھی وہ تو... وہ بے حد شریف لڑکی تھی۔''

''اچھا تو یہ بتاؤ باقی دوستوں کے ساتھ اس کے تعلقات کیسے تھے؟ کیا اس کا کسی کے ساتھ کوئی افیئر وغیرہ تھا؟''

''نہیں سر میری نالج میں تو ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ دراصل اس رجحان کی لڑکی نہیں تھی۔ ہمارے علاوہ اس کی محض نوید کے ساتھ تھوڑی سلام دعا تھی۔ وہ بھی باہر آیا ہوا ہے۔''

''اس بات کا پتا کہ تم اس کے بچے کے باپ ہو کہ نہیں، ڈی این اے ٹیسٹ سے چل جائے گا لیکن اگر تمہیں کوئی بھی ایسی بات یاد آتی ہے جو اس کیس کے سلسلے میں ہمارے لیے مددگار ثابت ہو تو ضرور بتانا۔ ٹھیک ہے اب تم جا سکتے ہو۔''

''کامران تم ڈی این اے ٹیسٹ کے لیے جنید اور اس دوسرے لڑکے نوید کا سیمپل لے لینا۔'' جنید کے جانے کے بعد میں نے کامران سے کہا۔ اس کے بعد جنید کی منگیتر نورین کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ قدرے تیکھے نقوش کی حامل ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ اس نے کالے رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔

''مس نورین آپ کی مس شازیہ کے ساتھ کس قدر گہری دوستی تھی۔ کیا آپ ایک دوسرے کے ساتھ ہر راز شیئر کرنے والی دوستیں تھیں؟'' میں نے سوال کیا۔

جواب میں وہ تھوڑا سا مسکرائی۔ ''سر! اس طرح کی دوستیں اب کہاں ہوتی ہیں۔ آج کل کے دور میں تو انسان خود پر بھی بعض باتیں ظاہر نہیں ہونے دیتا چہ جائیکہ دوسروں کو بتائے۔''

معاشرے پر اس کا یہ طنز مجھے بجا لگا۔ معاشرے میں واقعی ۔ بے اعتباری بڑھتی جا رہی ہے۔

''مس نورین ہم مطلب کی بات پر آجاتے ہیں۔ شازیہ تین ماہ کے حمل سے تھی اور بہت ممکن ہے کہ یہی اس کے قتل کی وجہ ہو۔ کیا آپ اندازہ لگا سکتی ہیں کہ وہ بچہ کس کا ہوسکتا ہے؟'' میں نے کہا۔

''کیا... شازیہ اور حاملہ؟'' اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ ''وہ... وہ تو بے حد اچھی لڑکی تھی... اول تو اس کا کسی کے ساتھ افیئر وغیرہ تو تھا ہی نہیں اور اگر ہوتا بھی تو وہ اس حد تک جانے والی لڑکی نہیں تھی۔'' نورین نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''اچھا یونیورسٹی میں اس کا کسی کے ساتھ کوئی جھگڑا کوئی دشمنی یا کبھی اس نے خود کو لاحق کسی خطرے کا ذکر کیا ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''نہیں، وہ بہت نائس تھی۔ امن پسند قسم کی اس کی کسی کے ساتھ دشمنی ہونا ایسا ہی ہے جیسے پانی سے آگ لگانا۔''

''ٹھیک ہے مس نورین، آپ جاسکتی ہیں لیکن اگر آپ کو کوئی ایسی بات یاد آئے جو اس کیس کے سلسلے میں تھوڑی بہت بھی کارآمد ہو تو ضرور بتایئے گا۔'' میں نے نورین سے نرم لہجے میں کہا۔

اس کے بعد آنے والا لڑکا نوید تھا۔ وہ چھ فٹ سے نکلتے ہوئے قد کا تھا۔ اس نے کافی لمبے بال رکھے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے سے کسی قدر سختی جھلکتی تھی۔ اس نے بلیک شرٹ کے ساتھ بلیک جینز پہن رکھی تھی۔ اس سے بھی کامران نے طے شدہ سوال کیا۔ ''مسٹر نوید آپ کے مقتولہ شازیہ کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟'' جبکہ میں اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیتا رہا۔ اس سوال سے صرف چند لمحوں کے لیے اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا لیکن اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔

''تعلقات کی نوعیت... نوعیت کیا ہوسکتی ہے، ہم صرف دوست تھے بلکہ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا۔ ہماری محض دعا سلام ہی تھی۔ دراصل ہمارا صرف یہی تعلق تھا کہ میں کبھی کبھار اس سے نوٹس مانگ لیا کرتا تھا اور چونکہ ایک بار میں نے نوٹس دے کر اس کی مدد کی تھی اس لیے وہ بھی میری مدد کر دیا کرتی تھی۔ اس سے بڑھ کر ہمارے درمیان اور کوئی تعلق نہ تھا۔''

''اچھا پہلے تم نے کہا، وہ تمہاری دوست تھی پھر تم نے کہا سلام دعا تھی۔ تھوڑی دیر بعد کہہ دینا تم اسے جانتے ہی نہیں ہو؟'' کامران نے طنز کیا۔

''دیکھو مسٹر نوید، میں سیدھی بات کروں گا۔ سچ نکلوانے کے ہمیں ایک سو ایک طریقے آتے ہیں۔ شازیہ حاملہ تھی ممکنہ طور پر یہ بات بھی اس کے قتل کی وجہ ہوسکتی ہے۔ اگر تمہارے اس کے ساتھ تعلقات تھے تو ابھی بتا دو کیونکہ ڈی این اے ٹیسٹ سے بہرحال ہمیں یہ معلوم ہو ہی جائے گا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

''جناب، آپ ایک سو ایک مرتبہ ٹیسٹ کروالیں۔ میرے اس کے ساتھ ایسے کوئی تعلقات نہیں تھے اور نہ ہی اس قتل میں میرا کوئی ہاتھ ہے۔''

''خیر تم کچھ ایسا جانتے ہو جو اس کیس میں ہمارے لیے مددگار ثابت ہوسکتا ہے؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں سر، میں ایسا کچھ نہیں جانتا۔'' اس نے قطعی لہجے میں کہا۔

''اوکے تم جاسکتے ہو۔'' میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''سر، یہ مجھے کچھ مشکوک لگا ہے۔'' کامران نے اس کے جانے کے بعد کہا۔

''تم ایسا کرو، جنید اور نوید دونوں کی نگرانی کا بندوبست کرو، خاص طور پر تب تک جب تک ڈی این اے کی رپورٹ نہیں آجاتی۔'' میں نے کامران سے کہا۔

شازیہ کے حاملہ ہونے کی بات جو ہم نے سب کو بتائی، اس کے پیچھے ایک خاص سوچ تھی۔ وہ یہ کہ اگر شازیہ کا قاتل اس کے بچے کا باپ ہی ہے تو ڈی این اے کے ڈر سے وہ کوئی ایسی غلطی کر بیٹھے جو اس کے خلاف ایک ثبوت بن جائے اور کیس مضبوط ہو جائے۔

مجھے رپورٹ کا بڑی بے تابی سے... انتظار تھا۔ ساتھ ہی ہم نے سب پر نظر بھی رکھی ہوئی تھی۔

مجھے اس بات کا پورا یقین تھا کہ کسی نہ کسی کا ڈی این اے میچ کر جائے گا کیونکہ اول تو اس شہر میں شازیہ کے جاننے والے کچھ ہی لوگ تھے۔ دوسرا اس کی کسی کے ساتھ کوئی دشمنی بھی نہیں تھی تو قتل کی ایک ہی وجہ نظر آتی تھی کہ قاتل نہیں چاہتا تھا کہ کوئی جانے کہ شازیہ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ خیر اگلے روز رپورٹ آگئی۔ رپورٹ دیکھ کر میرے ماتھے کی شکنیں اور گہری ہوگئیں۔ کامران بھی

میرے ساتھ ہی تھا۔
''کیا ہوا سر؟'' اس نے سوال کیا۔
''دیکھ لو۔'' میں نے رپورٹ اسے تھماتے ہوئے کہا۔
رپورٹ دیکھ کر اس کا منہ بھی لٹک گیا۔ ''یہ کیا سر کسی کا ڈی این اے میچ نہیں ہوا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے شازیہ تو ان ہی گنے چنے لوگوں کو جانتی تھی۔'' کامران نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔
''نہیں کچھ ایسے معاملات بھی ہیں جو ہماری نظر سے اوجھل ہیں۔ تم ایسا کرو شازیہ کے موبائل کا ڈیٹا نکلواؤ، امید ہے اس سے کوئی مدد مل جائے۔'' میں نے بھوؤں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
''او کے سر۔ جنید اور نوید کی نگرانی کروانا بند کردوں؟'' کامران نے سوال کیا۔
''نہیں ابھی جاری رکھو۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
کامران کے جانے کے کچھ دیر بعد حوالدار احسان کمرے میں داخل ہوا۔ ''سر! شازیہ قتل کیس کے سلسلے میں کوئی مس نورین آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔'' احسان نے مطلع کیا۔
''ٹھیک ہے بھیج دو۔'' میں نے کہا۔
تھوڑی دیر بعد نورین میرے سامنے بیٹھی تھی۔
''سر! مجھے نہیں پتا کہ یہ بات آپ کے کسی کام آسکے گی یا نہیں لیکن آپ نے کہا تھا کہ کوئی بات یاد آئے تو بتانا اس لیے میں یہاں آئی ہوں۔'' اس نے تذبذب سے کہا۔
''بالکل، آپ بے فکر ہو کر بتائیں۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔
''دراصل یہ تقریباً چار ماہ پہلے کی بات ہے۔ ایک دن میں شاپنگ کے لیے نکلی تھی۔ شاپنگ کے بعد میں نے کچھ وقت راول جھیل پر گزارنے کا سوچا وہاں میں نے شازیہ کو دیکھا، وہ ایک بلیک کرولا میں ایک آدمی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ جب میں نے ان کو دیکھا تو وہ آدمی شازیہ کو نوٹوں کی گڈی دے رہا تھا۔ شازیہ نے وہ لے کر بیگ میں ڈال لی۔ اگلے روز جب میں نے شازیہ سے اس بارے میں استفسار کیا تو اس نے اس بات سے صاف انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ مجھے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ کوئی اور لڑکی ہوگی لیکن سر مجھے یقین ہے وہ شازیہ ہی تھی۔''
''کیا آپ کو اس شخص کا حلیہ یا کار کا نمبر یاد ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''معاف کیجیے گا سر لیکن میں اس شخص کا تفصیلی حلیہ نہیں بتا سکتی کیونکہ میں اس وقت شازیہ ہی کو دیکھ رہی تھی اور یہ یقین کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ شازیہ ہی ہے۔ ہاں میں اتنا ضرور بتا سکتی ہوں کہ وہ ایک جوان شخص تھا اور گاڑی کا نمبر دیکھنے کی میں نے ضرورت محسوس نہیں کی۔'' نورین نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔
''ٹھیک ہے مس نورین آپ کے تعاون کا شکریہ۔'' میں نے کہا۔
یہ ایک نئی ہی بات نکل آئی تھی۔ آخر وہ شخص کون تھا؟ اس نے شازیہ کو پیسے کیوں دیے؟ کیا وہی اس بچے کا باپ تھا؟ یہ سب سوال جواب طلب تھے.... لیکن ہمارے پاس فی الوقت اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ شازیہ کے کردار کو جو اب تک ہمارے سامنے آیا دیکھتے ہوئے یہ نئی پتا چلنے والی باتیں عجیب سی لگ رہی تھیں۔ خیر جو کچھ بھی تھا، وہ سامنے آہی جانا تھا۔ نورین کی باتوں نے اور بھی الجھا دیا تھا۔ میں نے کامران کو بتایا تو وہ بھی کوئی حتمی نتیجہ نہ قائم کر سکا۔ موبائل کا ڈیٹا نکلوایا گیا۔ یہ تقریباً پچھلے ایک سال کا ڈیٹا تھا۔ شازیہ کے نمبر پر آنے والی کالز اور کی جانے والی کالز کم ہی تھیں۔ زیادہ تر نمبرز انہی لوگوں کے تھے جن کو ہم بھی جانتے تھے۔ کچھ نمبرز اَن ناؤن تھے اور خاص بات یہ تھی کہ ان نمبرز پر مہینے کی چند خاص تاریخوں میں یہ کالز کی جاتی تھیں۔ ان کی لوکیشن بھی معلوم نہیں کی جا سکتی تھی کیونکہ وہ اب کسی کے استعمال میں نہیں تھے۔
''سر، ہم ایک دفعہ پھر بند گلی میں آگئے ہیں۔'' کامران نے مایوسی سے کہا۔
''فکر نہ کرو، راستہ بنانے والے دیواریں گرانے کا ہنر جانتے ہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔
''جب بھی لگتا ہے کہ ڈور کا کوئی سرا ہاتھ آنے والا ہے، وہ ہم سے کئی میل دور چلی جاتی ہے۔'' کامران نے کنپٹی مسلتے ہوئے کہا۔
آنے والے دنوں میں ہم نے بڑے ہاتھ پاؤں مارے لیکن بے سود، مجھے لگنے لگا تھا کہ اس کیس کی فائل بھی کبھی نہ حل ہونے والے کیسز کی فائلوں کے نیچے دب جائے گی کہ نوید کی نگرانی کرنے والے شخص نے ایک اہم اطلاع دی۔ اس کے مطابق آج دن میں نوید نے سیکریٹری جمیل کے ساتھ ایک ہوٹل میں ملاقات کی ہے۔ نگرانی کرنے والے شخص نے اچھا کام یہ کیا کہ اس ملاقات کے دوران میں ان کی تصاویر لے لی۔

''سرنوید کی ملاقات جمیل سے آخر کیا معنی رکھتی ہے۔ نوید، شازیہ کا دوست ہے جبکہ جمیل میڈم جانی کا سیکریٹری ان کا ایک دوسرے سے کیا واسطہ؟''

''اہم بات یہ ہے کہ اگر وہ ایک دوسرے کو جانتے تھے تو جمیل نے یہ بات چھپائی کیوں؟ تمہیں یاد ہوگا جب میں نے جمیل سے پوچھ گچھ کی تھی تو اس دوران میں نے یہ بھی پوچھا تھا کہ وہ شازیہ کے کسی دوست کو جانتا ہے تو اس نے صاف انکار کردیا تھا۔''

''کیوں نا یہ بات جمیل ہی سے پوچھی جائے۔'' کامران نے کہا۔

''نہیں، اس طرح وہ محتاط ہو جائیں گے۔ ہم کچھ دن خاموش رہ کر رنگ ڈھنگ دیکھتے ہیں۔ آج سے تم ایسا کرو جمیل کی بھی نگرانی کروانا شروع کردو اور نوید اور جمیل کے ماضی کو بھی کھنگالو۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ اس ملاقات کے تانے بانے کہیں نہ کہیں شازیہ کیس سے جاملتے ہیں۔'' میں نے بھوؤں کو سہلاتے ہوئے پُرخیال لہجے میں کہا۔

اگلے روز کامران میرے کمرے میں آیا۔

''سر! میں نے نوید اور جمیل کے بارے میں معلومات حاصل کی ہیں۔ ان کا پہلے سے کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا۔ نوید کا تعلق ملتان سے ہے لیکن وہ یہی اسلام آباد میں پلا بڑھا ہے جبکہ جمیل کا تعلق کشمیر سے ہے۔ وہ تقریباً سات سال سے میڈم جانی کے ساتھ ہے۔ اس سے پہلے وہ ایبٹ آباد میں رہتا تھا۔ اس کی فیملی اب بھی وہیں رہتی ہے۔''

''ٹھیک ہے تم میڈم جانی کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرو۔ سر، ایک اور اہم بات ہے۔ آپ کے کہنے کے مطابق میں نے کل ہی سے ایک شخص سلیم کو جمیل کی نگرانی کے کام پر لگا دیا تھا۔ اس نے اطلاع دی ہے کہ جمیل آج صبح پشاور کی طرف نکلا ہے۔ وہ بھی برابر اس کے پیچھے ہے۔'' کامران نے اطلاع دی۔

''بہتر ہے۔ اس سے کہو اس پر گہری نظر رکھے، وہ وہاں کیا کرتا ہے کہاں جاتا ہے کس سے ملتا ہے، مجھے پوری تفصیل چاہیے بلکہ تم ایسا کرو سلیم سے میری بات کرواؤ۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''اوکے سر میں ابھی کرواتا ہوں۔'' کامران نے نمبر ملاتے ہوئے کہا۔

''ہیلو سلیم، سر ذیشان تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ ان سے بات کرو۔''

''السلام سر۔''

''وعلیکم السلام! سلیم اب تک کی کیا رپورٹ ہے۔ کیا پشاور پہنچ گئے ہو یا راستے میں ہو؟''

''سر پشاور پہنچ گئے ہیں۔ یہاں جمیل نے ایک ہوٹل بلیو مون میں قیام کیا ہے۔ اتفاق سے مجھے بھی اس کے سامنے والا کمرا مل گیا ہے۔ میں برابر اس پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔ ابھی تک وہ کمرے سے باہر نہیں آیا نہ ہی کوئی اس سے ملنے آیا ہے۔''

''ٹھیک ہے، تم اس پر نظر رکھو اور وہ کسی سے ملے یا کوئی اس سے ملنے آئے تو تم ان کی تصاویر اتار لینا اور کوئی بھی اہم بات ہو تو بتانا ٹھیک ہے۔''

''یس سر، میں فوراً آپ کو مطلع کروں گا۔'' سلیم نے مستعدی سے کہا۔

''اوکے۔'' یہ کہہ کر میں نے فون بند کردیا۔ اس وقت دن کے تقریباً تین بجے تھے۔

رات تقریباً نو بجے سلیم نے مجھے کال کی۔ ''ہاں کہو سلیم کیا پیش رفت ہے؟''

''سر شام تقریباً چھ بجے تین آدمی جمیل سے ملاقات کرنے آئے تھے۔ وہ تقریباً ایک گھنٹے تک کمرے میں رہے۔ میں نے ان کی تصاویر لے لی ہیں۔ ان کے جانے کے تقریباً ایک گھنٹے بعد جمیل نے بھی ہوٹل چھوڑ دیا اور اب میں اس کا پیچھا کر رہا ہوں اور ہم اس وقت راولپنڈی ہی کی طرف گامزن ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ صبح وہ تصاویر لے کر میرے پاس آجانا۔''

''یس سر۔'' سلیم نے کہا۔

فون بند کرکے میں دیر تک سوچتا رہا۔ جمیل کا کردار روز بروز مشکوک ہوتا جارہا تھا۔ بظاہر ان سب باتوں کا شازیہ کے کیس سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا تھا لیکن میری چھٹی حس اشارہ کررہی تھی کہ یہ ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں اور جمیل اور نوید کی ملاقات میری اس سوچ کو تقویت دے رہی تھی۔

اگلے روز سلیم میرے آفس میں آیا، میں اس کی اتاری ہوئی تصویریں دیکھ رہا تھا کہ کامران بھی آگیا۔ یہ تصاویر ہوٹل سے نکلتے وقت کی تھیں اور کافی واضح تھیں۔ وہ تینوں حلیے سے قبائلی لگتے تھے۔ ان میں سے دو کی عمریں تقریباً چالیس کے قریب رہی ہوں گی جبکہ تیسرا تھوڑا کم عمر نظر آتا تھا۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک چرمی بیگ بھی تھا۔ ایک تصویر میں وہ تینوں گاڑی میں بیٹھ رہے تھے۔ وہ

بلیو کلر کی پک اپ تھی۔ تصویر میں اس کی نمبر پلیٹ بھی نظر آ رہی تھی۔ وہ پشاور کی ہی گاڑی تھی۔

''ویل ڈن سلیم، بہت اچھا کام کیا۔ کیا کوئی ایسی بات ہے جو بتانے لائق ہو؟''

''نو سر۔''

''ٹھیک ہے۔ تم جا سکتے ہو اور ہاں جمیل کی نگرانی جاری رکھو۔''

''مجھے تو یہ کوئی لمبا چکر لگتا ہے۔ تم نے ان آدمیوں کے حلیے دیکھے ہیں۔ شکل ہی سے جرائم پیشہ لگتے ہیں۔'' میں نے تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یس سر حلیہ تو یہی کہتا ہے۔'' کامران نے کہا۔

''خیر تم بتاؤ میڈم جانی کے بارے میں کیا معلومات حاصل ہوئیں؟''

''سر حاصل کی گئی معلومات کے مطابق میڈم جانی کا تعلق پشاور سے ہے۔ وہ تقریباً دس سال سے یہ ہاسٹل چلا رہی ہے۔ اس سے پہلے وہ پشاور میں کہاں رہتی تھی، کیا کرتی تھی، ایک ہیجڑا ہوتے ہوئے اس کے پاس ہاسٹل کھولنے کے لیے اتنی رقم کہاں سے آئی، ہاسٹل کھولنے سے پہلے۔ اس کا ماضی سب اندھیرے میں ہے۔''

''یعنی میڈم جانی کا تعلق بھی پشاور ہی سے ہے۔'' میں نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ ''میرے خیال میں اب پشاور جانا ناگزیر ہو گیا ہے۔ یہ گتھی پشاور جا کر ہی سلجھ سکتی ہے۔'' میں نے اپنی کیپ درست کرتے ہوئے کہا۔

''سر، کیا میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا؟'' کامران نے سوال کیا۔

''میں وہاں ایک پولیس والے کی نہیں بلکہ عام شخص کی حیثیت سے جاؤں گا کیونکہ میرے ذہن میں کچھ ایسے معاملات ہیں جو اس طرح ہی حل ہو سکتے ہیں۔'' میں نے مبہم لہجے میں کہا۔ ''تم یہاں کے معاملات دیکھو گے۔ جمیل کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھنا اور جیسے ہی کوئی اہم بات پتا چلے مجھے فوراً آگاہ کرنا۔''

''او کے سر۔'' کامران نے کہا۔

پشاور میرے لیے اجنبی شہر نہیں تھا۔ راولپنڈی میں پوسٹنگ ہونے سے پہلے میں کچھ عرصہ پشاور میں گزار چکا تھا۔ میں اسی دن پشاور کے لیے روانہ ہو گیا۔

پشاور پہنچ کر میں نے بلال خان سے رابطہ کیا۔ وہ بڑے کام کی چیز تھا۔ وہ ایک صحافی تھا جن دنوں میں پشاور میں تھا، وہ کئی ایک کیس حل کرنے میں میرے لیے مددگار ثابت ہوا تھا۔ وہ پیدائشی طور پر پشاور کا رہنے والا تھا اس لیے وہ یہاں کے چپے چپے سے واقف تھا اور یہاں کے لوگوں خاص کر جرائم پیشہ لوگوں کے بارے میں اس کی معلومات قابلِ رشک تھیں۔

رابطہ ہونے پر میں نے اسے ہوٹل کا نام بتایا اور ملنے کے لیے بلایا۔ میرے اس کے ساتھ کافی دوستانہ تعلقات تھے۔ ایک گھنٹے ہی میں وہ میرے پاس پہنچ گیا۔

''اچھا سرپرائز ہے۔'' اس نے مجھ سے بغل گیر ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں تو سمجھا تھا تو مجھے بھول ہی گیا ہے۔'' اس نے شکوہ کیا۔

''کیا کروں یار تم سے بہتر ہماری مجبوری کون سمجھ سکتا ہے۔ صحافی اور پولیس والے تو ہمہ وقت آن ڈیوٹی ہی رہتے ہیں اور پھر جو حالات ہیں، جرائم کی شرح میں جو اضافہ ہو رہا ہے اس کے پیشِ نظر محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی ہے۔''

''یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو۔ خیر، تم بتاؤ آج کیسے میری یاد آ گئی۔ لگتا ہے کسی خاص شکار کی تلاش ہے جو بہ نفسِ نفیس خود تشریف لائے ہو۔'' بلال نے خوش دلی سے کہا۔

''ہاں ایسا ہی سمجھ لو۔ کافی پیتے ہوئے بات کرتے ہیں۔'' میں نے روم سروس کو کافی کا آرڈر دیتے ہوئے کہا۔

''تھوڑی دیر میں کافی آ گئی تو میں نے سلیم کی لی گئی تصاویر بلال کو دکھاتے ہوئے سوال کیا۔ ''یہ جو لوگ تصویر میں نظر آ رہے ہیں، کیا تم ان کو جانتے ہو؟''

بلال نے تصویر میرے ہاتھ سے لے لی۔ کچھ دیر گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''ان میں سے دو کو میں اچھی طرح جانتا ہوں، اچھی شہرت کے مالک نہیں ہیں۔ بہت سے جرائم میں ملوث رہتے ہیں لیکن ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرتے ہیں اس لیے کبھی پکڑے نہیں گئے۔'' بلال نے کہا۔

''اور یہ تیسرا؟'' میں نے ان میں سے تھوڑے کم عمر شخص پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ... یہ بڑی خطرناک چیز ہے۔ اس کا ان دونوں کے ساتھ ہونا کسی بڑے گھپلے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔'' پھر بلال نے مجھے اس تیسرے شخص کے بارے میں چند سنسنی خیز باتیں بتائیں۔

''ویسے تم ان کے پیچھے کیوں ہو؟'' بلال نے سوال کیا۔

جواب میں، میں نے اُسے تمام تفصیل سے آگاہ کیا۔

تفصیل سننے کے بعد اس نے ہنکارا بھرا۔ ''تو تم نے کیا

اندازہ لگایا ان کی جمیل سے ملاقات کے بارے میں؟''
بلال نے سوال کیا۔
''میں نے جو اندازہ لگایا تھا۔ وہ اب تمہارے انکشاف کے بعد یقین میں بدل گیا ہے۔ میرا خیال ہے تم بھی ویسا ہی سوچ رہے ہو۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اسے اپنے اندازے کے بارے میں بتایا۔
''ہاں، میرا بھی یہی اندازہ ہے لیکن یہ تو شازیہ کیس سے الگ ہی معاملہ ہے۔''
''اگر جیسا میں نے سوچا ہے، وہی بات نکلتی ہے تو شازیہ کے قتل کی یہ وجہ بھی تو ہو سکتی ہے۔'' میں نے کہا۔
''لیکن اس بچے کی گرہ پھر بھی نہیں کھلتی۔'' بلال نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔
''جیسا میں نے کہا کہ ضروری نہیں کہ اس کے بچے کا باپ ہی اس کا قاتل ہو۔ ہمیں دیگر امکانات کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔'' میں نے کہا۔
''یہ بتاؤ میں کیا کر سکتا ہوں؟'' بلال نے پوچھا۔
''یہ دیکھو، کیا تم اس کو جانتے ہو۔'' میں نے اسے میڈم جانی کی تصویر دکھاتے ہوئے سوال کیا۔
''یہ... یہ ہیجڑا میں... میں اس سے واقف نہیں، کون ہے یہ؟''
''جس میڈم جانی کا میں نے ذکر کیا تھا، یہ وہ ہے۔ تمہیں اپنی یادداشت پر زور ڈالنا ہوگا کیونکہ یہ تقریباً دس سال سے راولپنڈی میں ہاسٹل چلا رہی ہے۔ اس سے پہلے یہ پشاور میں تھی لیکن اس کے بارے میں بس یہی پتا چلا۔''
''جیسا کہ... تم جانتے ہو میں تقریباً پندرہ سال سے صحافت کے پیشے سے وابستہ ہوں اس دوران مجھے ہر قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ ان میں ہیجڑے بھی شامل ہیں لیکن اس صورت کے ہیجڑے کو میں نہیں جانتا ہوں لیکن تم فکر نہ کرو، اگر یہ ہیجڑا پشاور ہی سے تعلق رکھتا ہے تو اس کے بارے میں پتا چلانا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔''
''مجھے تم سے یہی امید تھی لیکن تمہارے دماغ میں کیا ہے؟''
''میں... یہاں کے ہیجڑوں کے ایک گرو کو جانتا ہوں۔ اس نے یہاں پوری زندگی گزاری ہے۔ وہ اس ہیجڑے جانی کو ضرور جانتا ہوگا۔ کل ہی ہم وہاں چلتے ہیں۔''
اگلے روز ہم ہیجڑوں کے گرو زلیخا سے ملنے اس کے ڈیرے پر پہنچے جو شہر کے اس حصے میں تھا جہاں قدیم عمارات موجود تھیں جو آزادی سے بھی کافی پہلے کی تھیں۔ زلیخا کا ڈیرا بھی ایک خاصی پرانی لیکن بڑی عمارت میں تھا لیکن اس عمارت کی حالت بہت اچھی تھی لگتا تھا کہ اس کی کافی دیکھ بھال کی جاتی رہی ہے۔
دروازے پر ایک ہیجڑے نے ہمیں ریسیو کیا۔ کیونکہ بلال پہلے سے فون پر زلیخا کو آگاہ کر چکا تھا اس لیے وہ ہمیں سیدھا زلیخا کے پاس لے گیا۔ وہ عمارت ہیجڑوں سے بھری پڑی تھی۔ ہر عمر کے ہیجڑے موجود تھے۔ کہیں سے تالیوں اور کہیں سے گانے بجانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بظاہر انہیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اپنے دلوں میں کتنا درد چھپائے بیٹھے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم پورے انسانوں کو ان ادھورے انسانوں سے بہت کچھ سیکھنا چاہیے۔ ادھورا ہو کر بھی وہ زندگی کے ادھورے پن کو محسوس نہیں ہونے دیتے اور نام نہاد پورے انسانوں کی تلخ سے تلخ بات سن کر بھی مسکراہٹ چہرے سے جدا نہیں ہونے دیتے۔ اصل میں اگر غور سے دیکھا جائے تو ادھورے تو وہ انسان ہیں جو ان کے ادھورے پن کا مذاق اڑاتے ہیں۔
خیر ہم زلیخا کے کمرے میں پہنچے تو فرش پر سرخ رنگ کا دبیز اور قیمتی قالین بچھا ہوا تھا اور گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ ایک ایسے ہی تکیے کے سہارے زلیخا نیم دراز تھی۔ اس نے کالے رنگ کی ساڑی زیب تن کر رکھی تھی۔ اس کے جھریوں بھرے چہرے کو دیکھتے ہوئے میں نے اس کی عمر کا اندازہ ساٹھ سال کے قریب لگایا۔ البتہ اس کی صحت کافی اچھی تھی۔ میڈم جانی کی عمر 45 سال تک رہی ہوگی۔ اس لحاظ سے جب میڈم جانی نے ہاسٹل قائم کیا تو وہ 35 سال کی رہی ہوگی۔ اس سے پہلے وہ پشاور میں رہی ہوگی تو زلیخا کو اسے ضرور جاننا چاہیے تھا۔
''ہائے بلال صیب آپ کو آج ہمارا یاد کیسے آ گیا؟'' زلیخا نے ہیجڑوں کے انداز میں پٹھانی لہجے میں کہا۔
''بس کچھ کام تھا میرے دوست کو آپ سے۔'' اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
''بلال صیب آپ کا ہر کام سر آنکھوں پر بولو کیا خدمت کر سکتی ہوں؟''
''ذرا یہ تصویر دیکھ کر بتائیں، اس ہیجڑے کو جانتی ہیں اس کا تعلق بھی پشاور ہی سے رہا ہے لیکن یہ تقریباً آج سے دس پندرہ سال پہلے کی بات ہے۔ بلال نے بتایا تھا کہ پشاور کا کوئی ہیجڑا ایسا نہ ہوگا جسے آپ جانتی نہ ہوں۔''
''بلال صیب ٹھیک کہتا ہے۔ یہ ڈیرا گزشتہ کئی سالوں سے پشاور کے ہیجڑوں کا مرکز رہا ہے۔ ہر ہیجڑا چاہے یہاں رہے یا نہ رہے یہاں آتا ضرور ہے۔ میری عمر ساٹھ سے اوپر

ہے۔ میں نے یہاں اپنی پوری زندگی گزاری ہے جو چہرہ میں ایک بار دیکھ لوں بھولتی نہیں ہوں۔'' اس نے وثوق سے کہا۔

''ٹھیک ہے پھر یہ دیکھیں۔'' میں نے تصویر اسے تھماتے ہوئے کہا۔

وہ کافی دیر تک اس تصویر کا بغور جائزہ لیتی رہی جبکہ میں اس کے چہرے کا بغور مشاہدہ کرتا رہا۔ اس کے چہرے پر کئی اتار چڑھاؤ آتے رہے۔ آخر کافی دیر بعد وہ گویا ہوئی اس کے کیے گئے انکشافات بے حد سنسنی خیز تھے۔ جب میں اس ڈیرے سے نکلا تو تمام گرہیں کھل چکی تھیں۔ پورا کھیل مجھ پر واضح ہو چکا تھا۔

میں نے بلال کا شکریہ ادا کیا، ایک بار پھر ایک کیس کو حل کرنے وہ میرا مددگار بن گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے وہاں کے مقامی ایس پی سے ملاقات کی اور حالات بتا کر تعاون کی درخواست کی۔ اس کے بعد میں تیزی کے ساتھ راولپنڈی روانہ ہو گیا۔ فون پر میں نے کامران کو کچھ ضروری ہدایات دیں اور جب میں راولپنڈی پہنچا تو وہ اپنے آپ کو ایک اچھا معاون ثابت کرتے ہوئے میری تمام ہدایات پر عمل کر چکا تھا۔ ہم بھاری نفری کے ساتھ ریڈ کے لیے نکل پڑے۔ اس وقت شام کے چھ بجے تھے جب ہم آشیانہ ہاسٹل میں داخل ہوئے جبکہ باقی کی نفری نے ہاسٹل کو گھیرے میں لے لیا تھا۔

ریڈ ہر طرح سے کامیاب رہا۔ ہمیں ہاسٹل سے بھاری مقدار میں منشیات ملی اور ساتھ ہی شازیہ کے بچے کا باپ اور اس کا قاتل جان محمد عرف میڈم جانی بھی ملا۔

جب میں نے اسے اس کے اصل نام سے مخاطب کرتے ہوئے گرفتار کیا تو اس کی صورت دیکھنے والی تھی۔ دس سال سے وہ ہیجڑا بن کر سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کے وہ جس طرح اس ہاسٹل کی آڑ میں منشیات کا دھندا چلا رہا تھا اور ہاسٹل کی لڑکیوں کو کس طرح منشیات کے سپلائر کی طرح استعمال کر رہا تھا، وہ سب طشت از بام ہو گیا تھا۔

لیکن اسے حیرت تھی تو اس بات کی کہ مجھے اس کا یہ راز کس طرح معلوم ہوا۔ اس نے تو اپنی شناخت کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کر لی تھی۔ میں نے اس کی حیرت کو دور کرنے کی خاطر بتا ہی دیا کہ کس طرح زلیخا نام کے پشاور کے ایک ہیجڑے نے اس کا پول کھولا۔ اصل میں زلیخا نے بیس سال پہلے جب وہ جان محمد تھا اور ڈاکو تھا، اسے ایک شادی کے گھر میں ڈاکا مارتے ہوئے دیکھا تھا اور اپنی بے مثال یادداشت کے سہارے بیس سال بعد بھی اسے ایک ہیجڑے کے روپ میں پہچان لیا تھا۔ جان محمد نے اپنے تمام جرائم کا اعتراف کر لیا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ کس طرح وہ ہاسٹل میں نئی آنے والی لڑکیوں کے کھانے میں بے ہوشی کی دوا ملا کر ان کی قابلِ اعتراض تصاویر اور ویڈیو بنا کر انہیں اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرتا تھا لیکن شازیہ نے اس کے کھیل کو خراب کرنا چاہا اور اپنے بچے کو اس کے خلاف استعمال کرنا چاہا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتی، اس نے اسے اپنے راستے سے ہٹا دیا لیکن درحقیقت تو وہ اس کے راستے کا وہ پتھر بن گئی جس نے اسے منہ کے بل گرا دیا تھا۔

اس کیس کا دوسرا اہم کردار جمیل تھا جو جان محمد کا دست راست تھا۔ وہ پشاور سے منشیات خرید کر ہاسٹل لاتا اور یہاں ہاسٹل میں موجود لڑکیوں کے ذریعے نہایت چالاکی سے یہ منشیات شہر بھر میں سپلائی کی جاتی۔ جس طرح شازیہ یونیورسٹی میں منشیات نوید تک پہنچاتی اور وہ آگے پھیلاتا۔ اس کے علاوہ بعض اوقات شازیہ اور دوسری لڑکیاں دیگر افراد تک بھی منشیات پہنچاتیں۔ جیسے شازیہ کی دوست نورین نے شازیہ کو بلیک کرولا میں ایک شخص سے رقم لیتے وقت دیکھ لیا تھا، وہ بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ اس کیس کے مرکزی کرداروں کے علاوہ بھی کافی لمبی چوڑی گرفتاریاں ہوئیں۔ پشاور میں موجود منشیات فروشوں کا گروہ بھی منتشر ہو گیا اور وہاں سے بھی کافی لوگ گرفتار کیے گئے جن میں وہ تینوں بھی شامل تھے جن کی تصاویر سلیم نے اس وقت لی تھی جب وہ منشیات کی کھیپ پہنچانے کے لیے جمیل کے پاس ہوٹل بلیو مون آئے تھے۔

جان محمد عرف جانی کو منشیات فروشی، عصمت دری، قتل، بلیک میلنگ اور کئی اور جرائم کے تحت تین مرتبہ سزائے موت سنائی گئی۔ اس میں اس کے پرانے ریکارڈ نے بھی کافی کردار ادا کیا۔

جمیل، نوید اور کئی اور افراد کو بھی عمر قید اور جرمانے کی سزا ہوئی۔ اس کیس کو حل کرنے کے اعزاز میں میری پروموشن ہو گئی۔ لیکن وہ احساس میرے لیے ہر اعزاز سے بڑھ کر تھا جو کیس کا فیصلہ ہونے کے بعد میں نے شازیہ کے مظلوم باپ کی خوشی سے بہتی آنکھوں کو دیکھ کر محسوس کیا اور دہری خوشی مجھے تب ہوئی جب جان محمد نے گڑگڑا کر روتے ہوئے جج سے رحم کی درخواست کی... لیکن قانونِ قدرت ہے... جسے کوئی بدل نہیں سکتا کہ جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جائے گا...

کاشف زبیر

دہری چال

بعض واقعات... احساسات اور زندگی کے تجربے ایک گہرے سمندر کی طرح ہیں... جس کی گہرائیوں میں گویا قدرت نے فراخ دلی کے ساتھ ان گنت پتھر اور قیمتی جواہر بکھیر دیے ہیں... موتی چننے والے کو سمندر کی پُراسرار گہرائیوں میں مسلسل تلاش جاری رکھنے کے لیے ہمت کی ضرورت پڑتی ہے... یہ ایک تھکا دینے والا ایسا کام ہے جس کے لیے اپنی پوری صلاحیت... اپنا سارا صبر و تحمل اور بے پناہ استقلال صرف کرنا پڑتا ہے... تیمور اور شامی ان تمام صلاحیتوں سے مالا مال ہیں... اور اپنے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا بھرپور عزم رکھتے ہیں... ماضی کے گم گشتہ واقعات سے منسلک ایک ایسی کہانی... جس کے کردار مر کے بھی زندہ تھے...

پراسرار قتل کی الجھی ہوئی گتھی... زرگروں کی خفیہ سوداگری...

شامی کا خیال تھا کہ دادا حضور نے بالآخر ان کی گزشتہ سہ ماہی کی ان تمام حرکتوں اور کارستانیوں کا بدلہ لے لیا تھا جو انہوں نے وقتاً فوقتاً انجام دی تھیں۔ شامی انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ایک فرم میں وقت گزاری جیسی نوکری کررہا تھا۔ فرم اس کے ایک دوست کے والد کی تھی۔ تیمور اس لحاظ سے خوش قسمت تھا کہ نواب صاحب نے اسے اپنے اسلام آباد کا دفتر سونپ دیا تھا۔ کام وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ صبح دس گیارہ بجے دفتر جاتا۔

چائے پیتا، لنچ تناول کرتا اور چار بجے دفتر سے نکل کر شامی سے کلب میں ملتا جو اس سے پہلے وہاں آن موجود ہوتا تھا۔ یہ شامی کا خیال تھا کہ تیمور خوش قسمت ہے اور تیمور کا خیال تھا کہ وہ بدقسمت ہے۔ وہ لندن کے سہانے خواب آنکھوں میں سجائے خوشی خوشی ڈگری لے کر آیا اور دادا جان نے اسے یہاں جوت دیا۔ وہ سرد آہ بھر کر کہتا۔ ''کہاں لندن اور کہاں اسلام آباد۔''

شامی اسے تسلی دیتا۔ ''بیٹا اگر آدمی نے مزے کرنے ہوں تو اس کے لیے وطنِ عزیز سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہے۔''

''مزے۔'' تیمور نے بھنّا کر کہا۔ ''یہاں آدمی صرف کرپشن کھل کر کر سکتا ہے۔ مزے پر تو دادا جان سے لے کر نہ جانے کتنے لوگ نظر جمائے بیٹھے رہتے ہیں۔''

''کہہ تو ٹھیک رہا ہے۔'' اس بار شامی نے سرد آہ بھری۔ ''مگر یارمن اب تو سر پر پڑ گئی ہے اس لیے خوشی سے بھگت، دیکھ یہاں بھی کم نظر نواز نظارے نہیں ہیں۔''

شامی نے کلب کے سوئمنگ پول کی طرف اشارہ کیا جس میں صنفِ نازک کی تعداد مردوں سے زیادہ تھی البتہ پول کے آس پاس مردوں کی تعداد خواتین سے چار گنا زیادہ تھی۔

''ہاں یار مگر گوریوں کی بات ہی کچھ اور ہے۔'' تیمور نے مایوسی سے کہا۔ ''خیر چھوڑ، یہ بتا ان گرمیوں میں کہیں جانے کا پروگرام نہیں ہے۔''

''نوکری چھوڑ کر۔''

''کیا فرق پڑتا ہے، نہ تو کچھ کرتا ہے اور نہ میں کچھ کرتا ہوں۔ میں تو سوچ رہا ہوں اس بار ٹریکنگ کرتے ہیں۔ نانگا پربت کے آس پاس کچھ نئے ٹریکس دریافت ہوئے ہیں۔''

''بالکل نہیں۔'' تیمور نے جلدی سے انکار کیا۔ ''یہ ٹریکس سیدھا دوسری دنیا میں لے جاتے ہیں۔''

''کنکورڈیا۔'' شامی نے دوسرا نام لیا۔

''مجھے اس کے راستے ازبر ہو گئے ہیں اور اب میں آنکھ بند کر کے بھی کنکورڈیا جا سکتا ہوں۔''

''یہ بھی دوسری دنیا کا راستہ ہو گا۔'' شامی نے کہا۔ ''تب سیدھے سادھے کسی ہل اسٹیشن ہو آتے ہیں۔ ادھر کشمیر میں بھی خاصی جگہیں ہیں۔''

مگر وہ تقریباً تمام ہی جگہوں پر گھوم پھر چکے تھے۔ اصل بات یہ تھی کہ لندن نہ جانے کی مایوسی اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی۔ اس لیے وہ تفریح چاہتے ہوئے بھی تفریح کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ دونوں چھ سات بجے تک ولا آجاتے تھے اور ایسا ظاہر کرتے جیسے دفتر سے آرہے ہوں۔ اگرچہ شامی کو یقین تھا کہ دادا حضور واقف ہوں گے کہ ان کی تشریف آوری کہاں سے ہو رہی ہے۔ مگر تیمور کا کہنا تھا کہ وہ اب اتنی نظر بھی نہیں رکھتے ہوں گے۔

اس سارے قصے کا آغاز جمعے کی سہ پہر ہوا جب دفتر سے آنے کے بعد شامی فولاد خان سے نشانے بازی پر بحث کر رہا تھا۔ فولاد خان کا دعویٰ تھا کہ وہ آنکھیں بند کر کے سو گز دور کھڑے آدمی کے سر پر رکھا ہوا سیب اڑا سکتا تھا۔ اس پر شامی نے اعتراض کیا۔ ''ناممکن، اس میں تو آدمی کا سر بھی شاید ہی اُڑے۔''

''ام ابی کر کے دکا سکتا ہے۔'' فولاد خان نے کہا اور کیبن سے ایک عدد سیب لے آیا۔ سیب اس نے شامی کو تھمایا۔ ''آپ سیب سر پر رکھ کر اُدر دیوار کے سات کھڑا او ام نشانہ لگاتا ہے۔''

شامی بدکا۔ ''مجھے معاف رکھو، ابھی تو میری شادی بھی نہیں ہوئی ہے۔''

فولاد خان کا اصرار اور شامی کا انکار جاری تھا کہ گیٹ پر کسی کی آمد ہوئی۔ فولاد خان بادلِ ناخواستہ گیٹ کی طرف روانہ ہوا۔

فولاد خان کے گیٹ کی طرف جاتے ہی شامی بھی اندر آ گیا۔ اس لیے اسے معلوم نہیں ہو سکا کہ گیٹ پر کون آیا تھا اور کیوں۔ وہ تو تیمور باہر سے آیا تو اس نے پوچھا۔

''شاہنواز خان کیوں آیا تھا؟''

شامی چونکا۔ ''شاہنواز خان اور یہاں؟... میں نے تو سنا ہے اس کی پوسٹنگ کہیں اور ہو گئی ہے۔''

''تو اور کہاں؟ ابھی میں آرہا تھا تو پولیس کی گاڑی اندر سے نکل رہی تھی۔ میں نے فولاد خان سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ کوئی ایس پی شاہنواز خان دادا جان سے ملنے آیا تھا۔''

شاہنواز خان نواب صاحب کے ایک دیرینہ دوست کا بیٹا اور پولیس میں ایس پی تھا۔ اس لیے شامی آرام سے واپس بیٹھ گیا۔ ''وہ ملنے آیا ہو گا۔''

تیمور نے سوچا اور وہ بھی مطمئن ہو گیا۔ ''تو ٹھیک کہہ رہا ہے وہ ملنے آیا ہو گا۔''

لیکن شاہنواز خان کے آنے کے بعد نواب صاحب زیادہ تر اپنے کمرے یا اسٹڈی تک محدود رہے تھے۔ اس پر شامی اور تیمور فکرمند ہوئے تھے کہ کوئی بات ہوئی ہے۔ نواب صاحب سے پوچھنے کی ہمت نہیں تھی اور نظام دین سے کچھ اگلوانا بھوکے کتے کے منہ سے ہڈی نکلوانے کے

مترادف ہے۔اس لیے شامی نے فولاد خان کا رخ کیا مگر وہ بھی اس معاملے میں بے خبر تھا۔اسے بس اتنا معلوم تھا کہ شاہنواز خان نے نواب صاحب سے ملنے کو کہا تھا اور وہ تقریباً آدھے گھنٹے اندر رہا۔اس کے ساتھ گاڑی میں صرف اس کا ڈرائیور تھا۔شامی کو شاہنواز خان کا خیال آیا مگر اسے مناسب نہیں لگا کہ وہ اس سے پوچھے کہ وہ ولا کیوں آیا تھا؟

تیمور زیادہ پُر جوش نہیں تھا اور وجہ وہی اس کی لندن تک نارسائی تھی۔البتہ شامی کو کسی کل چین نہیں آرہا تھا۔تیمور نے اسے خبردار بھی کیا تھا کہ اگر اس نے نواب صاحب تک جانے کی کوشش کی تو ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی بلا گلے پڑ جائے۔ مگر چند دن بعد شامی اتنا بے تاب ہو گیا کہ حقیقتِ حال سے واقف ہونے کے لیے وہ ہر خطرہ مول لینے کو تیار تھا اور وہ نواب صاحب کے پاس جا پہنچا۔وہ حسبِ معمول اسٹڈی میں تھے مگر مطالعے کے بجائے حقہ نوشی میں مصروف تھے اور فکرمند سے نظر آرہے تھے۔

”کہو برخوردار کیسے تشریف آوری ہوئی؟“

”آپ کچھ دنوں سے معمولات سے ہٹ رہے ہیں اور ایسا آپ بہت کم کرتے ہیں، ایسا شاہنواز خان کے آنے کے بعد ہوا ہے۔کیا میں اس کی وجہ جان سکتا ہوں؟“

نواب صاحب کچھ دیر سوچتے اور حقہ گڑگڑاتے رہے پھر انہوں نے سر ہلایا۔”ہم خود تم دونوں سے بات کرنے کا سوچ رہے تھے۔اچھا ہوا تم خود آگئے۔“

شامی کا دم ایک لمحے کو خشک ہوا تھا، کوئی بلا گلے پڑنے والی ہے۔مگر پھر تجسس اس پر غالب آگیا۔نواب صاحب نے کہا۔”آپ دونوں رات طعام کے بعد ہماری خواب گاہ میں تشریف لائیے گا۔“

شامی نے تیمور کو آگاہ کیا تو وہ فکرمند ہو گیا۔”مجھے لگ رہا ہے تو نے مروا دیا ہے۔“

”یار معلوم تو ہو کہ بات کیا ہے اور جہاں تک کسی ذمے داری کی بات ہے تو یار آخر ان کے پوتے اور ان کے وارث ہیں۔ان کی ذمے داریاں اور مسائل بھی ہمارے ہیں۔“

”کہہ تو تُو ٹھیک رہا ہے۔“

وہ دونوں ڈنر کے بعد نواب صاحب کی خواب گاہ پہنچے۔نواب صاحب ان کا انتظار کر رہے تھے۔انہوں نے بلا تمہید کہا۔”تم نے ریاست پور کا نام سنا ہے؟“

شامی نے نہیں سنا تھا مگر تیمور نے سنا تھا۔اس نے کہا۔”وہی چھوٹا سا قصبہ نا جو یہاں سے تقریباً سو کلومیٹرز کی مسافت پر جنوب مغرب میں دریا کے پاس واقع ہے۔“

”درست فرمایا۔“ نواب صاحب نے کہا۔”اس علاقے کا ایس پی شاہنواز خان ہمارے ایک دوست کا برخوردار ہے۔اس نے ہمیں اطلاع دی کہ ریاست پور میں ایک خاتون زرغونہ بیگم کا قتل ہوا ہے اور قاتل نے اس پر پستول سے فائر کیا اور اس کی موت واقع ہو گئی۔“

”شاہنواز خان نے آپ کو کیوں اطلاع دی؟“ شامی نے پوچھا۔

”کیونکہ زرغونہ بیگم سے ہماری واقفیت رہی ہے اگرچہ اس بات کو پچاس سال گزر چکے ہیں۔لیکن اصل وجہ وہاں ہمارے پستول کی موجودگی اور اس پر ہماری انگلیوں کے نشانات ہیں۔“

شامی اور تیمور اچھل پڑے تھے۔”آپ کی انگلیوں کے نشانات، کیا قتل اسی پستول سے ہوا ہے؟“

”بدقسمتی سے۔“ نواب صاحب نے سر ہلایا۔”اسی وجہ سے شاہنواز خان ہم سے ملنے آیا تھا۔“

شامی نے حیرت سے کہا۔”شاہنواز خان نے آپ کا لحاظ بھی نہیں کیا؟“

نواب صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔”اسے کرنا بھی نہیں چاہیے اور یہ اس کی شرافت ہے کہ اس نے معاملہ ابھی خود تک محدود رکھا ہے اور ہمیں صفائی کا موقع دیا مگر...“ نواب صاحب خاموش ہو کر حقہ گڑگڑانے لگے۔وہ دونوں ہمہ تن گوش تھے۔نواب صاحب کچھ دیر بعد بولے۔”مسئلہ یہ ہے ہمارا پستول زرغونہ بیگم کی حویلی میں کیسے پہنچا اور اس کی موت کا سبب بنا؟ پھر اس پر ہماری انگلیوں کے نشانات بھی ہیں۔“

”پستول اسلحہ خانے سے غائب ہوا؟“ تیمور نے پوچھا۔

”بالکل مگر یہ شوکیس میں نہیں تھا بلکہ ہم نے صفائی کے لیے نکالا تھا اور کسی وجہ سے کام ادھورا چھوڑنے پر مجبور ہوئے تو اسے ایک دراز میں رکھ دیا تھا۔یہ وہیں سے غائب ہوا ہے۔“

نواب صاحب کا اسلحہ خانہ بلٹ پروف شیشوں اور دھات سے بنے شوکیسوں پر مشتمل تھا جس میں ان کا ذاتی اور خاندانی اسلحہ سجا ہوا تھا۔تمام شوکیس مقفل ہوتے تھے اور ان کو جدید ترین الیکٹرانک لاک نمبروں اور فنگر پرنٹس کی مدد سے صرف نواب صاحب یا پھر تیمور کھول سکتا تھا۔البتہ اسے نمبروں کا علم نہیں تھا۔نمبر نظام دین کی تحویل میں تھے۔یعنی

دونوں مل کر ہی شوکیس کھول سکتے تھے۔ یہ متبادل انتظام تھا۔ مگر شامی کو پستول سے زیادہ مقتول خاتون سے دلچسپی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”زرغونہ بیگم کا پس منظر کیا ہے؟“

نواب صاحب ہچکچائے پھر انہوں نے کہا۔ ”یہ غیر ضروری ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اسے کیوں قتل کیا گیا اور اس کے قتل میں ہمارا پستول کیوں استعمال ہوا؟“

شامی کا خیال تھا کہ معاملات کی کڑیاں ماضی میں جاتی نظر آرہی تھیں مگر اس نے اس کے بجائے نواب صاحب سے کہا۔ ”زرغونہ بیگم کا موجودہ اسٹیٹس کیا تھا؟“

لفظ اسٹیٹس پر نواب صاحب نے اسے ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا مگر اعتراض نہیں کیا اور بولے۔ ”وہ ریاست پور کی ایک حویلی اور نزدیک ہی موجود ساڑھے تین سو ایکڑ زرعی اراضی کی مالک تھی۔ ماضی میں اس حویلی اور زمین کا مالک میاں ارمان علی شاہ تھا۔ وہی زرغونہ بیگم کو اس حویلی میں لایا تھا اور اس کی موت کے بعد وہ اس حویلی، زمین اور اس کی دولت کی مالک بنی تھی۔“

”اس کا کوئی والی وارث؟“

”ایک لڑکی سارہ ہے جو شاید مشرقِ وسطیٰ میں کہیں جاب کرتی ہے لیکن زرغونہ سے اس کا تعلق واضح نہیں ہے۔“

”جیسے میاں ارمان سے زرغونہ بیگم کا تعلق واضح نہیں ہے۔“

”تقریباً۔“ نواب صاحب نے کہا۔ ”اب ہم چاہتے ہیں کہ آپ دونوں وہاں جائیں اور جاننے کی کوشش کریں کہ یہ کیا معما ہے؟“

شامی نے جلدی سے کہا۔ ”پولیس اس معاملے میں بہتر کردار ادا کرسکتی ہے۔“

”بات اتنی سادہ نہیں ہے جتنی آپ سمجھ رہے ہیں۔“ نواب صاحب نے آہستہ سے کہا۔ ”زرغونہ بیگم نے اپنی ساری دولت اور جائداد اپنی موت سے ایک مہینا پہلے ہمارے نام کردی تھی۔“

☆☆☆

ریاست پور ایک چھوٹا لیکن دولت مند قصبہ تھا۔ تین طرف سے چھوٹے پہاڑوں میں گھرے اس قصبے میں بیشتر گھر اصل میں حویلی نما تھے۔ کم سے کم ایکڑ زمین پر بنی ان حویلیوں میں سے اکثر فنِ تعمیر کا نمونہ تھیں۔ دریا کے نزدیک ہونے کی وجہ سے یہ سارا علاقہ نہایت زرخیز تھا اور زمین سونا اگلتی تھی۔ نزدیکی پہاڑیوں کی وجہ سے آب و ہوا بھی خوشگوار تھی۔ انگریزوں نے یہاں اپنے وفاداروں کو بے حساب زمین بخشی تھی اور ان ہی وفاداروں نے ریاست پور آباد کیا تھا۔ یہاں کچھ چھوٹے مکانات بھی تھے۔ لیکن یہ کبھی عام لوگوں کے نہیں تھے کیونکہ عام فرد کو اس جگہ آباد ہونے کی اجازت ہی نہیں تھی۔ یہ چھوٹے مکانات چھوٹے زمینداروں کے تھے۔ ریاست پور کو منصوبے کے تحت آباد نہیں کیا گیا تھا۔ پہلے کسی ایک جاگیردار نے یہاں حویلی بنائی۔ اس کے بعد دوسرا آیا اور پھر لائن لگ گئی۔ آزادی سے پہلے ہی ریاست پور باقاعدہ قصبے کی صورت اختیار کر گیا تھا۔

اس کا انتظام جاگیرداروں کی بنائی ایک کمیٹی کے سپرد تھا اور وہی اس کے اخراجات برداشت کرتے تھے۔ اس لیے ریاست پور کی تمام گلیاں پختہ تھیں اور سڑک و فٹ پاتھ ایسے پتھروں سے بنائے گئے تھے کہ پون صدی گزرنے کے باوجود ان کی مضبوطی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ گلیوں میں نکاسِ آب کا ایسا انتظام تھا کہ بارش گھنٹوں ہوتو تب بھی صرف نصف گھنٹے میں پانی غائب ہوجاتا تھا۔ یہاں مین ہول نہ تو کھلے پائے جاتے تھے اور نہ سیوریج کا پانی ابلتا تھا۔ شام ہی سے تمام گلیاں روشنی سے جگمگانے لگتی تھیں کیونکہ ہر حویلی اور مکان مالک کی ذمے داری تھی کہ وہ اپنے گھر کے سامنے روشنی کا انتظام رکھے۔ کہیں کچرا، گندگی، مٹی اور فالتو کے لوگ نظر نہیں آتے تھے۔ ریاست پور صحیح معنوں میں پوش افراد کی آبادی تھی۔ یہ ساری معلومات انہیں زرغونہ بیگم کی حویلی کے نگراں، چوکیدار اور واحد ملازم خدا بخش نے فراہم کی تھیں۔

ستر سالہ خدا بخش اس وقت صرف بیس برس کا تھا جب زرغونہ بیگم اس حویلی میں آئیں۔ ان کی آمد کے بیس سال بعد میاں ارمان علی شاہ اسی برس کی عمر میں دنیا سے گزر گئے۔ انہوں نے وصیت میں اپنا سب کچھ زرغونہ بیگم کے نام کردیا تھا۔ خدا بخش ستر برس کی عمر میں بھی پوری طرح متحرک اور صحت مند تھا۔ اس کا سیاہی مائل سانولا رنگ یوں چمکتا تھا جیسے وہ ابھی دھوپ سے آیا ہو۔ جھریاں اور ہاتھوں کی نسیں بوڑھے برگد کی طرح نمایاں تھیں مگر کاٹھی مضبوط تھی۔ وہ سیدھا چلتا تھا اور اس عمر میں بھی اسے عینک کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے فخر یہ بتایا کہ وہ بلوں میں لکھی باریک رقم بھی آسانی سے پڑھ لیتا ہے۔ حویلی کی تمام ذمے داریاں اس کے سپرد تھیں اور وہ زرغونہ بیگم کی زندگی میں انہیں نبھاتا آیا تھا۔ قطع نظر اس کے کہ نواب صاحب پر کیا

الزام آرہا تھا خدا بخش اتنا جانتا تھا کہ اس حویلی کے مالک اب وہی ہیں۔ اس لیے اس نے شامی اور تیمور کا شایانِ شان استقبال کیا۔ وہ اطلاع دے کر آئے تھے اس لیے خدا بخش نے ان کی آمد سے پہلے تمام انتظامات کر لیے تھے۔ ایک ملازمہ بھی تھی جو اُن کے لیے کھانا بناتی اور دوسری ضروریات کا خیال رکھتی۔

خدا بخش نے سب سے پہلے انہیں پوری حویلی دکھائی۔ اس دو منزلہ حویلی میں اوپر نیچے کل سترہ کمرے تھے۔ جن میں سے دس خواب گاہیں تھیں۔ چار نشست گاہیں اور دو طعام گاہیں تھیں۔ ایک بڑا کمرا لائبریری کے لیے مخصوص تھا۔ اخروٹ، شیشم اور ٹیک کی لکڑی کا قیمتی فرنیچر جس کی آب و تاب نصف صدی گزر جانے کے باوجود... برقرار تھی۔ بلور اور دوسرے میٹریل کے بنے شوپیس جو عام بازاروں میں نظر نہیں آتے ہیں۔ شامی کا اندازہ تھا کہ مرکزی طعام گاہ میں جو فانوس لگا ہوا تھا، اس کی موجودہ مالیت پچاس لاکھ سے کم نہیں تھی۔ حویلی کی ایک ایک شے سے امارت اور ذوق ٹپکتا تھا۔ کیل سے بنے دروازوں پر نقاشی کا اتنا نفیس کام تھا جو شامی اور تیمور جیسے امیر زادوں نے بھی بہت کم دیکھا تھا۔ نچلی منزل مختلف مصوری کے فن پاروں سے سجی ہوئی تھی مگر اس میں سوائے میاں ارمان کے اور کسی کی تصویر نہیں تھی۔ وہ زرغونہ بیگم کے بارے میں متجسس تھے مگر ان کی کوئی تصویر نہیں تھی۔ البتہ اوپری منزل میں ایک پورٹریٹ تھا۔ اس میں ایک لڑکی جس نے بہت سلیقے سے میک اپ کیا ہوا تھا اور وہ دورِ جدید کی لگ رہی تھی۔ اس کے سر کے پیچھے مصور نے ایک اکتارا نواز کو پشت سے دکھایا تھا۔ اس کا اکتارے والا ہاتھ پھیلا ہوا تھا اور اس سے آگے چند کٹھ پتلیاں محو رقص تھیں۔ ایک زرتار باریک چادر نے اکتارے نواز سے لے کر پتلیوں تک کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ شامی کو اس پینٹنگ نے بہت متاثر کیا۔

''کمال کا تخیل اور حقیقت نگاری دکھائی ہے مصور نے۔''

تیمور نے خاص دلچسپی نہیں لی۔ وہ حویلی دیکھ رہا تھا۔ پوری حویلی میں ٹائلوں کا فرش تھا اور یہ ٹائلز خاص طور سے بنوائی گئی تھیں۔ ان پر ہر سال باقاعدگی سے پالش کی جاتی تھی۔ حویلی کی پوری بیرونی سطح پر ہلکے سرخی مائل بھورے رنگ کے ایسے پتھر جڑے تھے جن پر موسم کے سرد و گرم و تر کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ یہ آج بھی ویسے ہی تھے۔ حویلی کی اوپری منزل پر آگے پیچھے دو ٹیرس تھے جو شیشوں سے بند ہو جاتے تھے۔ حویلی میں آگے پیچھے وسیع باغ تھے جن کی باقاعدگی سے دیکھ بھال کی جاتی تھی۔ ایک طرف گیراج کے لیے الگ سے عمارت تھی۔ اس میں تین عدد پرانی لیکن قیمتی کاریں موجود تھیں۔ جب شامی اور تیمور یہاں آرہے تھے تو انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ زرغونہ بیگم اتنی شاندار حویلی کی مالک ہوگی۔ اس کی دولت کا تعارف کرانے کے لیے یہ حویلی ہی کافی تھی۔ خدا بخش نے بتایا کہ زمین کے معاملات وکیل شفیق احمد دیکھتے تھے۔ وہ گزشتہ چالیس برس سے زرغونہ بیگم کے وکیل چلے آرہے تھے۔

حویلی کی سیر نے شامی اور تیمور کی بھوک جگا دی تھی۔ خدا بخش انہیں مرکزی طعام گاہ میں لایا جہاں کھانے کی میز پر کم سے کم پچاس افراد آسکتے تھے۔ مگر فی الحال وہی دو تھے۔ کھانے میں مقامی روایتی ڈشیں تھیں جن میں مرغن کا عنصر بہت نمایاں تھا۔ کچھ شہری طرز کے کھانے بھی تھے مگر سب بہت لاجواب اور بہترین ذائقے کے حامل تھے۔ انہوں نے تعریف کی تو خدا بخش یوں خوش ہو گیا جیسے اسی نے سب بنایا ہو۔ کچھ دیر بعد پتا چلا کہ ملازمہ اس کی بیٹی تھی اور اس کی تربیت زرغونہ بیگم نے کی تھی۔ اسے کھانے پکانے سے لے کر دوسرے بہت سارے فنون اور ہنر اس نے ہی سکھائے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ شامی اور تیمور نے اس کے کھانوں اور پیش کرنے کے انداز میں اعلیٰ درجے کا سلیقہ اور طریقہ پایا تھا۔ سبین تقریباً پینتالیس برس کی لیکن اب بھی خوب صورت نظر آنے والی شائستہ عورت تھی جو بہت اچھے انداز میں بات کرتی تھی۔

سولہ سال کی عمر میں اس کی شادی خود زرغونہ بیگم نے کرائی تھی اور اس کا شوہر اسلام آباد کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں شیف تھا۔ مگر سبین نے کبھی ملازمت نہیں کی تھی۔ جب تک وہ زرغونہ بیگم کے ساتھ رہی اس نے کبھی تنخواہ نہیں لی۔ یہ اور بات تھی کہ زرغونہ بیگم نے اسے تنخواہ سے زیادہ ہی نوازا تھا۔ خدا بخش نے انہیں مطلع کیا کہ جب تک وہ یہاں ہیں سبین یہیں رہے گی۔ کیونکہ حویلی عام طور سے بند رہتی تھی اور اب کھلی تھی تو خدا بخش نے مزید ایک ملازمہ کا بندوبست کیا تھا جو اگلے دن سے آتی۔ شامی اور تیمور نے اوپری منزل کے دو بیڈ رومز چنے تھے جو آس پاس تھے۔ رات کے طعام کے بعد وہ چہل قدمی کے لیے باہر نکلے تو ہوا میں ہلکی سی نمی محسوس ہو رہی تھی۔ شاید بارش متوقع تھی۔ دن گرم رہا تھا۔ یہ علاقہ پہاڑوں سے نزدیک ہونے کی وجہ سے زیادہ گرم تو نہیں ہوتا تھا مگر موسم بہرحال گرمی کا تھا۔ اب

تک خدا بخش ان کے ساتھ تھا اس لیے وہ بات نہیں کر سکے تھے۔ دوپہر میں دو گھنٹے ملے جو انہوں نے سو کر گزارے تھے۔ شامی نے کہا۔

''زرغونہ بیگم نے خاصا متاثر کیا ہے۔''

''وہ بھی بعد از مرگ۔'' تیمور نے سر ہلایا۔ ''سوچ جب وہ زندہ ہوں گی اور آتش جوان ہوگا تو انہوں نے دادا جان پر کیا اثرات مرتب کیے ہوں گے۔ ہم نے انہیں دیکھا نہیں ہے مگر گمان ہے کہ چندے آفتاب و مہتاب وغیرہ ہوں گی۔''

''دادا جان نے خاتون سے اپنا تعلق واضح کرنے سے گریز کیا ہے اس کا مطلب ہے دال میں کچھ کالا ہے۔''

تیمور نے اسے گھورا۔ ''ضروری نہیں ہے دال میں کالا ہو۔''

''تب دادا جان نے وضاحت کیوں نہیں کی۔''

''وہ ٹھیک کہہ رہے ہیں، اس بات کا موجودہ صورتِ حال سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''اس کے برعکس میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ موجودہ صورتِ حال کا تعلق دادا جان اور اس خاتون کے رشتے سے بنتا ہے۔ تو جانتا ہے میری چھٹی حس کم غلط کہتی ہے۔''

''غلط نہیں کہتی لیکن ہمیشہ منحوس کہتی ہے۔'' تیمور نے جل کر کہا کیونکہ شامی نے پہلے بھی پیش گوئی کی تھی کہ اس کی چھٹی حس کہہ رہی ہے وہ لندن نہیں جا سکے گا اور ایسا ہی ہوا تھا۔

شامی ہنسا۔ ''اس میں اس بے چاری کا کیا قصور ہے۔ ہونا وہی ہے جو اوپر والے نے تیری میری تقدیر میں لکھ دیا ہے۔ خیر چھوڑ، اس ٹاسک کے بارے میں سوچ جو ہمارے سر پڑ گیا اور سچی بات ہے میرا دل تو آج ہی اس حویلی سے بھر گیا ہے جس میں سوائے ایک عمر رسیدہ خادمہ کے اور کوئی نسوانی صورت نہیں ہے۔''

''تو اس لڑکی کو بھول رہا ہے جو مڈل ایسٹ میں کہیں موجود ہے اور زرغونہ بیگم سے اس کا تعلق واضح نہیں ہے۔''

''مڈل ایسٹ یہاں سے کم سے کم پندرہ سو کلومیٹرز دور ہے اور اس لڑکی کا یہاں آنے کا کچھ اتا پتا نہیں ہے۔''

''پھر بھی دادا جان نے جو ذمے داری دی ہے وہ تو نبھانی ہے۔'' تیمور نے کہا۔

یہاں آنے سے پہلے انہوں نے پستول کے معاملے میں تفتیش کی تھی۔ یہ جنگِ عظیم سے پہلے کا کولٹ کا مقبول ماڈل تھا۔ خاص طور سے اس کا چھوٹا سا سائز۔ مار اور نشانے میں درستگی اس کی مقبولیت کی وجہ بنی تھی۔ نواب صاحب جنگِ عظیم میں شرکت کے بعد واپسی میں یہ پستول لائے تھے۔ پستول انہیں تحفے میں ملا تھا۔ ان کا کمانڈنگ آفیسر میجر جیمز ان کی صلاحیتوں کا مداح تھا۔ پستول اسی کا تحفہ تھا۔ خود نواب صاحب کو بھی پستول پسند تھا اس لیے وہ اس کی صفائی خود کرتے تھے اور انہوں نے آخری بار دو مہینے پہلے اسے صفائی کے لیے نکالا تھا اور پھر ایک ملاقاتی کے آنے پر اسے دراز میں رکھ کر چلے گئے اور بعد میں ان کے ذہن سے اتر گیا تھا۔ شامی اور تیمور متفق تھے کہ پستول اندر کے کسی آدمی نے نکالا ہے۔ نواب صاحب نے اس آدمی کو پکڑنے کی ذمے داری نظام دین کے سپرد کی تھی۔ حالانکہ شامی کا خیال تھا کہ نظام دین خود مشکوک ہے مگر تیمور اس سے متفق نہیں تھا۔ اس نے شامی سے کہا۔

''ہمارے معاملے میں یہ کیسا ہی کمینہ سہی لیکن دادا جان سے اس کی وفاداری شک و شبہے سے بالاتر ہے۔''

راستے میں وہ غور کرتے آئے تھے کہ نواب صاحب کا ایسا کون دشمن ہوسکتا ہے جو انہیں یوں زرغونہ بیگم کے قتل میں ملوث کرے۔ مگر دور دور تک کوئی نام ان کے ذہنوں میں نہیں تھا۔ درحقیقت وہ زرغونہ بیگم کے علاوہ اور کسی کا نام نہیں جانتے تھے۔ یہاں آکر خدا بخش اور اس کی بیٹی سین سے واسطہ پڑا۔ پھر وکیل شفیق احمد اور زرغونہ بیگم کی پروردہ ساریہ کے بارے میں علم ہوا مگر خدا بخش نے ساریہ کے بارے میں بتایا کہ وہ ملک سے باہر ہے اور کوشش کے باوجود اس سے رابطہ نہیں ہو پا رہا ہے۔ اس کا فون نمبر بند جا رہا ہے۔ اس لیے اب تک اسے زرغونہ بیگم کی موت کی اطلاع بھی نہیں دی جا سکی ہے۔ شفیق احمد پاکستانی سفارت خانے کے توسط سے اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ شامی نے کہا۔

''شفیق احمد بھی یہ کام کرسکتا ہے۔ ممکن ہے اس کی اس دولت اور جائداد پر نظر ہو۔''

تیمور کا خیال کچھ اور تھا۔ ''مجھے تو ساریہ مشکوک لگ رہی ہے۔ دیکھا جائے تو دولت اور جائداد پر اس کا حق بنتا تھا مگر زرغونہ بیگم نے اسے دادا حضور کے نام کردیا۔''

''یہی تو اس سارے چکر میں اہم ترین بات ہے۔'' شامی نے تکیہ پٹخا۔ تیمور اس کے بیڈروم میں تھا۔ ''آخر اس خاتون سے دادا جان کا کیا تعلق تھا جو اس نے اتنی بڑی دولت اور جائداد ان کے نام کردی۔''

"تو غلط سمت میں سوچ رہا ہے۔ اول تو دادا جان نے کہا ہے کہ وہ پچاس سال پہلے اس سے آخری بار ملے تھے اور تو نے غور کیا کہ وہ اس کی موجودہ حالت سے بے خبر تھے جب تک کہ پولیس نے ان سے رابطہ نہیں کیا۔ دوسرے دادا جان اس سے کہیں زیادہ دولت مند ہیں اگر زرغونہ بیگم ان کے بارے میں جانتی تھی تو اسے یہ بات بھی معلوم ہونی چاہیے۔ تب اس نے اپنے کئی قریبی لوگوں کو چھوڑ کر دادا جان کو اپنا وارث کیوں بنایا جبکہ انہیں اس کی دولت اور جائداد کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔"

"قریبی لوگوں سے یاد آیا کہ سیمیں بھی تو اس کی خادمہ رہی ہے بلکہ خادمہ سے بڑھ کر تعلق رہا ہے اور ممکن ہے وہ بھی امید لگائے بیٹھی ہو کہ اسے کچھ ملے گا مگر جب اسے پتا چلا کہ زرغونہ بیگم نے سب کچھ دادا جان کے نام کر دیا ہے تو اس نے یہ سازش تیار کی اور زرغونہ بیگم کو دادا جان کے پستول سے قتل کر دیا۔"

"دادا جان کے پستول کا حصول اتنا آسان نہیں ہے۔"

"سیمیں کا شوہر فائیو اسٹار ہوٹل میں شیف ہے، کیا تم اسے معمولی حیثیت کا آدمی سمجھ رہے ہو؟"

"نہیں، لیکن نہ جانے کیوں سیمیں پر میرا شبہ نہیں جا رہا۔ وہ بہت مہذب اور پُرخلوص عورت ہے۔" تیمور نے نفی میں سر ہلایا۔ "تو مفروضات کے گھوڑے نہ دوڑا۔ ابھی ہمیں یہاں آئے ہوئے بارہ گھنٹے ہوئے ہیں۔"

"یہ بارہ گھنٹے بہت مشکل گزرے ہیں۔"

تیمور نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو مزہ آرہا ہے۔ میں نے سوچا نہیں تھا کہ ہمارے ملک میں بھی ایسا کوئی قصبہ ہوگا۔"

"دولت ہر مشکل کا حل ہے۔" شامی نے آفاقی حقیقت بیان کی۔ "اور یہاں رہنے والے سب جدّی پشتی دولت مند ہیں اس لیے انہوں نے ہر سہولت حاصل کر لی ہے۔ یہاں بجلی، پانی اور گیس کے ساتھ ساتھ فون مع جدید ترین ڈی ایس ایل اور وائی فائی کے ساتھ موجود ہے۔"

زرغونہ بیگم کی حویلی میں بھی یہ سب چیزیں موجود تھیں۔ یہاں جدید ترین ڈش ٹی وی سسٹم بھی تھا مگر زرغونہ بیگم کے بعد وکیل شفیق احمد نے اسے بند کرا دیا تھا کیونکہ اب دیکھنے والا کوئی نہیں رہا تھا اور اس کی فیس اچھی خاصی تھی۔ البتہ مقامی کیبل دستیاب تھا۔ شامی ٹی وی سے دل بہلانے لگا اور اسی دوران میں اس کی آنکھ لگی تو صبح دھوپ سے کھلی تھی۔ رات اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا چھوڑ دیا تھا اور مشرق کی طرف ہونے کی وجہ سے سورج طلوع ہونے کے کچھ دیر بعد ہی دھوپ اس کے چہرے پر پڑنے لگی۔ مگر اے سی کی خنکی میں اسے دھوپ بھی اچھی لگ رہی تھی۔ کچھ دیر لطف اندوز ہونے کے بعد اس نے مزید سونے کا ارادہ کیا تھا کہ تیمور نے دروازے پر دستک دی اور جھانک کر بولا۔ "اٹھ جا، کچھ دیر میں ایس پی صاحب تشریف لا رہے ہیں۔"

شامی نے شاہنواز کو دل ہی دل میں بے نقط سنائیں جو اتنی صبح آرہا تھا۔ وہ جمائیاں لیتا ہوا اٹھا اور سرد پانی کا شاور لے کر نیچے آیا تو ناشتا تیار تھا اور تیمور ناشتے کا آغاز بھی کر چکا تھا۔ لنچ اور ڈنر کی طرح ناشتا بھی اعلیٰ درجے کا تھا۔ خدا بخش کچھ ضروری امور نمٹانے گیا تھا مگر اس کی بلائی ہوئی ملازمہ آگئی تھی اور یہ کمسن اور خاصی خوب صورت تھی۔ شامی کی کسی قدر تسلی ہوگئی تھی۔ اس نے کرسی سنبھالتے ہوئے تیمور سے کہا۔ "شکر ہے کچھ رونق نظر آئی۔"

"ہاں مگر یہ رونق بس دیکھنے والی ہے۔"

"چلو دیکھنے کو سہی۔" شامی نے سرد آہ بھری اور ناشتے میں مصروف ہوگیا۔ رات بارش ہوئی تھی اور موسم خوشگوار تھا۔ ایس پی شاہنواز خان نے خدا بخش کو کال کر کے اپنی آمد کی اطلاع دی تھی۔ وہ ناشتے سے فارغ ہوئے کہ شاہنواز خان آگیا۔ وہ نوجوان اور تروتازہ پولیس مین تھا جو ابھی پولیس کی زنگ آلود اور مخصوص انداز و رفتار سے چلنے والی مشینری کا حصہ نہیں بنا تھا۔ وہ سول سروس سے آیا تھا۔ ان کی ابتدائی میٹنگ لان میں چار ستونوں پر کھڑی چھتری نما جگہ پر ہوئی۔ اس کے نیچے بید سے بنے صوفے موجود تھے۔ اس نے سلام دعا کے فوراً بعد کہا۔ "مجھے پوائنٹ ون پرسنٹ بھی یقین نہیں ہے مگر پولیس والوں کی مجبوری ہوتی ہے کہ انہیں شواہد اور ثبوتوں کی بنیاد پر اپنی تفتیش آگے بڑھانی ہوتی ہے۔"

"سازش تو یوں ہی واضح ہے کہ دادا حضور کا پستول مع ان کی انگلیوں کے نشانات کے جائے وقوع پر پایا گیا ہے۔" شامی نے کہا۔ "معمولی قاتل بھی ایسی حماقت نہیں کرتا ہے۔ چہ جائیکہ اگر دادا جان جیسے شخص سے اس امر محال کی توقع کر لی جائے تب بھی وہ ایسی حماقت کیسے فرما سکتے ہیں۔"

کانوینٹ اور پھر اکیڈمی کے انگریزی زدہ ماحول کا پروردہ شاہنواز خان شامی کی اردو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "یہی چیزیں تو شبہ پیدا کر رہی ہیں۔"

''پھر تم دیکھو کہ دادا جان کی ذاتی دولت اس سے کئی گنا زیادہ ہے۔ وہ بھلا دولت کے لیے ایسی حرکت فرمائیں گے۔''

''ناممکن۔'' تیمور نے لقمہ دیا۔

''حقیقت تو یہ ہے کہ دادا جان کو اس کا علم ہی نہیں تھا کہ زرغونہ بیگم نے اپنی ساری دولت اور جائداد ان کے نام کر دی ہے۔ ان کے وکیل نے بھی دادا جان سے رابطہ نہیں کیا۔ بلکہ جب زرغونہ بیگم قتل کر دی گئیں تو پولیس نے دادا جان سے رابطہ کیا۔''

''تم دونوں ٹھیک کہہ رہے ہو، معاملہ بہت گڑبڑ ہے۔'' شاہنواز نے کسی قدر روبے انداز میں کہا۔ ''مگر نواب صاحب کے پستول اور اس پر ان کی انگلیوں کے نشانات کا کیا کیا جائے؟''

شامی کے خیال میں معاملے کو غتربود کرنے کا مشورہ قبل از وقت ہوتا اس سے پہلے تھوڑی بچ بچ کی تفتیش اور بھاگ دوڑ بھی کر لی جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ شامی نے کہا۔ ''ابھی تک ہمیں کچھ معلوم نہیں ہے کہ یہ سب ہوا کیسے ہے؟''

''میں بتاتا ہوں۔'' شاہنواز خان نے اپنی فائل کھولی۔ ''صبح چار بج کر دس منٹ پر ریاست پور کے نزدیکی تھانے کو خدا بخش کی طرف سے کال ملی کہ اس کی مالکن کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ پولیس پارٹی نصف گھنٹے بعد یہاں پہنچی تو زرغونہ بیگم کی لاش عقبی نشست گاہ میں کھڑکی سے ذرا فاصلے پر پڑی تھی۔ گولی ان کے سینے میں عین دل کے مقام پر لگی تھی۔ لاش کا معائنہ کرنے والے ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ موت فوری ہوئی تھی۔ پُراسرار بات یہ ہے کہ حویلی کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں سوائے اس نشست گاہ کی کھڑکی کے، اس کے پٹ کھلے ہوئے تھے مگر قاتل اس سے بھی اندر نہیں آسکتا تھا۔''

وہ دونوں چونکے۔ یہ نئی بات تھی۔ نواب صاحب شاید اس کا ذکر کرنا بھول گئے تھے۔ ''تب قاتل اندر کیسے آیا اور باہر کیسے گیا؟''

شاہنواز خان نے شانے اچکائے۔ ''یہ معما سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ نیچے کی تمام کھڑکیوں پر فولادی گرل ہے۔ یہاں تمام دروازے صرف چابی سے کھلتے اور بند ہوتے ہیں۔ کہیں کوئی آٹومیٹک لاک نہیں ہے۔ صرف ایک طریقہ سمجھ میں آتا ہے کہ قاتل نے کھڑکی کے باہر سے فائر کیا اور پھر پستول اندر چھوڑ کر فرار ہو گیا۔''

''ہم جائے وقوع پر چل کر بات کرتے ہیں۔'' شامی نے کہا تو شاہنواز کھڑا ہو گیا۔ وہ اندر آئے۔ عقبی نشست گاہ زیادہ بڑی نہیں تھی مگر اس کا بیشتر حصہ خالی تھا اور صرف ایک چھوٹا صوفہ سیٹ یہاں موجود تھا۔ صوفہ سیٹ والی جگہ پر دبیز افغانی قالین تھا مگر باقی جگہ فرش تھا۔ شاہنواز نے جگہ کی نشان دہی کی کہ لاش یہاں پائی گئی تھی۔ کیونکہ مقامی پولیس نے چاک سے نشان بنانے کی زحمت نہیں کی تھی اس لیے ایس پی کو خود لیٹ کر بتانا پڑا کہ لاش کس حالت میں تھی۔ زرغونہ بیگم پہلو کے بل گری تھی اور اس کے دونوں گھٹنے ذرا مڑے ہوئے تھے۔ اس کا رخ کھڑکی کی طرف تھا اور کھڑکی سے اس کا فاصلہ دس فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ کھڑکی کے ساتھ ہی ایک پرانا اور بھاری بھرکم وال کلاک تھا۔ جس کا پنڈولم ہی کوئی چار فٹ لمبا تھا۔ اس کے آخری سرے پر سنہری گول پلیٹ تھی۔ شاہنواز نے وال کلاک کے ساتھ زمین پر اشارہ کیا۔

''پستول یہاں پایا گیا تھا۔''

''خدا بخش کا کیا بیان ہے؟'' تیمور نے پوچھا۔

''اس کا کہنا ہے کہ وہ اپنے کوارٹر کے صحن میں لیٹا ہوا سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ بے خوابی کا مریض ہے اور ساری رات جاگتا ہے۔ رات میں وہ کم سے کم حویلی کے دو چکر لگاتا ہے۔ اس نے حویلی میں لگے اس گھڑیال کا گھنٹا سنا کیونکہ اس کا کوارٹر یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے اور جیسے ہی گھڑیال نے چوتھا گھنٹا بجایا ایک فائر کی آواز آئی۔ فائر کی آواز بھی اسی سمت سے آئی تھی۔ خدا بخش اپنے کوارٹر سے نکل کر عقبی باغ میں آیا تو اس نے کھڑکی کے پٹ خلاف توقع کھلے پائے۔ حالانکہ وہ رات خود اسے بند کر کے گیا تھا۔ کھڑکی کی اونچائی زمین سے کوئی سات فٹ ہے اس لیے اسے اندر کا منظر دکھائی نہیں دیا۔ وہ عقبی باغ میں کھلنے والے دروازے سے اندر آیا۔ اس کے پاس آگے اور پیچھے کے دونوں داخلی دروازوں کی چابیاں ہوتی ہیں۔ جب وہ عقبی نشست گاہ میں پہنچا تو اس نے زرغونہ بیگم کو مردہ حالت میں فرش پر پڑے پایا۔ ان کے دل کی دھڑکن رک چکی تھی اس لیے خدا بخش نے پہلے پولیس کو اور پھر ڈاکٹر کو کال کی۔''

''اس نے کسی فرد کو دیکھا؟''

''نہیں، اس کا کہنا ہے کہ زرغونہ بیگم کی لاش دیکھنے سے پہلے اور بعد میں بھی اس نے حویلی میں کسی فرد کو نہیں دیکھا تھا۔ پولیس کو اطلاع دے کر اس نے اپنی شاٹ گن

نکالی اور پوری حویلی کا چکر لگایا۔ پولیس کی آمد پر اسی نے مین گیٹ کھولا تھا۔''

''پولیس کو دراندازی کے نشانات ملے؟''

''نہیں، حویلی کی چاردیواری دس فٹ بلند ہے، اس پر اینگل آئرن کی مدد سے دو فٹ کی فولادی خاردار باڑ ہے۔ باڑ کہیں سے بھی ٹوٹی یا اپنی جگہ سے ہٹی نہیں پائی گئی۔''

''کیا اس صورت میں قتل پُر اسرار نہیں ٹھہرتا ہے؟'' تیمور نے پوچھا۔

''پُر اسرار تو ہے۔'' شاہنواز خان نے تسلیم کیا۔ ''قاتل اندر کیسے آیا اور باہر کیسے نکلا اس کا قطعی آئیڈیا نہیں ہے۔''

''کھڑکی یا اس کے آس پاس کسی اجنبی کے فنگر پرنٹ پائے گئے؟''

''نہیں یہاں سوائے خدا بخش کے اور کسی کے فنگر پرنٹ نہیں ملے۔ دروازے کھڑکیاں چیک کر کے بند کرنا اسی کی ذمے داری ہے۔''

''کیا اس صورت میں خدا بخش مشکوک نہیں ہوجاتا۔''

''وہ بھی مشکوک ہے مگر اس کے خلاف نہ تو کوئی ثبوت ہے اور نہ ہی قتل کا کوئی معقول سبب۔''

''مگر دادا جان کے خلاف ہے۔'' شامی نے طنز کیا۔

''ان کا پستول یہاں پایا گیا اور اس پر ان کی انگلیوں کے نشانات بھی ملے۔ سب سے بڑھ کر زرغونہ بیگم کی موت سے انہیں کروڑوں کا فائدہ بھی ہوتا۔''

''پلیز۔'' شاہنواز نے ہاتھ اوپر کیا۔ ''میں پہلے ہی نواب صاحب کو شک سے بری کر چکا ہوں۔''

''لیکن اس سے مسئلہ حل نہیں ہو رہا۔'' تیمور نے کہا۔ ''پستول..... پر انگلیوں کے نشانات صرف اصل قاتل کے پکڑے جانے سے مٹ سکتے ہیں۔''

''پولیس پوری کوشش کر رہی ہے۔''

''روایتی بیان مت دو۔'' شامی نے اسے ٹوکا۔ ''پولیس درحقیقت کچھ معلوم نہیں کر سکی ہے۔''

''یہ بھی نہیں کہ زرغونہ بیگم کی پُراسرار پروردہ ساریہ کہاں ہے اور وہ کیوں لاپتا ہے۔''

''حد یہ کہ زرغونہ بیگم کا پس منظر تک معلوم نہیں کر سکی۔''

اس پر شاہنواز مسکرایا..... ''نہیں، میں کم سے کم زرغونہ بیگم کا پس منظر جان گیا ہوں۔''

کچھ دیر بعد وہ اسی نشست گاہ میں چائے نوشی کر رہے تھے۔ خدا بخش آس پاس موجود تھا۔ شامی نے اسے وہاں سے جانے کا حکم دیا تو وہ بادلِ ناخواستہ وہاں سے رخصت ہوا تھا۔ شاہنواز زرغونہ بیگم کا پس منظر بتا رہا تھا۔ اس کے مطابق زرغونہ بیگم کا تعلق ایک نوٹنکی کمپنی سے تھا۔ آزادی سے پہلے پورے برصغیر میں یہ بڑی عوامی تفریح شمار ہوتی تھی اور لاتعداد تھیٹریکل اور نوٹنکی کمپنیاں تفریح فراہم کرتی تھیں۔ زرغونہ بیگم کا باپ ایک ایسی ہی کمپنی میں اکتارا بجاتا تھا اور کٹھ پتلیوں کا تماشا دکھاتا تھا۔ وہ کٹھ پتلیوں کی مدد سے پورا واقعہ بیان کرتا تھا اور بہت مقبول فنکار تھا۔ یہ چونکا دینے والی بات تھی۔ تیمور اور شامی کی توجہ لازمی اسی پینٹنگ کی طرف گئی تھی جو اوپری منزل پر لگی ہوئی تھی۔ زرغونہ نے آنکھ اسی کمپنی میں کھولی جو سارے سال سفر کرتی تھی اور وہ سفری ڈبوں میں رہتے تھے۔ کیونکہ زرغونہ کا باپ فنکار تھا اس لیے انہیں رہائشی ڈبا ملا ہوا تھا جسے گھوڑے کھینچتے تھے۔ عام افراد خیموں میں رہتے تھے۔ زرغونہ بیگم نے مروجہ تعلیم حاصل نہیں کی مگر اس نے سفر اور زمانے سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ اسے سات مختلف زبانیں مہارت اور روانی سے آتی تھیں۔ ان میں انگریزی اور اردو بھی شامل تھی۔ اسے اردو ادب اور شاعری کا بہت سا حصہ زبانی یاد تھا۔ بچپن سے اس نے رقص میں مہارت حاصل کی تھی۔ جوانی کے ساتھ خوب صورتی آئی تو وہ بھی تھیٹر میں کام کرنے لگی۔

زرغونہ بیگم کا باپ چاہتا تھا کہ وہ بمبئی کی فلم انڈسٹری میں قسمت آزمائے۔ اسی مقصد کے تحت وہ اسے بمبئی لے کر گیا مگر وہاں جا کر زرغونہ بیگم کا موڈ بدل گیا۔ ایک دن وہ چپکے سے ٹرین میں بیٹھ کر راولپنڈی چلی آئی اور اس کے بعد اس کا سراغ نہیں لگا۔ یہ پاکستان بننے سے دو سال پہلے کی بات ہے۔ اس کا باپ اسے پاگلوں کی طرح تلاش کرتا ہوا مر گیا۔ کئی سال بعد اس کا سراغ میاں ارمان علی شاہ کی حویلی میں لگا اور یہاں وہ بیگم کی طرح پورے اختیارات کے ساتھ رہ رہی تھی۔ پولیس کو یہ ساری معلومات اتفاق سے زرغونہ بیگم کی ایک سابق سہیلی اور تھیٹر کی ساتھی خاتون کے توسط سے حاصل ہوئیں جو اس کے بچپن اور جوانی کی عینی گواہ تھی۔ بعد میں وہ جب زبوں حالی کا شکار تھی تو اتفاق سے اس کا زرغونہ بیگم سے سامنا ہوا اور اس نے اپنی سہیلی کو ریاست پور بلوا لیا۔ اسے یہاں گھر دلوایا اور وہی اس کی کفالت کرتی تھی۔ مگر وہ بھی نہیں جانتی تھی کہ زرغونہ بیگم بمبئی

سے اچانک کیوں یہاں چلی آئی اور پھر وہ میاں ارمان کی حویلی میں کیسے پہنچی؟ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ یہاں کس حیثیت سے رہ رہی تھی۔ اس کی سہیلی کا نام نادیا امبر ہے اور وہ کرپچن ہے۔

''وہ کس سن میں بمبئی سے یہاں آئی تھی؟'' شامی نے سوال کیا اور جب شاہنواز نے جواب دیا تو اس نے معنی خیز انداز میں تیمور کی طرف دیکھا۔ تیمور سمجھ رہا تھا مگر اس نے تاثر دینے کے بجائے شاہنواز سے پوچھا۔

''چلو ایک معما تو حل ہوا۔ اس کے باوجود اسے کسی نے قتل کیا اور اس کے لیے دادا جان کا پستول چرا کر استعمال کیا گیا۔''

''جلد چور کا سراغ مل جائے گا۔'' شامی نے کہا۔ ''اس کے بعد معلوم کرنا مشکل نہیں ہوگا کہ اسے کس نے اس کام کے لیے استعمال کیا۔''

''اگر ایسا ہو جائے تو ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔'' شاہنواز نے کہا۔ ''میں صاف گوئی سے کہوں گا فی الحال ہمارے پاس امکانی قاتل کے بارے میں کوئی کلیو نہیں ہے۔''

''اگر کلیو نہیں ملا تو...؟''

شامی کے اس سوال پر شاہنواز سنجیدہ ہو گیا۔ ''تب میں صرف یہ کرسکوں گا کہ تفتیش سے خود کو الگ کرلوں اور اس کے لیے میرے پاس معقول جواز ہے۔''

''اس کے برعکس ہم چاہیں گے کہ تم کیس سے منسلک رہو۔'' تیمور نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ہمیں تم پر اعتبار ہے کہ تم اپنی سی پوری کوشش کرو گے۔''

شامی نے شاہنواز کے جانے کے بعد تیمور سے پوچھا۔ ''کیا یہ واقعی پوری کوشش کرے گا؟''

''کہنے میں کیا حرج ہے۔'' تیمور نے شانے اچکائے۔ ''انگریز کہتے ہیں نا کہ وہ شیطان بہتر ہے جسے آپ جانتے ہوں بہ نسبت اس شیطان کے جس سے آپ ناواقف ہوں۔''

''اب ہمیں کس سے ملنا ہے؟''

''ظاہر ہے وکیل شفیق احمد سے۔''

''اس کے برعکس میرا خیال ہے ہمیں نادیا امبر سے ملنا چاہیے۔''

☆☆☆

نادیا امبر ریاست پور کے نزدیک عام آبادی والے گاؤں کے ایک الگ تھلگ گھر میں رہتی تھی۔ وہ عام فرد تھی اس لیے ریاست پور کے ان لکھے قانون کے مطابق وہاں نہیں رہ سکتی تھی۔ مکان چھوٹا سا مگر پختہ تھا اور خوب صورت بنا ہوا تھا۔ اس کے سامنے چھوٹا سا احاطہ تھا اور اس پر لوہے کا جالی والا گیٹ لگا ہوا تھا۔ اندر ایک چھوٹا درخت لگا ہوا تھا جس پر سرخ پھول آئے ہوئے تھے اور کچھ پھولدار بیلیں جو دیواروں پر چڑھ رہی تھیں۔ شامی نے کال بیل بجائی اور اندر بیل بجنے کی آواز بھی آئی۔ مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ شامی نے ذرا توقف کے بعد دوبارہ بیل بجائی۔ اس دوران میں تیمور گیٹ کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس کا جالی دار ڈیزائن ایسا تھا کہ اس کے خلا سے اندر کا منظر واضح نظر نہیں آتا تھا۔ تیمور دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے لگا کوئی مکان کے اندر سے نکل کر تیزی سے عقبی سمت گیا ہے۔ مکان کے ایک طرف تنگ سی گلی تھی۔ جانے والا اسی میں گم گیا تھا۔ تیمور نے شامی کو آگاہ کیا۔ ''اندر کوئی ہے اور وہ بغلی گلی میں گیا ہے۔''

''حالانکہ اسے گیٹ کھولنا چاہیے تھا۔'' شامی نے کہتے ہوئے گیٹ کا چھوٹا دروازہ چیک کیا تو وہ ہاتھ لگاتے ہی کھل گیا۔ ''یہ کھلا ہوا ہے۔''

تیمور نے اندر جھانکا اور پھر وہ اندر داخل ہو گیا، شامی اس کے پیچھے تھا۔ تیمور بغلی گلی کی طرف بڑھا اور اس نے شامی کو اشارے سے مکان کے اندر دیکھنے کو کہا۔ بغلی گلی میں آتے ہی اسے عقبی صحن میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اور اس بار وہ تیزی سے لیکن دبے قدموں بڑھا اس کے باوجود وہ اس کی صرف ایک جھلک دیکھ سکا۔ پینٹ اور شرٹ میں ملبوس وہ شخص دیوار سے چھلانگ لگا چکا تھا۔ دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔ تیمور دوڑا اور دونوں ہاتھ سرے پر ٹکاتے ہوئے خود کو بلند کیا مگر جب باہر دیکھا تو اسے مایوسی ہوئی کیونکہ عقب میں گھنی جھاڑیاں تھیں اور ان میں کسی کو تلاش کرنا بھوسے میں سوئی تلاش کرنے کے مترادف تھا۔ پھر بھی اس نے نظر دوڑائی اور فرار ہونے والے کی ایک جھلک بھی نہ پا کر مایوس واپس آیا۔ شامی اس دوران میں مکان کے اندر داخل ہو کر اس بوڑھی عورت کی لاش کے پاس کھڑا تھا۔ جس کے سر کے تمام بال مکمل سفید ہو چکے تھے اور اس کا چہرہ جھریوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کی عمر کسی طرح بھی اسی سال سے کم نہیں تھی۔ کچن میں استعمال ہونے والی چھری دستے تک اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر دھنسی ہوئی تھی۔ تیمور نے سوالیہ نظروں سے شامی کی طرف دیکھا۔

''نادیا امبر؟''

شامی نے شانے اچکائے۔ ''میرا خیال ہے۔''

''وہ اسے قتل کر کے فرار ہو گیا۔''
''تم نے اسے دیکھا؟'' شامی نے پوچھا۔
''صرف ایک جھلک۔'' تیمور نے کہا۔ ''وہ چھوٹے قد اور متوسط جسامت کا شخص لگ رہا تھا۔ اس کی پھرتی قابلِ دید تھی۔''
شامی نے چیزوں کو زیادہ چھیڑے بغیر مکان کی تلاشی لی اور ایک الماری سے اسے ایک سالخوردہ البم ملا جس میں بلیک اینڈ وائٹ تصاویر تھیں اور ان میں سے کچھ میں مردہ عورت کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ جوانی میں وہ بلاشبہ نہایت حسین تھی۔ مگر عمر اور اس سے زیادہ موت کے کرب نے اس نقوش بگاڑ دیے تھے۔ پس منظر اور دوسرے افراد کی موجودگی بتا رہی تھی کہ یہ سب تصاویر نوٹنکی کمپنی کے دور کی ہیں۔ ایک تصویر پر وہ چونکے کیونکہ اس میں موجود لڑکی کی شباہت حویلی میں لگی اکتارے والی پینٹنگ کی لڑکی سے مل رہی تھی۔ کیا یہی زرغونہ بیگم تھی۔ عجیب بات تھی کہ انہوں نے اب تک اس کی کوئی تصویر نہیں دیکھی تھی۔ شامی نے یہ تصویر نکال کر باقی البم اسی طرح رکھ دیا۔ ایک چھوٹے سے پرس سے ملنے والے شناختی کارڈ سے ظاہر تھا کہ مقتولہ ہی ناڈیا امبر تھی۔ شامی نے مایوسی سے کہا۔ ''یہ تو بہت غلط ہوا۔''
''نہیں اس لحاظ سے اچھا ہوا کہ یہ بات اب ثابت ہو گئی ہے کہ دادا جان کے خلاف سازش کی جا رہی ہے۔''
''یہ تو پہلے ہی ثابت ہو چکی ہے۔'' شامی خفگی سے بولا۔ ''یہاں سے تو کچھ نہیں ملا۔''
''یہ ملا ہے۔'' تیمور نے ایک کاغذ کا چھوٹا سا ٹکڑا اس کے سامنے کیا۔ یہ چکنے کاغذ کا..... مشکل سے ایک مربع انچ کا ٹکڑا تھا، اس کے ایک طرف نیلا رنگ تھا اور دوسری طرف سفید رنگ تھا۔ شامی نے اس کا معائنہ کیا۔
''اس میں کیا خاص بات ہے؟''
''کوئی نہیں سوائے اس کے کہ یہ خاتون کی لاش کے پاس زمین پر پڑا ہوا تھا اور مجھے گھر میں کوئی ایسی کتاب، رسالہ یا کاغذ کی چیز نظر نہیں آئی جس کا یہ حصہ ہو سکتا ہے۔''
''تیرا خیال ہے اس کا تعلق قاتل سے ہو سکتا ہے؟''
''ایسا ناممکن نہیں ہے۔'' تیمور نے کہا تو شامی نے ٹکڑا اپنے پرس میں رکھ لیا۔
''ناڈیا امبر یقیناً اس چکر کے بارے میں کچھ جانتی تھی تبھی قاتل نے اس کی زبان بند کر دی۔''
''یہ تو سامنے کی بات ہے۔'' تیمور نے کہا۔ ''میرا خیال ہے ایس پی صاحب کو وقوعے کی اطلاع دینی چاہیے۔''
ریاست پور اور اس کے آس پاس تمام موبائل کمپنیوں کے سگنل آتے تھے۔ شامی نے شاہنواز کو کال کی اور اسے ناڈیا امبر کے قتل کی اطلاع دی تو وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا پھر اس نے کہا۔ ''میں پولیس پارٹی بھیج رہا ہوں تب تک تم دونوں وہیں رکو گے۔''
پولیس پارٹی آدھے گھنٹے میں آگئی۔ اس کی قیادت ایک ایس آئی کر رہا تھا۔ اس نے ان دونوں سے بیانات لیے۔ تیمور نے قاتل کے بارے میں بتایا مگر اس نے اس پر خاص توجہ نہیں دی تھی۔ حد یہ کہ اس نے کسی کو مکان کے عقبی حصے میں بھی نہیں بھیجا کہ وہ جا کر قاتل کا کوئی نشان ہی دیکھ لے۔ یہ کام شامی اور تیمور نے کیا۔ بیان دے کر وہ عقبی حصے میں آئے۔ زمین پر اوپر سے کوٹنے کی وجہ سے جوتوں کے نشانات بہت واضح تھے۔ یہ خاص ڈیزائن کے کریپ سول تھے۔ شامی نے اپنے موبائل کے ہائی ویزلیوشن کیمرے سے ان کی تصاویر لیں۔ واپسی پر وہ مایوس تھے۔ شامی نے کہا۔ ''پولیس اس معاملے میں کچھ نہیں کرے گی۔ دادا جان کی جان چھڑانے کے لیے ہمیں خود ہی اصل قاتل تلاش کرنا پڑے گا۔''
''ایسا ہی لگ رہا ہے اور اصل قاتل اتنا ہوشیار ہے کہ اس نے ناڈیا امبر کو بھی بروقت خاموش کر دیا۔'' تیمور نے سرہلایا۔ ''مجھے نہیں لگ رہا وہ ہمارے ہاتھ آئے گا۔''
''آئے گا کیوں نہیں۔'' شامی نے کہا۔ ''اس سے پہلے بھی ہم نے ایسے کتنے کیس حل کیے ہیں۔''
''ان میں باقاعدہ تفتیش نہیں کی گئی تھی۔ وہ سب تو... ایڈونچر تھے۔''
''تو اب تفتیش بھی کر کے دیکھ لیتے ہیں۔'' شامی نے کہا۔ ''تو ذرا دادا جان کو کال کر اور ان سے پستول چرانے والے اور شفیق احمد کا پوچھ، مگر ابھی یہاں کے بارے میں کچھ مت بتانا۔''
''ہمارے پاس بتانے کے لیے ہے ہی کیا۔'' تیمور نے موبائل نکالا۔
''میرا اشارہ زرغونہ بیگم کے پس منظر کی طرف ہے۔''
تیمور نے سرہلایا اور نواب صاحب کو کال کرنے لگا۔ وہ سخت خفا تھے کہ انہوں نے اب تک کچھ نہیں کیا تھا۔ بے چارہ تیمور ان کی سنتا رہ گیا۔ بہ مشکل وہ یہ معلوم کرنے میں

کامیاب ہوا کہ ابھی تک پستول چرانے والے کا سراغ نہیں ملا ہے اور نہ ہی شفیق احمد نے ان سے رابطہ کیا ہے۔ فون بند کر کے تیمور نے ماتھے پر آیا پسینا صاف کیا۔ ''اف دادا جان تو شمشیر برہنہ بنے ہوئے تھے۔''

''حالانکہ قصور اس بڈھرام نظام دین کا ہے جو ایک چور نہیں پکڑ سکتا۔'' شامی نے جل کر کہا۔

''اسے چھوڑ اب ہمیں شفیق احمد سے ملنا ہے، دادا جان کا حکم ہے کہ زرغونہ بیگم کے وصیت نامے کی کاپی حاصل کی جائے۔''

''تب کیا خیال ہے اس کی طرف چلا جائے؟''

''اس کی طرف کیوں چلا جائے؟'' تیمور ابھی تک غصے میں تھا۔ ''وہ حویلی آئے گا۔''

حویلی آ کر انہوں نے خدا بخش کے توسط سے شفیق احمد کو ملاقات کے لیے آنے کو کہا اور یہ بھی کہ وہ وصیت نامہ اور دوسری تمام متعلقہ چیزیں لیتا آئے۔ خدا بخش نے کال کر کے انہیں اطلاع دی۔ ''وکیل صاحب شام پانچ بجے تک آئیں گے۔''

شامی نے کہا۔ ''خدا بخش تم نے اب تک ہمیں زرغونہ بیگم اور میاں ارمان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

تیمور نے تائید کی۔ ''نہ ہی ان کی تصاویر دکھائی ہیں۔''

''میں البم کے ساتھ آتا ہوں۔'' خدا بخش نے کہا اور کچھ دیر بعد وہ چار عدد بھاری بھرکم البم لے آیا۔ سب سے پہلے اس نے میاں ارمان کا خاندانی البم کھولا جو سارے کا سارا بلیک اینڈ وائٹ تھا۔ میاں ارمان کا خاصا بڑا خاندان تھا۔ اس کی بیوی اور چھ بچے تھے مگر آزادی سے پہلے وہ ایک وبا کی نذر ہو گئے۔ وبا اتنی شدید تھی کہ اس نے حویلی کے تمام ہی افراد کو ختم کر دیا تھا۔ میاں ارمان کی زندگی تھی جو بچ گئے۔ اس کے بعد وہ بہت سال اکیلے رہے اور پھر ایک دن اچانک وہ زرغونہ بیگم کو حویلی میں لے آئے اور اوپر کا پورا فلور ان کے لیے مخصوص کر دیا۔ اس سے پہلے وہ خود اوپر رہتے تھے مگر زرغونہ بیگم کے آنے کے بعد وہ خود نیچے رہنے لگے۔ خدا بخش نے کہا۔ ''کم سے کم میں نے اپنی آنکھوں سے انہیں اوپر کی سیڑھیاں چڑھتے نہیں دیکھا۔''

''مگر یہ افواہ بھی ہے کہ زرغونہ بیگم اصل میں ان کی منکوحہ تھیں۔''

خدا بخش مسکرایا۔ ''سرکار آپ اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، کیا آپ نہیں جانتے کہ کسی عورت سے کسی قسم کا تعلق رکھنا کوئی مسئلہ ہی نہیں آپ لوگوں کے لیے۔ اگر میاں صاحب نے زرغونہ بیگم سے شادی کی ہوتی یا ایسے ہی رکھا ہوتا تب بھی ان کے بیڈروم تک جانے سے ان کو کون روک سکتا تھا۔''

''تب اس تعلق کو کیا کہو گے؟''

''میں تو اتنا جانتا ہوں کہ میاں صاحب اور زرغونہ بیگم کے درمیان خلوص اور عزت کا تعلق تھا۔ دونوں ایک دوسرے کا بہت احترام کرتے تھے حالانکہ میاں صاحب عمر میں ان سے بہت بڑے تھے مگر وہ ان کا یوں احترام کرتے تھے جیسے وہ ان سے بڑی ہوں۔''

گفتگو کے دوران خدا بخش البم بھی دکھا رہا تھا۔ میاں ارمان کی بیوی بہت حسین خاتون تھیں اور بچے بھی صورت شکل کے اچھے تھے۔ وہ خود عام صورت شخص تھے۔ مگر دولت نے ان میں نکھار پیدا کر دیا تھا۔ وبا کے وقت ان کے سب سے بڑے بیٹے کی عمر انیس برس تھی اور دو مہینے بعد اس کی شادی تھی۔ میاں ارمان اور ان کے حویلی دونوں ویران ہو گئے تھے۔ پھر جب زرغونہ بیگم آئیں تو حویلی کی رونق کسی قدر بحال ہوئی تھی۔ باقی تین البم گزشتہ پچاس برس سے زیادہ کے ادوار پر مشتمل تھے۔ جب شامی اور تیمور نے زرغونہ بیگم کی پہلی تصویر دیکھی تو وہ حیران رہ گئے تھے۔ اس کے نقوش ہو بہو اوپر والے فلور پر لگی تصویر سے مل رہے تھے۔ اگرچہ اس نے میک اپ اور تیاری کے پرانے طریقے استعمال کیے ہوئے تھے اسی طرح اس کا لباس بھی اس زمانے کے لحاظ سے تھا۔ اس سے ظاہر تھا کہ مصور نے اصل میں تخیل کی مدد سے زرغونہ بیگم کو پینٹنگ میں نئے زمانے کا رنگ و روپ بخشا تھا۔

البم میں کئی تصاویر تقریبات کی بھی تھیں جن میں وہ میاں ارمان کے ساتھ ملک کے مختلف پرانے نامور سیاست دانوں اور اوپری طبقے کے افراد کے ساتھ نظر آ رہی تھی۔ زرغونہ بیگم نے اس زمانے کے لحاظ سے ماڈرن ڈریسنگ بھی کی تھی مگر ساتھ ہی اس نے ایک رکھ رکھاؤ بھی برقرار رکھا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ بے پناہ حسین عورت تھی۔ شامی کا خیال تھا کہ پینٹنگ بنانے والا مصور اچھا سہی لیکن وہ زرغونہ بیگم کو ٹھیک سے پینٹنگ میں منتقل نہیں کر سکا تھا۔ یہاں حقیقت تخیل پر بازی لے گئی تھی۔ آخری البم میں انہیں زرغونہ بیگم کے ساتھ ایک نوجوان مگر عام سے نقوش والی لڑکی دکھائی دی۔ خدا بخش نے تصدیق کی۔ ''یہ سارہ بی بی ہیں۔''

"زرغونہ بیگم سے اس کا کیا رشتہ ہے؟"

"بہ ظاہر کوئی رشتہ نہیں ہے۔" خدابخش نے جواب دیا۔ "آج سے کوئی پچیس سال پہلے یہ تین سال کی تھیں جب زرغونہ بیگم انہیں حویلی میں لائیں۔"

"انہوں نے وضاحت نہیں کی کہ سارہ یہ کون ہے؟"

"کبھی نہیں اور ہم ملازموں کی اتنی جرأت کہاں ہوتی کہ ان سے کچھ پوچھتے۔"

"سارہ سے متعلق کبھی کوئی فرد اس سے ملنے حویلی میں آیا؟"

خدابخش نے نفی میں سر ہلایا۔ "میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"سارہ اس کے بعد یہیں رہی۔ وہ کہیں آتی جاتی تھی۔ میرا مطلب ہے طویل عرصے کے لیے؟"

اس بار خدابخش سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے سر ہلایا۔ "ہاں سارہ بی بی چند ایک بار اسکول کی گرمیوں کی چھٹی میں کہیں گئی تھیں۔ وہ شاید دو یا ڈھائی ہفتے بعد واپس آئی تھیں۔"

شامی اور تیمور البم میں سارہ کی تصاویر دیکھ رہے تھے اور ہر تصویر کے ساتھ تاریخ بھی درج تھی۔ اس کی اولین تصویر آج سے پچیس سال پہلے کی تھی جب وہ تین سال یا اس کے آس پاس تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ اٹھائیس سال یا اس سے ذرا اوپر کی تھی۔ جوان ہونے پر بھی اس میں خاص تبدیلی نہیں آئی تھی اور کم سے کم شامی کو وہ بالکل خوب صورت نہیں لگی تھی۔ اگر وہ زرغونہ بیگم کی اولاد ہوتی تو اس میں اس کی تھوڑی سی شباہت تو آتی۔ میاں ارمان سے اس کا تعلق ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ اس کی پیدائش سے خاصا پہلے میاں ارمان اس دنیا سے گزر چکے تھے۔ شامی نے خدابخش سے زرغونہ بیگم کی معروفیات کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ جاگیر کے معاملات میں خاص دلچسپی نہیں لیتی تھیں اور اسے انہوں نے شفیق احمد پر چھوڑ رکھا تھا۔ وہ جاگیر کو بہت اچھی طرح چلا رہا تھا اور اخراجات اور آمدنی کا مکمل حساب کتاب زرغونہ بیگم کو پیش کرتا رہتا تھا۔ لنچ کے بعد وہ اوپر آئے تو شامی مایوس تھا۔

"صفر جمع صفر برابر صفر۔"

"یار ابھی ہمیں آئے ہوئے دوسرا دن ہی ہوا ہے۔"

شامی نے بڑی سی کھڑکی کے شیشے سے باہر دور تک پھیلے خوب صورت لیکن خاموش اور جامد منظر کو دیکھا۔ "ہاں اور یہ سوچ کر میرا کلیجا منہ کو آرہا ہے کہ مزید نہ جانے کتنے دن یہاں ٹھہرنا پڑے۔"

"کم سے کم جب تک دادا جان کی بریت نہیں ہو جاتی۔"

شامی نے ٹھنڈی سانس لی۔ "نہ جانے کیوں مجھے یہ جگہ دوسرا چمن پور لگ رہی ہے۔"

"چمن پور میں پھر بھی رونق ہے۔"

"ہاں گھر کی رونق ہے، گھر کے باہر تو ایسا ہی ہے۔" شامی نے کھڑکی سے باہر اشارہ کیا۔ "اگر یہ حویلی اور جاگیر ہمارے پلے پڑ گئی تو ظاہر ہے اس کی دیکھ بھال کے لیے کسی کو تو یہاں آنا پڑے گا۔"

اب تیمور بھی تشویش زدہ ہو گیا۔ "تو ٹھیک کہہ رہا ہے، اس معاملے سے جلد از جلد جان چھڑا لینا ہی بہتر ہوگا۔"

"اس کے لیے اصل قاتل تک پہنچنا ضروری ہے۔" شامی نے کہا۔ "اب مجھے شفیق احمد پر شک ہو رہا ہے۔ آخر اس نے اب تک دادا جان سے رابطہ کیوں نہیں کیا جبکہ زرغونہ بیگم کی موت کے بعد یہ اس کی اولین ذمے داری بنتی تھی۔ اس کے بجائے اس نے پولیس کو بتا دیا کہ دادا جان ہی اس دولت اور جائداد کے وارث ہیں۔"

"اس کی نیت میں خرابی دکھائی دے رہی ہے لیکن حتمی نتیجہ ہم اس سے ملاقات کے بعد ہی نکال سکتے ہیں۔"

شفیق احمد پونے پانچ بجے آ گیا تھا۔ ملازمہ نے اس کی آمد کی اطلاع دی۔ یہ ذرا کمسن اور شوخ سی لڑکی تھی جسے شامی نے رونق قرار دیا تھا۔ شامی لیٹا ہوا اس معاملے پر غور کر رہا تھا کہ کمسن ملازمہ دستک دے کر اندر آئی اور اس نے آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔ "وہ جی وکیل صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔"

شامی کو وکیل سے زیادہ ملازمہ کی کمرے میں آمد پر خوشی ہوئی تھی۔ اس نے ملازمہ سے کہا۔ "اسے انتظار کرنے دو پہلے اپنا نام بتاؤ۔"

"شاداں۔" وہ بولی۔

"شاداں اب ہمارے تمام کام تم کرو گی۔"

"کیوں نہیں سرکار۔" وہ مستعدی سے بولی۔

ابھی شامی بات آگے بڑھانے کا سوچ رہا تھا کہ تیمور نے کمرے میں جھانکا اور معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "کیا خیال ہے وکیل سے نہ مل لیا جائے۔"

شامی بادلِ ناخواستہ حرکت میں آیا تھا ورنہ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا اور وہ دل ہی دل میں وکیل کو کوستا رہا تھا۔

پھر اسے خیال آیا کہ اگر وکیل نہ آتا تو شاداں بھی اس کے کمرے میں نہ آتی۔ شفیق احمد مرکزی نشست گاہ میں ان کا منتظر تھا۔ اس نے خاصی گرمی میں بھی تھری پیس سوٹ پہنا ہوا تھا۔ ٹائی نے قمیص کا کالر پوری طرح جکڑ رکھا تھا۔ وہ تقریباً ستر کے آس پاس کا دبلا پتلا اور چہرے سے چالاک نظر آنے والا شخص تھا۔ انہیں دیکھتے ہی اس کے چہرے پر مخصوص مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ یہ خوشامد اور چاپلوسی میں لتھڑی ہوئی مسکراہٹ تھی۔ اس نے عجلت میں اٹھ کر ان سے ہاتھ ملایا اور یوں ان کے سامنے جھکا جا رہا تھا جیسے ان کا معمولی خدمت گار ہو۔ ایسے لوگوں کے بارے میں شامی کی رائے بھی کہ وہ موقع ملنے پر یونہی جھکے جھکے آپ کی ٹانگ کھینچ لیتے ہیں۔ تعارف اور رسمی باتوں کے بعد اس نے سب سے پہلے معذرت کی۔ ''طبیعت خرابی کی وجہ سے میں نواب صاحب کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔''

شامی نے دل ہی دل میں اس کی چالاکی کو داد دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ ایک کال کر کے اطلاع تو دے سکتے تھے۔''

''جیسے پولیس کو اطلاع دی۔'' تیمور نے کہا تو اس کے چہرے کا رنگ بدلا تھا مگر اس نے زیادہ اثر لیے بغیر کہا۔

''یہ قانونی معاملات ہیں، فون پر میں نے ان کا ذکر مناسب نہیں سمجھا۔ بہرحال میں کل ہی نواب صاحب کی طرف جا رہا ہوں۔''

''کس سلسلے میں؟''

''وصیت کے سلسلے میں۔'' اس نے حیران ہو کر کہا۔ ''آخر نواب صاحب ہی اب زرغونہ بیگم کی تمام دولت اور جائداد کے وارث ہیں۔''

''جب زرغونہ بیگم نے وصیت نامہ مرتب کیا تو آپ سے مشورہ بھی کیا ہوگا؟''

تیمور کے اس سوال پر شفیق احمد چوکنا ہو گیا۔ ''نہیں جناب، یہ بیگم صاحبہ کا اپنا فیصلہ تھا۔ انہوں نے کسی قسم کا مشورہ نہیں کیا اور مجھے نواب صاحب کے حق میں وصیت نامہ تیار کرنے کا حکم دیا۔''

''آپ کو وصیت نامہ یا اس کی کاپی ساتھ لانے کو کہا تھا؟''

''میں معذرت خواہ ہوں، وصیت نامہ صرف نواب صاحب کو پیش کیا جا سکتا ہے۔''

''او کے، لیکن آپ کچھ بتا تو سکتے ہیں کہ وصیت نامے میں کوئی مخصوص شرط رکھی گئی ہے یا نہیں؟''

اس بار اس نے جواب دیا۔ ''وصیت نامہ بہت سادہ ہے۔ بیگم صاحبہ نے اپنی تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائداد و دولت، بنا کسی شرط کے نواب صاحب کے نام کی ہے اور وہ بیگم صاحبہ کی موت کے فوراً بعد ان کے وارث ہو چکے ہیں۔''

''کوئی ایسا فرد جو اس وصیت کو چیلنج کر سکے؟''

شفیق احمد نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میرے علم میں زرغونہ بیگم کا کوئی ایسا رشتے دار نہیں ہے جو اس وصیت کو چیلنج کر سکے۔ ہاں اگر کوئی کرنے والا ہو تو میں کہہ نہیں سکتا۔''

''فرض کریں اسے چیلنج کیا جاتا ہے تو وصیت رد ہونے کا امکان ہوگا؟''

''ہو بھی سکتا ہے لیکن چیلنج کرنے والے کو زرغونہ بیگم سے رشتے داری ثابت کرنا ہوگی۔'' شفیق احمد نے جواب دیا۔ ''اگر آپ کا اشارہ ساریہ بی بی کی طرف ہے تو میں بتا دوں ان کا زرغونہ بیگم سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ وہ صرف ان کی پروردہ ہیں۔''

تیمور نے اسے غور سے دیکھا۔ ''آپ زرغونہ بیگم کے قتل کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟''

''یہی کہ انہیں جس پستول سے قتل کیا گیا وہ نواب صاحب کی ملکیت ہے اور ان کے نام پر ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ایس پی صاحب نے جب مجھ سے نواب صاحب کے بارے میں پوچھا تو مجھے بتانا پڑا کہ وہی زرغونہ بیگم کے وارث ہیں اور ان کے حق میں وصیت کی گئی ہے۔''

''آپ نادیا امبر سے واقف ہیں؟'' شامی نے پوچھا۔

''جی زرغونہ بیگم ان کی کفالت کرتی ہیں اور انہوں نے ان کے لیے مجھے الگ سے ایک رقم دی ہے جو میں انہیں ہر مہینے پہنچاتا رہوں گا۔ اس رقم کا زرغونہ بیگم کی باقی دولت اور جائداد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''ساریہ کا کوئی سراغ لگا ہے؟''

''جی ہاں آج ہی مجھے ان کی ای میل آئی ہے کہ وہ پرسوں صبح اسلام آباد پہنچ رہی ہیں۔'' شفیق احمد کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ ''اب مجھے اجازت دیجیے، اسلام آباد جانے سے پہلے مجھے کچھ ضروری کام اور نمٹانے ہیں۔ اس سے پہلے نادیا بیگم کو ان کا وظیفہ پہنچانا ہے۔''

''میرا خیال ہے اب آپ کو مزید زحمت نہیں کرنا ہوگی۔'' شامی بھی کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''نادیا امبر کو چند گھنٹے پہلے اس کے گھر میں اس کے کچن کی چھری سے قتل

کر دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے اب اسے وظیفے کی ضرورت نہیں ہے۔''

اس اطلاع پر شفیق احمد کی باہر نکلی آنکھیں مزید باہر نکل آئی تھیں۔ اس کے جانے کے بعد شامی نے مایوسی سے کہا۔''ایک اور ڈیڈ اینڈ۔''

''مجھے لگ رہا ہے ہمیں واپس گھر جا کر اپنی تفتیش کا آغاز وہاں سے کرنا ہوگا۔'' تیمور نے کہا۔

''ہر گز نہیں۔'' شامی جلدی سے بولا۔''اس وقت دادا جان کا موڈ سخت خراب ہے اور ان سے دور رہنا ہی مناسب ہوگا۔''

''میں خدا بخش سے معلوم کرتا ہوں آس پاس کوئی تفریح گاہ ہے تو ہم وہاں کا چکر لگاتے ہیں۔''

''یہاں زیادہ سے زیادہ شکار کی تفریح ہو سکتی ہے۔'' شامی بولا۔ اس نے اوپر آ کر شاہنواز کو کال کی۔''نادیا امبر کے قتل کی ابتدائی رپورٹ آ گئی ہوگی؟''

''ہاں، ڈاکٹر کے مطابق مزاحمت کا کوئی نشان نہیں ہے یعنی قاتل اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ مرنے کے بعد بھی اس کی آنکھوں میں حیرت کا تاثر باقی تھا۔ باقی یہ کہ زرغونہ بیگم کی طرح یہاں بھی موت فوری واقع ہوئی۔ اسے شاید تیسرا سانس لینے کا موقع بھی نہیں ملا ہوگا۔ قاتل نے ٹھیک دل پر وار کیا تھا۔''

''ہمارا بھی یہی خیال ہے کیونکہ وہاں مزاحمت کے کوئی آثار نہیں تھے۔'' شامی نے کہا اور اسے مختصراً بتایا کہ وہ جب وہاں پہنچے تو انہیں کیا حالات پیش آئے۔ ساتھ ہی اس نے نااہل پولیس والوں کی کارکردگی کے بارے میں بھی بتایا اور کسی قدر تلخ لہجے میں بولا۔''اگر تمہاری تفتیش کا انحصار ان ہی پولیس والوں پر ہے تو اس کیس کا خدا ہی حافظ ہے۔''

''مجبوری ہے۔'' شاہنواز نے کہا۔''یہاں سب اسی قسم کے ہیں۔ کچھ سرکاری مصروفیات ہیں ان سے نمٹ کر میں اس کیس کو خود دیکھتا ہوں۔''

تیمور نہ جانے کہاں تھا۔ شامی شاداں کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ وہ خود آ گئی۔ اس نے شوخ رنگوں پر مشتمل سوٹ پہنا ہوا تھا اور سر کے بال دو چوٹیوں کی صورت میں باندھ کر دوپٹا ذرا بے پروائی سے لیا ہوا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔''سرکار کچھ لاؤں۔''

شامی کا موڈ نہیں تھا اس نے انکار کیا۔''تم کہاں رہتی ہو اور خدا بخش نے تمہارا انتخاب کیوں کیا؟''

''میں جی سبین بی بی کی لے پالک ہوں۔ میرے ماں باپ دریا میں بہہ گئے تھے تب انہوں نے مجھے پالا ہے۔'' اس نے تعارف کرایا اور فخر سے بولی۔''میں نے دس جماعت پڑھی ہیں۔''

لہجے سے وہ پڑھی لکھی اور سمجھدار لگ رہی تھی۔ پہلے شامی کا خیال تھا کہ وہ سولہ سترہ سال کی ہے۔ مگر نزدیک سے دیکھنے اور اس سے بات کرنے کے بعد اس نے خیال میں ترمیم کی۔ وہ کم سے کم اٹھارہ برس کی تھی۔ وہ بہت سادگی سے اپنے بارے میں بتا رہی تھی۔ شامی نے چھیڑنے کے انداز میں اس کی شادی کا پوچھا تو وہ سرخ ہو گئی۔ شرما کر بولی۔''مجھے کیا پتا جی یہ تو بی بی کے سوچنے کی بات ہے۔''

نہ جانے کیسے شامی کے ذہن میں خیال آیا، اس نے کہا۔''تم ساریہ کو جانتی ہو؟''

''ساریہ بی بی...؟'' اس نے کہا۔''لیں انہوں کیوں نہیں جانوں گی۔ وہ تو میری بہت اچھی دوست تھیں۔''

شامی چونکتا ہو گیا۔''دوست تھیں، کیا تم لوگ ایک ساتھ رہے ہو؟''

اس نے سر ہلایا۔''جب سبین بی بی یہاں تھیں تو میں بھی ان کے ساتھ ہی ہوتی تھی۔''

''سبین یہاں کب تھی؟''

شاداں نے انگلیوں پر حساب لگایا۔''دو سال پہلے تک تھیں اور اس سے پہلے وہ سات سال یہاں رہیں۔''

''سات سال سے پہلے کہاں تھیں؟''

''اپنے شوہر کے ساتھ۔'' اس نے جواب دیا۔''وہ اچھا آدمی نہیں ہے اس نے دوسری شادی کی تو سبین بی بی یہاں آ گئیں۔''

''اور اب کہاں ہوتی تھیں؟''

''بڑی بی بی نے ان کو یہاں مکان لے کر دیا ہوا ہے، وہ اس میں رہتی ہیں۔''

یہ ایک اور چونکانے والی اطلاع تھی۔''بڑی بی بی یعنی زرغونہ بیگم؟''

''ہاں وہی؟''

''مگر کیوں جب سبین یہاں رہ سکتی تھی تو...؟'' شامی نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''وہ جی ان کی ساریہ بی بی سے کچھ کھٹ پٹ ہو گئی تھی۔ اس لیے بڑی بی بی نے ان کو الگ کر دیا۔''

''ساریہ کب باہر گئی؟''

شاداں نے ایک بار پھر حساب کے لیے اپنی موٹی انگلیاں استعمال کیں۔''پانچ سال پہلے۔

''جب وہ باہر تھی تو اس کی سیبن سے کیسے کھٹ پٹ ہوئی؟''

''پتا نہیں جی، میری ان سے اچھی دوستی تھی مگر ان کی سیبن بی بی سے کبھی نہیں بنی۔ سار یہ بی بی آتی رہتی تھیں اور پھر بڑی بی بی نے سیبن بی بی کو الگ کر دیا۔ ان دنوں بھی سار یہ بی بی یہاں آئی ہوئی تھیں۔''

''سیبن کا خیال ہے کہ اسے یہاں سے نکلوانے میں سار یہ کا ہاتھ ہے؟''

اس سوال پر شاداں کسی قدر چوکنا ہوئی۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''پتا نہیں جی...''

اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے شامی نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور وہ محجوب نظر آنے لگی۔ مگر شامی نے بہت نرمی سے ہاتھ پکڑا تھا۔ اس نے آہستہ سے اسے سہلاتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا ہاتھ بہت خوب صورت ہے، بالکل تمہاری طرح۔''

شاداں شرم سے لال ہوگئی۔ اس نے ہاتھ ذرا بھی نہیں کھینچا مگر کسمسا کر بولی۔ ''کوئی آجائے گا۔''

''آنے دو۔'' شامی بے پروائی سے بولا۔ اس نے ہاتھ سہلانا جاری رکھا اور شاداں کا سانس تیز چلنے لگا۔ ''سیبن اس کا ذمے دار سار یہ کو سمجھتی ہے۔''

شاداں نے بے ساختہ سر ہلایا۔ ''جی... اور وہ اسے بہت برا بھلا بھی کہتی ہیں۔''

''اسے کہنا بھی چاہیے۔'' شامی کی انگلیاں اب کلائی پر تھیں۔ ''سار یہ بھی اس کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتی ہوگی؟''

''بالکل نہیں جی۔'' شاداں پھر بے ساختہ بولی۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اسے خود پر قابو نہیں رہا ہے اور وہ شامی کے ہاتھوں میں کھیل رہی تھی۔ شامی جیسے گرگِ باراں دیدہ کے سامنے اس الھڑ لڑکی کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ وہ اب فرفر بول رہی تھی اور اس نے چند منٹوں میں سار یہ اور سیبن کے آپس میں اختلافات کا پول کھول دیا۔ سار یہ کے آنے سے پہلے سیبن کی بہت اہمیت تھی مگر جب سار یہ آئی اور ذرا بڑی ہوئی تو اس کی اہمیت زیادہ ہوگئی۔ یہیں سے سیبن اس سے چڑنے لگی تھی۔ اس نے شاداں سے کہا کہ وہ سار یہ سے ملنا جلنا بند کردے۔ مگر وہ سار یہ کو پسند کرتی تھی اس لیے سیبن سے چھپ کر اس سے ملتی رہی۔ پھر وہ سیبن کے ساتھ یہاں سے چلی گئی اور سار یہ سے ملنا جلنا بند ہوگیا۔ شامی نے پوچھا۔

''سار یہ آخری بار یہاں کب آئی تھی؟''

''شاید ایک سال پہلے، مجھے ٹھیک سے پتا نہیں ہے جی۔''

''سیبن زرغونہ بیگم کے بارے میں کیا کہتی تھی؟''

''وہ کہتی تھیں کہ سار یہ نے انہیں بہکایا ہے۔''

شاداں کی بات سے ظاہر تھا کہ سیبن کو زرغونہ بیگم سے بھی شکایت تھی۔

''سار یہ اور زرغونہ بیگم کے تعلقات کیسے تھے؟''

شاداں ہچکچائی تو شامی نے پھر اس کی کلائی سہلانا شروع کر دی۔ اس نے اپنے سوال کو دہرایا نہیں۔ شاداں نے کچھ دیر بعد خود جواب دیا۔ ''جب میں یہاں سے جانے والی تھی تو اچھے نہیں تھے۔ بڑی بی بی کئی کئی دن اپنے کمرے سے نہیں نکلتی تھیں اور سار یہ بی بی ان کے کمرے میں نہیں جاتی تھیں۔''

گویا زرغونہ بیگم اور سار یہ کے تعلقات بھی معمول پر نہیں تھے۔ شامی نے اگلا سوال کیا۔ ''سار یہ کی یہاں کیا حیثیت تھی؟''

شاداں اس کے سوال میں چھپا مفہوم جان گئی، اس نے جواب دیا۔ ''وہ گھر کے فرد کی سی حیثیت رکھتی تھیں۔''

شامی کے خیال میں اس نے کام کی ساری باتیں جان لی تھیں اس لیے اس نے شاداں کا ہاتھ چھوڑ دیا اور بولا۔ ''اب موڈ ہو رہا ہے، ایسا کرو چائے اور ساتھ میں کچھ ہلکا پھلکا لے آؤ۔''

شاداں جو بستر کے کنارے ٹک گئی تھی جھینپ کر اٹھی اور جلدی سے بھاگ گئی۔ اس کے جاتے ہی تیمور اندر آیا۔ ''یہ کیوں رسی تڑوا کر فرار ہونے والی گائے کی طرح بھاگی ہے؟''

''مابدولت نے چائے اور ری فریش منٹ لانے کا حکم دیا ہے۔'' شامی بستر پر دراز ہوگیا۔ ''تو کہاں تھا؟''

''باغ میں اس بڈھے خدا بخش کے ساتھ۔'' تیمور نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''اور تو یہاں مزے کر رہا تھا۔''

''صرف مزے نہیں کیے ہیں۔'' شامی نے کہا اور اسے حاصل ہونے والی معلومات کا خلاصہ سنایا۔ تیمور نے حیرت سے کہا۔

''لڑکی نے سب بتا دیا؟''

''ایسے ہی نہیں بتایا۔'' شامی نے دانت نکالے۔ ''کچھ فنکاری دکھانی پڑی تھی۔''

''کچھ فنکاری میں نے خدا بخش پر بھی آزمائی ہے۔

سب سے پہلے تو اسے آخرت سے پہلے آخری عمر کے مشکل وقت کا احساس دلایا۔ خاص طور سے جب آدمی بے گھر اور بے در ہو جائے۔''

''تیرا کیا خیال ہے وہ کنگلا ہوگا۔ اس نے پچاس سال مزے سے ملازمت کی ہے، تنخواہ تو ساری بچالی ہو گی۔ پھر اس کی بیٹی بھی ہے اسے سہارا دینے کے لیے۔''

''تو ٹھیک کہہ رہا ہے مگر خدا بخش کا اس حویلی سے ایک جذباتی تعلق ہے اور وہ آخری دم تک یہیں رہنا چاہتا ہے۔''

''اوکے میں نے مان لیا۔ اس نے کیا بتایا ہے؟''

''اس کا کہنا ہے کہ زرغونہ بیگم ساریہ سے بیزار ہو گئی تھیں اور اسی وجہ سے انہوں نے اپنا سب کچھ نواب صاحب کے نام چھوڑا ہے۔''

''مگر دادا جان کے پستول سے وفات پا جانا یقیناً اس کا پروگرام نہیں ہوگا۔''

''یار میں سوچ رہا ہوں کہ جب سب کچھ اندر سے بند تھا تو قاتل نے کیسے وار کیا اور پھر پستول یہاں چھوڑ گیا۔ خدا بخش کا کہنا ہے کہ وہ تالا کھول کر اندر آیا تھا اور پولیس کو اطلاع دینے کے بعد اس نے ایک بار پھر تمام دروازے چیک کیے تھے۔ اوپر کی کھڑکیاں بھی اندر سے بند تھیں۔ یعنی قاتل کہیں سے باہر نہیں گیا۔''

شامی نے سر ہلایا۔ ''اس حوالے سے خدا بخش کی گواہی پر اعتبار کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس کے بعد وہ خود پولیس کی نظروں میں مشکوک ہو سکتا تھا۔''

''مگر ہوا نہیں۔''

شاداں چائے اور ری فریش منٹ کے لیے کچھ چیزیں لائی تھی مگر وہ تیمور کو دیکھ کر سنجیدہ رہی اور ان کو چیزیں سرو کرتی رہی۔ اس کے جانے کے بعد شامی نے کہا۔ ''کیا ساریہ یہاں آئے گی؟''

''اب تک ایسی کوئی اطلاع نہیں ملی ہے۔'' تیمور نے کہا۔ ''ساریہ نے صرف شفیق احمد کو اطلاع دی ہے۔''

''میں شاہنواز سے پوچھتا ہوں کہ اس کی کیا پروگریس ہے۔'' شامی نے کہا اور شاہنواز کو کال کی اور رابطہ ہونے پر بولا۔ ''یار شفیق احمد سے بات ہوئی ہے اس کا کہنا ہے کہ ساریہ نے اسے ای میل کر کے واپس آنے کو کہا ہے۔ وہ پرسوں اسلام آباد پہنچ رہی ہے۔''

''تقریباً یہی معلومات مجھے سفارت خانے کے توسط سے ملی ہیں۔ مگر ساریہ سے اب بھی رابطہ نہیں ہے۔''

''نادیا امبر کیس میں پولیس نے کوئی پیش رفت کی؟''

''نہیں۔'' شاہنواز نے توقع کے عین مطابق کہا۔ ''قاتل نے بہت قوت سے وار کیا تھا۔ چھری کند ہونے کے باوجود اس کے دل میں دستے تک اتر گئی تھی۔''

''کسی نے مبینہ قاتل کو آتے جاتے نہیں دیکھا۔''

''تم خود یہاں کی پولیس کی تعریف کر چکے ہو، اب ان سے کیا توقع رکھتے ہو۔'' شاہنواز نے بیزاری سے کہا۔ ''کل تک میں فارغ ہو جاؤں گا اس کے بعد خود دیکھوں گا۔''

''اوکے پھر کل بات کریں گے۔'' شامی نے کال کاٹ دی اور ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کیا۔ اس کے پسندیدہ ڈرامے کی قسط نشر مکرر ہو رہی تھی۔ تیمور کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

آنے والے دو دن نہایت بور گزرے۔ کرنے کو کچھ نہیں تھا۔ کوئی ملنے بھی نہیں آیا تھا۔ شاداں اب شامی کے آس پاس اتنا زیادہ منڈلانے لگی تھی کہ وہ بور ہونے لگا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کسی نہ کسی بہانے حاضر ہو جاتی تھی اور شامی کو اس سے بات کرنا پڑتی تھی۔ وہ اپنے طور پر اندر کی باتیں اسے گوش گزار کرتی تھی مگر شامی کو اب ان باتوں میں دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ جلد از جلد یہ معاملہ ختم ہو اور وہ واپس جا سکے۔ اب اسے اپنا دفتر یاد آنے لگا تھا اور حد یہ کہ اس کی انچارج میڈم بھی شامی کو یاد آ رہی تھی جس کی موجودگی بھی شامی کی نازک مزاجی پر گراں گزرتی تھی۔ بات ساری یہ تھی کہ اب اس کا یہاں دل نہیں لگ رہا تھا اور اگلے دن ناشتے کی میز پر وہ دل جمعی سے کلیجی کا ناشتا کرتے تیمور کا سر کھا رہا تھا۔ اس نے کوئی تیسری بار کہا۔

''اب میں یہاں نہیں رک سکتا۔''

''تو واپس چلا جا اور دادا جان کا سامنا کر۔''

''یہی تو مشکل ہے۔'' شامی نے میز پر مکا مارا۔ اس پر شاداں دوڑی آئی۔

''جی سرکار۔''

''کچھ نہیں۔'' شامی غرا کر بولا تو وہ جتنی تیزی سے آئی تھی اتنی ہی تیزی سے واپس چلی گئی۔

''تو اوور ہو رہا ہے۔'' تیمور نے اسے ٹوکا۔

''ہاں یہاں کے ماحول نے مجھے بیزار کر دیا ہے۔'' شامی نے ٹھنڈا ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں تو سوچ رہا ہوں چنن پور چلا جاؤں۔''

''میرا مشورہ بھی یہی ہے۔ اس کے بعد تیرا یہاں دل لگے گا۔'' تیمور نے کہا۔ ''میرا ارادہ شکار کا ہے۔''

شامی اچھل پڑا۔ ''شکار... یہاں کہاں؟''

''ادھر پہاڑیوں میں چکور ملتا ہے۔ شاید تیتر بھی ہاتھ لگ جائے۔ رائفل تو ہمارے پاس ہے۔''

''چکور کے شکار پر تو شاید پابندی ہے۔''

''اس سے شکار کا مزہ دوگنا ہو جائے گا۔''

ائرگن وہ ہمیشہ رکھتے تھے۔ اس بار بھی تیمور نے روانہ ہوتے ہوئے ائرگن ساتھ لے لی تھیں۔ شامی خوش ہو گیا۔ ''غیر قانونی سہی مگر بوریت تو کم ہو گی۔ کب چلنا ہے؟''

''شام میں، آج کل چاندنی ہے۔ چکور رات میں نکلتے ہیں۔''

''سرکاری جنگل ہے یا عام لوگوں کی زمین ہے۔''

''خدا بخش کا کہنا ہے کہ سرکاری جنگل ہے مگر کسی نے وہاں بھی قبضہ کر رکھا ہو تو الگ بات ہے۔''

وہ شام کے وقت روانہ ہوئے۔ سیمن نے ان کے لیے کھانا تیار کر دیا تھا کیونکہ ان کی واپسی اب صبح کے قریب ہی ہوتی۔ تاریکی چھانے تک وہ اس پہاڑی جنگل تک پہنچ گئے تھے جس میں درخت موجود تھے اور شامی کو حیرت ہوئی کہ اب تک کیسے موجود تھے۔ کیونکہ ٹمبر مافیا نے جنگل کے جنگل محکمۂ جنگلات کے اہلکاروں کے تعاون سے کاٹ ڈالے تھے۔ آس پاس آبادی نہیں تھی۔ اس کا سبب یہاں پانی کی نایابی تھی۔ زیرِ زمین چٹانوں کی اتنی موٹی تہ تھی جس کے پار سوراخ کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے یہاں بس چند ایک گھروں پر مشتمل چھوٹے گاؤں تھے جن کی ضروریات بارش سے بھرنے والے تالابوں سے پوری ہو جاتی تھی۔ یہ زیادہ تر چرواہے تھے۔ ایک جگہ انہوں نے چکور کی بیٹ بڑی مقدار میں پائی۔ یعنی رات یہاں چکور آتے تھے۔ انہوں نے اسی جگہ ڈیرا جما لیا۔ کھانا کھا کر وہ آرام کرنے لگے۔ چکور تو نصف رات کے بعد ہی آتے۔ وہ زرغونہ بیگم کیس پر بات کر رہے تھے۔ شامی نے کہا۔

''پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ ہم کسی معاملے میں اتنے تنگ ہوئے ہوں۔''

''بات تنگ ہونے کی نہیں بندھ جانے کی ہے۔ ورنہ اس سے پہلے کئی مشکل مرحلے آئے۔ ہماری جان تک خطرے میں پڑ گئی لیکن وہاں ہم مجبور نہیں تھے کہ یہ کام کرنا ہی ہے۔''

شامی اب نادم تھا۔ ''مجھے اپنے جذباتی پن پر افسوس ہو رہا ہے۔ مجھے دادا جان کا خیال بھی نہیں آیا۔''

''ایسا ہوتا ہے یار۔'' تیمور نے اسے تسلی دی۔ ''اسی لیے میں نے شکار کا پروگرام بنایا ہے کہ کچھ تبدیلی آئے گی۔''

''تبدیلی آگئی ہے۔'' شامی بولا۔ اس نے تھرماس سے چائے نکالی۔ یہاں رات سرد تھی اور ایسے میں چائے اچھی لگ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اونگھنے لگے اور نصف رات کے قریب ہوشیار ہو گئے۔ انہوں نے روشنی بجھا کر رائفلیں سنبھال لیں اور خود ساکت اور خاموش ہو گئے۔ چکور دن بھر درختوں پر آرام کرنے کے بعد چگنے کے لیے نیچے آتے اور تب وہ ان کا شکار کر سکتے تھے۔ صبح تک انہوں نے نصف درجن چکور شکار کر لیے تھے اور شامی کا اسکور چار رہا تھا اس لیے وہ بہت خوش تھا۔ تمام ہی چکور خاصے وزنی اور جوان تھے۔ جوان چکور کا گوشت لذیذ ہوتا ہے۔ اس کے چوزے اور بوڑھے ہو جانے والے چکور کے گوشت میں لذت نہیں ہوتی۔ انہوں نے فوری واپسی کی راہ لی اور حویلی پہنچ کر چکور خدا بخش کے سپرد کیے کہ وہ انہیں صاف کر کے فریج میں رکھ دے۔ گیٹ خدا بخش نے کھولا تھا اور جب وہ اندر جانے لگے تو اس نے اطلاع دی۔

''سار یہ بی بی آگئی ہیں۔''

شامی نے پوچھا۔ ''کب آئی؟''

''آپ کی روانگی کے آدھے گھنٹے بعد آئی تھیں۔ ان کی فلائٹ لیٹ ہوئی تھی۔''

''چلو صبح ملیں گے۔'' شامی نے کہا۔ اس وقت چھ بج رہے تھے اور روشنی ہو رہی تھی۔ شامی بستر پر گرا اور بے خبر سو گیا۔ اس کی آنکھ کھلی تو گیارہ بج رہے تھے اگرچہ اس کی کسلمندی دور نہیں ہوئی تھی مگر اس نے مناسب سمجھا کہ اٹھ جائے۔ پہلے گرم اور پھر سرد پانی سے غسل کر کے وہ تازہ دم ہو گیا تھا۔ وہ نیچے آیا تو تیمور پہلے ہی ناشتے کی میز پر تھا اور گرما گرم پراٹھوں کے ساتھ بھنے چکور کا لطف اٹھا رہا تھا۔ خود شامی کا بھوک سے برا حال تھا اس لیے وہ فوری ناشتے میں شریک ہو گیا۔ سیمن پراٹھے بنا رہی تھی اور شاداں لا رہی تھی مگر اس کے اگلے پھیرے سے پہلے پراٹھے غائب ہو چکے ہوتے تھے۔ کوئی تیسرے پراٹھے کے بعد شامی کو ہوش آیا تو اس نے میز کے دوسرے سرے پر اخبار دیکھتی اور کافی پیتی سار یہ کو پایا۔ اس سے پہلے اسے خیال نہیں تھا کہ ناشتے کی میز پر تیمور کے سوا بھی کوئی ہے۔ اس نے خفیف ہو

کر کہا۔ ''ہیلو... سوری میں نے دیکھا نہیں۔''
سارہ ہلکے سے مسکرائی..... ''کوئی بات نہیں۔''
سامنے سے دیکھنے میں وہ اب اتنی عام سی بھی نہیں لگی تھی جتنی کہ تصویروں میں دکھائی دیتی تھی، اس نے بال گولڈن براؤن ڈائی کیے ہوئے تھے جو اس کی سلونی رنگت پر جچ رہے تھے۔ اس نے سلیقے سے لیکن ہلکا میک اپ کر رکھا تھا۔ لباس البتہ مغربی تھا۔ اسکن فٹ جینز کے ساتھ اس نے چست شرٹ پہن رکھی تھی اور اس کے اوپری دو بٹن کھلے ہوئے تھے۔ ناشتا مکمل کر کے شامی اس کے پاس چلا آیا۔ اس نے بے تکلفی سے کہا۔ ''سفر کیسا گزرا؟''
''بور، پہلے روانگی میں دیر ہوئی اور پھر یہاں چیک آؤٹ میں بہت وقت لگا۔''
''ہمارے ہاں تو معمول ہے۔'' شامی نے تائید کی۔ ''تمہیں زرغونہ بیگم کی وفات کی اطلاع مل گئی تھی؟''
''خاصی دیر سے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اصل میں میرے سیل نمبر میں مسئلہ آیا تھا تو یہ بند تھا اور ان دنوں مصروف اتنی تھی کہ اپنی ای میل تک چیک نہ کر سکی۔ ای میل سے مجھے پتا چلا کہ ان کا مرڈر ہو گیا ہے۔''
''شفیق احمد نے تمہیں ای میل کی تھی۔ کیا اس سے تمہاری ملاقات ہوئی ہے؟''
''میری ابھی کسی سے ملاقات یا بات نہیں ہوئی ہے۔''
''تم مڈل ایسٹ میں کیا کرتی ہو؟''
''میں بیوٹی کنسلٹنٹ ہوں۔ میرے اپنے بھی بیوٹی سیلون ہیں اور میں دوسرے سیلون کے لیے بھی کام کرتی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''خدا بخش نے نواب صاحب اور آپ لوگوں کے بارے میں بتایا ہے۔''
اس گفتگو کے دوران شامی نے محسوس کیا کہ اسے زرغونہ بیگم کی وفات کا کوئی افسوس نہیں تھا۔ اس نے اسے کریدنے کی خاطر خود سے ذکر کیا۔ ''اگرچہ میں زرغونہ بیگم سے ذاتی طور پر واقف نہیں تھا لیکن مجھے ان کی وفات کا افسوس ہوا ہے۔''
سارہ نے سر ہلایا۔ ''افسوسناک بات تو ہے۔ نہ جانے کس نے ان کا مرڈر کیا جبکہ وہ خود زیادہ عرصے زندہ رہنے والی نہیں تھیں۔''
شامی چونکا۔ ''کیا مطلب! وہ بیمار تھیں؟''
سارہ نے سر ہلایا۔ ''ان کا جگر جواب دے گیا تھا زندہ رہنے کی واحد صورت ٹرانسپلانٹ تھا مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ ڈاکٹرز نے انہیں تین مہینے دیے تھے۔''
''لیکن یہ بات نہ پولیس کے علم میں ہے اور نہ کسی اور کے۔''
''انہوں نے اسے چھپایا تھا۔ صرف میں جانتی ہوں یا ان کے ڈاکٹر منیر انصاری جانتے ہیں۔ ان کی ساری رپورٹس ان کے پاس ہوں گی۔''
شامی نے فوراً تیمور کو شریک معلومات کیا۔ سارہ کا کہنا تھا کہ اسے اب تک زرغونہ بیگم کے قتل کے بارے میں کوئی خاص معلومات نہیں ہیں۔ شامی نے اسے تفصیلات سے آگاہ کیا۔ وہ حیران ہوئی۔ ''میرے خدا اتنی پُر اسراریت ہے اس قتل میں؟''
''قاتل نے اگر کھڑکی کے باہر سے فائر کیا تب بھی پستول اندر پھینکنے کی کیا تک تھی؟'' شامی نے کہا۔ ''یہ تو سیدھا خود کو قاتل کے طور پر پیش کرنے والی بات ہوئی۔''
سارہ نے ان کی طرف دیکھا۔ ''میرے علم میں آیا ہے کہ پستول نواب صاحب کا ہے اور اس پر ان کی انگلیوں کے نشانات موجود ہیں؟''
''یہ درست ہے لیکن دادا جان اس دوران میں وقار ولا سے نہیں نکلے اور اس کے متعدد گواہ بھی ہیں۔ خاص طور سے جس رات زرغونہ بیگم کا قتل ہوا اس رات دادا جان کی طبیعت خراب تھی اور رات تین بجے ان کے ذاتی معالج ان کو دیکھنے آئے تھے۔''
شامی کی اس بات پر تیمور نے چونک کر اسے دیکھا مگر کچھ کہا نہیں، اس کے برعکس شامی غور سے سارہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''یہ بات تو میری سمجھ میں بھی نہیں آئی کہ نواب صاحب جیسے مرتبے کے آدمی کو یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''
''تم جانتی ہو کہ زرغونہ بیگم نے اپنی ساری دولت اور جائداد دادا جان کے نام کیوں کی؟''
اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں تو نواب صاحب سے ہی ناواقف تھی اور نہ ہی مجھے علم تھا کہ یہ جائداد اور دولت ان کے نام وصیت کر دی گئی ہے۔''
سین کچن سے نمٹ کر آئی تھی اور اس نے سارہ کو نظر انداز کرتے ہوئے ان دونوں سے کہا۔ ''میں ذرا جا رہی ہوں۔ لنچ کس وقت کرنا پسند کریں گے؟''
''میرا لنچ کا ارادہ نہیں ہے۔'' شامی نے کہا اور تیمور نے اس کی تائید کی۔
''ٹھیک ہے پھر میں ذرا دیر سے آؤں گی۔''

شامی نے سبین کے جانے کے بعد سارہ کو دیکھا جو منہ بنائے بیٹھی تھی۔ ''لگتا ہے تم دونوں ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے ہو؟''

''ہاں کیونکہ میرے آنے کے بعد زرغونہ بیگم نے ان کے ہاتھوں بے وقوف بنتا بند کر دیا تھا۔''

''تمہارا اشارہ مالی معاملات کی طرف ہے؟''

سارہ نے سر ہلایا۔ ''ان لوگوں نے بہت رقم حاصل کی ہے۔ حد یہ کہ زرغونہ بیگم نے سبین کے شوہر کو شیف کا مہنگا کورس کرایا اور آج وہ فائیو اسٹار شیف ہے۔ سبین کو یہاں مکان لے کر دیا۔''

''لیکن سنا ہے اس شیف نے دوسری شادی کر لی ہے اور سبین اس سے الگ ہو گئی ہے۔''

سارہ نے منہ بنایا۔ ''یہ سب ہی مفاد پرست لوگ ہیں۔ اس کا مفاد نکل گیا تو اس نے سبین کو بھی دھوکا دے دیا۔''

''تمہارا زرغونہ بیگم سے کیا تعلق ہے؟''

''کوئی تعلق نہیں ہے۔'' اس نے نارمل لہجے میں جواب دیا۔ ''انہوں نے صرف مجھے پالا اور اس قابل بنایا کہ میں اپنے طور پر زندگی گزار سکوں۔''

''لیکن تمہارا ایک گراؤنڈ تو ہوگا؟''

''اگر میرا کوئی بیک گراؤنڈ ہے تو میں اس سے ناواقف ہوں۔'' اس نے کسی قدر استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''میں صرف تین سال کی تھی جب میں یہاں آئی اور مجھے قطعی یاد نہیں ہے۔''

''زرغونہ بیگم نے بھی اس بارے میں کچھ نہیں بتایا؟''

''نہیں۔'' اس نے شامی کو غور سے دیکھا۔ ''بائی دی وے تم اتنی انکوائری کیوں کر رہے ہو؟''

شامی ذرا آگے جھکا۔ ''مس سارہ... بات یہ ہے کہ اس سارے معاملے سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ داداجان کی زرغونہ بیگم سے واقفیت ہے لیکن ان کی آخری ملاقات پچاس سال پہلے ہوئی تھی اور اب پتا چلا کہ وہ اپنا سب کچھ داداجان کے نام کر کے فوت ہو چکی ہیں۔ اگر یہ فوتگی قدرتی ہوتی تب بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مگر انہیں داداجان کے پستول سے قتل کیا گیا اور پستول جائے واردات پر پایا گیا۔ یہ تو طے ہے کہ قتل داداجان نے نہیں کیا۔ مگر کسی نے تو یہ قتل کیا ہے؟''

سارہ چونکی تھی۔ ''تم مجھ پر شک کر رہے ہو؟''

''کیا نہیں کرنا چاہیے؟'' شامی نے الٹا سوال کیا۔ ''تم زرغونہ بیگم کی پروردہ ہو اور فطری طور پر خود کو ان کا وارث سمجھتی ہو گی مگر جب تمہیں پتا چلا کہ انہوں نے سب کچھ داداجان کے نام کر دیا ہے تو...''

''اوہ شٹ۔'' وہ شامی کی بات کاٹ کر بولی۔ ''مجھے ایسا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی میں نے کبھی زرغونہ بیگم کی دولت اور جائداد کے بارے میں سوچا۔ میرا مڈل ایسٹ میں بہت اچھا سیٹ اپ ہے اور میں اپنی مالی حالت سے بالکل مطمئن ہوں۔''

''تمہارا کہنا درست ہو سکتا ہے لیکن بدقسمتی سے واقعات بتاتے ہیں کہ اس قتل کے پس پشت دولت اور جائداد ہی ہے۔''

سارہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''فرض کرو اگر میں نے ایسا کیا بھی ہے۔ تب بھی مجھے کیا فائدہ ہوا۔ جائداد و دولت کی وارث میں کسی صورت نہیں بن سکتی۔ دوسرے اگر مجھے زرغونہ بیگم پر غصہ ہوتا تو انہیں قتل کرنا بے سود تھا کیونکہ ان کی زندگی چند مہینے کی رہ گئی تھی۔ پھر قتل بھی اس طرح ہے کہ نواب صاحب کا پستول چرا کر اس سے زرغونہ بیگم کو قتل کیا جائے اور پستول مع ان کی انگلیوں کے جائے وقوع پر چھوڑ دیا جائے۔ سب سے بڑھ کر میں بیرونِ ملک ہوتے ہوئے یہ سب کیسے کر سکتی ہوں؟''

''تمہارے پاس ثبوت تو ہو گا کہ تم وہاں سے ایگزٹ نہیں ہوئی تھیں۔''

سارہ نے اپنا پرس کھولا اور اس میں سے اپنا پاسپورٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''تم چیک کر سکتے ہو اور چاہو تو پاسپورٹ نمبر کے ساتھ آن لائن ایک درخواست دے کر چیک بھی کر سکتے ہو۔''

شامی نے پاسپورٹ لیا اور دیکھا تو اس کے مطابق سارہ آخری بار تقریباً دو مہینے پہلے یہاں آئی تھی اور اس کے بعد اب آئی تھی۔ اس نے آگے جھکتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت میں ان کی بیماری کی وجہ سے آئی تھی۔''

شامی نظریں چرانے پر مجبور ہو گیا۔ وہ بہت خوب صورت نہیں تھی۔ مگر اس میں نسوانیت کی کمی نہیں تھی۔ شامی نے پوچھا۔ ''سوال یہ ہے کہ زرغونہ بیگم کی بیماری کا ان کے وکیل یا کسی اور فرد کو علم کیوں نہیں ہے۔ حد یہ کہ سبین اور خدا بخش کو بھی علم نہیں ہے۔''

''کیونکہ انہوں نے سوائے میرے کسی کو نہ بتانے کا

فیصلہ کیا تھا۔''

یہ نئی صورتِ حال سامنے آئی تھی۔ شامی نے خدا بخش سے ڈاکٹر انصاری کا پوچھا۔ اس نے ڈاکٹر کا نمبر دیا۔ زرغونہ بیگم کا حوالہ آتے ہی ڈاکٹر منیر انصاری کا روکھا لہجہ مناسب ہوگیا۔ اس نے شامی سے کہا۔ ''فرمایئے میں آپ کے لیے کیا کرسکتا ہوں؟''

''زرغونہ بیگم آپ سے علاج کراتی تھیں۔ انہوں نے ساری دولت اور جائداد میرے دادا جان نواب وقار الملک کے نام کردی ہے۔ ابھی وصیت پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کچھ باتوں کی تصدیق فرما دیں۔''

''کن امور کی طرف اشارہ ہے آپ کا؟''

''اول زرغونہ بیگم آپ سے ہی علاج کراتی تھیں؟''

''گزشتہ تیس سال سے میں ہی ان کی صحت کے مسائل دیکھ رہا تھا اور اگر وہ علاج کے لیے کہیں اور یا کسی اور ڈاکٹر کے پاس جاتی تھیں تب بھی میں ہی انہیں تجویز کرتا تھا۔''

''شکریہ! دوسرا سوال یہ ہے کہ وہ جگر کے لاعلاج مرض میں مبتلا تھیں؟''

''ہاں ان کا جگر فیل ہوگیا تھا اور اس کا واحد علاج ٹرانسپلانٹ ہے لیکن انہوں نے اس سے انکار کردیا تھا۔ اگر وہ قتل نہ کی جاتیں تب بھی دو مہینے سے زیادہ زندہ نہ رہتیں۔''

''ان کی بیماری سے متعلق تمام ریکارڈ آپ کے پاس ہے؟''

''بالکل میرے پاس ہے۔'' ڈاکٹر منیر نے جواب دیا۔ ''ان کے وارث یا پولیس اسے مجھ سے طلب کرسکتی ہے۔''

شامی نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کرکے فون رکھ دیا۔ ساریہ غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''اب تم مطمئن ہو؟''

''ہاں مگر مسئلہ تو حل نہیں ہو رہا ہے۔''

ساریہ کھڑی ہوگئی۔ ''یہ تمہارا مسئلہ ہے۔''

اس کے جانے کے بعد تیمور نے کہا۔ ''یہ کس لیے آئی ہے جب اس کا یہاں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''شاید زرغونہ بیگم کے انتقال کا سن کر آئی ہے۔'' شامی نے سوچتے ہوئے کہا۔ وہ بھی کھڑا ہوگیا تھا۔

''تم کہاں جا رہے ہو؟''

شامی نے شانے اچکائے۔ ''بزرگوں سے سنا ہے کہ حرکت میں برکت ہے، ذرا اس مقولے کو آزمانے جا رہا ہوں۔''

شامی اس نشست گاہ میں آیا جہاں زرغونہ بیگم کا قتل ہوا تھا اور ان کی لاش پائی گئی تھی۔ اس نے پہلے لاش والے مقام کا جائزہ لیا اور ذہن میں لاش کی پوزیشن سوچنے لگا۔ وہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ گولی کھڑکی کی طرف سے چلائی گئی تھی۔ لاش کی پوزیشن سے یہ بات واضح تھی۔ جب شاہنواز نے انہیں بتایا تھا کہ پستول کہاں پڑا ملا تھا تو شامی نے اس جگہ پین کی نوک سے ایک نشان بنا دیا تھا۔ یہ کھڑکی کی دیوار کے عین ساتھ اور وال کلاک کے لکڑی کے اسٹینڈ کے نزدیک تھا۔ اسٹینڈ سے پستول کا فاصلہ چند انچ سے زیادہ نہیں تھا۔ آخر میں شامی نے کھڑکی کا معائنہ کیا۔ یہاں دیوار تقریباً ڈیڑھ فٹ موٹی تھی اور اس سے آگے فولادی گرل مزید کوئی چھ سات انچ باہر کی طرف نکلی ہوئی تھی۔ گرل کے نچلے حصے میں جالی کے خانے زیادہ بڑے نہیں تھے۔ آخر میں شامی باہر آیا اور اس نے عقبی باغ کی طرف کھلنے والی کھڑکی کا معائنہ کیا۔ اندر جاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اسے یہ کام پہلے کرلینا چاہیے تھا۔ جب وہ اندر جا رہا تھا تو اسے علم نہیں تھا کہ ایک کھڑکی سے کوئی اسے دیکھ رہا تھا۔

تیمور لاؤنج میں شاداں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا اور مسلسل ہنسنے سے شاداں کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ شامی نے معنی خیز انداز میں تیمور کو دیکھا اور شاداں سے کہا۔ ''جا کر چائے لے آ۔''

''آپ بھی پئیں گے سرکار۔'' شاداں نے تیمور سے پوچھا۔

''اگر تم پلاؤ گی تو ضرور پیوں گا۔''

''ابھی صبح تک تو بالکل سنجیدہ تھا۔'' شامی نے شاداں کے جانے کے بعد دریافت کیا۔

''ہاں لیکن پھر میں نے سوچا کہ میں کتنا ہی سنجیدہ ہو جاؤں زمین آسمان اپنی جگہ رہیں گے اس لیے کیوں نہ ہنس بول کر وقت گزار لیا جائے۔''

''شاداں کے ساتھ؟''

''ہاں یار اچھی لڑکی ہے۔ جذباتی ہے مگر آج کل کی لڑکیوں کی طرح تیز نہیں ہے۔''

میں نے سوچا ہے کہ کام کی رفتار ذرا تیز کی جائے اور میں نے کچھ جاسوسی کی ہے۔''

''جاسوسی زیروزیرو سیون۔''

"نہیں شرلاک ہومز اسٹائل میں۔"

"تب باقی کیس بھی یہیں بیٹھ کر حل کر لے اس کے بعد ہم شاہنواز کو کال کریں گے۔"

"مگر اب کچھ زیرو زیرو سیون والا کام کرنا ہوگا۔" شامی نے کہا۔ "ہمیں ایک بار پھر ناڈیا امبر کے گھر جانا ہوگا۔"

"کیوں؟"

"یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔" شامی نے صاف گوئی سے کہا۔ "لیکن ہوسکتا ہے وہاں جانے کا کوئی اچھا نتیجہ نکل آئے۔"

"جیسی تیری مرضی، ورنہ میرے خیال میں تو یہ بیکار کی مشق ہوگی۔" تیمور کھڑا ہوگیا اور وہ روانہ ہوئے۔ گیٹ پر خدا بخش دوڑا آیا تھا۔

"سرکار کہاں جارہے ہیں؟"

"ایسے ہی ذرا گھومنے پھرنے۔" شامی نے جواب دیا اور گاڑی گیٹ سے نکال لے گیا۔ "یہ بڈھا کچھ زیادہ ہی نظر نہیں رکھنے لگا ہے؟"

"ہاں، میں نے محسوس کیا کہ ہم بات کررہے ہوں یا جیسے شاہنواز آیا تھا تب بھی یہ ہمارے آس پاس ہی منڈلا رہا تھا۔"

ریاست پور سے نکل کر شامی نے گاڑی گاؤں کی طرف لے جانے کے بجائے سڑک کے کنارے جھاڑیوں میں اتار دی اور کسی قدر اندر آنے کے بعد وہ اترنے لگا تو تیمور نے پوچھا۔ "یہاں کیوں اتر رہے ہو؟"

"ہمیں براہِ راست نہیں جانا ہے، قاتل والا راستہ اختیار کرنا ہے۔"

بات تیمور کی سمجھ میں آگئی اور وہ بھی نیچے اتر آیا۔ اس نے شکوہ کیا۔ "سخت بوریت ہورہی ہے۔"

"ممکن ہے جلد تیری اور میری بوریت کا ازالہ ہو جائے۔" شامی نے آگے جاتے ہوئے کہا۔ یہ گھنی اور کسی قدر اونچی قدرتی جھاڑیاں تھیں جن کے درمیان راستہ تلاش کرنا آسان نہیں تھا۔ وہ بھٹک رہے تھے کیونکہ بعض اوقات جس راستے پر جارہے ہوتے تھے وہ آگے سے بند نکلتا اور انہیں پلٹ کر واپس آنا پڑتا۔ تیمور نے بیزاری سے کہا۔

"کن بھول بھلیوں میں گھس آئے ہیں؟"

"یار راستہ تو ہے ورنہ قاتل کیسے ناڈیا امبر کے گھر پہنچا تھا؟"

"ممکن ہے وہ سامنے سے آیا ہو، تجھے یاد نہیں کہ چھوٹا دروازہ کھلا ہوا تھا اور ہماری آمد پر وہ عقب سے فرار ہوگیا تھا۔"

"ہوسکتا ہے لیکن اس کے فرار سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان جھاڑیوں میں راستہ موجود ہے۔" شامی چلتے چلتے رکا۔ "میرا خیال ہے مل گیا۔"

"قاتل؟" تیمور ایک خاردار جھاڑی سے بچتے ہوئے بولا۔

"نہیں راستہ۔" شامی نے کہا۔ "وہ دیکھ ناڈیا امبر کے مکان کی عقبی دیوار نظر آرہی ہے۔"

وہ جھاڑیوں سے بچتے ہوئے دیوار تک پہنچے۔ جنگل کا کچرا جمع ہونے سے یہاں دیوار کی اونچائی زیادہ نہیں رہ گئی تھی۔ شامی نے اچک کر دیوار پر دونوں ہاتھ جمائے اور پھر تیمور سے کہا۔ "مجھے اوپر کر۔"

تیمور نے زیادہ ہی زور لگا دیا اور شامی سر کے بل اندر جاتے جاتے بچا۔ اندر اتر کر اس نے خفگی سے کہا۔ "میں نے سر کے بل لینڈ نہیں کرنا تھا۔"

تیمور خود کود کر اندر آگیا۔ "سوری میں سمجھ رہا تھا کہ تیرا وزن بڑھا ہوا ہے مگر تو تو پھول کی طرح ہلکا ہورہا ہے۔"

مکان خالی لگ رہا تھا مگر وہ احتیاطاً خاموشی سے آگے بڑھے۔ گلی سے گزر کر وہ سامنے آئے جہاں دروازے پر پولیس کی طرف سے تالا اور سیل لگی ہوئی تھی۔ سیل تو انہوں نے آرام سے الگ کردی مگر تالا بہت مشکل سے کھلا تھا۔ دھوپ براہ راست آرہی تھی اور اس میں تپش تھی۔ شامی پسینے پسینے ہوگیا تھا مگر عین اس وقت جب وہ مایوس ہوکر تالے کو چھوڑنے والا تھا وہ کلک کی آواز کے ساتھ کھل گیا۔ یہ دیسی طرز کا مضبوط اور مشکل تالا تھا۔ آج کل کے جدید تالوں سے مختلف تھا جو بعض اوقات کسی بھی چابی سے کھل جاتے ہیں۔ وہ اندر آئے اور شامی نے سب سے پہلے پنکھا چلایا اور اس کے نیچے کھڑا ہوگیا۔ تیمور آس پاس دیکھ رہا تھا۔ یہ کل تین کمروں والا مکان تھا۔ ایک کمرا سامنے تھا اور یہ خاصا بڑا تھا۔ اسی میں کچن بھی تھا۔ باقی دو کمرے جو اٹیچ باتھ کے ساتھ تھے وہ عقب میں اور برابر تھے۔ ان کے باتھ روم عقبی صحن میں تھے۔ تیمور کچن کیبنٹ چیک کرنے لگا۔ وہ رومال سے پکڑ کر دروازے کھول رہا تھا۔ اس نے شامی کو بھی خبردار کیا۔

"کہیں انگلیوں کے نشانات نہ آئیں۔ دادا جان اسی وجہ سے مشکل میں پڑے ہیں۔"

"وہ کہاں ہم پڑے ہوئے ہیں۔" شامی نے کمروں

کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ اس نے پہلے ناڈیا امبر کے بیڈ روم کی تلاشی لی۔ یہاں پولیس والے پہلے ہی تلاشی لے کر ہر قابلِ ذکر چیز سمیٹ کر لے جا چکے تھے۔ سوائے کپڑوں اور ان چیزوں کے جو اُن کے نزدیک بیکار تھیں۔ بیڈ کا گدا تک الٹ دیا تھا مگر وہ صحیح سلامت تھا۔ شامی گدا دبا دبا کر دیکھنے لگا۔ اتنے میں تیمور اندر آیا، اس نے دو عدد بوتلیں اٹھا رکھی تھیں جن کی تہ میں ہلکا سا ارغوانی سیال موجود تھا۔ تیمور نے تصدیق کی۔ ''دیسی شراب ہے اور ایسی ہی ایک درجن خالی بوتلیں ایک کیبنٹ میں موجود ہیں۔''

''بھری ہوئی پولیس والے لے گئے ہوں گے۔'' شامی نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ ناڈیا امبر پیتی تھی۔''

''اس کا یہ خرچ بھی زرغونہ بیگم کے ذمے تھا۔'' تیمور نے کہا اور اس سے پوچھا۔ ''یہ کیا کر رہا ہے؟''

''میرا خیال ہے اس مکان میں کچھ خفیہ اشیا ہیں۔ ان کو تلاش کر رہا ہوں۔'' شامی نے گدا چھوڑ دیا۔ ''اس میں نہیں ہے۔''

''کیا چیز ہو سکتی ہے؟''

''جس کی خاطر ناڈیا امبر قتل کی گئی۔'' شامی بولا۔ ''وہ کچھ جانتی تھی شاید زرغونہ کے قتل کے بارے میں اسی لیے ماری گئی۔''

''فرض کرو وہ زبانی کلامی جانتی ہو تب یہاں کچھ ملنے کا بھلا کیا امکان ہو سکتا ہے؟''

''تو ٹھیک کہہ رہا ہے لیکن ایک مفروضہ ہے ممکن ہے درست ثابت ہو۔''

کمرے میں باقی فرنیچر عام قسم کا تھا مگر تین دروازے والی الماری اعلیٰ درجے کے مضبوط شیشم کی بنی تھی۔ شامی نے اس کی تلاشی لی مگر یہاں بھی اسے کچھ نہیں ملا تھا۔ وہ دوسرے کمرے میں آئے جو شاید گیسٹ روم تھا کیونکہ وہاں سوائے ایک بیڈ اور فرش پر قالین کے اور کچھ نہیں تھا۔ شامی نے پہلے بیڈ چیک کیا اور قالین پر پاؤں مار کر دیکھنے لگا۔ جب اسے یہاں بھی کوئی سراغ نہیں ملا تو وہ مایوس ہو کر جانے لگا کہ اچانک اسے خیال آیا اور اس نے تیمور سے ایک خالی بوتل لی اور واپس آ کر بیڈ کے نیچے بچھے قالین پر مار کر چیک کرنے لگا اور یہاں اس کی کوشش رنگ لائی۔ ایک جگہ بوتل لگی تو ٹھوس فرش کے بجائے کھوکھلی سی آواز آئی۔ اس نے کئی بار مار کر تصدیق کی اور جب اسے یقین ہو گیا تو اس نے تیمور کو آواز دی۔ مگر اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔

دوبارہ پکار کا بھی یہی انجام ہوا تو شامی چوکنا ہو گیا اور اٹھ کر خاموشی سے دروازے تک آیا۔ اس نے سامنے والے کمرے میں جھانکا تو تیمور کہیں نہیں تھا۔ وہ باہر آیا اور اس کی نظر ہر طرف تھی۔ ذرا آگے آنے پر تیمور اسے فرش پر اوندھے منہ پڑا دکھائی دیا اور وہ بے ساختہ اس کی طرف بڑھا تھا کہ کچن کی درمیانی ماربل ٹاپ دیوار کے دوسری طرف سے ایک ٹانگ نمودار ہوئی اور اس سے الجھ کر شامی منہ کے بل گرا۔ گرتے ہوئے اس نے کسی کی جھلک دیکھی تھی، اس کے بعد اسے کچھ دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ سر پر لگنے والی ضرب خاصی کاری تھی ، اس کی آنکھوں کے سامنے پھلجھڑیاں سی چھوٹیں مگر وہ بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ وہ آہٹیں سن رہا تھا البتہ اپنے اندر اتنی ہمت بھی نہیں پا رہا تھا کہ ذرا سی حرکت کر سکتا۔ اس نے بیڈ کھینچے جانے کا شور سنا۔ اس کے چند منٹ بعد اس نے ایک عجیب سی انسانی آواز سنی۔ مگر اس کا چکراتا ہوا ذہن اسے واضح کرنے سے قاصر تھا۔ قدموں کی آہٹ باہر آئی اور اس کے نزدیک سے ہوتی چلی گئی۔

شامی نے ہمت کی اور اٹھ بیٹھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ شخص ابھی مکان میں ہی ہے۔ اس لیے اس نے خود کو بے آواز رکھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی طرف سے ہوشیار ہو کر وہ اسے اس بار سچ مچ لمبا لٹا دے۔ جب آہٹیں معدوم ہوئیں تو اس نے اٹھ کر کچن کے بیسن کا نل کھولا اور سر اس کے نیچے رکھ دیا۔ سرد پانی نے حیرت انگیز اثر کیا اور اس کا ذہن بالکل درست ہو گیا۔ اس نے پہلے تیمور کو چیک کیا۔ وہ بے ہوش تھا مگر نبض اور سانس ٹھیک چل رہی تھی۔ وہ بھی شاید آدھا پون گھنٹے میں ہوش میں آ جاتا۔ اس کے سر پر دائیں طرف سے وار کیا گیا تھا۔ وہ باہر آیا تو اسے عقبی صحن کی طرف سے آہٹ سنائی دی جیسے کوئی زمین پر کودا ہو۔ شامی بھاگا اور اس نے دیوار سے اچک کر دیکھا۔ گہرے رنگ کی شرٹ پہنا شخص جھاڑیوں میں غائب ہو رہا تھا۔

شامی دیوار پر چڑھا اور بے آواز کودا۔ اس کی کوشش تھی کہ آگے جانے والے کو اس کے تعاقب کا احساس نہ ہو۔ اس لیے اگر اسے کہیں خشک جھاڑیوں سے واسطہ پڑتا تو وہ احتیاط سے گزرتا تھا۔ اگر وہ شخص نظروں سے اوجھل ہو جاتا تو شامی رک کر اس کی آہٹوں سے سمت کا اندازہ لگاتا اور پھر آگے بڑھتا۔ اس کا اندازہ تھا کہ وہ گاؤں کے نزدیک سے گزرنے والی سڑک کی طرف جا رہا ہے۔ وہ جب جھاڑیوں سے نکلا تو اس نے اسے بائیک پر سوار دیکھا۔ اس نے ہیلمٹ پہن لیا تھا۔ شامی بے ساختہ اس کی طرف لپکا

اور راستے میں آنے والا ایک پتھر نہ دیکھنے کے پاداش میں زمین بوس ہوگیا۔ اس کے گرنے کی آواز پر بائیک سوار نے پلٹ کر دیکھا اور بائیک تیزی سے آگے بڑھا دی۔ شامی نے ہیلمٹ کی وجہ سے اس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ اس نے خاصی گرمی میں بھی پیراشوٹ کا اپر پہن رکھا تھا جیسا کہ اکثر بائیک والے اپنے لباس کو گرد سے بچانے کے لیے پہنتے ہیں۔

گاڑی خاصی دور پارک تھی۔ اس تک جانا بیکار تھا اور پھر اسے تیمور کی فکر بھی تھی۔ اس لیے شامی نے اسے بے بسی سے جاتا ہوا دیکھا اور اپنی بے احتیاطی پر خود کو برا بھلا کہتا ہوا واپس آیا۔ تیمور بدستور بے ہوش تھا۔ فریج سے نکالی بوتل کا یخ بستہ پانی اسے ہوش میں لے آیا۔ اس نے جھرجھری لی اور خفگی سے بولا۔ ''یہ کون سا طریقہ ہے اٹھانے کا۔''

''حضور والا ہوش فرمائیں، اپنی خواب گاہ میں محو استراحت نہیں ہیں۔ بلکہ ایک سابق قاتلائے عالم کے گھر فروکش ہیں۔ اسی گھر میں سابق قاتلائے عالم خود مقتول پائی گئی تھی۔''

تیمور نے کان میں چلا جانے والا پانی انگلی سے نکالا اور بولا۔ ''اتنی گاڑھی اردو تو اب دادا جان بھی نہیں بولتے۔''

''اس سے پہلے کہ مزید کوئی ایسا آجائے جسے یہاں نہیں آنا چاہیے ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔''

''مثلاً کون؟''

''پولیس والے۔'' شامی نے اسے سہارا دیا اور دونوں باہر آئے۔ اس نے سوال جواب یہاں سے نکلنے کے بعد پر چھوڑ دیا تھا۔ اسے احساس تھا کہ اگر نادیا امبر کے قتل کا شبہ ان پر گیا تو اس سے مزید خرابی پیدا ہوگی۔ اس نے دوسرے کمرے میں بیڈ کے نیچے دیکھنے کی زحمت نہیں کی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہاں جو کچھ تھا وہ شخص نکال لے گیا تھا اور شاید وہی نادیا امبر کا قاتل تھا۔ پہلی بار وہ اس چیز کو حاصل نہیں کرسکا تھا کیونکہ انہوں نے مداخلت کی تھی اور اسے فرار ہونا پڑا تھا۔ اس بار اس نے حساب برابر کردیا تھا مگر تیمور کا خیال تھا اس نے ان پر خاصا قرض چڑھا دیا تھا اور اسے مع سود کے اتارنا ضروری ہوگیا تھا۔ شامی نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

''اگر اصل ہی اتر جائے تو بڑی بات ہوگی۔ اس کھیل کے پس پشت جو شخص ہے ہم اس سے ذرا بھی واقفیت نہیں رکھتے۔''

''وہ بچ کر نہیں جائے گا۔'' تیمور نے سر پر ابھر آنے والا گومڑا سہلاتے ہوئے کہا۔

''بہتر ہے کہ حویلی میں موجود افراد ہمارے اس ایڈونچر سے بے خبر رہیں۔''

شامی کی چوٹ بالوں میں پوشیدہ تھی اور بالوں کی وجہ سے ہی اس کی بچت ہوئی تھی۔ مگر تیمور کی چوٹ نمایاں تھی۔ اس کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ تیمور نے سر پر پی کیپ لے لی۔ اس میں زخم چھپ گیا تھا۔ گاڑی میں فرسٹ ایڈ کٹ اور دوائیں موجود تھیں۔ اس نے گومڑ پر ورم ختم کرنے والا مرہم لگایا اور دو پین کلر لے لی تھیں۔ وہ واپس حویلی پہنچے اور کسی کی نظروں میں آنے سے پہلے انہوں نے اپنی حالت بہتر کرلی تھی۔ سکون سے بیٹھنے کے بعد انہوں نے صورتِ حال پر غور کیا۔ تیمور نے کہا۔

''اس طرح کچھ چھپانے کا کیا مطلب ہوسکتا ہے؟''

''یہی کہ نادیا امبر کے پاس کوئی ایسا مواد تھا جو قاتل کی نشان دہی کرسکتا ہے۔''

''کس قاتل کی؟''

''میرا خیال ہے زرغونہ بیگم اور نادیا امبر کو قتل کرنے والا شخص ایک ہی ہے۔''

تیمور نے غور کیا۔ ''میں تجھ سے متفق ہوں، مگر سوال ہے ہم اس قاتل تک پہنچیں گے کیسے؟''

''اس کے لیے کچھ جاسوسی کرنا ہوگی۔'' شامی نے کہا۔ ''ویسے ہم بالکل ناکام واپس نہیں آئے ہیں۔ کم سے کم میں جس مقصد کے تحت گیا تھا وہ حاصل ہوگیا۔''

''کیسا مقصد؟''

شامی نے پرس سے نیلے چکنے کاغذ کا ٹکڑا نکال کر اسے دکھایا۔ ''کہ اس کا تعلق نادیا امبر سے نہیں ہے اور اس کے پورے گھر میں ایسا کوئی کاغذ موجود نہیں تھا۔''

''اب تو کیا کرے گا؟''

''میں نے کہا نا جاسوسی کروں گا۔'' شامی نے کاغذ واپس رکھ لیا۔ ''لیکن اس سے پہلے ہمیں زور و شور سے اپنی ناکامی کا ڈھنڈورا پیٹنا ہوگا۔''

''کس کے سامنے؟''

''اس کیس سے متعلق تمام افراد کے سامنے کیونکہ ممکنہ قاتل ان میں سے ہی ایک ہے۔''

تیمور نے اسے طنزیہ انداز میں دیکھا۔ ''اس وقت تو شرلاک ہومز کا پاکستانی ایڈیشن لگ رہا ہے۔ تیرے انداز

سے لگ رہا ہے کہ تو نے کچھ خاص کلیو حاصل کر لیا ہے اور اب ڈاکٹر واٹسن کو اس وقت تک پکائے گا جب تک مجرم کو بے نقاب نہیں کر دیتا۔''

شامی ہنسا۔ ''تو درست سمجھ رہا ہے۔ میرے ذہن میں ایک خیال ہے لیکن پہلے میں اپنے طور پر اس تصدیق کرنا چاہوں گا۔''

''تصدیق کے لیے تو کیا کرے گا؟''

''کل صبح اسلام آباد واپس جاؤں گا۔ تو یہیں رہے گا اور وقت گزاری کرتا رہے گا۔''

''اگر تیرا خیال غلط ثابت ہوا؟''

''تو میں دوسرے خیال پر غور کروں اور اس کی تصدیق کرنے کی کوشش کروں گا۔'' شامی نے اطمینان سے جواب دیا اور اسی لمحے شاداں بڑی سی ٹرالی میں کھانے کی کئی اشیا اور چائے لے کر آگئی۔ یہ سب شاداں نے خود بنایا تھا اور بہت اچھا بنایا تھا۔ شامی نے موڈ میں آکر کہا۔ ''دل چاہ رہا ہے تمہیں اپنے گھر لے جاؤں۔''

شاداں کا رنگ لال ہو گیا، اس نے شرما کر کہا۔

''کیوں صاحب جی؟''

''تاکہ تم ہمیں ہر روز ایسی ہی مزے مزے کی چیزیں کھلاؤ۔'' شامی نے جواب دیا تو شاداں کا رنگ معمول پر آگیا۔ اس کے جانے کے بعد تیمور نے کہا۔

''یار یہ لڑکیاں اتنی احمق کیوں ہوتی ہیں۔''

''کوئی احمق نہیں ہوتی ہیں صرف پوز کرتی ہیں ورنہ ان کی زندگی کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے اور پچانوے فیصد لڑکیاں اس مقصد میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔''

تیمور نے غور کیا۔ ''کہہ تو تو ٹھیک رہا ہے۔''

''شاباش، اب بلاوجہ کسی کی صورت دیکھ کر دکھی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' شامی نے کہا۔

''او کے نہیں ہوں گا، لیکن یہ تو بتا کہ تجھے کس پر شک ہے؟''

''یہ نہیں بتا سکتا، بس اتنا جان لے کہ تو اس سے واقف ہے۔ باقی میں آکر بتاؤں گا۔''

پروگرام کے مطابق انہوں نے سب کے سامنے یہی ظاہر کیا کہ انہیں سوائے مایوسی اور ناکامی کے کچھ نہیں ملا ہے۔ اس لیے شاید اب پولیس کو ہی کچھ کرنا پڑے اور پھر شامی نے شاہنواز کو ایک جعلی کال بھی کی۔ اس نے اصل میں تیمور کا نمبر ملایا تھا اور اس سے بات کرتا رہا تھا۔ وہ اس وقت لاؤنج میں تھا جہاں سوائے خدا بخش کے تقریباً سب ہی موجود تھے۔ اگلے دن وہ صبح سویرے روانہ ہوا اور اس بار بھی خدا بخش متجسس تھا کہ وہ کہاں اور کیوں جا رہا ہے۔ باقی سب کا ردعمل سرسری سا تھا۔ تیمور وہیں رکا تھا اور شامی کے جاتے ہی شاداں آگئی۔ اس نے تیمور سے شکوہ کناں لہجے میں پوچھا۔

''صاحب یہ شامی صاحب کیسے آدمی ہیں۔ پہلے مجھ سے اتنے اچھے انداز میں پیش آئے اور اب یوں بات کرتے ہیں جیسے...''

''تم اس کی باتوں پر توجہ مت دیا کرو۔'' تیمور نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''وہ من موجی آدمی ہے لیکن دل کا برا نہیں ہے۔ ویسے اس نے پہلے کیا کیا تھا؟''

اس سوال پر شاداں شرما گئی مگر اس نے اٹک اٹک کر بتا دیا کہ شامی نے کیا کیا تھا۔ اس کے جواب سے تیمور کو اندازہ ہوا کہ وہ سچ مچ بہت معصوم لڑکی تھی اور وہ اس عمر میں تھی جب صنفِ مخالف سے خود بہ خود دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ تیمور نے پوچھا۔ ''تم نے میٹرک کیا ہے آگے پڑھنے کا ارادہ نہیں ہے؟''

''ہے جی مگر سین بی بی کہتی ہیں کہ میں نے جتنا پڑھنا تھا پڑھ لیا۔''

''میٹرک کچھ بھی نہیں ہے اور تمہیں آگے لازمی پڑھنا چاہیے۔'' تیمور نے کہا۔ ''جب تم پڑھنا چاہتی ہو تو وہ کیوں منع کر رہی ہے؟ تم کہو کہ تمہیں آگے پڑھنا ہے۔''

''جی مجھے انہوں نے پالا ہے۔ اپنا پیسا خرچ کیا ہے، میں ان کی بات کیسے ٹال سکتی ہوں؟''

''میں بات کروں گا۔''

وہ گھبرا گئی۔ ''نہیں جی، وہ پتا نہیں کیا سمجھیں گی کہ میں آپ سے کون کون سی باتیں کرتی ہوں۔ کاش کہ بڑی بی بی زندہ ہوتیں۔''

''اس سے کیا ہوتا؟''

''وہ مجھے آگے پڑھانے پر مان گئی تھیں اور انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ سین بی بی سے بات کر کے مجھے اجازت دلوا دیں گی۔ مگر اب وہی نہیں رہیں۔''

''وہ اس حویلی اور تمام چیزوں کی مالک تھیں۔ اب ایسے ہی میرے دادا نواب وقار الملک یہاں کے مالک ہیں۔ میں ان سے کہوں گا تو وہ تمہیں آگے پڑھنے کی اجازت دلوا دیں گے۔''

''سچ۔'' شاداں خوش ہو گئی۔

''ہاں بس یہ مسئلہ نمٹنے دو۔''

''کون سا مسئلہ جی؟'' وہ سادگی سے بولی تو تیمور کو اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ بھلا شاداں کو ان معاملات کا کیا پتا ہو سکتا تھا۔

''کوئی نہیں، اچھا چھوڑو یہ بتاؤ کہ تم کو کیا کیا آتا ہے۔''

''سب آتا ہے، کھانا بنانا اور بھی چیزیں بنانا، جو کل آپ نے کھائی تھیں وہ سب میں نے بنائی تھیں۔''

''تمہیں سین نے سکھایا ہے؟''

''نہیں جی مجھے تو بڑی بی بی نے سکھایا ہے۔ جب ان کی طبیعت خراب تھی تو میں ان کی دیکھ بھال کے لیے یہاں آئی تھی۔ تب انہوں نے بہت سی چیزیں بنانی سکھائی تھیں اور باقی میں نے دیکھ دیکھ کر سیکھ لیں۔''

''اس کا مطلب ہے تم بہت ذہین ہو۔''

''پتا نہیں، سین بی بی کہتی ہیں میرا ذہن کمزور ہے۔''

تیمور اس سے بات کر کے وقت گزاری کرتا رہا۔ شاداں اسے بہت کچھ بتا رہی تھی، زرغونہ بیگم، سین اور ساریہ کے بارے میں۔ البتہ اس نے خدا بخش کے بارے میں زیادہ بات نہیں کی تھی۔ تیمور نے اس کے لہجے اور کچھ باتوں سے اندازہ لگایا کہ وہ خدا بخش کو پسند نہیں کرتی یا اس سے ڈرتی ہے۔ وہ اس سے خدا بخش کے بارے میں مزید پوچھنا چاہتا تھا مگر وہ لنچ کی تیاری کے لیے نیچے چلی گئی۔ وقت گزاری کے لیے تیمور زرغونہ بیگم کے بیڈروم میں آیا۔ یہ نہایت شاہانہ قسم کی خواب گاہ تھی اور زرغونہ بیگم نے یہاں پچاس سال گزارے تھے۔ ڈریسنگ ٹیبل پر اس کے استعمال کی چیزیں اب تک رکھی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک شیشے کی الماری خوشبوجات کے لیے مخصوص تھی۔ اس میں کئی طرح کے پرفیوم اور عطر موجود تھے۔

تیمور سوچ رہا تھا کہ زرغونہ بیگم نے اپنی ذاتی زندگی کا کوئی ریکارڈ تو مرتب کیا ہوگا۔ ڈائری یا کسی اور صورت میں۔ اس نے سائیڈ درازوں، الماری اور دوسری جگہوں کی تلاشی لینا شروع کی مگر اسے کہیں بھی ایسی کوئی چیز نہیں ملی۔ یہاں وہ البم نہیں تھے جو خدا بخش نے انہیں دکھانے تھے۔ زرغونہ بیگم کا ذاتی ریکارڈ نہیں تھا یا غائب کر دیا گیا تھا۔ اسی طرح نادیا امبر کے پاس کچھ تھا جو شاید قاتل یا قاتلوں کی نشان دہی کر سکتا تھا مگر اب وہ بھی غائب تھا۔ قاتل نہایت صفائی سے خود تک رہنمائی کرنے والے تمام نشانات مٹا رہا تھا۔ تیمور جیسے جیسے سوچ رہا تھا اس کا شبہ شفیق احمد پر جا رہا تھا۔ ایک وکیل ہونے کے ناتے وہ ذہین تھا اور ساتھ ہی اسے جرائم کی باریکیاں ازبر تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ قانون کن وجوہات کی بنا پر اسے قابو کر سکتا ہے اور وہ ان تمام وجوہات کا خیال رکھتے ہوئے اپنی چالیں چل رہا تھا۔

شام تک وہ بوریت محسوس کرنے لگا۔ اس کے سر کا گومڑ تقریباً ٹھیک ہو گیا تھا اور درد صرف اس وقت ہوتا تھا جب اس کا ہاتھ یا کوئی چیز غلطی سے اس حصے پر لگتی اور درد کی ہلکی لہر اسے یاد دلاتی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ نادیا امبر کے گھر میں وہ بے خبری میں مار کھا گیا۔ آنے والا اتنی خاموشی سے آیا کہ اسے نہ تو آہٹ آئی اور نہ ہی اس کی چھٹی حس نے چونکایا۔ وہ آنے والے کی ایک جھلک تک نہیں دیکھ سکا تھا مگر شامی نے جو حلیہ بتایا تھا وہ اس شخص کا سا تھا جو نادیا امبر کو قتل کر کے فرار ہوا تھا۔ کنپٹی پر لگنے والی ضرب نے پہلے چودہ طبق روشن کیے اور اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ جب تک کہ شامی نے یخ بستہ پانی اس پر نہیں ڈالا۔ وہ واپس اپنے کمرے میں آیا تو شاہنواز کی کال آ گئی۔

''میں آج شام کسی وقت آؤں گا۔ سرکاری ڈیوٹی سے جان چھوٹ گئی ہے اور اب میں اپنی ساری توجہ کیس پر دوں گا۔''

''تم آ جاؤ لیکن یہاں شامی نہیں ہے۔''

''وہ کہاں گیا ہے؟'' شاہنواز چونکا۔

''اسے دادا حضور نے طلب فرمایا ہے۔'' تیمور نے غلط بیانی سے کام لیا۔ شامی نے اسے کسی کو بتانے سے منع کیا تھا۔

''نواب صاحب سے تو میری آج ہی بات ہوئی ہے اور انہوں نے شامی کا ذکر نہیں کیا۔''

''ضروری نہیں ہے کہ وہ تمہیں یا کسی کو بھی اپنے بارے میں سب بتائیں۔'' تیمور نے کسی قدر رکھائی سے کہا۔ ''اگر تمہیں کوئی مسئلہ ہے تو دوبارہ ان کو کال کر کے پوچھ سکتے ہو۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''نواب صاحب کو واقعی سب بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے ایسے ہی کہہ دیا۔''

''شام میں آنے کی وجہ؟''

''میں خدا بخش سے دوبارہ بات کرنا چاہتا ہوں کیونکہ اس کیس میں سب سے نزدیکی شخص وہی ہے۔ اسی نے قتل کی اطلاع دی تھی اور وہ گھر میں موجود واحد فرد بھی تھا۔''

''سوال یہ ہے کہ تم نے پہلے یہ کام کیوں نہیں کیا؟''

''دو وجوہات کی بنا پر۔ ایک وقت نہیں تھا اور دوسرے نواب صاحب کے پستول کی وہاں موجودگی۔'' شاہنواز نے جواب دیا۔ ''اب میرے پاس پورا وقت ہے۔''

تیمور کو پستول پر یاد آیا کہ اس نے نواب صاحب سے دوبارہ نہیں دریافت کیا تھا۔ شاہنواز سے بات کر کے اس نے نواب صاحب کو کال کی اور سکون کا سانس لیا جب اس نے ان کی آواز میں خوشگواری محسوس کی۔ انہوں نے سلام دعا کے بعد پوچھا۔ ''کہو برخوردار کوئی پیش رفت ہوئی؟''

''بہ ظاہر تو نہیں لیکن بہت سی چیزیں علم میں آئی ہیں۔'' تیمور نے کہا اور انہیں مختصر رپورٹ دی کہ اس دوران میں یہاں کیا ہوا تھا۔ پھر اس نے پوچھا۔ ''پستول چرانے والے کا کوئی سراغ ملا؟''

''تم جانتے ہو ہمارے سارے ملازم پرانے اور اعتماد کے لوگ ہیں۔ مگر اس واقعے سے ایک ہفتہ پہلے باورچی شکور کا ایک بھانجا یہاں رکنے کے لیے آیا تھا اور وہ تین دن یہاں رکا تھا۔ اس سارے عرصے میں وہی ایک باہر کا آدمی ہے جو یہاں آیا اور رکا بھی۔''

''ممکن ہے کسی عارضی طور پر آنے والے نے یہ کام کیا ہو؟''

''عارضی آنے والے کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ ہم نے پستول صاف کرنے کے لیے نکالا تھا اور پھر دراز میں چھوڑ دیا۔''

''تب شکور کے بھانجے کو بھی اس کا علم نہیں ہونا چاہیے۔''

''اگر وہ اسی نیت سے آیا تھا تو اس کے لیے کام ہم نے آسان کر دیا۔''

''یہی بات کسی عارضی آنے والے کے لیے بھی کہی جا سکتی ہے۔'' تیمور نے دبے لہجے میں کہا جس سے بحث کا تاثر نہ ابھرے۔ وہ نواب صاحب کا خوشگوار موڈ خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''خیر چھوڑو ہم نے یہ معاملہ نظام دین کے سپرد کر دیا ہے۔ برخودار شامیر کہاں ہیں؟''

تیمور ہچکچایا۔ وہ نواب صاحب سے جھوٹ نہیں کہہ سکتا تھا اس لیے سچ بول دیا۔ ''وہ شہر گیا ہے اسے کچھ سراغ ملا ہے مگر اس نے مجھے بھی نہیں بتایا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ پہلے کچھ تصدیق کرے گا، اس کے بعد ہی معاملہ آگے بڑھائے گا۔''

''وہ یہاں تو نہیں آیا۔''

''سب سے چھپ کر گیا ہے اور شاید ولا بھی نہ آئے۔ میں آپ سے چھپا نہیں سکتا اس لیے بتا دیا۔ پلیز دادا حضور اس کا خیال رکھیے گا۔''

''ہمیں معلوم ہے۔'' وہ کسی قدر خفگی سے بولے۔ ''مگر اسے چاہیے اپنی حفاظت کا خیال بھی رکھے۔ قاتل دو قتل کر چکا ہے اور وہ مزید کسی کی جان لینے سے دریغ نہیں کرے گا۔''

''میرا خیال ہے شامی اس کا خیال رکھے گا۔ ویسے بھی وہ شہر گیا ہے خطرہ تو یہاں ہے۔ زرغونہ بیگم اور نادیا امبر کا ممکنہ قاتل یہیں موجود ہے۔ میرا شبہ وکیل پر ہے۔ وہ بھی یہیں کہیں رہتا ہے اور صرف کسی کیس کے سلسلے میں شہر جاتا ہے۔''

''شفیق احمد اچھی شہرت کا حامل وکیل ہے۔'' نواب صاحب نے خلافِ توقع اس کی تعریف کی۔ ''قانون کے مطابق چلتا ہے اور غیر قانونی کاموں سے اجتناب کرتا ہے۔''

''آپ کی اس سے ملاقات ہوئی؟''

''ہاں، ہم نے دریافت کیا تھا کہ اگر زرغونہ بیگم کے قتل کی فردِ جرم ہم پر عائد ہو جائے تو اس دولت و جائداد کا کیا ہوگا۔ اس نے جواب دیا کہ کسی قانونی وارث کے نہ ہونے کی صورت میں یہ حکومتی تحویل میں چلی جائے گی۔''

''مجھے سو فیصد یقین ہے کہ اس سارے چکر کے پیچھے یہی دولت اور جائداد ہے۔''

''اس صورت میں قاتل خود کو چھپا نہیں سکے گا۔ اسے دولت و جائداد حاصل کرنے کے لیے سامنے آنا پڑے گا۔'' نواب صاحب نے کہا۔ ''لیکن اس کا ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔''

تیمور نواب صاحب کی بات سمجھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''آپ بے فکر رہیں، اللہ نے چاہا تو آپ اس معاملے سے باعزت نکل جائیں گے۔ آج شام شاہنواز بھی آئے گا۔''

''اس کی کال بھی آئی تھی اور وہ بھی ایسی ہی باتیں کر رہا تھا مگر برخوردار یہ قانونی معاملات ہیں۔ ان میں اگر وزیراعظم بھی پھنس جائے تو اس کی بچت مشکل ہو جاتی ہے۔ خیر اللہ سے امید ہے کہ وہ عمر کا یہ آخری حصہ بھی عزت و آبرو سے گزارنے کی مہلت دے گا۔''

تیمور نے محسوس کیا کہ نواب صاحب مایوس نہیں تھے مگر وہ اسے عملی طور پر لے رہے تھے اور صورتِ حال زیادہ

اچھی نہیں تھی۔ لنچ کے بعد شاداں دوبارہ اس کے پاس آئی تھی اور اس بار تیمور نے سیمین کے شوہر سراج ظہیر کے بارے میں پوچھا۔ شاداں کچھ عرصے اس کے ساتھ بھی رہی تھی جب سیمین اس کے ساتھ تھی۔ شاداں نے دبے لفظوں میں کہا۔ ''وہ اچھا آدمی نہیں تھا جی؟''

''کس لحاظ سے؟''

''پتا نہیں جی، پر وہ مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔'' شاداں نے کہا۔ ''مجھے بہت عجیب نظروں سے دیکھتا تھا اور ایک بار جب سیمین بی بی نہیں تھیں تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔''

''ہاتھ تو تمہارا شامی نے بھی پکڑا تھا۔''

وہ شرمائی۔ ''ان کا انداز دوسرا تھا جی۔ اس کا انداز دوسرا تھا۔ میں اس وقت پندرہ برس کی تھی مگر مجھے یہ بات اتنی بری لگی کہ میں ہاتھ چھڑا کر بھاگ گئی تھی۔''

سراج کردار کا اچھا آدمی نہیں تھا اور شاید یہی وجہ سیمین سے علیحدگی کا سبب بنی تھی۔ تیمور نے پوچھا۔ ''کیا اس نے سیمین کو طلاق دے دی تھی؟''

''یہ تو مجھے نہیں معلوم جی لیکن اس کے بعد وہ دونوں کبھی نہیں ملے۔ نہ سیمین بی بی اس کے پاس گئیں اور نہ وہ یہاں آیا۔''

''ان کی کوئی اولاد بھی نہیں ہے؟''

''میں نے سنا ہے کہ بچہ ہوا تھا پر مر گیا۔ یہ میرے آنے سے بہت پہلے کی بات ہے۔''

سراج کی دوسری شادی کی ایک وجہ شاید اولاد کا نہ ہونا بھی تھا۔ شاداں زرغونہ بیگم کے خاصے نزدیک رہی تھی مگر وہ اس کے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ زرغونہ بیگم اس بارے میں بات کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ شاہنواز شام کے وقت آیا اور اس نے تیمور کی موجودگی میں خدا بخش سے سوالات کیے۔ اس کا لہجہ خاصا سخت اور بعض اوقات دھمکی آمیز بھی ہو جاتا تھا مگر بوڑھا خدا بخش سکون سے جواب دیتا رہا۔ وہ اپنے ابتدائی بیان پر قائم تھا اور اس نے دوبارہ کیے گئے سوالوں کے بھی وہی جوابات دیے تھے۔ اس نے شاہنواز کو پیشکش کی۔

''سرکار اگر مجھ پر شک ہے تو بے شک اٹھا کر بند کر دو۔ پر یہ تو سوچو کہ مجھ جیسا بوڑھا آدمی ایسا کام کیوں کرے گا۔ میں چند برس اور جیوں گا۔''

''تم اپنی اولاد کے لیے تو کر سکتے ہو؟''

''اس کے لیے بڑی بی بی بہت کچھ کر گئی ہیں، اسے اس سے زیادہ کی اور کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔'' وہ بولتے ہوئے رکا جیسے ہچکچا رہا ہو پھر اس نے کہا۔ ''ویسے سرکار میں بتا دوں کہ سیمین میری اولاد نہیں ہے۔''

یہ انکشاف تھا۔ تیمور اچھل پڑا اس نے کہا۔ ''یہ کیا چکر ہے، یہاں کسی کا کسی سے تعلق بھی ہے یا نہیں؟''

''تب سیمین کہاں سے آئی؟'' شاہنواز نے سوال کیا۔

''میں نہیں جانتا، یہ چند دن کی تھی جب یہاں آئی اور بڑی بی بی نے اسے میرے اور میری مرحوم بیوی کے سپرد کر دیا۔ اسے ہم نے ہی پالا ہے اس لیے سب اسے میری اولاد سمجھتے ہیں۔''

''کیا یہ بات سیمین جانتی ہے؟''

''چھوٹی تھی تو نہیں جانتی تھی جب بڑی ہوئی تو اسے بتا دیا تھا مگر وہ آج بھی باپ کی طرح میری عزت کرتی ہے۔''

''زرغونہ بیگم نے اس کے ماضی کے بارے میں بتایا؟''

''نہیں جیسے انہوں نے ساریہ بی بی کے بارے میں نہیں بتایا اسی طرح سیمین کے بارے میں بھی نہیں بتایا۔''

''تم نے پوچھا؟''

''کئی بار مگر انہوں نے کبھی جواب نہیں دیا۔''

تیمور سوچ رہا تھا کہ کیا اس حویلی میں آنے والا ہر فرد اپنا ماضی کہیں چھوڑ آتا تھا۔ زرغونہ بیگم آئی اس کے بعد سیمین آئی اور پھر ساریہ بھی اسی طرح سے آئی۔ زرغونہ بیگم کا ماضی نواب صاحب کی وجہ سے ان کے علم میں تھا مگر سیمین اور ساریہ کا ماضی آج بھی تاریکی میں تھا۔ ساریہ کا دعویٰ تھا کہ وہ اپنے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں جانتی.... اور دوسری طرف سیمین کے بارے میں خدا بخش ایسی ہی کہانی سنا رہا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، وہ اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کر رہے تھے مگر یہ گتھی مزید الجھتی جا رہی تھی۔ شاہنواز نے خدا بخش سے پوچھا۔ ''تم نے یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی تھی؟''

''بڑی بی بی نے منع کیا تھا پر اب بات مجھ تک آئی تو میں مجبور ہو گیا۔ ویسے بھی بڑی بی بی نے اپنی زندگی کی حد تک منع کیا تھا۔ اگر آپ مجھ پر شک نہ کرتے تو میں کبھی یہ بات نہ کھولتا۔''

''سیمین نے بھی یہ بات نہیں بتائی۔''

''اس کی وجہ یہی ہے کہ بڑی بی بی نے منع کیا تھا۔''

اگرچہ خدا بخش نے بہت اچھے انداز میں وضاحت کی تھی مگر شاہنواز کے تیور خراب ہو گئے تھے۔ اس نے پہلے سیمین کو بلا کر اس سے بیان لیا... اس نے بھی اعتراف کیا کہ وہ اپنے ماضی سے لاعلم ہے۔ وہ نہیں جانتی کہ زرغونہ بیگم اسے

کہاں سے لائی تھی؟ شاہنواز نے خدا بخش سے کہا۔ ”تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“

سیمن بے چین ہوگئی۔ ”آپ انہیں کیوں لے جا رہے ہیں؟“

”اس سے اب تھانے میں پوچھ گچھ ہوگی۔“ شاہنواز نے رکھائی سے کہا۔

”پولیس اس بوڑھے شخص پر تشدد کرے گی۔“ سیمن چلائی۔

”اگر ضرورت پڑی تو سختی بھی کرنا ہوگی۔“ شاہنواز نے کہا تو خدا بخش کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔

”ایس پی صاحب میں نے آپ کو سب کچھ سچ بتا دیا ہے۔“

”سچ اور جھوٹ کا تھانے چل کر پتا چل جائے گا۔“

شاہنواز نے اسے ہتھکڑی نہیں لگائی تھی مگر اسے خبردار کر دیا تھا کہ اب وہ پولیس کی تحویل میں ہے اس لیے کسی الٹی سیدھی حرکت سے گریز کرے۔ وہ اسے لے کر روانہ ہوگیا۔ سیمن بہت پریشان تھی۔ وہ رو رہی تھی اور شاداں اسے تسلی دے رہی تھی۔ تیمور نے اس سے کہا۔

”تم نے یہ بات کیوں چھپائی کہ تم خدا بخش کی اولاد نہیں ہو۔ اسی وجہ سے شاہنواز اسے لے گیا ہے۔“

”پلیز آپ اسے چھڑائیں، وہ بوڑھا آدمی ہے، پولیس کی سختی برداشت نہیں کر سکے گا۔“

”شاہنواز روایتی پولیس افسر نہیں ہے۔“ تیمور نے اسے تسلی دی۔ ”وہ اگر سختی کرے گا تب بھی خدا بخش کا خیال ضرور رکھے گا۔“

تیمور کو ساریہ کا خیال آیا، وہ نظر نہیں آرہی تھی۔ تیمور نے اس کا پوچھا تو سیمن بولی۔ ”وہ اپنے کمرے میں ہے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

تیمور شامی سے بات کرنے کے لیے بے چین تھا۔ وہ اسے تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ کمرے میں آیا تو شاداں بھی چلی آئی مگر تیمور نے اسے چائے بنانے کے لیے بھیج دیا۔ اس نے شامی کو کال کی اور اسے خدا بخش کی گرفتاری اور سیمن کے بارے میں نئی بات سے باخبر کیا۔ شامی چونکا تھا مگر زیادہ نہیں البتہ اس نے کہا۔

”یہ تو نے اچھا کیا کہ مجھے بتا دیا۔“

”تو کیا کر رہا ہے اور واپسی کب تک ہوگی؟“

”آج میں نے جو کام کرنے تھے ان کا آغاز کر دیا ہے، کل جیسے ہی تکمیل ہوگی اور میرے ہاتھ میں کچھ آئے گا میں آ جاؤں گا۔“

”میں بے چین ہوں۔ اس بار تو سچ مچ شرلاک ہومز بنا ہوا ہے۔“

شامی ہنسا۔ ”اس کا بھی ایک مزہ ہے۔“

”لیکن ڈاکٹر واٹسن بننے میں کوئی مزہ نہیں ہے۔“

تیمور نے اسے خبردار کیا۔ ”میں کل تک تیرا انتظار کروں گا۔“

تیمور نے موبائل رکھا تھا کہ شاداں چائے لے آئی۔ تیمور نے ایک سپ لیا تھا کہ اس کے موبائل کی بیل بجی اور اس نے دیکھا اسکرین پر شاہنواز کا نام تھا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ شاہنواز آواز سے ہی پریشان لگ رہا تھا۔ اس نے چھوٹتے ہی کہا۔ ”یہاں ایک حادثہ ہوگیا ہے؟“

”کیسا حادثہ اور خیر تو ہے؟“

”نہیں یار، ہم جا رہے تھے کہ اچانک میری گاڑی کے اگلے دونوں ٹائر برسٹ ہوئے اور وہ گھوم کر سڑک کنارے ایک درخت سے ٹکرائی۔ سب کے ہوش اُڑ گئے تھے اور اسی دوران میں ایک آدمی گاڑی تک آیا اور اس نے پچھلی کھڑکی سے اندر بیٹھے خدا بخش پر دو فائر کیے۔ دونوں گولیاں اس کے سر پر لگیں اور وہ موقع پر ہی ایکسپائر ہوگیا۔“

”میرے خدا۔“ تیمور بولا۔ ”تم نے قاتل کو دیکھا؟“

”میرے اپنے سر پر چوٹ آئی تھی اور جب تک میں حواس قابو میں رکھ کر باہر نکلتا وہ بائیک پر بیٹھ کر جا چکا تھا۔“ شاہنواز نے کہا۔ ”میں عقب سے اس کی بس ایک جھلک دیکھ سکا۔ اس نے براؤن رنگ کی شرٹ...“

”اور گرے رنگ کی پتلون پہنی ہوئی ہوگی اور سر پر ہیلمٹ ہوگا؟“

”تمہیں کیسے پتا چلا؟“ شاہنواز کو تعجب ہوا۔

”بالکل اسی لباس میں وہ شخص بھی تھا جو نادیا امبر کو قتل کرنے کے بعد فرار ہوا تھا اور میں بھی عقب سے اس کی ایک ہی جھلک دیکھ سکا تھا۔“

”تمہارا مطلب ہے ان واقعات میں ایک ہی شخص ملوث ہے؟“

”بالکل، بلکہ مجھے یقین ہے کہ یہ سارے واقعات اصل میں زرغونہ بیگم کے قتل کے بعد شروع ہوئے ہیں۔“

”میں نے سڑک دیکھی ہے وہاں بے شمار چپٹے سرے والی کیلیں پڑی تھیں اور ان سے ہی میری گاڑی کے ٹائر پنکچر ہوئے۔“ شاہنواز نے کہا۔ ”ایسا لگ رہا ہے کہ خدا بخش کچھ جانتا تھا اور قاتل نے قبل از وقت اس کی زبان بند کردی۔“

تیمور نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''ہمارا واسطہ بہت ہی عیار اور شاطر قاتل سے پڑا ہے۔''

''تم محتاط رہنا۔'' شاہنواز نے کہا۔ ''میں جلد رابطہ کروں گا۔ ابھی مصروف ہوں۔''

تیمور نے موبائل رکھ کر شاداں کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''ایک بُری خبر ہے۔''

''کیسی خبر؟''

''خدا بخش کو پولیس ساتھ لے جا رہی تھی۔ راستے میں گاڑی کو حادثہ ہوا اور وہ ایک درخت سے ٹکرا گئی اس کے بعد کسی نے خدا بخش کو گولی مار دی۔''

شاداں نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ مگر یہ نارمل ردِعمل تھا۔ اسے خدا بخش کی موت کا بہت زیادہ دکھ نہیں ہوا تھا۔ البتہ اسے سین کا خیال تھا۔ ''ان کو کیسے بتائیں؟''

''بتانا تو ہوگا۔'' تیمور نے کہا۔ ''تم نیچے جاؤ اور اسے لاؤنج میں بلا لو، میں ابھی آتا ہوں۔''

شاداں کے جانے کے بعد تیمور نے پھر شامی کو کال کی اور اسے تازہ ترین خبر سے آگاہ کرتے ہوئے مشورہ دیا۔ ''یار محتاط رہنا، بہ ظاہر ایک عام سا دکھائی دینے والا قتل کچھ زیادہ ہی سنگین صورت اختیار کر گیا ہے۔ قاتل چالاک ہی نہیں دیدہ دلیر بھی ہے۔''

''فکر مت کرو وہ کتنا ہی دلیر سہی مگر بچ نہیں سکے گا۔ اب مجھے اپنے خیال پر اور بھی زیادہ یقین ہو گیا ہے۔''

''پھر بھی محتاط رہ اور ہو سکے تو اپنے ساتھ کوئی ہتھیار رکھ۔''

''گاڑی میں پستول ہے۔'' شامی نے اسے تسلی دی۔ ''مجھے تیری فکر ہے۔''

''میں دیکھتا ہوں یہاں کوئی نہ کوئی ہتھیار ہوگا۔ خدا بخش نے کسی بندوق کا ذکر تو کیا تھا جو وہ اپنے ساتھ رکھتا ہے۔''

''اسے فوراً اپنی تحویل میں لے لے۔''

تیمور نیچے آیا۔ شاداں اور فکرمند سین لاؤنج میں موجود تھیں۔ سین نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ ''کیا ہوا ہے؟''

''بتاتا ہوں لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ یہاں کوئی ہتھیار ہے؟''

سین نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اگر ہے تو میرے علم میں نہیں ہے۔''

''خدا بخش کا کوارٹر کہاں ہے؟''

''میں بتاتی ہوں۔'' شاداں بولی۔

''تم ساریہ کو بلاؤ، صورتِ حال بہت سنگین ہو گئی ہے۔ میں آکر بتاتا ہوں۔''

خدا بخش کا کوارٹر صرف نام کا کوارٹر تھا ورنہ یہ تین کمروں کا بہت خوب صورت اور بہترین انداز میں بنا ہوا کاٹیج تھا۔ وہ اندر آئے اور تیمور نے شاداں سے کہا۔ ''ہمیں خدا بخش کی رائفل تلاش کرنی ہے۔''

''کیوں جی؟''

''کیونکہ کوئی قاتل ہے جو باری باری یہاں سے متعلق لوگوں کو ختم کر رہا ہے۔ اس نے پہلے زرغونہ بیگم، پھر ناڈیا امبر اور اب خدا بخش کو قتل کر دیا ہے۔''

وہ بات کرتے ہوئے رائفل بھی دیکھ رہے تھے اور وہ انہیں نشست گاہ میں دیوار پر لگی مل گئی۔ یہ بارہ بور کی سنگل بیرل رائفل تھی جس میں ایک وقت میں پانچ گولیاں آتی ہیں، اس کی گولیوں کا بیلٹ بھی وہاں موجود تھا۔ تیمور نے رائفل چیک کی وہ لوڈ تھی۔ اس نے گولیوں کا بیلٹ بھی اتار لیا اور شاداں کے ساتھ واپس حویلی میں آیا جہاں سین اور ساریہ لاؤنج میں موجود تھیں۔ ساریہ نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے، کچھ ہوا ہے؟''

تیمور نے سر ہلایا اور انہیں خدا بخش کی ہلاکت سے باخبر کیا۔ حسبِ توقع سین رونے لگی اور ساریہ کا چہرہ بھی ست گیا تھا۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ ''کہیں اسے پولیس نے تو نہیں مار دیا ہے۔''

''اسی نے مارا ہے۔'' سین چلائی۔ ''میں کہہ رہی تھی کہ وہ اس کے ساتھ غلط کریں گے۔''

''احمقانہ باتیں مت کرو۔'' تیمور نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ ''یہ اسی قاتل کا کام ہے جو زرغونہ بیگم اور ناڈیا کو قتل کر چکا ہے۔''

''آخر وہ اتنے لوگوں کو کیوں مار رہا ہے؟'' ساریہ نے پوچھا۔

''خود کو بچانے کے لیے۔'' تیمور نے کہا۔ ''لیکن وہ بچے گا نہیں، جو شخص بھی آخر میں اس دولت و جائداد کا دعوے دار ہوگا وہی اصل قاتل ہوگا۔''

وہ تینوں چونکیں۔ سین نے کہا۔ ''دعوے دار کیسے ہو سکتا ہے جب زرغونہ بیگم سے کسی کی رشتے داری ہی نہیں ہے۔''

''یہ تو آنے والا وقت بتائے گا۔'' تیمور نے کہا۔

''تم رائفل کیوں لائے ہو؟'' ساریہ نے تیمور کی طرف دیکھا۔

''اپنی اور تم سب کی حفاظت کے لیے۔'' تیمور نے کہا اور شاداں کی طرف دیکھا۔ ''تمام دروازے اور اوپری منزل کی کھڑکیاں چیک کرو۔ جو کھلی ہوں ان کو فوراً بند کرو اور ہاں باہر کی تمام روشنیاں آن کر دو۔''

شاداں چلی گئی۔ تیمور نے شاہنواز کو کال کی۔ وہ خدا بخش کی لاش لے کر اسپتال پہنچ گیا تھا۔ تیمور نے اس سے کہا۔ ”اگر ہو سکے تو چند پولیس والے یہاں بھیج دو۔“

”میں دیکھتا ہوں لیکن یہاں مشکل ہے۔ نفری زیادہ نہیں ہے۔“

”ایک دو بھی ممکن ہوں تو بھیج دو۔“ تیمور نے اصرار کیا۔ ”قاتل کا نشانہ اب ہم میں سے کوئی ہوگا۔“

”میں بھیجتا ہوں۔“

حالات اچانک سنسنی خیز ہو گئے تھے۔ شاداں واپس آئی اور اس نے رپورٹ دی۔ ”تمام کھڑکیاں اور دروازے بند ہیں۔“

”اب کوئی باہر نہیں جائے گا۔“

”کیوں؟“ ساریہ نے اکھڑ لہجے میں پوچھا۔ ”تم کون ہوتے ہو پابندی لگانے والے؟“

”میں اس گھر کے مالک کا پوتا ہوں اور فی الحال تم مجھے اس کا قائم مقام سمجھو۔ اس لیے یہاں میرا حکم چلے گا۔“

”میرا تم سے یا مالک سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”یہ بات تمہیں یہاں آنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھی۔“

”میں زرغونہ بیگم کے گھر آئی تھی۔“ ساریہ ہٹ دھرمی سے بولی۔

تیمور مسکرایا۔ ”اس کا پتا اب ریاست پور کا قبرستان ہے۔“

سیمین نے ساریہ سے کہا۔ ”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے، اس وقت کسی کا باہر جانا ٹھیک نہیں ہوگا۔ پتا نہیں کون ہے جو یوں ہمارے پیچھے پڑ گیا ہے۔“

ساریہ سوچتے ہوئے بولی۔ ”قاتل کون ہو سکتا ہے۔“

”وہ جو بھی ہے جلد سامنے آ جائے گا۔“ تیمور نے کہا۔

کچھ دیر وہاں خاموشی رہی پھر سیمین نے کہا۔ ”کیا ہم یہیں بیٹھے رہیں گے؟“

”نہیں حویلی میں کوئی پابندی نہیں ہے جہاں چاہے رہو مگر کوئی باہر نہ جائے اور اگر کوئی آئے تو اکیلا دروازہ نہ کھولے۔“

”تب میں آرام کروں گی۔“ ساریہ کھڑی ہو گئی۔ ”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔“ سیمین بولی اور شاداں کی طرف دیکھا۔ ”تم چائے بناؤ، میں دوا لے کر آتی ہوں۔“

تیمور لاؤنج میں موجود رہا۔ ساریہ اپنے کمرے سے ڈنر کے وقت آئی۔ سیمین نے بھی کچھ دیر آرام کیا۔ ڈنر شاداں نے بنایا تھا اور سب نے بے دلی سے کھایا۔ ڈنر کے بعد تیمور نے پوری حویلی کا ایک چکر لگانے کا ارادہ کیا تو شاداں بولی۔ ”باہر موسم خراب ہو رہا ہے۔“

تیمور چونکا کیونکہ جب شاہنواز خدا بخش کو لے کر روانہ ہوا تو موسم ٹھیک تھا اور آسمان صاف تھا۔ وہ شاداں کو عمارت کے مرکزی دروازے پر چھوڑ کر باہر آیا۔ واقعی موسم خراب تھا۔ تیز آندھی نما ہوا چل رہی تھی اور آسمان پر گہرے سرمئی بادل چھائے ہوئے تھے۔ تیمور نے چیک کیا، گیٹ بند تھا۔ اس نے احتیاطاً اسے اندر سے لاک کر دیا۔ پھر اس نے پوری حویلی کا ایک چکر لگایا۔ واپس آ کر اس نے شاداں کو دروازہ کھولنے کو کہا، اس کی آواز پہچان کر اس نے دروازہ کھولا۔ تیمور نے اسے بھی اندر سے لاک کر دیا اور چابیاں اپنی تحویل میں رکھیں۔ شاہنواز کے ساتھ جاتے وقت خدا بخش چابیاں اس کے حوالے کر گیا تھا۔ سیمین اور ساریہ اپنے کمروں میں جا چکی تھیں۔ اس نے شاداں سے پوچھا۔ ”تم کہاں سوؤ گی؟“

”میں یہاں لاؤنج میں سو جاؤں گی۔“

”نہیں یہ جگہ غیر محفوظ ہے، تم سیمین کے ساتھ سوؤ۔“

شاداں ہچکچائی۔ ”نہیں جی وہ پسند نہیں کریں گی۔ میں یہاں آرام سے سو جاؤں گی۔“

مگر تیمور کو مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ اتفاق کی بات تھی کہ سیمین اور ساریہ دونوں کے بیڈ رومز نیچے تھے اور یہاں مزید کوئی اضافی بیڈ روم نہیں تھا۔ باقی بیڈ رومز اوپر تھے۔ اس نے شاداں سے کہا۔ ”تم اوپر کے کسی بیڈ روم میں سو جاؤ اور دروازہ اندر سے بند رکھنا۔“

شاداں ہچکچائی۔ ”نہیں جی دوسرے کیا سوچیں گے؟“

”دوسرے جائیں بھاڑ میں۔“ تیمور نے سخت لہجے میں کہا۔ ”اس وقت اپنی حفاظت کے بارے میں سوچو۔“

اس بار شاداں نے انکار نہیں کیا اور اوپر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد تیمور نے عقبی اور دائیں باغ میں کھلنے والا دروازہ چیک کیا اور انہیں بھی اندر سے لاک کر دیا۔ وہ اوپر آیا۔ شاداں اس کے کمرے کے نزدیک ایک کمرے میں تھی۔ تیمور نے اسے ایک بار پھر کمرا اندر سے بند رکھنے کو کہا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ شام تک موسم اچھا تھا مگر اب ایسا لگ رہا تھا کہ آندھی کے ساتھ تیز بارش کا امکان ہے۔ دو دن سے پڑنے والی خاصی گرمی کے بعد بارش کا امکان تھا۔ اچانک بجلی چمکی اور بادل گرجے۔ اس کے فوراً بعد بہت تیز بارش شروع ہو گئی۔ ابھی رات کے

بارہ بجے تھے۔ بارش شروع ہوئے آدھا گھنٹا گزرا تھا کہ بجلی چلی گئی۔ مگر یہاں یو پی ایس موجود تھا۔ لائٹس اور پنکھے آن ہوگئے۔ البتہ اے سی اور دوسرے بجلی استعمال کرنے والے آلات بند تھے۔

بارش نے گرمی کا زور توڑ دیا تھا اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اے سی کا متبادل بن گئے تھے اس لیے تیمور نے کھڑکی کھلی چھوڑی اور اس کے سامنے راکنگ چیئر پر بیٹھ کر باہر سے آنے والے بھیگے جھونکوں سے لطف اندوز ہونے لگا۔ رائفل اس نے برابر میں رکھ لی تھی۔ اسے خبر نہیں ہوئی کہ کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ معاً اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں تاریکی تھی۔ بارش اور تیز ہوا کا سلسلہ جاری تھا۔ لائٹس بند تھیں اور پنکھا رک گیا تھا۔ یو پی ایس بند ہوگیا تھا۔ وہ اٹھا اور اس نے اپنا موبائل آن کرنا چاہا تو پتا چلا کہ وہ بھی بند تھا۔ اس کی چارجنگ ختم ہوگئی تھی۔ کمرے میں لگے ایل ای ڈی ٹی وی کے اسٹینڈ پر ایک جگہ ایمر جنسی لائٹ رکھی تھی۔ تیمور ٹٹول کر اس تک آیا اور اسے اٹھا کر آن کیا۔ یہ خاصی تیز روشنی والی لائٹ تھی۔ صبح کے چار بج رہے تھے۔ وہ باہر آیا اور شاداں کے دروازے پر دستک دی۔ اس کی سہمی ہوئی آواز آئی۔

”کون ہے؟“

”میں ہوں۔“ تیمور نے کہا تو اس نے تیزی سے دروازہ کھولا اور اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ تیمور بوکھلا گیا۔

”کیا ہوا؟“

”کوئی آیا تھا جی، پہلے لائٹ گئی اور پھر یو پی ایس والی لائٹ بھی بند ہوگئی۔ اس کے بعد کسی نے میرے کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ میں نے پوچھا کون ہے مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ میں بہت ڈر گئی تھی۔“

”فکر مت کرو، میں ساتھ ہوں تمہارے۔“ تیمور نے اسے الگ کیا۔ ”یہ بتاؤ جنریٹر کہاں ہے؟“

”نیچے ہے جی۔“

تیمور اس کے ساتھ نیچے آیا۔ مگر لاؤنج میں آتے ہی وہ ٹھٹک گیا۔ عمارت کا مرکزی دروازہ کھلا ہوا تھا اور تیز ہوا اندر آرہی تھی۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی تیمور چوکنا ہوگیا۔ اس نے ایمر جنسی لائٹ شاداں کو پکڑا دی اور خود دروازے تک آیا۔ اس نے باہر جھانکا جہاں تاریکی کا راج تھا اور دروازہ اندر سے بند کردیا۔ پھر وہ سبین اور ساریہ کے کمروں کی طرف بڑھا۔ مگر وہ دونوں ہی اپنے کمروں میں نہیں تھیں۔ ان کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ تیمور نے معائنہ کیا۔ کمرے اور ساتھ موجود واش روم میں کوئی نہیں تھا۔ شاداں نے سہمے لہجے میں پوچھا۔ ”یہ کہاں چلی گئیں؟“

یہی سوال تیمور کے ذہن میں تھا مگر اس نے شاداں سے کہا۔ ”پہلے ہمیں جنریٹر آن کرنا ہوگا۔“

جنریٹر حویلی کے تہ خانے میں تھا۔ شاداں اسے تہ خانے تک لائی۔ وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آئے اور اس نے سب سے پہلے ایمر جنسی لائٹ کی روشنی میں تہ خانے کا جائزہ لیا۔ یہاں بے شمار کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا اور لائٹ کا سارا سسٹم یہیں تھا۔ مین سوئچ اور بورڈ کو دیکھنا بیکار تھا۔ وہیں یو پی ایس تھا اور جنریٹر ایک کونے میں تھا۔ اس کا ایگزاسٹ پائپ باہر جارہا تھا۔ یہ اچھا خاصا بڑا اور ڈیزل سے چلنے والا جنریٹر تھا۔ تیمور نے اس کا فنکشن چیک کیا اور پھر اسے آن کرنے والا بٹن دبایا مگر کوئی ردعمل نہیں ہوا۔ کئی بار کوشش کے بعد جب اس نے پیچھے جاکر اس کا بیٹری والا پورشن چیک کیا تو وہاں سے بیٹری ہی غائب تھی۔ تیمور کی چھٹی حس اب پہلے سے زیادہ شور مچارہی تھی۔ وہ واپس آیا اور روشنی دکھاتی شاداں سے کہا۔ ”یہاں گڑبڑ ہے، کسی نے جنریٹر کی بیٹری غائب کردی ہے۔“

وہ ڈر گئی۔ ”کس نے؟“

”پتا نہیں۔“ تیمور نے کہا۔ ”شاید وہی قاتل ہے۔“

وہ اوپر آئے اور نچلے فلور پر سبین اور ساریہ کو تلاش کرنے لگے۔ تیمور نے شاداں سے کہا کہ وہ انہیں آواز دے۔ وہ انہیں آواز دے رہی تھی مگر کوئی جواب نہیں آرہا تھا۔ وہ عقبی سمت آئے جہاں دوسری نشست گاہ تھی اور جیسے ہی انہوں نے دروازہ کھولا اندر کھڑکی کے پاس سبین اور ساریہ کرسیوں پر بیٹھی نظر آئیں۔ ان کے سر ڈھلکے ہوئے تھے۔ تیمور بے ساختہ ان کی طرف بڑھا تھا۔ شاداں دروازے پر ہی کھڑی تھی۔ جیسے ہی تیمور سبین اور ساریہ کے نزدیک آیا عقب سے شاداں کی چیخ سنائی دی، اس کے ساتھ ہی نشست گاہ کا دروازہ زور سے بند ہوا اور باہر سے اس کی کنڈی لگنے کی آواز آئی۔ یہ دو پٹوں والا دروازہ تھا جس میں باہر کی طرف پالش شدہ دھات کی بنی مضبوط کنڈی تھی۔

تیمور دروازے کی طرف بھاگا اور اسے کھولنے کی کوشش کی مگر وہ لاک تھا۔ اس نے چیخ کر شاداں کو آواز دی۔ جواب میں اس کی صرف چیخ سنائی دی تھی اور یہ بھی دور سے آئی تھی۔ تیمور نے دروازے پر زور آزمائی کی اور مایوس ہوکر باہر نکلنے کے لیے کوئی دوسرا راستہ تلاش کیا۔ مگر یہاں سوائے ایک کھڑکی اور ایک دروازے کے اور کچھ نہیں تھا۔ کھڑکی پر فولادی گرل تھی۔ اسی طرح دروازہ بہت

مضبوط لکڑی کا تھا جسے توڑنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔
ایمرجنسی لائٹ شاداں کے پاس تھی اور شاید اس کے ہاتھ سے باہر ہی گر گئی تھی۔ یہاں اندھیرا تھا مگر رہ رہ کر چمکنے والی بجلی کمرے کو روشن کر رہی تھی۔ پھر اسے بندوق کا خیال آیا۔
اس نے بندوق کا رخ دروازے کی کنڈی کی طرف کر کے فائر کیا۔ دھماکا ہوا مگر دروازے پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ دوسرا اور پھر تیسرا فائر بھی بے سود گیا۔ اس نے رائفل سے باقی کارتوس نکال کر دیکھے۔ یہ ڈمی کارتوس تھے، ان میں صرف بارود بھرا ہوا تھا اور گولی غائب تھی۔ یہی حال بیلٹ میں لگے کارتوسوں کا تھا۔
تیمور نے سر تھام لیا۔ قاتل اس کے اندازے سے زیادہ چالاک اور عیار ثابت ہو رہا تھا۔ اس کی ہر پہلو پر نظر تھی۔ کچھ دیر بعد تیمور پلٹ کر سبین اور ساریہ کی طرف آیا۔
وہ بے ہوش تھیں اور ایسا لگ رہا تھا کہ بے ہوشی کسی دوا کے زیر اثر تھی۔ ان کی نبض کی اور سانس کی رفتار درست تھی۔ تیمور نے کھڑکی کھولی اور باہر دیکھا۔ بارش کا زور کم ہوا تھا مگر یہ اب بھی جاری تھی۔ وہ واپس دروازے تک آیا اور وقفے وقفے سے اسے بجانے لگا۔ وہ گھڑی دیکھ کر ہر دو منٹ بعد دروازہ رائفل کے بٹ سے بجاتا تھا اور اس کا شور اتنا ہوتا تھا کہ یقیناً عمارت کے باہر تک جا رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ پولیس یا کوئی اور آیا تو وہ اس شور کو ضرور سن لے گا۔ وقت گزر رہا تھا اور بالآخر اس کی جدوجہد رنگ لائی۔ ایک بار اس نے دروازہ بجایا اور پیچھے ہٹا تھا کہ باہر سے شامی کی آواز آئی۔ ”تیمور یہ تو ہے؟“
”خدا کا شکر ہے۔“ وہ لپک کر دروازے کے پاس آیا اور چلایا۔ ”شامی کھول اس منحوس دروازے کو۔“
”آہستہ یار۔“ شامی نے دروازہ کھولا اور اسے خیریت سے پا کر بولا۔ ”شکر ہے تو خیریت سے ہے۔“
”ہاں یار پر وہ شاداں کو لے گیا۔“
شامی نے اندر جھانکا اور سبین و ساریہ کو دیکھا۔ ”ان کو کیا ہوا ہے؟“
”بے ہوش ہیں۔“
”انہیں ہوش میں لانا ہوگا اس کے بعد تجھے ایک شاندار ڈراما دکھاتا ہوں۔“
”شامی اب سسپنس ختم کر، میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔“
”بس کچھ صبر اور میرے یار۔“ اس نے دونوں کا جائزہ لیا اور باہر جاتے ہوئے بولا۔ ”یہیں رہنا میں ایک منٹ میں آیا۔“
شامی کچھ دیر بعد آیا اور اس نے ایک شیشی باری باری سبین اور ساریہ کی ناک سے لگائی اور اس کا فوری ردعمل ہوا۔ وہ چونکیں اور ہوش میں آنے لگیں۔ شیشی میں یقیناً امونیا تھی۔ ان کے حواس بحال ہوئے تو پہلے سبین چلائی۔
”تم قاتل ہو۔“
تیمور بھونچکا رہ گیا۔ ”میں...؟“
ساریہ نے اس کی تائید کی۔ ”ہاں تم نے ہی ہمیں یہاں قید کیا ہے۔“
تیمور نے برہمی سے کہا۔ ”تم دونوں کیا بکواس کر رہی ہو۔“
”میں ابھی پولیس کو کال کرتی ہوں۔“ سبین اٹھتے ہوئے بولی۔
”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ شامی نے سکون سے کہا۔ ”پولیس آگئی ہے۔“
”شاداں کہاں ہے؟“ اب ساریہ نے پوچھا اور تیمور کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ اس کے ساتھ تھی۔“
”بدقسمتی سے وہ قاتل کا چوتھا شکار بن گئی ہے۔“ شامی کا لہجہ مغموم ہو گیا اور تیمور کا دل جکڑنے لگا۔ اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔
”کیا شاداں...؟“
”ہاں یار...“ شامی بولا۔ ”مجھے اور پولیس کو آنے میں دیر ہو گئی، قاتل اپنا کام کر کے جا چکا تھا۔“
”اس کے قاتل بھی تم دونوں ہو۔“ سبین چیخنے لگی۔ ”ہمیں تم نے یہاں قید کیا تھا۔“
”کیا خیال ہے یہ سب پولیس کے سامنے نہ بیان کیا جائے۔“ شامی بولا۔ ”ایس پی شاہنواز خان خود آیا ہوا ہے۔“
وہ لاؤنج میں پہنچے جہاں شاہنواز اور دوسرے پولیس والے موجود تھے اور فرش پر سفید چادر سے ڈھکی شاداں کی لاش پڑی تھی۔ اس پر کہیں کہیں خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ شاہنواز نے سبین اور ساریہ سے بیان لیا۔ ان دونوں نے بتایا کہ وہ اپنے کمرے میں سو رہی تھیں کہ تیمور نے دستک دے کر انہیں باہر بلایا اور پھر دھوکے سے بے ہوش کر دیا۔ جب انہیں ہوش آیا تو وہ کرسیوں پر بیٹھی تھیں۔ انہوں نے الزام لگایا کہ زرغونہ بیگم، نادیہ امبر، خدا بخش اور اب شاداں کے قتل میں یہی لوگ ملوث تھے۔ شاہنواز کے ساتھ اس کا ایک ماتحت سبین اور ساریہ کے دیے ہوئے بیان لکھ رہا تھا۔ بیان مکمل ہونے کے بعد ان پر سبین اور ساریہ کے دستخط لیے گئے اور جب یہ کام ہو گیا تو شاہنواز نے اپنے

آدمیوں کو حکم دیا۔ ''شاداں اور سراج کو لے آؤ۔''
سین اور ساریہ چونکیں۔ ان کے چہرے سفید پڑ گئے۔
سین نے جھپٹ کر لاش سے چادر اٹھائی تو اس کے نیچے ایک ڈمی پڑی تھی۔ شاہنواز نے دوسرا حکم ان دونوں کو ہتھکڑی پہنانے کا دیا تھا۔ سین چلائی۔ ''ہمارا قصور کیا ہے؟''
''جلد تم دونوں کو قصور کا بھی علم ہو جائے گا۔''
انہیں ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں۔ اسی لمحے باہر سے شاداں اور سراج اندر آئے۔ سراج کو بھی ہتھکڑی لگی تھی البتہ شاداں آزاد تھی۔ وہ دوڑ کر تیمور تک آئی۔ ''آپ ٹھیک ہیں؟''
''ہاں تم کیسی ہو، اس نے کوئی تکلیف تو نہیں دی۔'' تیمور نے دریافت کیا۔ شاداں کو زندہ پا کر اس نے سکون کا سانس لیا اور پھر شامی کو گھورا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔
''یہ تو مجھے مارنے والا تھا جی۔ اس نے مجھے پکڑ کر دروازہ بند کر دیا تھا۔'' شاداں نے سراج کی طرف اشارہ کیا۔ ''شامی صاحب نے آکر بچایا۔''
''تو تو آج آرہا تھا۔'' تیمور نے اس کی طرف دیکھا۔
''سب بتاتا ہوں یار۔'' شامی نے کہا اور شاہنواز کے پاس جا کر دھیمی آواز میں کچھ کہنے لگا۔ شاہنواز نے سین، ساریہ اور سراج کو وہاں سے لے جانے کا حکم دیا۔ پولیس والوں نے اپنا کام مکمل کر لیا تھا اور وہ گرفتار شدگان کو لے کر رخصت ہو گئے تھے۔ اب وہ چاروں رہ گئے تھے۔ صبح ہو رہی تھی۔ شاداں ان کے لیے ناشتا بنانے لگی۔ ساتھ ہی وہ ان کی گفتگو بھی سن رہی تھی۔ شامی کی فرمائش پر اس نے پہلے ان کے لیے چائے بنا دی تھی۔ تیمور نے پوچھا۔
''اب شروع ہو جا، یہ سب کیا ہے اور اصل قاتل کون ہے؟''
''یہ سب۔'' شامی نے اطمینان سے کہا۔
''یعنی سین، ساریہ، سراج اور خدا بخش؟''
''خدا بخش صرف مہرہ تھا اصل قاتل یہی تینوں ہیں۔ زرغونہ بیگم کا قتل سراج نے کیا جبکہ ناڈیا امبر اور خدا بخش کو ساریہ نے قتل کیا۔ ان کا اگلا شکار شاداں ہوتی۔''
''شاداں...'' تیمور چونکا۔ ''وہ کیوں؟''
''یہ کہانی خاصی طویل ہے لیکن مختصراً عرض کرتا ہوں۔ زرغونہ بیگم دادا جان سے محبت کرتی تھی اور اسی وجہ سے اس نے شادی نہیں کی۔ دوسری طرف میاں صاحب اس سے محبت کرنے لگے تھے۔ مگر زرغونہ بیگم نے ان سے شادی سے انکار کیا تو انہوں نے منت سماجت کر کے اپنے ساتھ حویلی میں رہنے پر آمادہ کر لیا اور وعدہ کیا کہ وہ کبھی اسے شادی یا کسی اور تعلق کے لیے مجبور نہیں کریں گے۔ اس شرط پر وہ یہاں رہنے کو تیار ہوئی تھی۔ اس کے ماضی کے بارے میں کسی کو علم نہیں تھا۔ مگر پھر ناڈیا امبر نے اسے دیکھ لیا اور وہ اس کے پاس آئی۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ اس نے زرغونہ بیگم کو بلیک میل کیا یا پھر زرغونہ بیگم کو اس پر ترس آگیا تھا۔ اس نے اسے یہاں رکھا اور اس کی کفالت کرنے لگی۔''
''سین؟'' تیمور نے کہا۔ ''یہ کون ہے؟''
''بہ ظاہر ناڈیا امبر کی بیٹی، کیونکہ وہ عادی شرابی تھی اور وہ کوئی ذمے داری نہیں اٹھا سکتی تھی۔ اس لیے زرغونہ بیگم نے سین کو اپنے پاس رکھا اور اس کی پرورش کی۔ ناڈیا امبر سے بچانے کے لیے اسے خدا بخش کی بیٹی ظاہر کیا۔ درحقیقت سین زرغونہ بیگم کی بیٹی ہے۔''
تیمور اچھل پڑا۔ ''وہ کیسے جبکہ زرغونہ بیگم نے شادی ہی نہیں کی؟''
''یہ تو وہی جانتی ہے کہ سین کا باپ کون ہے لیکن یہ حقیقت ہے زرغونہ نے میاں صاحب کی حویلی میں آنے سے پہلے اسے ایک سرکاری اسپتال میں جنم دیا تھا اور اس کا ریکارڈ بھی موجود ہے۔ سین اسی ریکارڈ کے بل بوتے پر اس دولت و جائداد پر اپنا دعویٰ ثابت کرتی جب پولیس دادا جان اور ہمیں گرفتار کر لیتی۔ مگر میں اس سے پہلے ہی ان کی حقیقت تک پہنچ گیا۔ مجھے سین اور ساریہ کی پیدائش کا ریکارڈ مل گیا اور میں واپس آرہا تھا مگر تجھ سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے پریشان ہو کر شاہنواز کو بھی کال کر دی۔ ہم یہاں بروقت پہنچے جب سراج شاداں کو بھی قتل کرنے والا تھا۔''
''یہاں تک بات سمجھ میں آتی ہے لیکن یہ ساریہ کہاں سے آئی اور ان کے ساتھ کیسے شامل ہوئی؟''
''وہ شروع سے ان کے ساتھ تھی کیونکہ ساریہ سین اور سراج کی بیٹی ہے۔'' شامی نے انکشاف کیا۔ ''اگر ان میں پہلے اختلاف تھا بھی تو اس دولت اور جائداد کے لیے وہ ایک ہو گئیں۔''
''ایک سوال اور ہے، ساریہ نے بیرونِ ملک رہتے ہوئے ناڈیا امبر کو کیسے قتل کیا؟''
''وہ جس ملک میں ہے اس کی سمندری حدود ہمارے پڑوسی ملک سے ملتی ہے۔ وہ بنا پاسپورٹ کے وہاں آئی اور وہاں سے غیر قانونی سرحد عبور کر کے یہاں آئی۔ اس نے ناڈیا امبر کو قتل کیا اور واپس چلی گئی۔''
''اسے تو سراج بھی قتل کر سکتا تھا پھر ساریہ نے اتنا بڑا خطرہ کیوں مول لیا؟'' تیمور نے اعتراض کیا۔
''شاید پولیس کو الجھانے کے لیے۔ سراج زرغونہ بیگم

کو قتل کرنے کے بعد واپس اسلام آباد چلا گیا تھا اور وہاں اپنی جاب کر رہا تھا۔ ممکن ہے ناڈیا امبر کو عجلت میں راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کیا گیا ہو کیونکہ وہ سیبن اور ساریہ کی حقیقت جانتی تھی۔ اس قتل کے بعد ساریہ واپس گئی اور پھر قانونی طریقے سے واپس آئی۔ زرغونہ اور ناڈیا کے قتل کے وقت وہ باہر تھی اس لیے خود بہ خود شک سے بری ہو گئی۔ اسی نے خدا بخش کو قتل کیا کیونکہ وہ سارے کھیل سے واقف تھا اور پولیس کے سامنے سب اُگل سکتا تھا۔ پولیس نے وہ بائیک اور لباس برآمد کر لیا ہے جو وہ قتل کے وقت پہنے ہوئے تھی۔“

”میرے خدا! میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ لڑکی اس قدر خطرناک ثابت ہوگی۔“ تیمور نے سرہلایا۔

”سیبن اور سراج خدا بخش کے قتل کے وقت حویلی اور ہوٹل میں تھے۔ پھر سراج وہاں سے روانہ ہوا تاکہ اس کھیل کا خاتمہ کر سکے۔ شاداں کے قتل کے بعد اس کا الزام ہم پر لگایا جاتا اور طے ہو جاتا کہ دادا جان اور ہم ہی ان وارداتوں کے پسِ پشت ہیں۔ ہمیں سزا نہ بھی ہوتی تب بھی یہ لوگ بچ نکلتے اور زرغونہ بیگم کی دولت اور جائداد کے وارث بھی قرار پاتے۔“

”سیبن نے اپنی ماں کو بھی نہیں چھوڑا۔“ تیمور نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”لیکن زرغونہ بیگم نے اسے کیوں وارث نہیں بنایا۔“

”شاید وہ ایسا ہی کرتی لیکن دولت و جائداد کی اصل وارث آگئی تھی اور زرغونہ بیگم اس کے اٹھارہ سال کے ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔“ شامی نے شاداں کی طرف دیکھا۔ ”بدقسمتی سے اس سے پہلے بیماری نے اسے موت کے دہانے پر پہنچا دیا۔ پھر اسے ان تینوں سے اپنی جان کا خطرہ محسوس ہونے لگا اور اس نے ان لوگوں کو بے نقاب کرنے کے لیے اپنی دولت و جائداد دادا جان کے نام کر دی۔ اس نے چھپایا تھا مگر ان تینوں کو کسی طرح علم ہو گیا اور انہوں نے یہ منصوبہ بنایا۔“

”شاداں کیسے وارث ہو سکتی ہے؟“

”میاں صاحب نے ایک شادی دورانِ طالب علمی چھپ کر کی تھی۔ اس خاتون سے ان کا ایک بیٹا تھا اور شاداں اسی کی اکلوتی بیٹی ہے۔ اس لحاظ سے وہ وارث بنتی ہے۔ ان لوگوں کے شر سے بچانے کے لیے اس نے اسے ملازمہ ظاہر کیا اور اس کے ماں باپ کے بارے میں جھوٹ بولا کہ وہ دریا میں بہہ گئے تھے۔“

”سراج سیبن کو چھوڑ چکا تھا، وہ اس معاملے میں کیسے شامل ہوا؟“

”جب اسے سیبن کی حقیقت کا پتا چلا تو وہ لوٹ آیا اور اسی نے یہ منصوبہ تیار کیا تھا۔ اسی نے شکور کے بھانجے کی مدد سے نواب صاحب کا پستول چوری کرایا اور زرغونہ بیگم کو گولی مارنے کے بعد وہیں چھوڑ دیا۔ ساریہ باپ کی طرح مجرم ذہن رکھتی تھی۔ وہ خوشی سے راضی ہو گئی اور سیبن پہلے ہی ماں سے نفرت کرنے لگی تھی کہ اس نے اس کے بجائے کسی اور کو وارث بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔“

”میرے خدا۔“ تیمور نے سر سہلایا۔ ”یہ تو ایک تیر سے کئی شکار کرنے والی بات ہے۔“

”زندگی فسانے سے زیادہ حیرت انگیز ہوتی ہے۔“ شامی نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

تیمور نے رشک سے شامی کو دیکھا۔ ”تجھے کیسے شک ہوا؟“

”یار کسی فلسفی نے گم شدہ گھوڑے کے بارے میں سوچا تھا کہ وہ گھوڑا ہوتا تو کہاں جاتا؟ جو جواب آیا اس کی بنیاد پر اس نے گم شدہ گھوڑا تلاش کر لیا۔ تو میں نے سوچا کہ فرض کیا جائے کہ دشمنوں کا منصوبہ کامیاب ہوتا ہے تو وہ اس کے بعد کس بنیاد پر زرغونہ بیگم کی دولت و جائداد حاصل کریں گے۔ ظاہر ہے اس کا ایک ہی جواب ہے حقِ وراثت کے تحت اور پھر میں نے سینٹرل ریکارڈ کے لیے شہر کا رخ کیا۔ وہاں مجھے کامیابی ملی۔ سیبن اور ساریہ کے برتھ سرٹیفکیٹس مل گئے۔ البتہ شاداں کے بارے میں سراج نے بتایا۔“

”اس کا مطلب ہے تم لوگ خاصا پہلے یہاں آ گئے تھے۔“ تیمور نے خفگی سے کہا۔ ”مجھے بلاوجہ اندر بند رکھا۔“

”صرف اس لیے کہ ان تینوں کو پوری طرح جکڑا جائے۔ شاداں کی موت بھی اسی لیے ظاہر کی کہ سیبن اور ساریہ کھل کر سامنے آ جائیں اور وہ آ گئیں۔ ان کا اپنا بیان اب ان کے گلے پڑے گا اور وہ سازش میں شریک ہونے سے کسی صورت انکار نہیں کر سکتیں۔“

تیمور نے کام کرتی شاداں کو دیکھا۔ ”اس کے مزے ہیں، بیٹھے بٹھائے اتنی بڑی حویلی اور دولت کی مالک بن گئی۔“

شاداں ناشتا لگانے لگی تو شاہنواز اٹھ گیا۔ اسے ابھی بہت سے کام کرنے تھے۔ اس کے جانے کے بعد شامی نے شاداں سے کہا۔ ”کیا خیال ہے ہمارے ساتھ چلو گی یا یہیں رہو گی۔“

”سچ آپ مجھے لے جائیں گے۔“ وہ خوش ہو گئی۔ شامی اور تیمور اس کی معصومیت پر مسکرانے لگے۔

عمر قید

احمد اقبال

اس دورِ عذاب میں جب سورج ڈوبنے لگتا ہے... اور درختوں کے سائے دراز ہوجاتے ہیں تو بے ساختہ دل سے دعا نکلتی ہے... اے تاریکیو... پیچھے ہٹ جاؤ... اور روشنی کی کرن نمودار ہونے دو... وہ بھی ہراساں و پریشان... ایک ایسے ہی دوراہے پر کھڑا تھا... جہاں ایک طرف نجات تھی... اور دوسری طرف عمر قید... فیصلے کی گھڑی چند ساعتوں پر مشتمل تھی... آر... یا پار... زندگی کس نہج سے گزرتی ہے... کاروانِ حیات کن کن شعلہ چکاں... شب و روز سے نبرد آزما ہوتا ہے... وہ ان راستوں کا دوبارہ شاہد نہیں بننا چاہتا تھا... ان راہوں سے کٹ کر ایک نئی زندگی کا آغاز ہی اسے ماضی سے چھٹکارا دلا سکتا تھا... جذبات پر قابو پاکے... ضمیر کو الوداع کہنے والے مسافر کی آبلہ پائی...

خواہشات و احساسات... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کا فسانۂ حیات

گھڑی گھڑی، گھڑی مت دیکھو... آئی گھڑی بھی ٹل جاتی ہے۔

کسی اُڑ جانے والے ریکارڈ کی طرح یہ فضول بات اس کے دماغ میں پھنس کے رہ گئی تھی مگر اس کے چاروں طرف گھڑیاں تھیں، دیوار پر، اس کی کلائی پر، موبائل فون میں، آرائش کے لیے استادہ مجسمے کی دونوں آنکھوں میں اور سب کی سوئیاں ایک دوسرے کے ساتھ دوڑ لگا رہی تھیں۔ وقت کو پیچھے چھوڑتی جا رہی تھیں اور کسی صورت ان کی گردش کو الٹا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہندسے الٹے لکھنے سے بھی فرق نہیں پڑ سکتا تھا اور بالفرض محال ایسی مشین لگا دی جائے گھڑی میں تو...

انتظار میں یلغار کرنے والے بے سروپا خیالات یوں بکھر گئے جیسے گلاس ٹاپ ٹیبل پر اچانک پتھر آ گرے۔ ایک شخص اس کے مقابل آ بیٹھا۔ وہ شہاب کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا اور اس کے سامنے والے تمام بدنما دانت صاف نظر آ رہے تھے۔ اس کا رنگ گہرا سانولا تھا چنانچہ بڑھی ہوئی شیو کے سفید بال ازخود اس کی عمر کے چالیس سال سے زیادہ ہونے کا ثبوت تھے۔ سر کے بال چھوٹے چھوٹے اور کھڑے ہوئے تھے۔ اس کا لباس ایک بوسیدہ چارخانے والی شرٹ اور جینز کی پینٹ پر مشتمل تھا۔

''تم... کون ہو...؟'' شہاب نے اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک دیکھ کر پوچھا۔

''تم بتاؤ۔'' اس کی مسکراہٹ کچھ اور پھیل گئی۔

جھنجلاہٹ کے ساتھ اسے غصہ بھی آیا۔ یہاں وہ کسی اجنبی کا انتظار نہیں کر رہا تھا اور نہ ایسے بوجھو تو جانیں جیسے گیم کھیلنے کے موڈ میں تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''دیکھو، مجھے تم صورت آشنا بھی نہیں لگتے اور میں یہاں تمہارا نہیں کسی اور کا انتظار کر رہا ہوں۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔ ''تمہارا نام شہاب خان ہے نا... میرا شیر علی سمجھ لو حالانکہ میں بلی

سے بھی زیادہ معصوم اور بے ضرر ہوں۔''

شہاب نے پھر گھڑی دیکھی۔ ''فضول باتیں چھوڑو۔ تم کیا چاہتے ہو... شیر علی۔''

شیر علی نے دانتوں پر زبان پھیری۔ ''کچھ بھی نہیں۔ بس باہر سے گزرتے گزرتے شیشے میں سے تمہیں دیکھا۔ پاکستانی چہرے ذرا کم ہی نظر آتے ہیں، برادر اسلامی ملک کے اس شہر میں۔''

''یہ تمہارا خیال ہے ورنہ ٹورسٹ بہت ہیں اور یہاں انڈین، پاکستانی بھی آباد ہیں جو ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔''

اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''گو موز تباک، بہت مہنگا ریسٹورنٹ ہے کیا تم مجھے ٹرکش کافی اور اس کے ساتھ گرما گرم کو مو سینڈوچ نہیں کھلاؤ گے؟''

شہاب کو اب واقعی غصہ آ رہا تھا۔ ''بالکل نہیں۔''

''تم افورڈ کر سکتے ہو۔''

''تم سمجھتے کیوں نہیں، یہاں میں کسی کا انتظار کر رہا ہوں۔'' شہاب برہمی سے بولا۔

''جیسے ہی وہ آئے گی، میں اپنا سینڈوچ اور کافی کا مگ لے کر کسی دوسری ٹیبل پر چلا جاؤں گا۔ کوئی لڑکی ہوگی نا؟''

''تم حد سے بڑھ رہے ہو۔ مجھے مجبور کر رہے ہو کہ میں انتظامیہ سے کہہ کے تمہیں نکلوا دوں کہ میں اس اجنبی کو نہیں جانتا، یہ مجھے پریشان کر رہا ہے۔''

وہ انگلی کھڑی کر کے ہلانے لگا۔ ''نا نا نا... اجنبی مت کہو... ہم وطن تو خیر ہوں۔ تمہارے شہر کا بھی ہوں۔ جانتا ہوں تم کون ہو اور اس سے پہلے.... کہاں تھے۔ الیکشن اسی سال ہوئے تھے جب پیپلز پارٹی جیتی تھی۔ تم راجا کرم داد اور جیتنے والی پارٹی کے امیدوار کے ساتھ تھے بلکہ اس کی بیٹی عائشہ کو پسند بھی کرتے تھے۔ حالانکہ تم نے خود کو بہت بدلا ہے ظاہری طور پر لیکن پھر بھی میں نے پہچان لیا تمہیں۔''

شہاب کے کان کھڑے ہوئے۔ اس نے غور سے اپنا نام شیر علی بتانے والے کو دیکھا مگر کچھ یاد نہ آیا۔ سوائے ان واقعات کے جو الیکشن کے دوران میں اور اس کے بعد پیش آئے تھے لیکن وہ کون تھا، کیا چاہتا تھا، یہ سب پوچھنے کا نہ وقت تھا اور نہ یہ موقع۔

"چلو مان لیا کہ تم مجھے جانتے ہو مسٹر شیر علی... کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم پھر کبھی ملیں تو بات کریں کسی اور جگہ..."

شیر علی نفی میں سر ہلانے لگا۔ "بات یہ ہے شہاب کہ میں بھوکا ہوں۔ آگے جا کے میں کچھ نہ کچھ کھا کے پیٹ بھر لیتا۔ پردیس میں کون دیکھنے والا ہے۔ آدمی بھیک مانگ لے۔ سیاح تو بہت پھرتے ہیں یہاں جن کے پاس فالتو پیسا ہوتا ہے لیکن تمہیں اور اس جگہ کو دیکھ کر میرا دل للچا گیا۔ یہ بڑے کمال کا "کومو" سینڈوچ بناتے ہیں۔ تمہیں تو معلوم ہوگا یہاں رہتے ہو.. بتل اور پنیر والے۔"

"تم یہ بھی جانتے ہو؟"

وہ مسکرایا۔ "اس کا اندازہ تو ایک نظر میں ہو جاتا ہے کہ تم ٹورسٹ نہیں ہو۔" اس نے میز پر سے چابی اٹھائی اور الٹ پلٹ کر دیکھا۔ "یہ کار تمہاری ہے نا۔ ایسی کاریں پاکستان میں نہیں ہوتیں۔ جاپان کی اجارہ داری ہے وہاں۔ آرڈر دے دو پلیز۔"

شہاب کو اس کے انداز میں لجاجت دکھائی نہ دیتی تھی۔ وہ درخواست نہیں کر رہا تھا، حکم دے رہا تھا۔ اگرچہ ابھی تک اس نے اپنا لہجہ عاجزانہ رکھا تھا۔ شہاب کے خیالوں میں کہیں کوئی الارم سنائی دینے لگا۔ کوئی خطرے کی گھنٹی بج رہی تھی جس کو نظرانداز کرنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ وہ مسلسل اس پُراسرار نظر آنے والے اجنبی کی صورت دیکھ رہا تھا مگر اسے پہچاننے سے قاصر تھا۔

الیشا ابھی تک نہیں آئی تھی اور اب اس کے آنے کا امکان بھی ختم ہوگیا تھا۔ وہ وقت کے معاملے میں اتنی پابند تھی کہ کئی بار شہاب سے پہلے جائے ملاقات پر پہنچ جاتی تھی۔ ازمیر ابھی استنبول جیسا بین الاقوامی شہر نہیں بنا تھا جہاں ٹریفک جام اکثر وقت پر پہنچنا مشکل بنا دیتے تھے۔ لیکن اسے فون کر کے مطلع تو کرنا چاہیے تھا۔ اس نے میز پر چپ پڑے موبائل فون کو دیکھا۔

"آپ کچھ لیں گے سر؟" ایک ویٹر نے قریب آکر پوچھ ہی لیا۔

شہاب کے لیے آرڈر دینا ضروری ہوگیا۔ "ہاں، دو کافی... ایک ٹرکش... ایک "کیپے چینو" اور "کومو" دو پلیٹ۔"

شیر علی عیاری سے مسکرایا۔ "یعنی اب تم مایوس ہوگئے ہو؟ وہ نہیں آئے گی... تمہاری بیوی..."

"نہیں۔" شہاب نے سختی سے جواب دیا۔

"پھر ضرور ہونے والی بیوی ہوگی۔ میں ایک کال کر لوں؟" اس نے موبائل فون اٹھا لیا۔

شہاب نے جھپٹ کر فون چھین لیا۔ "اپنی حد میں رہو۔ تم میرے بے تکلف دوست نہیں ہو۔ صرف ہم وطن اور ضرورت مند جان کے میں نے تمہاری بات مان لی ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم کون ہو۔"

"میرا نام شیر علی ہے، میں نے بتایا۔"

"نام شیر علی ہو یا کچھ اور... تم یہاں ایران کے راستے یونان جانے کے لیے غیر قانونی طور پر رکے ہو اور یورپ یا امریکا جاؤ گے۔ اگر میں چاہوں تو ابھی تمہیں پولیس کے حوالے کر سکتا ہوں۔"

ویٹر نے کافی اور کومو کی دو پلیٹیں لوازمات کے ساتھ ان کے سامنے رکھ دیں۔

وہ ندیدوں کی طرح کھانے لگا۔ "پولیس کو بیچ میں لانے سے زیادہ نقصان تمہارا ہی ہوگا۔" وہ کھاتے کھاتے شہاب کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ "میرا کیا ہے، ایک ناکام کوشش پہلے کر چکا ہوں یونان والوں نے پکڑ کے پاکستان بھیجا تو کچھ دن اپنے ایف آئی اے والوں کی تحویل میں رہا... دینے دلانے کو تھا نہیں مگر ایک انسپکٹر اپنی طرف کا نکل آیا... وہ اب بھی ہوگا۔"

شہاب کے غصے اور حیرانی میں اب خوف بھی شامل ہو گیا تھا۔ "میرا کیا نقصان ہوگا؟"

"تم خود جانتے ہو۔ اب تمہارے مخالف برسرِاقتدار ہیں۔ سیاسی مخالفین کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے، یہ تم سے بہتر کون جانتا ہوگا اور اس کی تو ضمانت ہی ضبط ہوگئی تھی جس کے لیے تم نے کام کیا۔ ہر ناجائز اور غیر قانونی۔"

شہاب کی سمجھ میں ساری بات آچکی تھی۔ وہ کوئی محرمِ رازِ درونِ مے خانہ تھا۔ اندر کی بات جاننے والا جس سے وہ خود نا آشنا تھا۔ ایسے نہ جانے کتنے ہوں گے جن کو وہ بھول چکا تھا لیکن وہ اسے نہیں بھولے تھے۔

شہاب نے مفاہمت کا راستہ اختیار کرنا بہتر سمجھا اس لیے پُرسکون ہو کے کہا۔ "ازمیر سے کہاں جاؤ گے اور کب؟"

"کب کا تو پتا نہیں۔" وہ کھانے کے بعد پُرسکون ہو

کے کافی پینے لگا۔ ”مگر یہاں سے تمہارے گھر جا رہا ہوں۔“
شہاب بھونچکارہ گیا۔ ”میرے گھر؟“
”ہاں، یہ تو اندازہ کر لیا میں نے تمہارے لباس سے اور اس کار سے تمہارے موبائل فون سے اور جس طرح تم نے ترکی میں ویٹر سے بات کی اور سب سے بڑھ کر اس سے کہ تم یہاں کسی لڑکی کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ پیشہ ور ہرگز نہیں ورنہ ضرور آتی اور تمہاری اس کے لیے بے چینی کے جذبات دیکھ کر... کیا تم اس سے شادی کرنے والے ہو، شہریت حاصل کرنے کے لیے؟“
شہاب کی زبان گنگ ہو گئی۔ یہ آدمی اس کی توقع سے زیادہ چالاک اور خطرناک تھا۔ وہ اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا۔ اس نے جھوٹ بولا تھا کہ گزرتے گزرتے اسے شہاب نظر آ گیا تو وہ رک گیا۔ وہ نہ جانے کب سے اس کا پیچھا کر رہا تھا اور اس کے بارے میں تفصیلی معلومات رکھتا تھا۔ پرانی بھی اور نئی بھی... اس سے پیچھا چھڑانا آسان نہیں تھا۔
میز پر رکھے موبائل فون پر الیشا کی کال آ گئی تھی۔ شہاب نے اپنی پسند سے اس کی رنگ ٹون الگ رکھی تھی مگر اس سے پہلے کہ وہ فون اٹھاتا، شیر علی اسے اٹھا چکا تھا اور غور سے اس کے نمبر کو دیکھ رہا تھا۔
”یہ کیا بدتمیزی ہے؟“ شہاب آگ بگولا ہو کے اٹھا اور اس نے فون چھین لیا۔
”نمبر محفوظ ہو گیا میرے دماغ کی میموری میں۔“ شیر علی نے خباثت بھری مسکراہٹ سے اعلان کیا۔
شہاب نے ضبط سے کام لیا اور الیشا سے بات کی۔ ”خیریت ہے نا الیشا؟“ اس نے ترکی زبان میں پوچھا۔
”الیشا؟“ شیر علی نے لبوں پر زبان پھیر کر دہرایا۔
الیشا کی آواز آئی۔ ”سوری ڈارلنگ... ایک معمولی سا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔“
”تم تو ٹھیک ہو نا؟“
وہ ہنسی۔ ”گھبراؤ نہیں۔ سب ٹھیک ہے۔ گاڑی بھی لیکن قانونی کارروائی تو ہوتی ہے نا... اور اس کے بعد گاڑی اسٹارٹ نہیں ہوئی۔ بس ایک تار ٹوٹ گیا تھا۔ تم کہاں ہو؟“
”وہیں، تمہارے انتظار میں۔“
”اوہ شہاب، مجھے معاف کر دو۔ میں اب نہیں آسکتی۔ تم کال کر لیتے۔“
”وہ... بس تھی ایک مجبوری اور بھی... اور میرا خیال تھا کہ تم آجاؤ گی... خیر، کل ملیں گے۔“
”ضرور... تم نے بڑی کوفت اٹھائی، آئی لو یو۔“ یہ آخری بات اس نے انگریزی میں کہی تھی۔
شہاب نے جواب ترکی میں دیا تھا۔ ”تمہارا عشق تو میری جان لے لے گا کسی دن۔“
وہ ہنسی۔ ”بری بات منہ سے مت نکالو۔ وہ دن پہلے آجائے گا جب ہم ایک ہو جائیں گے۔“
شہاب نے فون بند کر دیا اور خون آشام نظروں سے شیر علی کو دیکھا جو ڈھیٹ بنا بیٹھا تھا۔
”آخر تم چاہتے کیا ہو؟“
ویٹر نے بل اس کے سامنے رکھ دیا جو اشارہ تھا کہ اب آپ کو شرافت سے اٹھ جانا چاہیے کیونکہ آپ کی ریزرویشن بھی نہیں ہے۔ اس نے کارڈ نکال کے بل پر رکھ دیا۔
”جلدی کیا ہے۔ گھر چل کے بات کرتے ہیں۔“ شیر علی اٹھ کھڑا ہوا۔
”اگر میں انکار کر دوں پھر...؟“ شہاب نے کہا۔
وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ ”مجھے یقین ہے کہ تم ایسی کوئی بےوقوفی نہیں کرو گے جس سے تمہاری اچھی بھلی پرسکون اور خوش حال زندگی کا باقی حصہ پاکستان کی کسی جیل میں عمر قید کاٹتے گزرے... قتل کی کم سے کم یہ سزا تو ہے...“
”میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔“
وہ شہاب کو دیکھتا رہا۔ ”تم نے جس کے کہنے پر قتل کیا تھا، اب وہ مخالف پارٹی میں ہے اور وزیر مملکت ہے۔ اس پر بھروسا مت کرنا۔ ہے نا بریکنگ نیوز؟“
اچانک شہاب نے معاملے کو اسی جگہ طے نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ تو شیر علی ایک آدمی ہی... جس کا قانونی وجود یہاں ثابت نہیں ہوتا۔ یہ بات اس نے تسلیم کر لی تھی تو قانون بھی تسلیم کرے گا کہ وہ لاوارث تھا۔ ظاہر ہے اس کی تمام سفری دستاویزات یا تو سرے سے ہوں گی ہی نہیں یا پھر جعلی ہوں گی اور شاید اسے ایران کے راستے یہاں لانے والوں کی تحویل میں ہوں گی جن کا اپنا پتا ٹھکانا نہیں ملتا۔ وہ ہر سرحد کے بعد یا سفر کی ہر منزل میں خود بخود بدل جاتے ہیں۔ شیر علی کی حیثیت اس ریت کے ذرّے جیسی ہے جو ایک صحرا کی بے کراں وسعت سے سیکڑوں ہزاروں میل دور کے کسی صحرا کی ریت میں مل جائے...
گاڑی کو اس نے جانتے بوجھتے اس کے لیے مخصوص جگہ پر کھڑا نہیں کیا۔ ہر اپارٹمنٹ کے رہنے والوں کو ایک

کار کی جگہ نیچے الاٹ کر دی گئی تھی۔ سب کی گاڑی اپنی مقررہ جگہ پر ہی کھڑی ہوتی تھی۔ یہ اتفاق تھا کہ ساتھ والی بلڈنگ میں رہنے والی خاتون جس کے ساتھ شہاب کی اتفاقیہ علیک سلیک انہیں قریب لے آئی تھی۔ وہ پچاس سال سے زائد عمر کی عورت تھی جو شوہر کے حادثے میں مرجانے اور بیٹوں کے کاروبار کے لیے استنبول میں رہائش اختیار کر لینے کے بعد تنہا رہ گئی تھی۔ ماں سے ملنے کی انہیں فرصت نہ تھی چنانچہ ہر چار چھ مہینے بعد وہ چند دن ان کے ساتھ گزار آتی تھی۔ اسے لاؤنج میں سونا پڑتا تھا اور اس کی حیثیت ایک ناپسندیدہ مہمان جیسی رہتی تھی۔ ہر جگہ وہ پہلے سے زیادہ دل برداشتہ ہو کے آتی تھی تو دوبارہ نہ جانے کا عہد کرتی تھی مگر چھ مہینے پورے ہونے سے پہلے ہی جذباتی شکست مانتے ہوئے پھر نکل جاتی تھی۔

شہاب نے گاڑی اس عورت کی گاڑی والی جگہ پر کھڑی کی جو استنبول گئی ہوئی تھی۔ تھوڑا سا فاصلہ اس نے فٹ پاتھ پر گاڑیوں کی قطار کے پیچھے دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے طے کیا۔ اس وقت گلی میں نظر کوئی نہ آتا تھا۔ اوپر رہائشی کمروں کے دریچے روشن تھے یا اسٹریٹ لائٹس کا اجالا تھا۔ شہاب کے ذہن میں اپنی بلڈنگ کے ..... گارڈ کا مسئلہ تھا جو آتے جاتے لوگوں پر نظر رکھتا تھا۔

اچانک اس کی یہ پریشانی بھی دور ہو گئی۔ کسی مسجد سے اذان عشا کی آواز سنائی دی۔ شہاب ایک دم رک کر بیٹھا اور جوتے کے تسمے کھول کے بوٹ اتارا۔ ''ایک کنکر ہے یا کچھ اور...'' وہ بولا اور جوتا اتار کے اسے فٹ پاتھ پر الٹا کر کے دو چار مرتبہ جھاڑا۔ دوبارہ جوتا پہننے اور تسمے باندھنے کے عمل میں چند منٹ گزر گئے، اسے اتنی ہی مہلت درکار تھی۔ اب اسے یقین تھا کہ گارڈ مخالف سمت میں رخ کیے جا نماز پر کھڑا ہو گا اور دس منٹ تک کسی آتے جاتے کو نہیں دیکھے گا۔ اس وقفے میں کسی کو بات کرنی ہو تو وہ انتظار کا برا نہیں مانتا تھا۔

شہاب اپنے بن بلائے گلے پڑ جانے والے مہمان کو گیٹ سے گزار کے اوپر لے گیا۔ شیر علی کو اپنے اپارٹمنٹ میں داخل کرنے تک شہاب زیادہ پُراعتماد ہو گیا تھا۔ حالات اس کی مدد کر رہے تھے۔

شیر علی کی آواز پر وہ چونکا۔ ''ایسے کیوں کھڑے ہو جیسے مہمان تم ہو اور میں کہوں گا کہ بیٹھو۔''

شہاب نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ لانا ضروری سمجھا۔ شیر علی اب سینٹر ٹیبل پر پیر پھیلائے نیم دراز تھا۔

''دراصل میں رات کو تمہارے سونے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بیڈروم ایک ہی ہے۔''

وہ ہنسا۔ ''تمہارے ساتھ بیوی تو ہوتی نہیں۔''

شہاب نے جلدی سے کہا۔ ''وہ... دراصل مجھے کسی کے ساتھ نیند نہیں آتی۔''

''یہ کہو کسی دوسرے مرد کے ساتھ۔'' شیر علی نے ہنس کے اسے آنکھ ماری۔ ''کوئی بات نہیں، میں یہاں لاؤنج میں سو سکتا ہوں۔''

شہاب نے سکون کا سانس لیا کہ زبردستی کے مہمان نے اسے لاؤنج میں سونے کا مشورہ نہیں دیا۔

لباس بدلتے ہوئے اس کا دماغ ٹاپ گیئر میں چلنے لگا۔ آسان طریقہ گوگل سرچ کی طرح فوراً اس کے سامنے آ گیا۔ وہ اطمینان سے کچن کی طرف بڑھا۔ شیر علی کے لیے ''آخری طعام'' تیار کرنے میں اسے دس منٹ لگتے۔ اس نے طعام کو کچھ دیر کے لیے ملتوی کر دینا بہتر سمجھا جب تک خود معزز مہمان بھوک کی شکایت نہ کرے، ابھی تو وہ ''کوموز'' ٹھونس کر آیا تھا۔

''غلام حسین... اوہ، معاف کرنا... میری زبان پر تمہارا پرانا نام آ گیا۔ یہاں کوئی اور تو ہے نہیں۔''

شہاب چونکا۔ ''تمہیں کس نے بتایا کہ یہاں میرا نام شہاب ہے؟''

''بہت دیر سے خیال آیا تمہیں یہ پوچھنے کا۔ نام کی تختی جو باہر لگی ہے۔ وہ تو میں نے ابھی دیکھی۔ دراصل تم کو ریسٹورنٹ میں دیکھ کر میں نے ایک ویٹر سے پوچھا تھا کہ ان صاحب کا نام کیا ہے؟ میرا خیال تھا کہ اسے معلوم نہیں ہو گا یا وہ بتائے گا نہیں مگر اس کی جگہ دوسرا ویٹر بول پڑا۔ بعد میں پتا چلا کہ تم نے ریزرویشن نہیں کرائی تھی تو میں سمجھ گیا کہ تم وہاں اکثر آتے ہو۔ بھاری ٹپ بھی دیتے ہو گے ورنہ ویٹر نام کہاں یاد رکھتے ہیں۔ ہاں وہ عائشہ کہاں ہے اب... اس سے رابطہ تو تھا تمہارا...''

اس چالاک آدمی کے ذہن نے صحیح نتائج اخذ کیے تھے۔ حیرت تھی کہ وہ جعلی ریکروٹنگ ایجنٹ کے فریب میں کیسے آ گیا تھا۔ شاید اسی کو قسمت کہتے ہیں جب شامتِ اعمال آدمی کو آواز دیتی ہے تو وہ سوچے سمجھے بغیر لبیک کہتا ہے اور خود بخود وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں فرشتۂ اجل اس کے انتظار میں ہوتا ہے کہ جس کی روح مجھے یہاں قبض کرنے کو کہا گیا ہے، وہ تو کہیں اور پھر رہا ہے۔ ٹھیک ٹھاک اور بے فکر۔''

اب شیر علی پرانی باتیں کر رہا تھا۔ خصوصاً وہ باتیں جن سے شہاب پر دباؤ بڑھے۔ وہ بلیک میل کرنا جانتا تھا۔

شہاب نے اسے روک دیا۔ ''چھوڑو پرانی باتیں۔ سب مجھے یاد ہے، یہ بتاؤ کہ مجھ سے تم کیا چاہتے ہو؟ کھانا ہم تھوڑی دیر میں کھائیں گے۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''بہتر یہی ہے کہ ہم ایک دوسرے کا پردہ رکھیں اور مدد کریں۔''

وہ ایک دم سیدھا بیٹھ گیا۔ ''ہے مسٹر غلام حسین آف موضع کلیار اعوان تحصیل و ضلع راولپنڈی... تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے ہو۔ ایک مقصد میرے سامنے بھی ہے۔ اس میں تم میری مدد کرو پھر میں تمہاری مدد کیوں نہیں کروں گا کہ تمہاری اس نئی کامیاب زندگی کا سفر جاری رہے۔ تم شادی کرلو گے۔ تمہارے بچے ہوں گے اور خوش حالی میں مزید اضافہ ہوگا۔ خدا مبارک کرے۔''

''میں تمہاری کیا مدد کروں، یہی تو پوچھ رہا ہوں۔''

''حالانکہ یہ کوئی پوچھنے کی بات نہیں۔ تمہارے لیے تو بہت آسان ہے، مجھے یورپ پہنچا دو۔''

''وہ کیسے؟''

''کوئی راستہ نکالو۔ عام طور پر لوگ یونان قبرص کے ساحل پر مارے جاتے ہیں یا پکڑے جاتے ہیں۔ میں نے ان کو غچا دیا اور غائب ہو گیا۔ میں اپنے ساتھ کچھ لاتا تو لٹ جاتا۔ میں نے ایران میں ایک ذریعہ پیدا کیا۔ اسے پاکستان سے دگنی رقم مل جائے گی۔ اسے اطمینان ہے اس نے میرے لیے یہاں تک پہنچنا ممکن بنا دیا۔ وہ دوسری قسم کے اسمگلر تھے۔ میرا مطلب ہے انسانوں کے نہیں... ترکی تو ہے آدھا یورپ میں...''

''جو تمہیں یہاں تک لائے تھے...''

''انہوں نے مجھے کسی سے ملوا دیا تھا۔ میں آسانی سے نکل جاؤں گا کیونکہ یہ راستہ ہی الگ ہے۔''

''پھر کیا پریشانی ہے؟''

''پیسے نہیں ہیں میرے پاس... بند دروازے اسی چابی سے کھلتے ہیں۔''

''کتنی رقم سے تمہارا کام چل جائے گا؟''

جو رقم شیر علی نے بتائی وہ تقریباً دس ہزار ڈالر کے مساوی تھی۔ ''یہ تو بہت زیادہ ہے۔''

''یہ ایک اچھے مستقبل کے تحفظ کی انشورنس سمجھ لو۔ ہم دونوں کے... میرا تو ابھی پتا نہیں لیکن تم اس سے سوگنا کیا ہزار گنا کمالو گے اگر واپس پاکستان نہ گئے۔''

''میں تم سے جھوٹ نہیں کہہ رہا۔ اس کا ایک چوتھائی بھی نہیں ہے میرے پاس۔'' شہاب نے مردہ آواز میں کہا۔

''یہ معاملات بعد میں طے کرلیں گے، کیا خیال ہے اب ہمیں کھانا کھالینا چاہیے۔''

شہاب نے سر ہلایا۔ ''تمہارے آخری طعام کا وقت آگیا ہے مسٹر شیر علی... تو میں کیا کرسکتا ہوں، کھالو۔''

☆☆☆

مکمل اندھیرا ہوتے ہی اس کا بیڈروم ایک سینما ہال میں تبدیل ہو گیا جس کی چھت ایک روشن اسکرین تھی۔ زندگی کی فلم کی ایک ریل اس کے سامنے چلنے لگی۔

ساٹھ سال کی عمر میں ڈاک خانے سے ریٹائر ہو جانے والا پنشنر عاشق حسین عشا کی اذان کے بعد دکان بند کر کے مسجد جاتا تھا اور عشا کی نماز باجماعت ادا کر کے گھر لوٹتا تھا تو بے دم ہو کے اپنی چارپائی پر گر پڑتا تھا۔ دوسرے کمرے میں غلام حسین کی دونوں کالج کی طالب علم بہنیں بظاہر بڑے انہماک سے دونوں کی چارپائیوں کے درمیان رکھی میز پر جھکی امتحان کی تیاری میں مصروف نظر آتی تھیں۔ بہت کچھ جاننے کے باوجود غلام حسین میں ہمت نہ تھی کہ باپ کو کچھ بتا سکے۔ وہ دونوں پنجے جھاڑ کے اس کے پیچھے پڑ جاتیں۔ ایک بار ایسا ہو چکا تھا۔ انہوں نے رو رو کے قسمیں کھا کے بھائی کے سچ کو جھوٹ بنا دیا تھا اور اسے چیلنج کر دیا تھا کہ وہ کسی پیریڈ سے ان کی غیر حاضری ثابت کر کے دکھائے۔ چنانچہ جو غلام حسین نے اپنی آنکھوں دیکھا تھا، جھوٹ بن گیا تھا اور باپ نے الٹی اسے گالیاں دی تھیں کہ شرم نہیں آتی، خود آوارہ گردی کرتا ہے تو معصوم بہنوں پر بھی الزام لگاتا ہے، بے غیرت۔

ماں نے ٹرے میں روٹی سالن اس کے سامنے لا کے رکھ دیا تھا۔ پراویڈنٹ فنڈ اور گریجویٹی کی رقم سے اس نے وہی مکان خرید لیا تھا جس میں وہ پندرہ سال سے کرائے دار تھا۔ مالک مکان کے مرنے کے بعد اس کی بیوہ لندن میں بیٹوں کے پاس چلی گئی تھی اور جاتے جاتے یہ مکان ترس کھا کے دے گئی تھی۔ یوں سر چھپانے کا ٹھکانا آدھی قیمت میں مل جانا اللہ کا انعام تھا جو شاید اس نے 35 سال تک رزق حلال کمانے کے انعام میں دے دیا تھا۔ آخرت کے لیے رہ گیا بس اعمال کا حساب... مگر دنیا میں رہنے کے لیے پنشن بہت ناکافی تھی چنانچہ اس نے گھر کے تیسرے کمرے کو جس کا دروازہ باہر کی طرف کھلتا تھا، دکان میں بدل دیا تھا اور بسکٹ، ٹافی، ربر پنسل جیسی چھوٹی

چھوٹی چیزوں سے برائے نام کمائی کرنے لگا تھا مگر صرف ایک سال میں دکان بھر گئی تھی۔ اب اس کے پاس اسٹیشنری کے سارے آئٹم تھے۔ نئی پرانی ٹیکسٹ بکس تھیں اور وہ سوچ رہا تھا کہ باہر چبوترہ نکال کے فوٹو اسٹیٹ کی مشین لگالے کیونکہ آس پاس کی گلیوں میں چھوٹے بچوں کے اسکول بہت کھل گئے تھے۔

وہ باپ کو کھانا ختم کر کے کلّی کرتا دیکھتا رہا۔ حسب توقع اس نے روز کا سوال پوچھا۔ ''ہاں بھئی، اپنے گلو بادشاہ... آج کی اسٹوری سنا، کہاں عیش کی، سارا دن کیسا گزرا...''

اس نے ضبط سے کام لیا۔ ''کیا فائدہ ابا جی آپ کو یہ بتانے کا کہ ایک کلرک یا سیلزمین کی نوکری کے لیے بھی میں کہاں کہاں گیا۔ کس کس کی منت سماجت کی، کتنی ذلت اور پریشانی اٹھائی، آپ نے یقین تو کرنا نہیں ہے۔''

''یقین کیسے کروں جبکہ تیرے سوا اِدھر اُدھر سارے بی اے پاس کچھ کر رہے ہیں۔''

''اب تو چپراسی بھی نہیں رکھتا سفارش کے بغیر کوئی... ورنہ نقد پچاس ہزار میں نوکری ملتی ہے۔ میٹر ریڈر کے لیے وزیر کی سفارش چاہیے... اتنا ہوتا کہ قسطوں پر رکشا لینے کے لیے ایڈوانس دے سکتا...''

عاشق حسین سگریٹ جلا کے بستر پر تکیے کے سہارے نیم دراز ہو گیا۔ ''وہ اپنے راجا کرم داد خان کو جانتا ہے نا تو... اپنی سوسائٹی کے صدر ہیں کئی سال سے... ان کی چھوٹی بیٹی کو پڑھایا تھا میں نے جب پانچویں میں تھی۔ اب تو خیر سے دس جماعت پاس کر چکی۔ کالج میں ہے، وہ آئی تھی میرے پاس ایک کتاب لینے... نئی چھپ کر نہیں آئی۔ بازار میں پرانی بھی نہیں تھی۔ وہ میرے پاس نکل آئی۔ بہت خوش ہوئی کہ نہ ملتی تو فوٹو کاپی کرانا پڑتی۔ بس اللہ توفیق دے تو اسی سال میں بھی مشین لگا لوں، کام بہت ہے، تو خیر...'' وہ بات کرتے کرتے کش لگا کے کھانسنے کے لیے رکا۔

''خدا رسول کا واسطہ چھوڑ دو یہ لعنت... گھر میں اور بھی ہیں کچھ ان کا خیال کرو، اب تو ڈاکٹر کہتے ہیں سب کو نقصان ہوتا ہے۔''

وہ بگڑ گیا۔ ''روز وہی بکواس... ساری عمر ایک ڈبی سگریٹ پر لڑتی رہی، میرا اتنا بھی حق نہیں اپنی کمائی پر۔''

صرف لڑائی روکنے کے لیے غلام حسین نے کہا۔ ''آپ چیئرمین کی بیٹی عائشہ کی بات کر رہے تھے۔''

عاشق حسین نے بیٹے کی معلومات پر اسے حیرانی سے دیکھا۔ ''ہاں اچھی لڑکی ہے قسمت والے کے گھر جائے گی۔ میں نے اس سے ذکر کیا تیرا تو بولی کہ گھر بھیج دو۔ میں نے کہا کہ پہلے والد صاحب سے تو پوچھ لو... وہ بولی کہ ڈیڈی کی لاڈلی ہوں، میری بات ٹال نہیں سکتے کچھ نہ کچھ ضرور ہو جائے گا۔ تو بس اب صبح راجا صاحب سے مل لینا وہ ویسے بھی اچھے آدمی ہیں۔''

''مجھے پتا ہے کتنے اچھے ہیں۔ اس الیکشن میں ان پر ساٹھ کروڑ کے غبن کا الزام تھا۔'' غلام حسین بولا۔

عاشق حسین بھڑک اٹھا۔ ''مخالف تو ایسے ہی بھونکتے ہیں۔ تجھے اس سے کیا۔ دیکھ تیرا کام ہو جائے تو بڑی پریشانی دور ہو جائے ورنہ یہ سب کیسے ہوگا۔ رشتے آنے لگے ہیں بہنوں کے... یا اللہ خیر...'' وہ کھسک کے..... سیدھا لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

غلام حسین پندرہ سال سے اسی علاقے میں تھا اور یہاں کے سب پرانے پاپیوں کا سارا نامۂ اعمال اس کے سامنے تھا۔ مگر کیا کرتا، باپ کا کہنا ماننا ضروری تھا۔

راجا صاحب کے عالی شان گھر کی طرف جاتے ہوئے غلام حسین کا اپنا ضمیر اس ماحول میں پرورش پا کے بہت پہلے انتقال فرما چکا تھا۔ رہی سہی کسر تعلیم کی ناقدری اور بے روزگاری کے عذاب نے پوری کر دی تھی اور اس نے جان لیا تھا کہ اب سارے دکھوں کی ایک دوا پیسا ہے جو ہر عیب کا پردہ ہے اور عزت کا پیمانہ ہے۔ بے شک معاملات کی خرابی میں ان ٹیلی ویژن ڈراموں کا بھی کردار تھا جو اس کی ماں اور بہنیں اسٹار پلس اور پاکستانی چینل سے دیکھتی تھیں تو عالی شان گھروں، خوب صورت قیمتی کپڑوں، لمبی چوڑی کاروں، ہوٹلوں اور کلبوں کی تقریبات کی چمک دمک اور ہلا گلا دیکھ کے ان کا دل بھی للچاتا تھا۔

خیالات کی بے راہ روی تھی جس نے غلام حسین کی بہنوں کو بھی کالج کے زمانے میں خواہشات کی تکمیل کے وہ راستے دکھا دیے تھے جو لاکھ بدکرداری کے زمرے میں آتے ہوں مگر محفوظ تھے اور اختیار کیے جا سکتے تھے۔ یہ سیدھا سیدھا طلب اور رسد کا قانون تھا۔ ایک طرف عیاش تھے جو قوتِ خرید رکھتے تھے، دوسری طرف عیاشی کے اسباب برائے فروخت تھے۔ وہ غلام حسین کی نظر کا دھوکا نہیں تھا جب اس نے اپنی بہنوں کو کالج ٹائم میں کسی کے ساتھ چمکتی دمکتی کار میں دیکھا تھا لیکن کالج سے معلوم کیا تو اس وقت ان کی حاضری لگی ہوئی تھی۔ پھر اس نے جان لیا

کہ حاضری بھی قیمت ادا کر کے لگوائی جاسکتی تھی۔

غلام حسین کو حالات نے نئے وقت کے تقاضوں کے مطابق جینے کا ہنر سکھا دیا تھا۔ جو سیکھا تھا، آزمانے کا وقت اب آرہا تھا جب وہ راجا کرم داد خان کے نمک خوار کا مرتبہ حاصل کرنے جارہا تھا۔ اب وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھا کیونکہ اسے بھی پیسا کمانا تھا جو آج کل صرف جائز ہوتا تھا خواہ کسی کا گلا کاٹ کے حاصل ہو یا حق مار کے...

راجا صاحب سے ملاقات کے لیے اسے کافی دیر اُن کے شاندار .... سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں انتظار کرنا پڑا جہاں بیٹھا وہ ان چیزوں کی مالیت کا اندازہ کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہا جن سے وسیع ہال جیسا کمرا ابھرا پڑا تھا۔

ہر دیوار پر پینٹنگز تھیں۔ ان کے درمیان خود راجا صاحب کی تصاویر تھیں جن میں وہ ''بڑے لوگوں'' سے ہاتھ ملا رہے تھے یا ان کے ساتھ کھڑے تھے۔ دائیں جانب الماری میں قانون کی کتابیں بھری ہوئی تھیں کیونکہ راجا صاحب خیر سے وکالت کی ڈگری ضرور لے چکے تھے۔ اصلی نقلی کا سوال لاحاصل تھا۔ کارنس پر ان کی فیملی ممبرز کی تصاویر رکھی تھیں۔ وہ سب دیکھنے میں مصروف تھا کہ راجا کرم داد کمرے میں داخل ہوئے اور وہ اسپرنگ کی طرح کھڑا ہوگیا۔

''بیٹھو بیٹھو... کیا نام ہے تمہارا... ہاں غلام حسین۔'' راجا اس کے مقابل صوفے پر گر گیا۔ ''کیسے آنا ہوا؟''

غلام حسین ٹپٹا گیا۔ ''جی وہ... آپ کی صاحب زادی نے والد صاحب سے کہا تھا...''

''اوہ... ہاں، اپنے عاشق حسین کے بیٹے ہو تا تم... چنگا بندہ ہے ڈاک بابو... اس کی ایمان داری اور نیک نیتی کی قسم کھاتے ہیں لوگ اسی لیے بلایا میں نے تمہیں کہ باپ کا اثر کچھ تو ہوگا تم میں... ایک اعتماد والا آدمی چاہیے مجھے... جو خیر سے پڑھا لکھا اور ذہین بھی ہو اور کچھ ہمت والا بھی... لیکن سب سے بڑھ کر یہ...'' اس نے اپنی سگریٹ جلائی اور پھر بات شروع کی۔ ''اور دیکھنے میں بندر کا بچہ نہ لگتا ہو... مجھے اسمارٹ نوجوان اچھے لگتے ہیں۔ شکل صورت کے ساتھ ڈھنگ سے کپڑے پہننا جانتے ہوں۔''

غلام حسین کے پاس لنڈے کا ''ماسٹر پیس'' سرخ رنگ کی ایک ٹی شرٹ تھی جس پر سامنے انگریزی کے حروف میں لکھا تھا۔ ''دی ونر'' یعنی فاتح... ٹی شرٹ اس کے قدرتی متناسب بدن پر چپکی ہوئی تھی۔ باپ کی مرضی کے خلاف شلوار قمیص کی جگہ یہ لباس پہن کر آنا ہی درست فیصلہ ثابت ہوا تھا۔

ایک ملازم ٹرے درمیان کی میز پر رکھ گیا جس میں چائے کے دو کپ اور ملتان کا سوہن حلوا تھا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ تم میرے کام کے آدمی ہو، چائے پیو۔''

اس نے کپ اٹھالیا۔ ''جی سر مگر کام کیا کرنا ہوگا مجھے؟''

''کام؟'' وہ چائے کا گھونٹ لے کر رکا۔ ''کام کوئی ایک نہیں، جو بھی میں بتاؤں۔ دراصل بندہ چاہیے مجھے جو اعتماد کا ہو اور میں کوئی بھی کام کہوں... میری تسلی کے مطابق کر سکے۔ بات کو سمجھے اور حرامی پن نہ کرے۔ خود کو مجھ سے زیادہ چالاک نہ سمجھے۔ کبھی کام نہیں تو موج کرے اور جب کام ہو تو دن رات نہ دیکھے۔ تم بھی منہ سے کچھ بولو۔''

''آپ آزما کے دیکھ لیں راجا صاحب، انشاء اللہ آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔ ڈائیلاگ تو بولتا نہیں کہ جہاں آپ کا پسینا گرا وہاں اپنا خون بہا دوں گا۔ غلطی کرسکتا ہوں کیونکہ انسان ہوں، جانتے بوجھتے کروں تو آپ بے شک اینٹوں کے بھٹے میں ڈال دیں۔'' غلام حسین کو اچانک زبان مل گئی۔ ''رزقِ حلال کھلایا ہے باپ نے... نمک حرام کیسے ہوسکتا ہے اس کا بیٹا۔''

راجا کرم داد کے چہرے پر طمانیت کے آثار نمودار ہوئے۔ ''سمجھو آج سے بلکہ ابھی سے تمہارا کام شروع... اور تنخواہ تمہاری ہوگی...'' وہ لحہ بھر کے لیے رکا۔

غلام حسین کے دل کی دھڑکن رک گئی۔

''پچیس ہزار۔'' راجا نے جیسے لاٹری کی رقم کا اعلان کیا۔

غلام حسین دم بخود بیٹھا خود کو یقین دلاتا رہا کہ اس نے ٹھیک سنا ہے۔

''جی... جی... بڑی مہربانی راجا صاحب۔'' اس نے جذبات سے مغلوب آواز میں کہا۔

''کام دل خوش کرنے والا کرو گے تو ہم بھی خوش کر دیں گے تمہیں تنخواہ کیا ہے... اللہ نے دینے کے لیے ہی دیا ہے لیکن کسی ہڈحرام کو نہیں مستحق کو... جا کے ابا کو خوش خبری سنا دو، اور یہ لو...'' اس نے ہزار کا ایک نوٹ آگے بڑھایا۔ ''مٹھائی لیتے جانا... کل صبح چھوٹی بی بی کو کالج لے جانا ہے اور اس کی چھٹی تک وہیں ٹھہرنا ہے۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

غلام حسین کا دل پچیس ہزار کی گرانقدر رقم کے تصور میں گم ہونے کے باوجود اضطراب کا شکار تھا۔ اس کی ڈیوٹی

انتہائی پُرخطر صبر آزما اور دنیا و عافیت خراب کرنے والی تھی۔
اِک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔ گھڑی دے کر ولایت جانے والے دوست سے یہ شعر اس نے اکثر سنا تھا۔ اب وہ خود اس آزمائش سے دوچار تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ اسی حسنِ خانہ خراب والی حسینہ عائشہ کو صرف ڈرائیو کر کے کالج گیٹ تک لانے لے جانے کی ڈیوٹی نہیں تھی۔ اس میں آزمائش کے ہزار مرحلے تھے جن سے گزرنا بھی اتنا ہی مشکل جتنا نہ گزرنا... اسی کالج میں خود اس کی بہنیں ثریا اور نسرین بھی فرسٹ اور سیکنڈ ایئر کی طالبہ تھیں۔

خیر، اللہ مالک ہے۔ اگلی صبح اس نے ساڑھے سات بجے گیٹ پر اپنی آمد کی اطلاع کرتے وقت سوچا، جان ہے تو جہان ہے۔ پچیس ہزار ملیں گے تو راجا کرم داد کے خزانے سے... یہ رقم وصول کرتے رہنے کے لیے زندہ رہنے کی پہلی شرط ہے۔ جس دن عائشہ نے اس کو آزمائش میں ڈالا، وہ راجا صاحب کے قدموں میں سر رکھ دے گا کہ اب آپ کی مرضی... اسے سچ مانیں یا جھوٹ، میرے سو جوتے ماریں یا اسے میری وفاداری سمجھ لیں۔ وہ اس وقت چونکا جب سیاہ عبایا میں صرف نشیلی آنکھیں دکھاتی عائشہ باہر کھڑی تین گاڑیوں میں سے ایک میں بیٹھ گئی۔ اس نے پھر اللہ کا نام لے کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ سوئچ کے ساتھ اے سی چلایا تو اندر ایک مسحور کن خوشبو بھر گئی۔

راستے میں ہمت کر کے اس نے کہہ دیا۔ ”آپ کی بہت مہربانی جناب راجا صاحب نے مجھے ملازم رکھ لیا۔“

وہ آہستہ سے بولی۔ ”نوکری میری وجہ سے ملی ہے تو میری وجہ سے ختم بھی ہو سکتی ہے غلام حسین۔“

اس کا دل ڈوب گیا۔ اس کے اندیشے درست ثابت ہو رہے تھے۔ اسے راجا صاحب کا نہیں، عائشہ کا غلام بن کے رہنا ہوگا اور چند دن بعد آزمائش کا وقت آ گیا۔ وہ گیٹ کے اندر وسیع میدان میں گاڑی پارک کیے دروازے کھولے اور سیٹ پیچھے کیے سو رہا تھا کہ عائشہ نے پیچھے والا دروازہ کھولا اور وہ ہڑبڑا کے اٹھا۔ ”دامنِ کوہ چلو۔“

”دامنِ کوہ؟ اس وقت... عائشہ بی بی اگر راجا صاحب کو معلوم ہوا تو...“

”ان کو فرشتے بتا سکتے ہیں یا تم... میں نے کیا سمجھایا تھا تمہیں پہلے دن...“ وہ سکون سے بولی۔

وہ وقت بہت جلد آ گیا تھا جس کا اسے ڈر تھا۔ اسے ابھی اور فوراً فیصلہ کرنا تھا کہ وہ انکار کر دے اور پیدل راجا صاحب کی خدمت میں حاضر ہو جائے یا سوئچ آن کر کے گاڑی آگے بڑھا دے اور فیصلہ کرنے میں پچیس ہزار کے فکر نے فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ اس نے منمنا کے ”جی“ کہا اور گاڑی باہر نکال لی۔ عائشہ کی ہدایت کے مطابق اس نے گاڑی کو الگ پارک کیا حالانکہ اس وقت ہر لین خالی ہی تھی۔ وہ کار سے اتری اور دور کھڑی دوسری کار میں غائب ہو گئی جس کے شیشے کالے تھے۔ یہ بہت آزمائش کا وقت تھا۔ ویسا ہی جیسا مجرم تختۂ دار پر گزارتا ہے۔ کچھ دیر میں اس کا ذہن بدل گیا۔ کیسے پتا چل سکتا ہے راجا صاحب کو اگر ڈاک بابو غلام حسین کو اپنی بیٹیوں کے بارے میں معلوم نہیں اور اسے بچانے کی ذمے داری بھی عائشہ نے قبول کی ہے۔

واپس آنے کے بعد وہ دیگر ملازموں کے ساتھ کھانا کھاتا تھا۔ پھر اسے راجا صاحب اپنے آفس میں بلا لیتے تھے۔ یہاں یہ چیز دے آؤ۔ وہاں سے فلاں کو لے آؤ۔ اس ہوٹل میں ڈنر کی ریزرویشن کرا دو۔ ایک فنکشن کے لیے ہال دیکھو۔ چار پانچ سو مہمان ہوں گے۔ کسی میوزیکل بینڈ سے رابطہ کرو۔ اس علاقے سے انتخاب کے لیے چودھری کو ٹکٹ دیا جائے گا۔ فلاں کے پاس جاؤ اور انتخابی جلسے کی بات کرو۔ پوسٹر، بینر، ہورڈنگ وہ بنوا کے دیں گے۔ رقم وہ دیں گے۔ تم بنواؤ گے۔ جو اچھے اور سستے بنائے، اس کام میں بھی رانا اس کے ساتھ ہوتا تھا تو کبھی ملک... وہ پرانے تجربہ کار لوگ تھے۔ انہوں نے غلام حسین کو بھی اپنا ”حقِ محنت“ نکالنے کی ٹریننگ دی۔ وہ اوپر سے لے کر نیچے دیتے ہوئے اپنا کمیشن رکھنا سیکھ گیا۔

اب آمدنی غلام حسین کا مسئلہ نہیں رہی تھی۔ بہت کچھ زمانے کے دھکے کھا کے وہ سیکھ چکا تھا۔ باقی اب سیاست کے میدان میں قدم رکھ کے سیکھ رہا تھا۔ اس کے سر پر تلوار کی طرح لٹکنے والا خطرہ عائشہ تھی۔ افشائے راز کی صورت میں غلام حسین کا باعزت یا بے عزت طور پر فارغ کیا جانا طے تھا لیکن کرنا خدا کا یہ ہوا کہ چھوٹی بی بی کا رشتہ ایک ایسی سیاسی اثر رسوخ رکھنے والی فیملی کی طرف سے آ گیا کہ انکار تو کیا تاخیر بھی ممکن نہ تھی۔ چٹ منگنی کے بعد پٹ بیاہ طے ہوا تو عائشہ کے لیے حصولِ تعلیم کا مقصد ختم ہوا۔ مقصد ویسے بھی اس کو فارغ وقت میں مصروف رکھنا تھا۔

راجا کرم داد کے دربار میں اس کے مفید مشورے قبول ہوئے تو رقابت اور حسد کا نیا محاذ کھل گیا۔ رانا اور ملک نے اس پر الزام عائد کیا کہ راجا کرم داد خان کی نظر میں ان کی وقعت کم کر کے وہ ان کے خلاف سازش کر رہا ہے۔ یہ خیال غلام حسین کے دماغ میں نہیں آیا تھا مگر ڈالا گیا تو اس

نے کہا کہ اچھا یوں ہے تو پھر یونہی سہی۔ اس نے نامعلوم ذرائع سے رانا اور ملک کی بے ایمانی اور غبن کے قصے راجا صاحب تک پہنچائے جو تصدیق اور تفتیش پر درست ثابت ہوئے۔ رانا اور ملک باری باری رخصت ہوئے تو غلام حسین راجا صاحب کا معتمدِ خاص بن گیا۔

غلام حسین کے گھر کا نقشہ تو عائشہ بی بی کی ڈرائیوری کے دور میں ہی بدلنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ خوش ہو کے اسے اکثر پیسوں سے نوازتی رہتی تھی۔ چھ ماہ بعد عاشق حسین کا فوٹو اسٹیٹ مشین لگانے کا خواب پورا ہو چکا تھا مگر اس سے پہلے گھر کے اندر چھوٹی موٹی خوش نما تبدیلیاں آ چکی تھیں مثلاً رنگ روغن نیا فرنیچر اور فریج، اسے صبح شام حرام خوری کے طعنے دینے والا باپ اب اس سے بہت خوش تھا اور فرشتہ سیرت چھوٹی بی بی کو دن رات دعائیں دیتا تھا جس نے غلام حسین کی سفارش کی اور ان پر خوش حالی کے دروازے کھول دیے۔ غلام حسین مسکرا کے چپ ہو جاتا تھا لیکن اس نے ماں کو ریڈ الرٹ دے دیا تھا کہ ایک ڈیڑھ سال میں دونوں بیٹیوں کو رخصت کرنے کا سوچے۔ یہ کالج کی تعلیم سب بیکار ہے۔

غلام حسین رات کو ڈپلی کیٹ اکاؤنٹ بکس بناتا تھا۔ اس کے لیے ڈپلی کیٹ رسیدیں بھی تیار کرتا تھا۔ وہ سب جانتا تھا کہ سو روپے میں ہونے والا ہر کام چار سو میں کیسے ہوتا ہے۔ اس کے لیے جعلی ٹینڈر کیسے بھرے جاتے ہیں اور جو بچت ہوتی ہے، وہ کس کس میں تقسیم ہوتی ہے۔ یہ سوسائٹی تو کرپشن کے سمندر میں ایک نظر نہ آنے والے جزیرے کی طرح تھی ورنہ ملک میں بڑے بڑے ادارے اور محکمے کرپشن کے براعظم تھے۔ غلام حسین نے ایک سال میں اپنا اعتماد قائم کر لیا تھا اور اندر کے سارے راز جان گیا تھا مگر اپنی عافیت اسی میں دیکھتا تھا کہ آنکھیں کھلی اور زبان بند رکھے۔ اسی میں فائدہ تھا اور دولت مندی کا محفوظ مستقبل تھا۔ راجا صاحب مل بانٹ کر کھانے کے اصول پر سختی سے کاربند تھے چنانچہ غلام حسین کو بھی اس کی حیثیت کے مطابق نوازتے رہتے تھے۔ جب اس نے قسطوں پر موٹر سائیکل لی تو راجا صاحب نے پوری قیمت کا چیک دے دیا کہ جا کے شوروم والے کے منہ پر مار۔ ماں کے ہاتھ میں پیسا آنے لگا تو اس نے شادی کی تیاری شروع کر دی اور رشتے طے کرنے کے بعد چھ مہینے کے اندر اندر دونوں بیٹیوں کو ایک ساتھ رخصت کر دیا۔ اس موقع پر راجا صاحب نے پھر اپنا دستِ شفقت رکھا اور ڈاک بابو عاشق حسین کو دونوں شادیوں کے لیے ایک ایک لاکھ روپے عطا کیے۔ اب عاشق حسین بھی ان کا غلام ہو گیا، اس کا بیٹا غلام حسین تو پہلے ہی زرخرید تھا۔

یونہی ایک دن بیٹھے بیٹھے غلام حسین کو خیال آیا کہ آخر کب تک وہ ایک ہی کولھو کے بیل کی طرح آنکھوں پر پٹی باندھے ایک دائرے میں پھر سکتا ہے؟ کیا ہوگا جس دن راجا کرم داد نہیں ہوگا؟ وہ پچاس سے اوپر کا تھا۔ نتائج کی پروا کیے بغیر... بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست... کے فلسفے پر عمل کرتا تھا۔ سگریٹ سے شراب تک سب پیتا تھا۔ کاروباری معاملات کے بہانے عیاشی کرنے دبئی اور بینکاک جاتا رہتا تھا۔ ایک دن شدید سر درد کی شکایت پر وہ ڈاکٹر کے پاس گیا تو بلڈ پریشر خطرناک حد تک زیادہ تھا۔ ڈاکٹر نے اسے اسٹروک کے خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے کچھ دوائیں دیں۔ کچھ ٹیسٹ اور کچھ چیزوں کا پرہیز بتایا تھا۔ دوا اس نے کچھ دن کھائی۔ ٹیسٹ بھی کرائے مگر رپورٹیں اس کی میز کی دراز میں پڑی رہیں اور پرہیز کی نوبت ہی نہیں آئی۔ وہ اچانک کسی دن مر گیا تو کیا ہوگا؟ دو سال سے وہ اندھا دھند ایک ہی راستے پر بگٹٹ بھاگتا چلا جا رہا ہے۔ یہ سوچے بغیر کہ اس راستے کا اچانک اختتام اندھی کھائی میں ہو گیا تو کیا ہوگا؟ اس خیال نے غلام حسین کو نروس کر دیا۔

اس نے گھڑی دیکھی۔ جس سے ایک منافع بخش ڈیل کی بات فائنل ہونی تھی، نہ وہ آیا تھا نہ اس نے فون پر کال کر کے کوئی وجہ بتائی تھی۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی مگر نمبر کسی اور کا تھا۔

''غلام حسین! یار وہ شاہد بلا نہیں تھا؟'' کسی نے سلام دعا کے بغیر نروس لہجے میں کہنا شروع کیا۔

اس کا دل تیزی سے دھڑکا۔ وہ فون کرنے والے کو جانتا تھا۔ ''ہاں... کیا ہوا اُسے؟''

''اسے کسی نے گولی مار دی۔''

''مگر وہ تو کراچی گیا ہوا تھا، اسے کل آنا تھا؟''

''ہاں کل نہیں آیا تھا وہ، آج یہ اطلاع آئی ہے، وہاں تو یہ ہوتا ہے۔''

غلام حسین نے فون بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔

اس نے سیکٹر آئی ایٹ کے پارک کی طوالت کو دیکھا جس میں ان گنت نوجوان اور عمر رسیدہ مرد جوگنگ ٹریکس میں دوڑ رہے تھے یا واک کر رہے تھے۔ خوب صورت

چہروں اور پُرکشش جسموں والی لڑکیاں تھیں جو ٹریک سوٹ اور جوگرز میں دوڑتی تھیں تو ان کے بالوں کی پونی ٹیل دائیں بائیں اچھلتی تھیں اور ان کے بدن کا تموج دعوتِ نظارہ دیتا تھا۔

اس کی توجہ سامنے کسی ٹریک پر سے دوڑ کے گزرنے والی لڑکی کی طرف ہوگئی۔ وہ اس کے سامنے سے دوسری بار گزر رہی تھی۔ گرے کلر کا ٹریک سوٹ گلابی اور زرد جاگر... اس کی صورت غلام حسین کو جانی پہچانی لگتی تھی مگر یاد نہ آیا کہ کہاں اسے دیکھا تھا تو کب اور کہاں، اس کے پیچھے چند قدم کے فاصلے سے دو نوجوان دوڑ رہے تھے اور اس فاصلے کو برقرار رکھنے یا شاید مزید کم کرنے کے لیے کوشاں نظر آتے تھے۔ لڑکی نے دوسری بار پلٹ کر انہیں گھورا اور شاید کچھ کہا۔ اتنی دور سے غلام حسین کی سمجھ میں کسی کی بات نہیں آئی مگر ایک دم اس کے دماغ میں سین ری وائنڈ ہوگیا۔ جیسے آؤٹ ہونے والے کرکٹ کے کھلاڑی کا ایکشن ری پلے۔ اوہو، یہ تو پہلے راؤنڈ کا سین ہے۔ لڑکی جب پہلی بار گزری تھی تب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ کہ وہ جوگنگ کے نام پر لڑکی کے پیچھے دوڑ رہے تھے، اسے پریشان کر رہے تھے۔

ایک دم غلام حسین کے اندر کا فلمی ہیرو جاگ گیا۔ سچویشن فلمی نہیں تھی مگر بن گئی۔ وہ چاہتا تو کپڑے اور ہاتھ جھاڑ کے اٹھتا اور اپنی راہ لیتا لیکن اس نے سامنے پڑا ہوا پتھر اٹھالیا۔ نشانہ اس کا پکا نہیں تھا اور وہ خود نہیں جانتا تھا کہ پتھر سیدھا ایک ہیرو کے سر پر لگے گا مگر ایسا ہوگیا۔ ہیرو نے ایک زوردار ''ہا'' کر کے ہاتھ سر پر رکھا۔ اس کا ساتھ دینے والا رک گیا اور لڑکی نے بس پلٹ کے دیکھا۔

نوجوان کا نہ سر پھٹا تھا نہ کہیں سے خون نکلا تھا مگر اس نے سنگ زنی کے مجرم کو دیکھ لیا تو اس کا پارا چڑھ گیا۔ وہ اور اس کا ساتھی غلام حسین کی طرف دوڑے۔ غلام حسین کھڑا ہوگیا۔

''تم نے مارا ہے مجھے پتھر... باسٹرڈ۔'' وہ غلام حسین پر حملہ آور ہوا۔

غلام حسین نے اسے دھکا دیا تو وہ پیچھے جا گرا۔

''ہاں، تم اس لڑکی کو پریشان کر رہے تھے۔''

''تیری بہن ہے وہ...'' حملہ آور کا ساتھی غلام حسین سے لپٹ گیا اور وہ دونوں ایک ساتھ نیچے گرے۔ اس کے بعد چند منٹ کی ایک مختصر سی فائٹ ہوئی جس میں انہوں نے ولایتی سے دیسی گالیوں پر آتے ہوئے ایک دوسرے کو مُکے یا ٹھڈے مارے اور نیچے گرا کے مار لگانے کی خواہش میں کالر کھینچے تو کپڑے پھاڑے... غلام حسین کوئی ٹارزن نہیں تھا مگر حریف بھی مضبوط تھے اور دو تھے۔ کوئی دخل نہ دیتا تو مار زیادہ اسے ہی پڑتی لیکن اِدھر اُدھر سے چھڑانے والے آگئے اور انہیں الگ کر دیا۔

وہ نوجوان تو اسے خون آشام نظروں سے گھورتے اور دھمکیاں دیتے چلے گئے۔ ''دیکھ لیں گے تجھے پتر۔''

غلام حسین نے لڑائی کی جو وجہ بتائی تھی، اسے کسی نے اہم نہیں سمجھا۔ ''یہ سب کھیل تماشا ہوتا رہتا ہے۔ دفع کرو، اپنے کام سے کام رکھو جوان...'' ایک سابق فوجی نظر آنے والے نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور مشورہ دیا۔

ان کے ساتھ واک کرنے والے دوست کوئی ریٹائرڈ بیوروکریٹ دبلے پتلے اور بیمار صورت تھے۔ ''وہ بدمعاش اپنے مددگاروں کے ساتھ نہ آجائیں، تم گھر جاؤ میاں...''

غلام حسین نے سر ہلایا۔ ''جی جاتا ہوں۔'' اور بینچ پر بیٹھ کے اپنی حالت کا جائزہ لیا۔ اس کی قمیص بری طرح پھٹی تھی اور پتلون بھی مٹی میں بھر گئی تھی۔ مصالحت کرانے والے چلے گئے تھے۔ غلام حسین نے مٹی جھاڑی اور ایک اتر جانے والا جوتا اٹھایا۔

اس وقت کسی نے آہستہ سے کہا۔ ''غلام حسین صاحب...''

اس نے چونک کے بینچ کے پیچھے دیکھا۔ وہاں وہی گرے ٹریک سوٹ اور گلابی جوگرز والی لڑکی سہمی کھڑی تھی۔

غلام حسین جوتا پہننا بھول گیا۔ ''آپ یہاں کھڑی ہیں؟ اور میرا نام کیسے جانتی ہیں؟''

''راجا کرامادادخان کے وہ ہیں نا آپ... چچے...'' وہ روانی میں کہہ گئی۔ پھر اسے غلطی کا احساس ہوا۔ ''آئی ایم سوری... میرا مطلب تھا اسسٹنٹ۔''

''آپ ان کو بھی جانتی ہیں؟ کیا وہیں رہتی ہیں سوسائٹی میں؟''

اس نے اقرار میں سر ہلایا تو غلام حسین نے محسوس کیا کہ شوخی اس کی آنکھوں میں ہی نہیں مسکراہٹ میں بھی ہے جو ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے...

''اب آپ گھر کیسے جائیں گے... میرا مطلب ہے اس حلیے میں؟'' وہ بولی۔

''چلا جاؤں گا۔ کیا ہوا جو راستے میں کچھ لوگ گھوریں گے یا ہنسیں گے۔ موٹر سائیکل ہے میرے پاس۔''

''پولیس نہ پکڑ لے مشکوک سمجھ کے... آپ یوں کریں کہ میرے ساتھ چلیں۔ گھر سے کپڑے بدلیں پھر میرے ساتھ واپس آکے موٹر سائیکل اٹھالیں۔''

اس نے لڑکی کو غور سے دیکھا۔ ''اور آپ کے ساتھ اس حلیے میں مجھے دیکھنے والے کیا سوچیں گے؟ آپ تو وہیں رہتی بھی ہیں... نو تھینک یو... آپ کو یہ کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''ضرورت تو آپ کو بھی وہ سب کرنے کی نہیں تھی جو آپ نے کیا۔'' اس کی نظر بدستور غلام حسین پر جمی رہی۔

وہ چند سیکنڈ مسحور سا بیٹھا رہا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

''او کے، ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ آپ مجھے آبپارہ مارکیٹ تک لے جائیں، وہاں پانچ منٹ گاڑی روکیں سڑک کے کنارے... میں نئی شرٹ خرید کے پہنتا ہوں اور پتلون بھی۔''

''پیسے ہیں آپ کے پاس؟''

وہ حیران ہوگیا۔ ''اے ٹی ایم کارڈ ہے میرے پاس... اور اتنے پیسے تو ہر عقلمند آدمی رکھتا ہے جیب میں۔''

''اتنے عقلمند ہوتے آپ... تو یہ سب نہ ہوتا۔'' وہ آہستہ سے بولی اور چل پڑی۔

باہر صف بستہ لمبی چوڑی گاڑیوں میں اس کی چھوٹی سی مہران بڑی عاجزی سے کھڑی تھی۔ ''وہ اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

''آپ سمجھتی ہیں کہ یہ میری بے وقوفی تھی تو آئندہ نہیں کروں گا دخل اندازی... خواہ کوئی میرے سامنے کسی لڑکی کو اٹھا کے لے جائے۔ سچ کہتے ہیں لوگ کہ شرافت کا زمانہ ہی نہیں۔'' وہ ونڈ اسکرین سے باہر دیکھتا رہا۔

کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے گاڑی کو ترچھا کر کے روکا اور کہا۔ ''دکان سامنے ہے۔''

نئی شرٹ اور پینٹ منتخب کر کے ٹرائی کرنے تک وہ صرف بلقیس کے بارے میں سوچتا رہا۔ صورت تو خیر اس کی دل کشیں تھی مگر اس کا مزاج اور اعتماد غلام حسین کے ذہن کو نشے کی طرح مغلوب کررہا تھا۔ اس کے حواس پر طاری ہوتا جارہا تھا۔ کئی بار وہ اس کی کوئی بات یاد کر کے مسکرانے پر مجبور ہوا۔ وہ باہر نکل کے گاڑی میں بیٹھا تو اسے ڈیش بورڈ پر گول گپوں کی ایک پلیٹ نظر آئی۔ ان میں بھرا جانے والا آتش فشاں محلول بلقیس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پیالے میں تھا۔ اس نے منہ پھاڑ کے ایک گول گپے کو اندر پہنچاتے ہوئے پلیٹ کی طرف آنکھوں سے اشارہ کیا کہ کھاؤ۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''لاحول ولاقوۃ... یہ سب میں نہیں کھاتا۔ ابھی سارے نئے کپڑوں کا حشر نشر ہوجائے گا۔'' اس نے کہا۔

بلقیس نے سی سی کرتے ہوئے ایک گول گپے کی نمائش کی۔ ''لو... یہ بھی کوئی مشکل کام ہے۔ دیکھو، ایسے... یوں بھرا... اب دیکھو پیالہ ٹھوڑی کے نیچے... ایک قطرہ نہیں گرے گا کپڑوں پر۔'' اس نے غڑاپ سے گول گپے کو منہ میں رکھ لیا۔ اس کے گال دونوں طرف سے پھولے اور پچک گئے۔

غلام حسین نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''بالکل نہیں۔ مجھے تو معاف ہی رکھو، مجھے یہ سین دیکھنے میں زیادہ مزہ آرہا ہے۔''

غلام حسین پر اب عشق کا جادو چل چکا تھا۔ ایک پرانے کھلاڑی کی حیثیت سے اس کا حوصلہ اور اعتماد لوٹ آیا تھا۔ یہاں تو اسے کچھ کرنا ہی نہیں پڑا تھا۔ بہانہ خود قدرت نے فراہم کردیا تھا اور نقصان ہوا تھا ساڑھے تین ہزار کا تو اس کے بدلے میں انعام کیا ملا تھا۔ اب بھی اس نے موقع سے فائدہ نہ اٹھایا تو نامرد سے بھی بڑے خطاب کا مستحق ہوگا۔ جو وہ نہیں تھا۔ بلقیس نے سارے گول گپے نگل کے طمانیت اور لطف سے آنکھیں مٹکائیں۔

''تمہیں یہ بم بارود کھاتے دیکھ کر آگ میرے اندر لگ گئی ہے اور اسے آئسکریم سے ہی بجھایا جاسکتا ہے۔ تمہیں دیر تو ہوگی کچھ مگر آدھا گھنٹا اور سہی... پلیز۔''

اس نے غلام حسین کو دیکھا۔ مسکرائی اور اقرار میں سر ہلا دیا۔ سینے کے اندر غلام حسین کا دل قلابازیاں کھانے لگا اور شور مچانے لگا۔ مبارک، مبارک پھنس گئی کڑی... بس بیٹا آنکھیں بند کر کے کود جا... اِک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے...

بلیو ایریا میں ''تہذیب'' بیکرز کے سامنے پارکنگ ایریا کے ساتھ بیٹھنے والوں کے لیے چند بینچیں تھیں۔ ایک بینچ خالی ہوئی ہی تھی کہ غلام حسین دوڑ کے اس پر بیٹھ گیا۔ کچھ فاصلے پر موجود ایک امیدوار جوڑے نے اس جارحیت اور بدتمیزی کا سخت برا مانا مگر غلام حسین ڈھٹائی سے مسکراتا رہا۔

بلقیس مسکراتی ہوئی بعد میں سامنے آبیٹھی۔ ''وہ پہلے سے کھڑے تھے۔''

''کوئی پہلا دوسرا نہیں چلتا یہاں، جو کرسی پر قبضہ کر لے کرسی اسی کی... شرافت کا زمانہ ہی نہیں، آئسکریم کھاؤ۔''

''ہاں، شرافت کا زمانہ ہی نہیں پھر بھی میں تمہارے

ساتھ آ گئی یہاں... معلوم ہے کیوں؟'' وہ نظر اٹھائے بغیر بولی۔

وہ کچھ حیران ہوا۔ ''یہ کہوں کہ تم نے قرض ادا کیا شرافت کا... یا...''

''یہ تو ہم اتفاق کر چکے ہیں کہ شرافت کا زمانہ ہی نہیں۔'' اس نے غلام حسین کی بات کاٹ دی۔ ''دراصل میں تمہارے پیچھے لگی ہوئی تھی۔''

غلام حسین بھونچکا رہ گیا۔ اسے یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا جو اس نے سنا۔ ''تم؟... یعنی وہ جاگنگ...''

''نہیں، جاگنگ کے لیے تو میں روز جاتی ہوں تقریباً... آج ایک موقع مل گیا اتفاق سے... ایسے مت گھورو مجھے... یہ گول گپوں کا اثر نہیں ہوا ہے میرے دماغ پر... مجھے تمہارے پیچھے لگایا گیا تھا۔'' وہ آئسکریم کے خالی کپ میں لکڑی کا چمچہ گھما کے چاٹتی رہی۔

غلام حسین نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ''تمہیں میرے پیچھے لگایا گیا تھا؟ کس نے لگایا تھا؟''

''اسی نے جو تمہارے راجا صاحب کا سیاسی حریف ہے۔ ویسے وہ رشتے دار ہیں آپس میں... کیا تمہیں معلوم ہے؟''

''مجھے معلوم ہے... تمہارا کیا تعلق ہے اس سے...؟''

''وہی جو تمہارا کرم داد سے ہے۔ میں اس کی پی آر او ہوں۔ لیکن اس کے بھائی کی بیٹی بھی ہوں۔ اس نے تو پالا ہے مجھے... تنخواہ کوئی نہیں لیتی میں... جتنے پیسوں کی ضرورت ہو اس کی دراز میں سے نکال لیتی ہوں۔ یہ گاڑی بھی اسی نے دلائی تھی۔ دراصل اس کی اپنی اولاد کوئی نہیں ہے اور میرے ماں باپ نہیں ہیں۔ دونوں ایک حادثے میں مارے گئے تھے۔ میں بھی ساتھ تھی، مجھے خراش بھی نہیں آئی تھی۔''

''بلقیس، میری عقل میں اب بھی یہ بات نہیں آتی کہ اس نے اپنی بھتیجی کو میرے پیچھے لگایا؟ شرم نہیں آئی اسے تم سے یہ بات کہتے ہوئے... توبہ توبہ...''

''اس نے کہا کچھ نہیں، لیکن اس سے میری بات ہوتی تھی تو وہ کہتا تھا کہ کیا فائدہ... کرم داد میرا کزن ہے... خوامخواہ ایک دوسرے کے خلاف کھڑے ہیں۔ اگر ہم مل جائیں تو بڑا فرق پڑتا ہے۔ ایک کی حمایت وہ کرتا رہے گا دوسرے کی میں... یہ نہ ہو تیسرا جیت جائے جو کسی شمار قطار میں نہیں۔ وہ مولوی... میں نے چاچا جی سے اتفاق کیا کہ بات تو آپ کی سولہ آنے درست ہے مگر راجا صاحب کو آپ قائل نہیں کر سکے تو اور کون منا سکتا ہے۔ اس پر انہوں نے تمہارا نام لیا کہ غلام حسین کر سکتا ہے یہ کام...'' وہ اپنی بات کا اثر دیکھنے کے لیے رکی۔

''اور تم سے کہا کہ اسے تم پھنسا لوگی آسانی سے...''

بلقیس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ ''شٹ اپ... کیا تمہارا باپ ڈاک بابو اپنی بیٹی سے ایسی بات کہہ سکتا ہے؟''

غلام حسین کو اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا۔ ''آئی ایم سوری، بہت غلط بات کی میں نے... پلیز معاف کر دو مجھے۔''

بلقیس نے ایک گہری سانس لی۔ ''اچھا چلو، لوگ جگہ کے انتظار میں کھڑے ہیں، اٹھو۔''

اس نے گاڑی کو واپس نکالا اور آہستہ آہستہ چلاتی شاہراہ دستور سے واپسی کے راستے پر لے آئی۔ ''اس نے ایک دن ایسے ہی کہا کہ غلام حسین میرے پاس آ جائے تو میں اس کو دگنی تنخواہ دوں۔ ایک لاکھ روپے بھی دے سکتا ہوں۔ ایسے ہی راجا کے پاس ذلیل خوار ہو رہا ہے۔ راجا خود تو دوزخ کا ایندھن سمیٹ رہا ہے۔ غلام حسین بھی اس کے ساتھ چوری غبن اور لوٹ مار میں شریک ہے۔ یہ نہیں سمجھتا کرم داد کہ پتا نہیں الیکشن میں کیا ہو۔ جن کا وہ چمچہ ہے ان کا پتا ہی صاف ہو جائے۔ پھر وہی حشر ہوگا جو اس سے پہلے گجر کا ہوا۔ کھایا پیا سب نکل جائے گا اور گیہوں کے ساتھ گھن تو پستے ہیں۔ غلام حسین خوامخواہ رگڑے میں آ جائے گا۔ تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ہر قیمت پر تمہیں بلانا چاہتے ہیں۔''

''ایک طرح سے چاچا جی کا احسان اتارنے کے لیے تم نے خود فیصلہ کیا کہ مجھے گھیر و گی... قائل کرو گی...؟''

''ہاں اور میں کسی موقع کی تلاش میں تھی کہ تم سے ملوں اور سمجھاؤں۔''

اور اس وقت غلام حسین کے دل نے دماغ کو کسی تھانے دار کی طرح ڈانٹنا شروع کیا۔ الّو کے پٹھے۔ پاگل خانے، ایک اتنی خوب صورت چہرے والی اور ایسی اچھی عادت کی اور اتنی ذہین لڑکی خود تمہیں دعوت دے رہی ہے اور تمہیں پڑی ہے سیاست کی، راجا کرم داد خان کے مفاد کی اور اپنی آمدنی کی... ارے بھاڑ میں ڈالو سب کو بعد میں جو دل چاہے کرنا... ابھی تو گھر آئی حسن کی دیوی پر دروازے بند مت کرو، اسے خوش آمدید کہو۔ کچھ دل لگی میں دل لگانے کا سوچو، موج مستی کے تو یہی دن ہیں...

''کس سوچ میں پڑ گئے؟ میری بات اچھی نہیں

لگی؟'' بلقیس نے مایوسی اور شرمندگی سے کہا۔

وہ چونکا۔ ''ارے نہیں، مجھے تو یقین نہیں آرہا اپنی خوش قسمتی پر... کسی دن کی کیا بات ہے، کل آسکتی ہو، کہیں اچھی سی جگہ بیٹھ کے باتیں بھی کریں گے اور کھانا بھی کھائیں گے۔ ''منال'' کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''منال۔'' اس نے سوچتے ہوئے دہرایا اور پھر مسکرا کے رضامندی میں سر ہلا دیا۔

''گھر سے لے لینا... سات بجے گلی کے کونے پر آ کے مجھے رنگ دے دینا، میرا نمبر سیو کر لو۔''

گھنٹی بجنے کے دو منٹ بعد اس نے اسی نمبر پر کال بیک کیا اور گاڑی سے اترا تو ہوا میں اُڑ رہا تھا۔ اس رات وہ نصف شب کے بعد تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔

وہ آنکھیں کھولے تاریک چھت کو دیکھتا رہا جس پر بلقیس کا چہرہ روشن تھا۔ اس نے تسلیم کر لیا تھا کہ یہ واقعی لو ایٹ فرسٹ سائٹ کا سیریس کیس تھا۔ اتفاقات کا عجیب سلسلہ اس ملاقات کا سبب بن گیا تھا کہ دو گھنٹے میں وہ اس کے ساتھ گول گپے اور آئس کریم کھانے کے بعد خود اعتراف بھی کر چکی تھی کہ وہ غلام حسین کے پیچھے لگی ہوئی تھی اور یوں ملاقات نہ ہوتی تو کہیں اور بہرحال ہوتی۔ اور کل وہ اس کے ساتھ ''منال'' میں ڈنر کرے گی۔ جو پیر سہاوہ کی انتہائی بلندی پر تھا۔

جھوٹ، خود فریبی، مانگے کی گاڑی اور وہ لڑکی جو اس کے پیچھے لگائی گئی تھی کہ وہ ان کی نوکری چھوڑ کے کاروبار سنبھال لے۔ ایک لاکھ روپے ماہانہ... دبئی کے دورے، وہاں کی چمک دمک اور کیسی عجیب بات تھی کہ بلقیس اس وقت ملی جب وہ خود اس خیال سے پریشان تھا کہ راجا کرم داد مر گیا تو اس کا کیا بنے گا؟ اسے تو کوئی پچیس ہزار والی نوکری بھی نہیں دے گا۔ نوکری میں تجربہ کام آتا ہے مگر یہ تو غلامی تھی اور وہ بھی غلامی تھی جس کی طرف بلقیس اسے لے جانا چاہتی تھی لیکن اس میں کاروباری تجربہ ضرور حاصل ہوتا تھا اور کاروبار کی سمجھ بوجھ کے ساتھ تعلقات بڑھتے تھے۔ راستے کھلتے تھے پھر وہ کیا کرے۔ بلقیس کی مان لے؟ کیا یہ اتنا آسان ہوگا؟

اسے خیال آیا کہ بلقیس کو جو کہنا تھا، وہ کہہ چکی۔ بال تو اب غلام حسین کے کورٹ میں تھی۔ انکار یا اقرار یا سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لیے وقت اسے درکار تھا۔

نیند آنے تک غلام حسین یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ کیا زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ بلقیس کی خاطر کیا جا سکتا ہے۔

دن میں وہ اونگھتا رہا۔ پھر راجا صاحب سے ڈاکٹر کے پاس جانے کا بہانہ کر کے گاڑی لی اور گھر آ کے وہ ڈریس چینج کیا جو اس نے آج ہی بینک روڈ سے خریدا تھا۔ تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے۔ باپ سے اس نے کہہ دیا کہ وہ کسی دوست کی شادی میں جا رہا ہے۔ ٹھیک سات بجے تو اس نے بلقیس کے نمبر کو ٹچ کیا۔ دوسری طرف رنگ ٹون بجتی رہی پھر بند ہو گئی۔ آپ کے ملائے ہوئے نمبر سے جواب موصول نہیں ہو رہا ہے۔ وہ سسپنس میں بیٹھا رہا۔ کہیں اس نے ارادہ بدل تو نہیں دیا؟ اس کا یہی طریقہ ہو سکتا تھا کہ کال ہی ریسیو نہ کرے۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس پر مایوسی طاری ہوتی گئی۔

اچانک اس کی مہران پاس سے گزری اور دس فٹ آگے ٹھہر گئی۔ غلام حسین نے اس کے ہاتھ کا اشارہ دیکھا۔ وہ پیچھے آنے کا کہہ رہی تھی۔ اس کا تصور تھوڑا سا مجروح ہوا کہ وہ خوشبو کا جھونکا بن کے ساتھ آ بیٹھے گی پھر وہ پیچھے چل پڑا۔ شاید ایسا کرنا بلقیس کے لیے ممکن نہ ہو۔ وہ دامنِ کوہ تک اس کار کا تعاقب کرتا رہا جس کا نمبر اسے پہلے ہی ازبر تھا۔ وہاں کار پارک کر کے وہ غلام حسین کے ساتھ آ بیٹھی۔

وہ دم بخود پلک جھپکائے بغیر اسے دیکھتا رہ گیا۔ آج وہ ٹریک سوٹ میں نہیں تھی۔ اس نے روشن پھولوں والا سیاہ لباس پہنا تھا جو اس کے حسین پیکر کے سانچے میں ڈھل گیا تھا۔ اس کا اجلا رنگ دمکنے لگا تھا۔ بالوں کو اس نے سادگی سے دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ ایک حصہ پیچھے تھا دوسرا شانے پر سے آگے آیا تھا۔ اس کے وجود سے پھوٹتی خوشبو غلام حسین کے حواس پر طاری ہونے لگی۔

''ہم یہاں بیٹھے رہنے کے لیے تو نہیں آئے تھے۔'' اس نے نظر جھکا کر آہستہ سے کہا۔

غلام حسین کو ہوش آ گیا۔ ''سوری اس بدتمیزی پر... لیکن تمہیں نہ دیکھنا زیادہ مشکل تھا۔ تم وہ تو نہیں ہو جو کل گول گپے کھا رہی تھیں منہ پُھلا پُھلا کے... اور سی سی کر رہی تھیں۔''

اس نے کار کو گھما کے باہر نکالا اور پیر سہاوہ کے راستے پر ڈال دیا۔

''تم بھی بہت بدل گئے ہو۔'' اس نے شوخی سے غلام حسین کے لباس کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔

وہ ہنسا۔ ''وہاں تو دیوانہ لگتا تھا میں۔ پھٹے کپڑے، پریشان بال، ایک پیر میں جوتا، مگر وہ بھی کیا یاد کریں گے۔''

''غلام حسین، تمہیں ڈر نہیں لگتا، اگر انہوں نے تمہیں پھر کہیں گھیر لیا۔ ایسے لوگ کینہ پرور ہوتے ہیں اور کیا پتا وہ

رئیسوں کی بگڑی اولادیں ہوں۔"

"جوڑ گیا، وہ مرگیا۔ ریوالور دے رکھا ہے مجھے راجا صاحب نے۔"

"کیا؟... یعنی تم گولی مار دو گے انہیں اگر وہ پھر سامنے آئے؟" وہ گھبرا گئی۔

غلام حسین ہنس پڑا۔ "ڈرو نہیں، یہ شہدے کم ہمت لوگ ہوتے ہیں..."

اس نے غلام حسین کی بات کاٹ دی۔ "وعدہ کرو تم ایسا نہیں کرو گے، تمہیں میری قسم ہے۔"

غلام حسین پھر بھونچکا رہ گیا۔ بلقیس نے اسے کلین بولڈ کر دیا تھا۔ اپنی قسم ہر لڑکی تو نہیں دے سکتی۔ جب تک وہ اس حق کو تسلیم کرنے کا یقین اور حوصلہ نہ رکھتی ہو اور غلام حسین کا خیال غلط نہیں تھا پیر ساوہ کی ہزاروں فٹ بلندی پر آسمان اور زمین کے تاروں کی گواہی میں اس نے تسلیم کیا کہ وہ غلام حسین کو بہت پہلے سے پسند کرتی تھی مگر ایک حسنِ اتفاق نے اسے جرأتِ اظہار دے دی اور غلام حسین کا دل چاہا وہ اس بلندی سے نشیب میں پرواز کر جائے۔

خوشبو، موسیقی رومانس اور جلوت میں خلوت کے اس ماحول میں غلام حسین اور کیا کر سکتا تھا سوائے اعترافِ عشق کے اور اظہارِ وارفتگی کے... اور اپنی خوش قسمتی پر ناز کے اور عہدِ وفا کے... اور سرِ تسلیم خم کرنے کے اور اس کے ساتھ زندگی گزار دینے کی خواہش کو زبان دینے کے... سو یہ سب اس نے کیا اور جب نصف شب کو اس سے دامن کوہ کے پارکنگ ایریا میں جدا ہوا تو اس کے گھر تک کار کے پیچھے پیچھے یوں چلتا رہا جیسے لوگ نیند میں چلتے ہیں اور صبح تک چلتا رہا۔ کبھی خواب میں کبھی تصور میں... اس کے ساتھ ساتھ اس کی خوشبو کے پیچھے... اس کی قربت کی آنچ میں چلتا ہوا۔

اگلے دن اسے لگا کہ یہ دنیا کتنی بدل گئی ہے ایک رات میں... سب کچھ نکھرا نکھرا نیا نیا اور خوش رنگ تھا۔ اس دن دفتر میں کوئی خاص کام نہ تھا چنانچہ اس نے سنجیدگی سے اپنے اور بلقیس کے مستقبل کے لائحہ عمل پر سوچنا شروع کیا۔ آغاز وہ کہاں سے کرے اور کیسے کرے، راجا کرم داد خان سے کیسے کہے کہ میں آپ کی مزید غلامی نہیں کر سکتا کیونکہ میں بلقیس کا بندۂ بے دام ہو گیا ہوں۔ بھیس چھڑائے دیس چھڑائے کیا کیا کرے نہ پریت۔

راجا صاحب نے نظر اٹھا کے اسے دیکھا۔ "تم جانا چاہتے ہو؟ کہاں... اور کیوں؟"

"میں آپ کی نوکری چھوڑنا چاہتا ہوں۔ ابھی فیصلہ نہیں کیا کہ کہاں جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے باہر چلا جاؤں۔"

"آخر اس اچانک فیصلے کی وجہ بھی ہو گی کوئی۔ کیا تکلیف ہے یہاں کوئی شکایت ہے مجھ سے؟"

غلام حسین نے کہا۔ "نہیں، کوئی نہیں۔ آخر کب تک آپ پر انحصار کر سکتا ہوں میں، مجھے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہیے، خود کچھ کرنے کے قابل بننا چاہیے۔"

راجا کرم داد خان اسے دیکھتا رہا۔ "یہ پٹی کس نے پڑھائی ہے تجھے؟"

وہ ٹپٹا گیا۔ "کسی نے نہیں راجا صاحب، دراصل راجا صاحب، یہ سیاست کا کھیل بہت خطرناک ہے۔ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتے ہیں۔ اب آپ دیکھیں نا، گجر کے ساتھ کیا ہوا۔ مگر وہ تو جیل میں بھی چیئرمین بنا ہوا ہے، مارے گئے اس کے جاں نثار، کارکن، پولیس نے کیسے کیسے مقدمات میں ڈال دیا۔ میرے باپ کا تو کوئی نہیں میرے سوا۔ میں جانتا ہوں اسے کوئی خطرہ نہیں اور اب اس کی زندگی کے دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ آپ نے اس چھوٹے مکان کے بدلے اسے ایک نیا دس مرلے کا گھر بھی دے دیا ہے۔ لیکن اللہ آپ کا سایہ سلامت رکھے۔ میرا کیا ہو گا جس دن آپ نہیں ہوں گے۔ آپ کے بیٹے تو سب باہر ہیں اور سیٹ ہیں۔"

غلام حسین حیران تھا کہ اس میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی اور اس نے اتنے مضبوط دلائل کیسے دے دیے جس میں بلقیس کا نام ہی نہیں آیا نہ اس کے عشق کا حوالہ آیا اور نہ اس کے ساتھ مستقبل کے کسی عہدِ وفا کا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کے پیچھے وہی ہے جیسے پہاڑ کی بلندی سے پھوٹنے والا پانی کا چشمہ جب نشیب کی طرف بڑھتا ہے تو راستے کی ہر رکاوٹ کے باوجود اتنی قوت حاصل کر لیتا ہے کہ اس کا بہاؤ بڑے بڑے پتھروں کو ریزہ ریزہ کر دے۔ لیکن اس قوت کا سرچشمہ تو وہی زمین میں چھپی نظر نہ آنے والی کششِ ثقل ہوتی ہے۔ تو اسے بھی بلقیس کے خیال نے سب کچھ کر گزرنے کی ہمت عطا کر دی تھی۔

راجا چپ ہو گیا۔ میز پر پنسل بجاتے ہوئے وہ کچھ سوچتا رہا۔ بہت دیر بعد اس نے ہلکا پھلکا ہو کے کام میں مصروف ہو جانے والے غلام حسین سے کہا۔ "بات تو ٹھیک ہے تیری پتر غلام حسین... لیکن جلدی مت کر... اور سوچ لے چند دن۔"

راجا کے منہ سے اپنے لیے "پتر" کا لفظ غلام حسین نے پہلی بار سنا تھا مگر وہ متاثر نہیں ہوا، اسے کون سا کھڑے

دم ستعفادے کر اپنے واجبات وصول کرنے تھے۔ چند دن میں وہ بھی بلقیس کے چچا سے مل کر معاملات طے کرے گا اور یہ بھی کہ اس کو راجا سے کتنا مال کھینچنا چاہیے۔ اپنی خدمات، فرض شناسی اور مخلصی کے بدلے... اس کو جذباتی طور پر ایکسپلائٹ کرنا مشکل تھا۔ بڈھا بڑا گھاگ اور گرگِ باراں دیدہ تھا۔ صاف کہے گا کہ الو کے کان... تو نے کوئی احسان کیا مجھ پر؟ جو کام کیا اس کا معاوضہ دوسروں سے زیادہ ہی وصول کیا تو کیا سمجھتا ہے کہ مجھے کچھ پتا نہیں تیری ہیرا پھیری کا؟ یاد کر جب میرے پاس آیا تھا تو کیا تھا۔ کنگلا، نکما اور آوارہ گرد... آج مجھ سے بات کرتا ہے انعام کی۔ چل پھٹ اِدھر سے ڈاک بابو کی اولاد۔ مجھے تو جب کچھ ہوگا تب ہوگا۔ تجھے ابھی تھانے دار کو بُلا کے اندر کرا دوں غبن کے الزام میں۔ تیرہ نمبر کے ایک سو ایک چھتر روز ملیں گے انعام میں... بس، ایسا بھی ہو سکتا تھا۔ ابھی تو اس کے پاؤں دوسری زمین پر ٹکے بھی نہیں۔ اسے عجلت نہیں کرنا چاہیے۔ عجلت کار شیطان پہنچ پکے سو میٹھا ہو اور انا اللہ مع الصابرین... وغیرہ وغیرہ۔

راجا کرم داد خاں کا دور کا کزن اب خود کو فیروز خان ... لکھتا تھا اور اس کا بزنس ''ایف کے انٹرپرائز'' کا دفتر مری روڈ کی ایک عمارت کے دوسرے فلور پر تھا۔ دو بڑے کمروں میں شیشے اور لکڑی کی پارٹیشن والے کیبنوں میں اس کا اسٹاف بیٹھتا تھا۔ درمیان میں موٹے شیشے کی دیوار کے پیچھے فیروز کی بیش قیمت انسانی گردے کی شکل والی آفس ٹیبل تھی جس کے پیچھے اس کی بلیک لیدر کی گھومنے والی کرسی تھی اور سامنے قوس کی صورت میں چھ کرسیاں تھیں جن پر مہمان بیٹھتے تھے۔ عملہ اس کی جھاڑ کھڑے رہ کر سنتا تھا۔ شیشے کی دیوار پولرائزڈ گلاس تھا جس میں سے وہ خود نظر آئے بغیر اسٹاف کو دیکھ سکتا تھا۔ اس کے پاس رسائی ایک نسبتاً بہت چھوٹے کمرے سے گزر کے ہوتی تھی جس میں اس کی سیکریٹری بیٹھتی تھی۔ سب کے کردار کا یہی احوال غلام حسین کو بلقیس سے ہی معلوم ہوا تھا جس نے اسے چاچاجی سے ملاقات کا گرین سگنل دے دیا تھا۔

ان چند منٹوں میں جو غلام حسین نے سیکریٹری کے آفس میں کھڑے رہ کر گزارے، اس نے پوری کوشش کی کہ وہ اس کے اچھلتے بلاؤز کی طرف نہ دیکھے۔ بلقیس نے خبردار کیا تھا کہ اس فاحشہ سے بچنا مگر اس سوال کا جواب گول کر گئی تھی کہ آخر چاچاجی اس کو نکال باہر کیوں نہیں کرتے۔ فاحشہ نے بلاوجہ شرماتے ہوئے جیسے وہ اسی کو گھور رہا تھا کہا۔ ''جائیے، سر بلا رہے ہیں آپ کو۔''

اس نے اپنا رسمی تعارف ضروری سمجھا۔ ''میں غلام حسین ہوں۔ راجا کرم داد خاں آپ کے کزن کے پاس کام کرتا ہوں۔''

فیروز نسبتاً کم وزن کا صحت مند آدمی تھا۔ ''مجھے معلوم ہے لیکن تم کو شاید یہ معلوم نہیں کہ ہم فرسٹ نہیں، سیکنڈ یا تھرڈ کزن ہیں۔ تم ڈاک بابو عاشق حسین کے بیٹے ہو، کیسے آنا ہوا؟''

اب وہ کیسے کہتا کہ معلوم تو مجھے سب ہے۔ یہ بھی کہ کرم داد اور آپ کے درمیان دشمنی کی وجہ سیاست نہیں رقابت ہے اور جو آج کرم داد کی بیوی ہے آپ اس سے شادی کرنا چاہتے تھے اور آپ محض تجاہل عارفانہ سے کام لے رہے ہیں ورنہ آپ کو معلوم ہوگا کہ مجھے آپ کی پروردہ بھتیجی نے یہاں بھیجا ہے۔ آپ کی خواہش پر... اور میرے لیے اس کا حکم ہی کافی ہے خواہ اشارۂ ابرو ہو۔ دیگر وجوہ ثانوی ہیں۔

مگر اس نے تیاری کے مطابق اپنی آمد کی غرض و غایت بڑے مدلل انداز میں بیان کی۔ ''میں پاکستان کی سیاست کے انتقامی کھیل کا نشانہ بننے سے ڈرتا ہوں۔ یہ میں نے راجا صاحب کو بتا دیا تھا کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتے ہیں۔ میں تو اپنے والدین کا ایک ہی سہارا ہوں۔''

''اچھا؟ اور اس نے کیا کہا؟ پوچھا نہیں کہ کیا کرنا چاہتے ہو تم؟''

''پوچھا تھا۔ میں نے کہا کہ بزنس، اپنا بزنس... ابھی تو کچھ نہیں ہے میرے پاس... لیکن سرمایہ ہو جاتا ہے لیکن تجربہ پہلے ہونا چاہیے ورنہ سرمائے کے ساتھ بندہ خود بھی ڈوب جاتا ہے۔ میں پہلے کاروبار سیکھوں گا۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ میں کسی ملٹی نیشنل کمپنی کے صدر سے مل کے کہوں کہ جناب میں بزنس سیکھنے آیا ہوں۔''

فیروز ہنس پڑا۔ ''میں نے بھی کوئی بزنس اسکول تو نہیں کھول رکھا۔ لیکن ہاں، میں نے سن رکھا تھا تمہاری ذہانت اور انتظامی صلاحیت کے بارے میں... تم نے کرم داد کے لیے دن رات ایک کر دیا اور وہ بھی بہت اعتماد کرتا ہے تم پر۔ اس نے روکا نہیں تمہیں؟''

''روکا تھا، یہ کہا کہ جلدی مت کرو، سوچ لو۔ اتنی ہی محنت میں آپ کے لیے بھی کر سکتا ہوں۔ آپ کا کاروبار تو ماشاء اللہ دبئی تک پھیلا ہوا ہے۔''

''غلام حسین، یہ سننے کے بعد کہ تم صرف کاروبار سیکھنے

کے لیے اس ادارے میں آرہے ہو اور جب سیکھ لو گے تو چھوڑ کے چلے جاؤ گے، اپنا کام کرو گے۔ یعنی ایک طرح سے حریف بن کے... کون بے وقوف ہے جو تمہیں دروازے کا راستہ نہیں دکھائے گا کہ تم نے ہمارا وقت ضائع کیا... لیکن...'' وہ بات کرتے کرتے رکا اور پانی کے گلاس سے ایک گھونٹ لیا۔ ''مجھے تمہاری صاف گوئی پسند آئی۔''

''تھینک یو سر۔''

''دوسری بات... مجھے کوئی خطرہ محسوس کرنے کی کیا ضرورت ہے تم سے؟ اس دیس میں میرے جیسے بہت ہیں کچھ مجھ سے بہت آگے، کچھ بہت پیچھے... کل یا دو چار... پانچ دس سال بعد اگر تم یہی کام کرتے ہو، تو میرا تمہارا کیا مقابلہ... تم مجھ سے تیس برس پیچھے سے آغاز کرو گے۔ میرے حریف کیسے بن سکتے ہو تم... بزنس تو ایک سمندر ہے جس میں بڑی مچھلی ہمیشہ چھوٹی مچھلی کو نگل جاتی ہے لیکن پھر بھی سمندر خالی تو نہیں ہو رہا۔''

''آپ تو فلسفی ہیں سر...''

وہ ہنسا۔ ''ابھی ابھی تمہاری بات سے مجھے ایک نیکی کا خیال آیا۔ ہمارے حکیم اور پہلوان اسے غلطی شمار کرتے تھے کسی شاگرد کو حریف بنانا، نتیجہ یہ کہ حکمت بھی ختم اور پہلوانی بھی۔ تو بس میں تمہیں یہ موقع دوں گا۔ میرا اس سے کوئی نقصان نہیں ہوگا اور نہ یہ میرے لیے خطرے کی بات ہوگی۔ تمہاری جگہ کوئی اور لے لے گا۔ رازق اللہ ہے۔ وہ تمہارے ارادوں میں اور تمہاری کمائی میں برکت دے۔ میں تمہیں ملازم نہیں رکھ رہا ہوں۔ اپنا شاگرد بنا رہا ہوں۔ بزنس سکھانے کے لیے...''

غلام حسین اسے بے یقینی سے دیکھتا رہا۔ ''میں تو نوکری کے لیے آیا تھا سر۔''

وہ پھر ہنس پڑا۔ ''ڈرو نہیں۔ میں تم سے فیس نہیں لوں گا جو کام کرو گے اس کی تنخواہ دوں گا۔ کتنی ہونی چاہیے تمہارے خیال میں یہ تنخواہ...''

غلام حسین نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''راجا کرم داد سے ایک لاکھ مل جاتے تھے سب ملا کے... انعام وغیرہ۔''

''میں بھی ایک لاکھ دوں گا۔ گاڑی بھی، رہائش تمہاری اپنی ہے اس کا بھی کچھ ہو جاتا، کب جوائن کرو گے؟''

غلام حسین سخت جذباتی ہو رہا تھا۔ نوکری اور نیکی کے فلسفے نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ ''سر! جلد از جلد... شاید اسی ہفتے میں لیکن... کیا آپ کو کسی معاون کی ضرورت نہیں تھی؟''

فیروز نے شیشے کی دیوار کے پار دیکھا۔ ''معاون تو ان میں سے کوئی بھی ہو جاتا بلکہ سب معاون ہیں۔ بس تمہاری بات میرے دل کو لگی۔ میں نے سوچا کہ... بیٹا ہوتا میرا اپنا... تو کیا اس کو میں کام نہ سکھاتا؟ چلو اس کی جگہ ایک باصلاحیت نوجوان کو اگر اس کے پیروں پر کھڑا ہونے میں مدد کی جائے... تو شاید یہ پہلی کاروباری نیکی ہوگی۔ ورنہ کاروبار میں تو رقابت ہوتی ہے۔'' وہ ہنسا۔

''ایسا وقت کبھی نہیں آئے گا سر کہ میں آپ کا کاروباری حریف بنوں۔ دنیا بہت بڑی ہے اور کاروبار بھی بہت ہیں کرنے والے کے لیے... آپ کی بات نے مجھے خرید لیا ہے سر۔'' وہ عقیدت کے ساتھ ہاتھ ملا کے کمرے سے نکل آیا۔

فیروز اسے شیشے کی دیوار سے جاتا ہوا دیکھتا رہا اور مسکرایا۔ ''میں دیکھتا ہوں تم یہاں سے نکلتے کیسے ہو میرے حریف بننے کے لیے۔'' ایف کے انٹرپرائز کے چیئرمین نے طمانیت سے سوچا۔ میں تو تمہیں خرید چکا۔

اگلے دن راجا کرم داد خاں کا رویہ معمول کے مطابق رہا جیسے ان کے درمیان ایسی کوئی بات ہی نہیں ہوئی تھی جو آپس کے اعتماد کو متاثر کرے۔ دوپہر کو ایک غیر متوقع بات ہوگئی۔ عاشق حسین کی طبیعت فوٹو اسٹیٹ مشین پر کام کرتے ہوئے اچانک بگڑ گئی۔ پرانا مکان چھوڑنے کے بعد اس نے مین روڈ پر ایک دکان کرائے پر حاصل کر کے مشین، کتابوں اور اسٹیشنری کی دکان کو وہاں شفٹ کر دیا تھا اور اب دوسری مشین لگانے کا سوچ رہا تھا۔ یہ صبح سے رات تک کھڑے رہ کر کرنے کا کام تھا جس کی اب اس میں سکت نہ تھی۔ صفائی اور چھوٹے موٹے کاموں کے لیے ایک لڑکا یہ کام سیکھ رہا تھا اور عاشق حسین کا ارادہ تھا کہ دوسری مشین وہ سنبھال لے گا۔ بڑھتی ہوئی آمدنی کی خوشی میں وہ اپنی عمر کو بھول گیا تھا۔

اس نے تمام عمر ڈیسک پر بیٹھ کے کام کیا تھا۔ کبھی کاؤنٹر پر لفافے اور ٹکٹ بیچے تھے تو اس سے پہلے ڈاک پر مہریں لگائی تھیں۔ مسلسل بیٹھنے سے صحت پر اثر پڑتا ہی تھا۔ بعد میں چند سال وہ پرچون کی دکان کرتا رہا اور پھر کتابوں اسٹیشنری وغیرہ پر آیا تو اس کی عمر ستر کے لگ بھگ تھی۔ وہ دن کے چودہ گھنٹے کھڑے رہ کر کیسے گزار سکتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ اسے چکر آیا اور وہ وہیں گر کے بے ہوش ہوگیا۔ اطلاع ملتے ہی غلام حسین اسے ٹیکسی میں ڈال کے اسپتال لے گیا جہاں

ڈاکٹرز نے بتایا کہ اس کو بلڈ پریشر ہے اور اس کے دل کی دو شریانیں مکمل بند ہیں تو تیسری بند ہونے کے قریب تھی۔ اس کا بائی پاس آپریشن ضروری ہے۔

عاشق حسین کو داخل کرلیا گیا۔ اسپتال آنے جانے کے لیے راجا کرم داد کی ایک گاڑی اس کے استعمال میں رہی۔ وہ ماں کو بھی لاتا لے جاتا رہا اور وہ خود وہاں موجود رہا۔ آپریشن کی تاریخ مقرر ہوگئی تھی اور ڈاکٹروں نے پوری یقین دہانی کرائی تھی کہ خطرے کی بالکل کوئی بات نہیں۔ یہ اب روٹین کا معمولی آپریشن شمار ہوتا ہے۔ اس تمام عرصے میں اس کی بلقیس سے صرف فون پر بات ہوسکی۔ دوسرے معاملات بھی پس پشت چلے گئے تھے۔

جس صبح آپریشن شیڈول تھا اس سے پہلے رات کو راجا کرم داد خود آیا۔ اس نے بھی وہی باتیں کیں جو سب کرتے تھے۔ جاتے وقت اس نے دو چابیاں غلام حسین کو دیں۔ یہ کار کی چابیاں تھیں۔

''یہ کیا راجا صاحب؟'' سمجھنے کے باوجود غلام حسین نے پوچھا اور چابیوں کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔

''یہ تمہاری گاڑی ہے، رکھو۔'' راجا نے چابی اس کی مٹھی میں تھما دی۔ ''تمہیں ضرورت ہے۔''

غلام حسین سمجھ گیا کہ یہ مدد نہیں رشوت ہے جس کے لیے سب سے موزوں وقت اور جگہ یہی تھی لیکن اس کے مزید کچھ بولنے سے پہلے عاشق حسین کا چہرہ مسرت اور احسان مندی کے جذبات سے کھل اٹھا۔ ''رکھ لے پتر رکھ لے... اتنی محبت سے راجا صاحب دے رہے ہیں۔'' پھر وہ انہیں دعائیں دینے لگ گیا۔ صحت اور خوش حالی کی اور کامیابی کی۔ غلام حسین کو چابیاں رکھنا پڑیں اور شکریہ بھی ادا کرنا پڑا۔

''بھئی بکنگ تو بہت پہلے کرادی تھی مگر یہ شوروم والے بہت کمینے ہیں۔ فوری ڈلیوری کے لیے زیادہ پیسے مانگتے ہیں۔ اسے آن منی کہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اب ایسی بھی آفت کوئی نہیں آرہی ہے مجھ پر... اللہ کے فضل سے تین گاڑیاں تو ہیں۔ اب دیکھو آج ملی جب واقعی ضرورت تھی۔ دن میں تمہارے نام بھی کرادی میں نے۔'' اس نے واسکٹ کی جیب سے نئی رجسٹریشن بک نکال کے غلام حسین کو دی۔

اس بات کا مقصد صرف یہ واضح کرنا تھا کہ غلام حسین کے مستعفی ہونے کے فیصلے سے بہت پہلے وہ اس کو انعام سے نوازنے کا فیصلہ کرچکے تھے اور اس پر قائم تھے ورنہ آج ایک دن میں گاڑی اس کے نام پر رجسٹرڈ کیسے ہوتی۔ اس کے لیے بھی ان کو تعلقات کی ڈوری ہلانے کے علاوہ رشوت بھی دینی پڑی ہوگی۔ خیر، وہ ایسے کسی دباؤ میں آنے والا نہیں۔ نہ بلقیس کو چھوڑا جاسکتا ہے اور نہ اس چانس کو جو کاروبار میں اپنے قدم جمانے کے لیے فیروز دے رہا تھا۔

دو دن بعد جب عاشق حسین کی حالت بالکل نارمل ہوگئی۔ اس نے بلقیس کو دوپہر کے وقت ملنے کا کہا۔

صدر کے ''دیس پردیس'' ریسٹورنٹ میں وہ دو گھنٹے اس سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے اپنے مستقبل کا پورا نقشہ بلقیس کے سامنے رکھ دیا جس کو اب وہ بلّو کہنے لگا تھا۔ ''یہ رشوت یا دنیا کی کوئی طاقت اب میرے تمہارے درمیان حائل نہیں ہوسکتی بلّو... میں فیصلہ کرچکا ہوں۔''

وہ ہنسی۔ ''اتنا فلمی ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''وہ راجا سمجھتا ہے کہ ایک کار کی رشوت تمہاری محبت سے بڑی طاقت ہے۔ میں یہ واپس کردوں گا۔''

''گلو بادشاہ، جو تمہیں مل گیا تمہارا مقدر تھا اسے ٹھکراتے کیوں ہو، ہاں راجا خود واپس مانگے تو اور بات ہے ورنہ رکھو، موج کرو۔ چاچاجی سے تمہاری ملاقات کا پتا چلا تھا مجھے، لیکن اتنی تفصیل سے نہیں۔''

''انہوں نے تو خرید لیا مجھے بلّو، کہنے لگے کہ تمہاری صاف گوئی اچھی لگی مجھے... اب میں تمہیں بزنس سکھاؤں گا جیسے... کوئی بیٹا ہوتا تو اسے سکھاتا۔''

بلقیس نے سر ہلایا ''اولاد نہ ہونے کا دکھ کبھی نہ کبھی ان کی زبان پر آجاتا ہے۔''

اس نے بلقیس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ میں نے تمہیں مانگا تو وہ انکار نہیں کریں گے۔ وہ کیا کہتے ہیں اپنی فرزندی میں قبول کرلیں گے۔''

وہ ہنسی۔ ''اتنا تیز مت بھاگو کہ ٹھوکر لگے تو منہ کے بل گرو۔''

''کیوں؟ جب تم میرا ساتھ دو گی؟''

اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ ''غلام حسین، ان کے احسانات کا پہاڑ ہے میرے سر پر... مجھے نہیں معلوم ان کا فیصلہ کیا ہوگا۔ اور کیا پتا وہ پہلے سے کچھ سوچ رہے ہوں۔ ان سے اختلاف کا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں۔''

غلام حسین کا دل ڈوبنے لگا۔ ''کیا مطلب، تم میرا ساتھ نہیں دو گی، اگر ایسا ہوا؟''

''ساتھ دینے کا مطلب اگر تم نے یہ لیا ہے کہ میں تمہارے ساتھ جا کے اپنی مرضی سے کورٹ میرج کرلوں گی

تو... نہیں یہ میں نہیں کرسکتی۔ ویسے کیا میں نے تمہارا ساتھ نہیں دیا ہے اب تک...؟''

''وہ تم سے پوچھے بغیر تو کوئی رشتہ طے نہیں کرسکتے، کیا ایسا ہے کوئی؟''

''مجھے کیا معلوم... رشتے تو سب کے آتے ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ جہاں بیری ہوتی ہے پتھر تو آتے ہیں۔''

''گولی مارو بیری کو... ایسا نہ ہو کہ میں سوچتا رہ جاؤں۔''

''یار ابھی کچھ نہیں ہورہا اور چاچا جی کیا تمہیں ایسے لگے کہ میری مرضی کے بغیر مجھے زبردستی کسی کے ساتھ بھیج دیں۔ تم حوصلہ رکھو۔ پہلے ان کے نمک خوار بن جاؤ۔ اپنی قدروقیمت ان پر واضح کرو۔ مجھے یقین ہے کہ بیٹی کی پسند ان کی پسند بن جائے گی بہت جلد۔'' اس کا چہرہ کچھ لال ہوا۔

لیکن تقدیر تھی کہ غلام حسین کے ساتھ شطرنج کا گیم کھیل رہی تھی اور اسے شہ پر شہ دینے پر تلی ہوئی تھی۔ عاشق حسین کو تین دن بعد اسپتال سے رخصت کردیا گیا۔ اسے کہا گیا تھا کہ اب وہ فٹ ہے۔ اس کا دل جوان ہوگیا ہے۔ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ اس کا مطلب عاشق حسین نے یہ لیا کہ وہ پہلے کی طرح صبح سے شام تک فوٹو اسٹیٹ مشین پر گزارہ سکتا ہے۔ حالانکہ ڈاکٹروں کا مقصد اس کا مورال بڑھانا تھا۔ غلام حسین نے اسے سختی سے روک دیا۔

''آپ وہاں جاکے بیٹھ سکتے ہیں اس لیے کہ گھر میں آپ کا وقت نہیں گزرے گا۔ لیکن وہاں کام ملازم کریں گے۔ ایک مشین آپ کی مصروفیت کے لیے کافی ہے۔ آمدنی میں اضافے کی فکر آپ کو کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ نے میری بات نہ مانی تو میں دکان بند کردوں گا۔''

ایک ہفتے بعد اس نے آفس کے معاملات دیکھے اور سوچنے لگا کہ اب اسے چارج دینے کی تیاری کرنی چاہیے۔ راجا کرم داد سے کہہ دینا چاہیے کہ وہ جس کو مناسب سمجھیں اس کی جگہ رکھ لیں۔ وہ اسے دو چار دن میں تمام معاملات سمجھا دے گا۔ فیروز خان کی طرف سے وہ بے فکر تھا۔ اس کا کوئی کام رکا ہوا نہیں تھا۔ الٹا غلام حسین ان کی ایک ذمے داری بن کے آرہا تھا کہ کام سکھادیں اور اپنا بزنس سیٹ کرنے میں اس کی مدد کریں۔ بقول ان کے یہ نوکری نہیں، نیکی تھی جو وہ کرنا چاہتے تھے۔

راجا کرم داد کہیں جاتے جاتے ایک منٹ کے لیے اس کے پاس رکا۔ ''دیکھو، ایک گاڑی سروس کے لیے گئی ہے۔ دوسری خراب ہے۔ تم ذرا اپنی گاڑی میں بی بی کو لے جاؤ۔''

کچھ پوچھنے کا سوال ہی نہ تھا۔ وہ کئی بار کرم داد کی بیوی کو بازار لے گیا تھا۔ اور تینوں بیٹیوں کے سسرال... اب ایک باہر چلی گئی تھی۔ باقی دو اسلام آباد میں تھیں۔ وہ گاڑی میں بیٹھا ان کا انتظار کررہا تھا کہ پیچھے والا دروازہ کھلا۔ خوشبو کا ایک مانوس جھونکا آیا اور اس نے بیک ویو مرر میں بس ایک جھلک دیکھی۔ یہ عائشہ تھی جو آج برقع میں نہیں تھی۔ جیسے وہ کالج جاتے وقت ہوتی تھی۔

''اب کیا میں درخواست کروں کہ چلیے۔'' عائشہ نے کہا۔

وہ چونکا۔ ''سوری بی بی جی۔'' اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

''نہ بی بی جی اور نہ بی بی سی۔ میرا نام عائشہ ہے سیدھا سیدھا...''

''جی... کہاں جانا ہے؟'' وہ بولا۔ ''دراصل مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ آئی ہوئی ہیں۔''

''مجھے کچھ شاپنگ کرنی تھی اپنے لیے۔ بازار کھل تو گیا ہوگا۔ بارہ بجے ہیں۔''

''طارق روڈ پوری طرح ایک بجے کھلتی ہے۔''

''اچھا، چلو کچھ دیر انتظار کرلیں گے۔ تم نے لسی والی گلی دیکھی ہے؟ سندھی مسلم سوسائٹی میں۔''

''آپ... لسی پئیں گی؟'' اس نے حیرانی سے کہا۔

''کیوں نہیں پی سکتی میں لسی۔ اس پر بھی مردوں کی اجارہ داری ہے کیا؟''

''وہ... دراصل... لڑکیاں ذرا اپنے وزن کے معاملے میں محتاط ہوتی ہیں۔ میں نے کبھی دیکھا نہیں وہاں۔''

''آج دیکھ لینا۔ تم کہو تو دو گلاس پی کے دکھاؤں؟''

وہ مسکرایا۔ ''میجر صاحب کیسے ہیں؟'' اس نے عائشہ کے شوہر کے بارے میں پوچھا۔

''مر گئے میجر صاحب۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''مر گئے؟'' غلام حسین نے حیران ہو کے پیچھے دیکھا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟''

''میرا مطلب تھا کہ میرے لیے مر گئے۔ میں نے چھوڑ دیا ہے انہیں... بچہ بھی پکڑا دیا ہے کہ پالو، تمہاری شکل پر کیوں بارہ بج گئے ہیں؟'' وہ بیک ویو مرر میں اسے دیکھ رہی تھی۔ ''اب یہ مت پوچھنا کہ کیا ہوا کیوں ہوا۔ میری

مرضی بس۔ میں نہیں رہ سکتی تھی اس کے ساتھ۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں اس کے گھر میں نہیں اس کی یونٹ میں ہوں۔''

وہ چپ چاپ سنتا رہا اور لسی پیتا رہا۔ اس نے گاڑی ایک بجے سے کچھ پہلے ڈالمین مال کے سامنے روکی جہاں اس وقت پارکنگ کی جگہ ملنا ناممکن نہیں تھا۔ اس نے عائشہ کو گاڑی سے اتر کر انتظار کرتے دیکھا۔

''تم کیا دھوپ میں بیٹھے رہو گے یہاں اکیلے... ڈرائیور نہیں ہو تم میرے۔''

اس نے پھر کہا۔ ''جی'' اور گاڑی لاک کر کے عائشہ کے ساتھ ہولیا۔ اپنے خرید کردہ کپڑوں، جوتوں کے شاپنگ بیگ وہ غلام حسین کو پکڑاتی گئی۔ پھر اچانک جینٹس کے کپڑوں کی ایک دکان میں داخل ہوگئی۔ اس نے سیلز مین سے شرٹس دکھانے کے لیے کہا۔

''صاحب کے لیے۔'' سیلز مین نے پوچھا۔

''نہیں، میرے لیے۔'' عائشہ نے برہمی سے کہا۔ ''اور ڈریس پینٹ بھی۔''

''عائشہ... مجھے ضرورت نہیں۔'' غلام حسین نے احتجاج کیا مگر دبے دبے لہجے میں۔

''آپ چپ کریں۔ یہی کہتے ہیں آپ تو...'' عائشہ نے اسے روایتی بیویوں کے لہجے میں ڈانٹا۔

اس نے باہر آ کے احتجاج کیا۔ ''عائشہ... ایسا مت کرو پلیز۔''

''غلام حسین... وہ بہت پرانی بات ہوگئی جب تم میرے لیے صرف ڈرائیور تھے۔ مجھے کالج لاتے لے جاتے تھے اب ڈیڈی تم کو گھر کے ایک فرد جیسی اہمیت دیتے ہیں۔ اور بہت تعریف کرتے ہیں تمہاری۔'' عائشہ نے کہا اور اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

غلام حسین کے دماغ میں خطرے کا گھنٹا بجنے لگا۔ دوپہر کو ایک چائنیز میں جہاں اس وقت ان کے سوا ان جیسا ہی ایک اور جوڑا تھا۔ وہ غلام حسین کو بڑی اپنائیت کے ساتھ جتاتی رہی کہ اس نے شادی کے بعد ڈیڑھ سال کس عذاب میں گزارا اصولاً تو واجب تھا کہ وہ شوہر کو قتل کر دیتی۔ ایسے کئی مواقع آئے تھے لیکن اس نے گزارا کیا۔ اب وہ میجر صاحب کو چھوڑ آئی ہے اور ڈیڈی نے بھی خلع کا نوٹس بھجوانے کے لیے وکیل سے بات کرلی ہے۔

غلام حسین سنتا رہا اور سوچتا رہا۔ اسے لگتا تھا کہ اسے روکنے کے لیے گاڑی کے بعد شاید عائشہ بھی جال کا ایک پھندا بنے گی۔ یہ تو فرض کرنا مشکل تھا کہ ایسا راجا کرم داد کی مرضی، اشارے پر ہو رہا تھا۔ کوئی باپ قانونی علیحدگی ملنے سے بھی پہلے بیٹی کو دوسرا شوہر تلاش کرنے کا اشارہ دے۔ ماضی میں عائشہ کے کردار سے جتنا وہ واقف تھا اتنا اور کون ہوسکتا تھا۔

ویٹر بل لایا۔ عائشہ ابھی بیگ میں ہاتھ مار رہی تھی کہ غلام حسین نے اپنا ویزا کارڈ رکھ کے ویٹر کے حوالے کر دیا۔ عائشہ نے دیکھا اور پسندیدگی سے مسکرائی۔ ''یہ کی نا تم نے ایک قابلِ تعریف مردانہ حرکت۔''

''آج سے پہلے بھی مرد نہیں... ڈرائیور تھا۔'' وہ بولا ''لیکن میں نے راجا صاحب کی نوکری چھوڑ دی ہے عائشہ۔''

اس کا منہ انکشاف کی حیرت سے کھلا رہ گیا۔ ''نوکری چھوڑ دی ہے؟ کیوں؟''

''جو چھوڑی نہ جا سکے وہ غلامی ہوتی ہے۔'' وہ مسکرایا۔ ''لیٹ سی گو۔'' غلام حسین نے بل پر سائن کر کے کارڈ اٹھالیا اور دروازے کی طرف چل پڑا۔

گاڑی میں بیٹھ کر عائشہ اس پر برس پڑی۔ ''آخر کچھ پتا تو چلے، نوکری کیوں چھوڑی تم نے؟''

''تم نے بھی تو چھوڑی ہے۔'' غلام حسین نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''بہتر مستقبل کی امید میں۔''

عائشہ کے لیے یہ جواب کسی تھپڑ سے کم نہ تھا۔ اس کا چہرہ اتر گیا۔ ''مت بتاؤ، میں نے تو ایک دوست سمجھ کے پوچھا تھا۔''

''عائشہ! ہم کبھی دوست نہیں رہے۔''

عائشہ یہ وار بھی سہہ گئی۔ ''اوکے، آئی واز رانگ... لیکن ہم اب دوست بن سکتے ہیں۔''

''ایسی کیا مجبوری درپیش ہے تمہیں یا مجھے... مجھے تو دوستوں کی کمی نہیں۔''

''مگر مجھے ہے۔ دنیا میں کوئی نہیں جس سے میں دل کی بات کہہ سکوں۔ نہ ماں سمجھتی ہے نہ باپ۔'' اس نے گلوگیر لہجے میں بولنا شروع کیا اور اپنے شوہر کے ظلم و ستم اور غیر انسانی سلوک کی کہانی سناتے سناتے سچ مچ رو پڑی۔ غلام حسین نے خاموش رہنے کا جو فیصلہ کیا تھا، اس پر وہ گھر پہنچنے تک قائم رہا۔

دو دن بعد غلام حسین نے راجا کرم داد سے فائنل بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ چارج گیا بھاڑ میں۔ کوئی چارج لینے والا نہیں ملتا تو یہ آپ کا مسئلہ ہے۔ میں کل سے نہیں آؤں گا۔ گزشتہ شام وہ بلقیس کو یہ بات بتا چکا تھا اور اس نے

کہا تھا کہ جلدی مت کرو۔ چاچاجی کوئی تمہارے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے ہیں لیکن وہ اپنے وعدے پر قائم رہیں گے کیونکہ انہوں نے تمہارے مسئلے کو ذرا مختلف انداز میں لیا ہے۔ اسے وہ نیکی سمجھ رہے ہیں اپنی جو تمہارے لیے نوکری ہے۔ چاچاجی کی بات میں کوئی منطق نہیں تھی مگر ان کی عمر میں سوچ غیر منطقی ہو جائے تو حیرانی کیسی۔ اس کے حق میں تو یہ اچھا ہی تھا۔

اس کے خیال کی رو اچانک ٹوٹ گئی جب اچانک دو ملازم راجا کرم داد کو تقریباً اٹھا کے باہر کھڑی گاڑی تک لائے اور گاڑی بڑی طوفانی رفتار سے نکلی۔ اس کے پیچھے پیچھے ان کی بیوی اور بیٹی آنسو پونچھتی دوسری گاڑی میں بیٹھ گئیں اور وہ بھی اسی طرح پہلی گاڑی کے پیچھے گئیں۔ غلام حسین کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے واپس اندر جاتی ملازمہ کو بلا کے پوچھا۔

"راجا صاحب کو دورہ پڑا ہے دل کا... وہ بے ہوش ہو گئے تھے۔ انہیں اسپتال لے گئے ہیں۔" وہ بولی۔

غلام حسین کا دل بیٹھ گیا۔ یہ پھر گئی دو چار دن کے لیے کم سے کم... اور خدانخواستہ راجا نہ رہا تو گویا حکومت بھی گئی۔ لیکن فوری طور پر یہ ناممکن ہوگا کہ ادھر تدفین ہوا دھر وہ ہاتھ جھاڑ کے کہے کہ اچھا جی... میں بھی چلتا ہوں۔ اب راجا صاحب ختم تو نوکری بھی خودبخود ختم۔ اسے رانی اور راجکماری جانے کہاں دیں گی اور ان سب سے بڑھ کر اس کا احسان کے بوجھ تلے دبا ہوا ڈاک بابو باپ... اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اسپتال روانہ ہو گیا۔

راجا کرم داد پھر بچ گیا۔ اس کا بائی پاس ہوا۔ پھر تین دن وہ آئی سی یو میں رہا۔ ڈاک بابو ویٹنگ روم میں جا نماز اور تسبیح لے کر بیٹھ گیا۔ آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ سب کو جواب دینا غلام حسین کی ذمے داری۔ ڈاکٹرز سے رابطہ رکھنا اور "سب ٹھیک ہو جائے گا انشاء اللہ" کہنے کے لیے بار بار اس کمرے میں جانا اور عائشہ کے ساتھ اس کی ماں کو تسلی دینا۔ دن میں ایک بار ان کو گھر لے جانا کہ وہ کپڑے بدل لیں، پھر واپس لانا۔ رات تک غلام حسین کا حال خراب کر دیتا تھا مگر یہ ایک انسانی فریضہ بن گیا تھا۔ راجا صاحب کی فیملی اس پر اتنا ہی انحصار کر رہی تھی جتنا اپنے بیٹے پر کرتی۔

اندر کے ذرائع سے غلام حسین کو وہ بات معلوم ہو گئی تھی جو راجا صاحب پر دل کے دورے کا سبب بنی تھی۔ خلع کے قانونی نوٹس کے جواب میں عائشہ کے شوہر نے طلاق نامہ ارسال کر دیا تھا۔ راجا صاحب کا خیال تھا کہ پانچ ماہ کے بچے کی مجبوری میجر صاحب کو جھکنے پر مجبور کر دے گی لیکن طلاق نامے کے ساتھ یہ اطلاع بھی ملی کہ اس نے دوسری شادی کر لی ہے۔ یہ باپ بیٹی دونوں کے منہ پر پڑنے والا وہ جوتا تھا جس کی ان کو بالکل توقع نہ تھی۔ خاص طور پر اس لیے کہ راجا صاحب نے فوج میں ہی کسی بہت بڑے جنرل رینک کے افسر کا دباؤ ڈالا تھا کہ بیوی کو واپس نہ لائے تو سیاچن میں پوسٹنگ کر دی جائے گی (اور بعد میں ایسا ہوا بھی اور وہ پانچ ماہ کا بچہ بھی زندہ نہ رہا)

اسپتال میں اسپیشل وی آئی پی روم راجا صاحب کے لیے تھا تو سامنے والا اسپیشل روم اضافی لیا گیا تھا جہاں ان کی بیوی اور بیٹی قیام پذیر تھیں اور عیادت کے لیے آنے جانے والوں کی فیملی کی خاطر مدارات بھی چلتی تھی۔ عائشہ اب ماں کی طرح اسے غلام حسین کی آواز لگا کے دن میں سو بار بلاتی تھی اور جس کمرے میں غیر مرد کا داخلہ جرم تھا وہاں سارا دن اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ خرابی اس دن ہوئی جب پہلے فیروز خان ایک اخلاقی تقاضا پورا کرنے آیا۔ اسی روز شام کو بلقیس آئی اور غلام حسین نے ماں بیٹی کے چہرے پر ناگواری کے واضح جذبات دیکھے۔

جب وہ واپس گئی تو غلام حسین اس کے ساتھ چل پڑا۔ اسے پتا نہیں چلا کہ پیچھے سے عائشہ کی آنکھیں ان دونوں کو طویل کاریڈور میں ساتھ ساتھ جا کے دروازے سے غائب ہوتا دیکھ رہی تھیں۔

غلام حسین پارکنگ ایریا تک گیا جہاں بلقیس کی گاڑی کھڑی تھی۔ "میں ایک منحوس چکر میں پھنس گیا ہوں بلو۔"

"دل کے دورے سے تو راجا صاحب بال بال بچے ہیں..." وہ بولی۔ "تمہیں کیا ہوا ہے؟"

"یار میری برداشت سے باہر ہوتا جا رہا ہے یہ سب۔ میں جب نکلنے کا فیصلہ کرتا ہوں کوئی مصیبت آ جاتی ہے۔ اب یہاں سے جانے کے بعد اور کچھ ہو جائے گا۔" وہ بلقیس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"یار حوصلہ رکھو۔" بلقیس نے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"بالکل نہیں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ ابھی سب چھوڑ چھاڑ کے بھاگ جاؤں تمہارے ساتھ۔"

"بری بات، اس وقت تم ہی تو سب سنبھال رہے ہو۔ چاچاجی بھی سمجھتے ہیں تمہاری مجبوری کو... جہاں سیر وہاں سوا سیر... ایک مہینا بھی ہو جائے تو کوئی بات نہیں۔"

غلام حسین نے ایک دم اسے اپنی طرف کھینچ کے چوم لیا۔ بلقیس نے اسے دھکا دیا۔ ''پاگل ہو گئے ہو۔ چلو نکلو۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔''

''پاگل ہوا تو نہیں مگر ہو جاؤں گا۔'' وہ باہر نکل کے کھڑا ہو گیا۔ دیکھا کسی نے نہیں تھا مگر بلقیس نروس ہو گئی تھی۔ اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

واپس آ کے کاریڈور میں اسے عائشہ کی نظروں کا سامنا ہوا۔ ''تم بلقیس کو کیسے جانتے ہو؟''

''ایسے ہی... وہ کزن ہے تمہاری... اس نے بتایا تھا۔'' وہ سٹپٹا گیا۔

''وہ دشمن ہے ہماری اور تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تم اسے چھوڑنے گئے تھے۔''

غلام حسین نے خود کو سنبھالا۔ ''ساتھ جانا کوئی جرم نہیں۔''

وہ چلائی۔ ''اعترافِ جرم تمہارے ہونٹوں پر ہے۔''

غلام حسین کا ہاتھ بے اختیار اپنے ہونٹوں پر گیا۔ بلقیس کے ہونٹوں کی لالی اس کی ہتھیلی پر آ گئی۔ عائشہ ایک دم پلٹی اور اندر چلی گئی۔ ان کے درمیان پھر کوئی بات نہیں ہوئی۔

راجا کرم داد کو ڈاکٹروں نے ایک مہینا تک مکمل بیڈ ریسٹ کا کہا تھا۔ ان کے گھر پہنچ جانے کے اگلے دن وہ آفس میں تھا کہ عائشہ نمودار ہوئی۔ ''مسٹر غلام حسین! ڈیڈی نے بتایا کہ تم جانا چاہتے ہو۔'' وہ راجا کرم داد کی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''جی... میں تو بہت پہلے چلا جاتا...''

عائشہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''سارا کام مجھے سمجھاؤ... حساب دو اور جاؤ۔''

''آپ کو؟'' غلام حسین نے سوچا اور پھر سر ہلا دیا۔ ''دو چار دن میں آپ سمجھ جائیں گی۔''

احمد حسین دوسرے دن نمودار ہوا۔ تب اس نے خود کو کسی اور نام سے متعارف کرایا تھا۔ عائشہ نے کہا کہ وہ چارٹرڈ اکاؤنٹس کی کسی فرم میں ملازم تھا۔ ''یہ تمام حسابات کا آڈٹ کریں گے۔'' عائشہ نے کہا۔

غلام حسین کا ماتھا ٹھنکا۔ آڈٹ ہر سال ہوتا تھا جیسے سب جگہ ہوتا ہے۔ معاملات خوش اسلوبی سے ''کچھ لو اور کچھ دو'' کی بنیاد پر طے ہو جاتے تھے۔ انکم ٹیکس والوں کے ساتھ بھی اچھے مراسم تھے۔ ان کے ساتھ خراب مراسم پاکستان میں کون افورڈ کر سکتا تھا۔ یہ انٹرنل آڈٹ کا معاملہ تھا۔ غبن یا ہیرا پھیری کا شبہ ہو تو راجا صاحب بھی کسی سے حسابات چیک کرا سکتے تھے لیکن چور کو کیا پڑی ہے کہ دوسرے چوروں کا سراغ لگانے کی کوشش کرے۔ یہاں بھی سارے حسابات جعلی اور فرضی تھے۔ اصل کا علم صرف غلام حسین کو تھا یا راجا صاحب کو۔ شریکِ جرم تو نہ جانے کتنے تھے۔ وہ سب جو رقوم وصول کرتے رہے تھے اور جعلی رسیدیں جاری کرتے آئے تھے۔

غلام حسین نے سارے رجسٹر، کیش بک، واؤچر ایک الماری میں سے نکال کے سامنے رکھ دیے۔ تمام متعلقہ فائلوں کا ڈھیر لے کر وہ سامنے بیٹھ گیا۔ حسبِ توقع آڈٹ کرنے والے نے ایک نظر دیکھ کے سب کو مسترد کر دیا۔ ''یہ جعلی حساب کتاب نہیں... اصل دکھاؤ۔''

غلام حسین نے دوٹوک کہا۔ ''وہ راجا صاحب کے پاس ہے۔ ان سے بات کریں۔ میں عائشہ کو بلاتا ہوں۔''

عائشہ آئی۔ ساری بات سنی اور اندر جا کے لوٹ آئی۔ ''ڈیڈی کہتے ہیں کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ ڈاکومنٹس آفس میں ہوتے ہیں کہ گھر میں۔''

''یہاں تو لاکھوں کا گھپلا ہے۔'' آڈٹ کرنے والے نے صاف کہا۔ ''آپ راجا صاحب کو بتا دیں۔''

عائشہ کی واپسی کے انتظار میں وہ دونوں آمنے سامنے متحارب حریفوں کی طرح بیٹھے رہے۔ غلام حسین نے ہار نہ ماننے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ حریف تو ہر سال کے انتخابات میں چیئرمین پر کروڑوں کے غبن کا الزام عائد کرتے تھے مگر ثابت کرنے کے لیے عدالت میں کون جائے۔ انتخابات کا نتیجہ آتے ہی سب شور شرابا ختم ہو جاتا تھا۔ اگر اس پر الزام آیا تو وہ بتا دے گا کہ گھپلا کیسے ہوتا تھا کہاں ہوتا تھا کس کے اشارے پر ہوتا تھا اور کس کی مدد سے ہوتا تھا۔ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔ وقت گزرنے کے ساتھ اعصابی کشیدگی بڑھتی گئی اور اس وقت ختم ہوئی جب عائشہ کے بجائے مقامی تھانے کے ایک انسپکٹر نے اندر قدم رکھا۔ اس کے ساتھ دو کانسٹیبل ہتھکڑی لے کر آئے تھے۔ انہوں نے تمام رجسٹر اور فائلوں کو ایک بوری میں ڈالا اور باہر جیپ میں رکھ دیا۔

''یہ سب تم کس کے حکم پر کر رہے ہو؟'' غلام حسین نے پوچھا۔

''راجا صاحب نے کسی افسرِ اعلیٰ سے بات کی تھی۔ باقی سوال جواب تھانے میں کرنا۔'' اس نے غلام حسین کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈالی اور اس کے احتجاج کو بالکل

نظرانداز کر دیا۔ یہ نظام ایسا ہی تھا۔ اگر اس کا گلا پھانسی کے پھندے کے لیے فٹ تھا تو اصل مجرم کوئی بھی ہو۔ پھانسی اسے ہی ہو گی۔ جرم ثابت کرنا کوئی مسئلہ نہیں۔ ثبوت شہادت گواہ سب دستیاب ہیں۔

ان کے روانہ ہونے سے پہلے اچانک عائشہ آ گئی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے۔ انسپکٹر واٹ از دس۔''

''کچھ نہیں میڈم۔'' انسپکٹر سٹپٹایا۔ ''معمول کی کارروائی ہے۔''

وہ چلائی۔ ''کیا ہے معمول کی کارروائی۔ غلام حسین صاحب کو ہتھکڑی کیوں لگائی ہے، کھولو ہتھکڑی۔''

''وہ جی، تھانے لے جا کر کچھ تفتیش کرنی ہے۔ غبن کا معاملہ ہے۔ راجا صاحب نے کہا تھا۔'' ہتھکڑی کھل گئی۔

''کیا کہا تھا راجا صاحب نے؟ یہ کہا تھا کہ ان کے ساتھ مجرموں جیسا سلوک کرو۔ شرافت سے بات نہیں کر سکتے تم؟ جانتے نہیں یہ کتنے بھروسے کے آدمی ہیں۔'' عائشہ بگڑتی رہی۔

''غبن وہی کرتے ہیں جی... آپ کو نہیں پتا۔''

''میں کہتی ہوں چھوڑو انہیں۔'' عائشہ نے چلا کے کہا۔

انسپکٹر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''ہمیں افسروں کا آرڈر ہے جی... وہ کہیں گے تو ہم چھوڑ دیں گے... چلو بھئی۔''

''میں ابھی بات کرتی ہوں ڈیڈی سے۔ غلام حسین... آئی ایم سوری۔''

غلام حسین کو یقین کرنا مشکل تھا کہ عائشہ کا غصہ اصلی ہے اور یہ سب اس کی رضامندی کے بغیر ہو رہا تھا۔ راجا صاحب سے وہ ایسی امید نہیں رکھ سکتا تھا۔ ابھی ان کی حالت بھی ایسی نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے جیپ میں بیٹھ گیا۔

اسے حوالات میں تو بند نہیں کیا گیا۔ ایک الگ کمرے میں جو اسٹور روم تھا ایک شکستہ کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ وہ سارا دن وہاں بیٹھا رہا۔ اسے حراست میں ساتھ لانے والے غائب ہو چکے تھے۔ کمرے کے باہر کھڑے کانسٹیبل نے بس اتنا کہا کہ انچارج صاحب آئیں گے تو بات کریں گے۔ باقی ہر درخواست اس نے مسترد کر دی۔ چائے لا دو، کھانا لا دو، پیشاب کرنے جانا ہے۔ ہر بات کا جواب وہ روبوٹ کی طرح دیتا رہا۔ آرڈر نہیں ہے۔

دوپہر سے شام اور پھر رات ہو گئی۔ مجبوراً اس نے اسٹور کے ایک کونے میں پیشاب کیا۔ تھکن کے ساتھ اب اس پر آنے والی رات کی دہشت بھی سوار ہو رہی تھی۔ اس کے اعصاب جواب دینے لگے تھے۔ اس کے گھر پر کسی کو خبر تک نہ تھی کہ وہ کہاں ہے۔ یہ بلقیس کے ایک بوسے کی قیمت تھی جو وہ چکا رہا تھا۔ اس کے لبوں کی لالی غلام حسین کے ہاتھ پر ثبوت بن کے نہ آتی تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ عائشہ کھلم کھلا بلقیس کی حریف بن کے میدان میں اتر آئی تھی۔ اس اصول کے مطابق کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔

تھانے دار نصف شب کے قریب آیا۔ یہ اس کا اور تقریباً ہر تھانے دار کا معمول تھا۔ وہ دن میں ''گشت'' پر ہوتے تھے۔ چھاپے مارتے تھے۔ پولیس مقابلے کراتے تھے اور پھر گرفتار کر کے تھانے لائے جانے والوں سے معاملات طے کرتے تھے۔ تھانے دار نے اسے فوراً ہی بلا لیا۔ دروازے پر لگی تختی کے مطابق اس کا نام شاہ زیب بنگش تھا۔ دیکھنے میں وہ روایتی تھانے دار نہیں تھا۔ وہ گورا چٹا تیس بتیس سال کا صحت مند آدمی تھا جس کی توند ذرا بھی نہیں نکلی ہوئی تھی۔ وہ میز پر مختلف کھانوں کی پیکنگ کھول رہا تھا۔

اس نے اشارے سے بیٹھنے کے لیے کہا۔ ''تمہارا نام غلام حسین ہے نا، کیا معاملہ ہے تمہارا؟''

''جی، آپ کے تھانے والے مجھے گرفتار کر کے لائے ہیں۔ انہوں نے بتایا نہیں آپ کو؟''

''بتایا تھا لیکن تم ان کو چھوڑو، اپنی بات کرو۔''

''مجھ پر غبن کا الزام لگایا گیا ہے۔''

''جو تم نے نہیں کیا۔ غبن قبول کون کرتا ہے۔ تم راجا کرم داد خان کے خاص آدمی تھے، کئی سال سے... اچانک کیا بات ہو گئی؟ خود راجا سوسائٹی کا چیئرمین ہے۔ کروڑوں کی ہیرا پھیری سے بنا ہے۔ اپنے علاقے کے سب معززین کا پتا ہے مجھے۔ سب کا کوئی خاص آدمی ہوتا ہے جو آگے رہتا ہے اور سارے معاملات طے کراتا ہے۔ وہ کوئی نمازی پرہیزگار نہیں ہوتا۔ اپنا حصہ وہ بھی رکھتا ہے۔ تم نے رکھا تو کون سی انوکھی بات کی۔ یہ غبن کا کیس بلاوجہ نہیں بنا۔ اس سے فرق نہیں پڑتا کہ دس لاکھ کا ہے یا دس ہزار کا۔''

''آپ یقین کریں گے میری بات کا۔'' کھانے کی خوشبو اور بھوک سے اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے تھے۔

''پتا تو چلے تمہاری اسٹوری کیا ہے ورنہ پتر... جیل تو تم ہی جاؤ گے خواہ اس کے خلاف کروڑوں کی ہیرا پھیری کا الزام ہو اور ثابت ہو جائے کہ تم واقعی ایماندار ہو۔ فیصلہ تو عدالت کو کرنا ہے۔ مجھے نہیں۔ تفتیش بھی مجھے کرنی ہے۔ ایف

آئی آر اور تمام ثبوت شواہد عدالت کو ہم ہی فراہم کریں گے۔ تم نے کھانا نہیں کھایا؟ اچھا پہلے کھانا کھاؤ، بہت ہے۔''

اس کے حوصلہ افزا رویّے اور صاف گوئی نے غلام حسین کو بہت متاثر کیا تھا۔ وہ کھانے میں شریک ہو گیا۔ پولیس سے نیکی کی امید رکھنا تو ایسا ہی ہوتا جیسے بھینس سے دودھ کے بجائے انڈا دینے کی امید رکھنا۔ لیکن یہ تھانیدار اسے کچھ مختلف لگ رہا تھا۔ کھانے کے بعد اس نے ہمت کر کے کہا۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہیں غبن اس نے کروڑوں کا کیا تو میں نے لاکھوں کا۔ اس کی مرضی سے۔ خود اس نے مجھے بہت کچھ دیا مثلاً گاڑی، بڑا مکان...''

''پھر دشمنی کیسے ہو گئی اچانک؟'' وہ آرام سے کرسی پر ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔

''جب میں نے کہا کہ میں نوکری چھوڑنا چاہتا ہوں۔''

''کیوں؟ کیا شکایت تھی تمہیں؟''

''شکایت کوئی نہیں۔ بس مجھے خیال آیا کہ وہ مر گیا تو میں کیا کروں گا؟ ایک دل کا دورہ پہلے پڑ چکا تھا۔ دوسرے سے ابھی جانبر ہوا ہے۔ میں نے اپنا بزنس کرنے کا فیصلہ کر لیا۔''

تھانے دار ہنس پڑا۔ ''اور یہ بات تم نے اس سے کہہ دی؟''

''ہاں، میرا فیوچر کوئی نہیں تھا۔''

''اوئے فیوچر کے گھوڑے... وہ مر جاتا تو نوکری ویسے ہی ختم ہو جانی تھی تیری... اس کے بعد جو مرضی کرتا۔ ایسی جلدی کیا تھی... بس تو یہی ہونا تھا تیرے ساتھ... آگے آ رہے ہیں الیکشن اور وہ جس کو سپورٹ کر رہا ہے، وہ منتخب ہو چکا ہے پہلے ہی۔''

''یہ آپ کو کیسے معلوم؟'' غلام حسین کے منہ سے نکل گیا۔

''ایک مجھے کیا، نیچے سے اوپر تک سب کو پتا ہوتا ہے کہ الیکشن میں کون جیتے گا کون ہارے گا۔'' وہ برہم ہو گیا۔ ''اس کا ساتھ چھوڑ کے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مت مار۔ معاملہ مکا۔ اسے فون کر کہ تو نے فیصلہ بدل دیا ہے۔''

غلام حسین بڑے شش و پنج میں پڑ گیا۔ کیا وہ تھانے دار کو اپنی دوسری مجبوری بھی بتا دے کہ وہ فیروز داد خان سے بات کر چکا ہے اور بلقیس کے ساتھ اس کا مستقبل طے ہے۔ اس لیے وہ کیسے پیچھے ہٹ سکتا ہے۔

''ایک وجہ اور بھی ہے۔'' غلام حسین نے چند سیکنڈ کے توقف سے کہا۔ ''راجا صاحب کی ایک بیٹی ہے عائشہ... سب سے چھوٹی والی... میں اسے کالج لاتا لے جاتا تھا۔''

''اچھا تو اس کے ساتھ چکر چل گیا؟'' تھانے دار نے سر ہلایا۔

''نہیں جی، وہ بڑی بدکردار لڑکی ہے۔ کالج سے پتا نہیں کس کس کے ساتھ نکل جاتی تھی اور مجھے لے جانا پڑتا تھا ورنہ دھمکی دیتی تھی کہ مجھ پر الزام لگا کے نکلوا دے گی۔ میری نئی نئی نوکری تھی۔''

''پیسے بھی دیتی ہو گی انعام میں؟'' تھانے دار مسکراتا رہا۔

''ہاں جی، بس لالچ تھا اور نوکری ملتی نہیں تھی۔ اللہ نے بچایا۔ اس کی شادی ہو گئی لیکن ابھی کچھ دن پہلے وہ طلاق لے کر گھر آ گئی۔ پانچ مہینے کا بچہ بھی چھوڑ آئی۔ خلع کا نوٹس بھیجا تھا اس امید میں کہ شوہر صلح صفائی کرنے آ جائے گا۔ اس نے طلاق نامہ بھیجا تو راجا صاحب کو ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ میرے خلاف کارروائی اس کے کہنے پر ہوئی۔''

''کیوں؟ تو نے بلیک میل کیا ہو گا کہ پچھلی باتیں بتا دوں گا؟''

''نہیں جی، اب ایسا لگتا ہے کہ... وہ مجھے قابو کرنا چاہتی ہے اور مجھے پتا ہے کہ راجا کرم داد اور اس کی بیوی فوراً مان جائیں گے بیٹی کی بات... ابھی تو عدت پوری کرے گی مگر اس کے بعد...''

''اگر اس نے کہا ہے... تو بیٹے عیش کر... وارث ہو جا راجا کا...'' تھانے دار نے میز پر بید ماری۔

''یہ بات نہیں سر جی۔ جانتے بوجھتے مکھی کوئی نہیں نگلتا... مجھے پتا ہے وہ کیسی لڑکی تھی۔ میں اس کو بیوی بناؤں۔''

تھانے دار جلال میں آ گیا۔ ''اوئے بہن بنا لے پھر اسے... مگر ایک بات سمجھ لے۔ ابھی معاملہ خراب نہیں ہوا۔ ابھی نہیں مانے گا تو صبح تک تیرا باپ بھی مانے گا۔ ڈاک بابو کا بیٹا ہے نا... کیا تھی تیری اوقات راجا کرم داد سے ملنے سے پہلے... اپنا نوکری بدلنے کا فیصلہ واپس لے۔ چھوکری بونس میں... اتنی بری تو نہیں ہے وہ دیکھنے میں۔''

غلام حسین نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ ''تھانے دار صاحب آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن میں کسی اور سے محبت کرتا ہوں۔ اس سے شادی کا وعدہ کر چکا ہوں۔''

نہ جانے کیوں وہ ہنس پڑا۔ ”ہے نا پاگل۔ اوئے محبت سے کون منع کر رہا ہے تجھے۔ کرتا رہ... بعد میں شادی بھی کر لینا۔ میری بھی دو ہیں۔ مگر زندہ رہے گا تو سب ہوگا نا، ورنہ دونوں کوئی تیرے غم میں بیٹھی نہیں رہیں گی۔ چل جا اپنے گھر... صبح مجھے بتا دینا کیا سوچا ورنہ خود ہی آ جانا تھانے، مجھے اب تفتیش کرنی ہے ڈرائنگ روم میں جا کے۔“

غلام حسین سے پہلے تھانے دار کھڑا ہو گیا۔

غلام حسین نے وہ ساری رات کانٹوں کے بستر پر گزری۔ وہ نہ اپنے باپ سے بات کر سکتا تھا نہ بلقیس سے... انکار کے سارے راستے مسدود تھے۔ اس کی بات کوئی نہ سمجھتا۔ پر ہو سکتا تھا کہ وہ بھاگ جائے، روپوش ہو جائے لیکن ڈاک بابو عاشق حسین اس کے پیروں کی زنجیر تھا۔ وہ بھی دل کا مریض تھا۔ تھانے میں ایک رات نہیں گزار سکتا تھا۔ ماں کو بیوہ کر کے کیا اسے بلقیس مل جاتی؟

اگلے روز وہ دل پر پتھر رکھ کے ڈیوٹی پر حاضر ہو گیا۔

یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا اور آفس میں اس نے سب کچھ ویسا ہی دیکھا اور وہیں دیکھا تو اسے سوچنا پڑا کہ کہیں اس نے کوئی ڈراؤنا خواب تو نہیں دیکھا تھا۔ فائلیں، رجسٹر، کیش بک اور واؤچر سب اپنی اپنی جگہ تھے جیسے ان کو چھیڑا ہی نہیں گیا اور شک و شبے کی بات ہی نہ تھی کہ پرانی ترتیب کو صرف عائشہ بحال کر سکتی تھی یا راجا صاحب مگر وہ تو بستر سے بھی صرف ضرورت کے لیے اٹھتے تھے۔ پولیس سب ڈاکومنٹس جس طرح بوری میں بھر کے لے گئی تھی ایسے ہی واپس چھوڑ گئی ہوگی۔ بلاواسطہ یہ عائشہ کی طرف سے ایک پیغام تھا کہ سمجھو کچھ نہیں ہوا اور جو ہوا تو بھول جاؤ۔ بس وہی ہے ویسا ہی ہے اگر تم سمجھو تو... ورنہ...

اس ورنہ کے آگے پیچھے تباہی و بربادی کے غار تھے۔

معاملہ صرف راجا کرم داد کی ملازمت جاری رکھنے کا ہوتا تو اسے کوئی پریشانی ہی نہ ہوتی۔ وہ خود کو سمجھا لیتا کہ چلو جب تک نصیب میں یہاں کا مال ہے گزارا کرو، جس دن فیض کا یہ سرچشمہ خشک ہوا اس دن دیکھی جائے گی۔ لیکن اس کے ساتھ زیادہ کڑا امتحان عائشہ کو قبول کرنے کا تھا۔ جیسے قیدی کو دال کی جگہ چھلکے ابال کے دیے جائیں تو وہ اپنی سزا یا مقدر سمجھ کے قبول کرے گا کہ پیٹ کی آگ تو بجھے... لیکن اس میں کاکروچ اور گدھے کی لید بھی ڈال کے دی جائے تو وہ کیا کرے گا یا فاقے سے مرجانا قبول کرے گا یا زہر مار کے بالآخر کھائے گا۔ غلام حسین نے تو سنا تھا کہ سمندروں میں بھٹک جانے والے فاقہ کشی سے مرے یا خودکشی سے

لیکن ایسے بھی تھے جو مرنے والوں کو کھا گئے۔ اگر وہ عائشہ کو لانے لے جانے کی ڈیوٹی نہ کرتا تو اسے آج بھی عائشہ کو قبول کرنے میں کیا تامل ہوتا۔

لیکن سب سے بڑا عذاب تھا بلقیس کا خیال... وہ سب بھگت لے گا۔ بلقیس کی دل شکنی کا عذاب کیسے بھگتے گا۔ چلو وہ اپنا دل پتھر کر لے۔ بے غیرت اور بے ضمیر ہو جائے۔ یہ سوچ کر کہ وہ کب تک روئے گی۔ بالآخر اس کے آنسو بھی خشک ہو ہی جائیں گے اور میری طرح وہ بھی قسمت کے لکھے پر قانع ہو جائے گی۔ لیکن ایسا نہ ہوا پھر؟ خودکشی ایسے ہی جذباتی دباؤ میں کرتے ہیں لوگ... اور یہ لڑکیاں تو ہوتی ہیں جذباتی طور پر کمزور ہیں۔ اس دن موصول ہونے والی بلقیس کی ایک کال کے بعد اس نے اپنا موبائل فون آف کر دیا۔ دوسرے دن اس نے پہلا قدم دل پر پتھر رکھ کے اٹھایا اور بلقیس کا نمبر بلاک کر دیا۔ لیکن یہ سب کھیل چلنے والا نہیں تھا۔ غلام حسین جانتا تھا کہ وہ کسی بھی وقت نازل ہو جائے گی۔

ان دو دنوں میں عائشہ نے اسے اپنی بہترین اداکاری سے یہ تاثر دیا کہ جو کچھ ہوا راجا کرم داد کے حکم کو غلط سمجھنے کا نتیجہ تھا اور احمد حسین کو محض عائشہ کی مدد کے لیے بلایا گیا تھا کہ حساب کتاب سمجھا دے۔ اس خبیث نے غلام حسین کا پتا صاف کر کے اپنی جگہ بنانے کی کوشش کی۔ وہ بھاگ گیا ورنہ جوتے کھا کے جاتا۔ غلام حسین سب خاموشی سے سنتا رہا۔ جس کا مطلب یہ بتانا تھا کہ تم جو چاہو کہو، سننا میری مجبوری ہے یقین کرنا نہیں۔ ابھی وہ حالات کو اپنے لیے مزید خراب کر کے مسائل میں اضافہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔

راجا صاحب کے بارے میں غلام حسین یہ سمجھتا تھا کہ کمینے خودغرض اور لالچی وہ کم نہیں لیکن غلام حسین کے ساتھ وہ ایسا سلوک نہیں کر سکتے تھے اور اس حالت میں... یہ جانتے ہوئے بھی کہ غلام حسین نے کس طرح ان کی تیمارداری کی اور گھر والوں کا بھی خیال رکھا۔ وہ پہلے اسے وارننگ ضرور دیتے کہ بیٹا جانے کی اجازت تو میں نہیں دے سکتا پھر بھی جاؤ گے تو بھگتو گے۔ راجا صاحب اور وہ اب لازم و ملزوم ہو چکے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ غلام حسین اندر کے سارے بھید بھاؤ جانتا ہے۔ اسے ساتھ رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ مالِ غنیمت میں بھی حصہ بقدر جثہ دیا جائے اور وہ غلام حسین کو یقیناً مل رہا تھا۔ راجا کرم داد کیسے سوچ سکتے تھے کہ غلام حسین کتنا آگے کی فکر میں مبتلا ہے۔ اسے کھونا وہ افورڈ ہی نہیں کر سکتے تھے اور وہ بھی اس مرحلے

میں جب الیکشن سر پر تھے۔ تو کچھ بعید نہیں کہ خاموشی سے انہوں نے تڑپ کا پتا چل کے اس کے پر کتروا دیے ہوں جو آزاد ہو کے اونچی پرواز کا سوچنے لگا تھا۔

اس کو غلامی کی زنجیر میں باندھ کے واپس لانے والا ان دونوں میں سے کوئی ایک تھا یا باپ یا بیٹی... باپ سیاست کے کھیل کا چیمپئن تھا تو بیٹی محبت کے کھیل کی ماہر تھی اور دونوں نے اس کو ریس کا گھوڑا بنا لیا تھا۔ شاید باپ نے کم اور بیٹی نے زیادہ کیونکہ محبت کے ڈرامے میں ہیروئن وہ خود تھی۔ اسے ہر حال میں بلقیس کو باہر رکھنا تھا۔ وہ غلام حسین کی نظر میں خود کو معصوم اور بے گناہ بنائے رکھنے کی پوری کوشش کرتی رہی۔ راجا کرم داد ایک دن خوش ہو کے مسکرایا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ ”تم نے جو کچھ بھی میرے لیے کیا۔ اس کا صلہ میں نہیں دے سکا شاید۔“ وہ کچھ رک گیا۔

”جی... ایسی کوئی بات نہیں۔“

اس وقت عائشہ کی ماں نے کہا۔ ”صلہ کیا دے سکتا ہے کوئی، دن رات ایک کر دیا اس نے تمہاری بیماری میں۔“

وہ سر جھکائے نکل آیا۔ اسے معلوم تھا کہ اب اس پر عائشہ کی مہربانیاں بھی بڑھ جائیں گی اور اس کے باپ کی بھی۔ وہ کیا کرے کدھر جائے... آنے والے طوفان سے خود کو کیسے بچائے۔ بلقیس کو کیسے سمجھائے، اس کا سامنا کیسے کرے۔ لیکن طوفان کو ٹالا کیسے جا سکتا تھا۔ اس نے ایک شام اسے آفس سے گھر جاتے ہوئے راستے میں روک لیا۔ وہ سائڈ میں کار روکے منتظر تھی۔ غلام حسین کی گاڑی نظر آئی تو اپنی کار سے نکلی اور اس کے ساتھ آ بیٹھی۔

”یہاں سے چلو، کہیں بھی چلو۔“ اس نے حکم دیا۔

”جناح پارک چلو۔“

غلام حسین نے خاموشی سے تعمیل کی۔ صاف نظر آتا تھا کہ وہ تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز... تصویر بنی بیٹھی ہے۔

جناح پارک میں اس نے ”دیوا“ ریسٹورنٹ میں جانے سے انکار کر دیا جس کے اوپر والے اوپن ائر حصے میں بیٹھ کے چائے پینا اسے اچھا لگتا تھا مگر وہاں وہ ہنگامہ نہیں کر سکتی تھی جو اس نے ایک الگ تھلگ بینچ پر بیٹھ کے کیا۔

”یہ کیا ہے غلام حسین... کیا گیم کھیل رہے ہو تم میرے ساتھ؟ یہ کیا چکر ہے، تم بات بھی نہیں کر رہے ہو؟“

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”شاید اب یہ ممکن نہ ہو بلقیس۔“

”کیا ممکن نہ ہو؟“ اس نے کھوکھلی آواز میں پوچھا۔

”یہی ہمارا ملنا، وہ جو ہم نے سوچا تھا۔“

”تم پاگل ہو گئے ہو، یا نشے میں ہو؟“

”میں تمہیں سب بتا دیتا ہوں۔ پہلے سن لو پھر جو چاہو کہنا۔“ غلام حسین نے کہا۔

اس نے سب بتا دیا۔ اول تا آخر... اپنی مجبوری بے بسی اور شکست کی ساری ذلت کا احوال... وہ بت بنی بیٹھی رہی اور پلک جھپکائے بغیر سنتی رہی۔ جب وہ خاموش ہو گیا تو بلقیس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے مگر وہ چپ تھی۔

”کچھ بولو بلقیس... کچھ کہو۔ صرف اپنی بات ہوتی تو میں نکل جاتا تمہارے ساتھ... مگر بھگتنا پڑے گا میرے ماں باپ کو۔“

بلقیس ایک دم اٹھی اور دوڑتی ہوئی باہر جانے والے گیٹ کی طرف چلی گئی جہاں ٹیکسیاں ہر وقت لائن میں کھڑی رہتی تھیں۔ غلام حسین نے دیکھا کہ لوگ دیکھ رہے ہیں مگر وہ اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکا۔ بلقیس کے پیچھے دوڑنا اور اسے پکڑنا ایک تماشا بن جاتا۔ اس پر ہسٹریا غالب تھا۔ وہ مچلتی چیختی چلاتی تو کچھ نہ سمجھنے والے پوچھنے آ جاتے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ آہستہ آہستہ کار پارکنگ کی طرف چلنے لگا۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کسی نے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ قطار سے کار نکال کے اس نے باہر نکلنے کے مقررہ راستے پر پارکنگ ٹوکن دیا اور باہر آ کے ٹیکسیوں کے ساتھ ساتھ چلتا گیا مگر تب تک بلقیس جا چکی تھی۔ وہ غلام حسین جس نے بلقیس کے ساتھ عہد و پیمان کیے تھے، مر گیا تھا۔ ابھی تک اس کی میت موجود تھی مگر اب جنازہ گھر سے نکل گیا تھا تو گھر خالی ضرور ہوا تھا۔ مگر دکھ کے شکنجے کا دباؤ اس حد تک ضرور کم ہو گیا تھا کہ وہ سانس لے سکے۔ وہ خود اپنے لیے صبر جمیل کی دعا کر سکتا تھا اور بلقیس کے لیے بھی۔

اگلے چند دن یوں گزرے کہ پہلا دن عذاب کا طویل ترین دن تھا۔ جیسے گزر جانے والی رات تھی۔ مگر اس کے بعد ہر دن کے ساتھ اس کی طوالت اور شدت میں کمی آتی گئی۔ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا... مرض کی اذیت سے نجات صرف موت دلاتی ہے۔ وہ بھی مر گیا۔ کم سے کم بلقیس کے لیے مر گیا۔ مگر بلقیس اس کے لیے زندہ رہی۔ گزرے ہوئے وقت کے ہر لمحے کی یاد کے ساتھ۔ وہ رات کو اچانک اٹھ کے بیٹھ جاتا جیسے اس نے ابھی بلقیس کی

ہنسی سنی تھی، اس کی آواز سنی تھی۔ وہ زندگی کے لیے لڑتا رہا ورنہ سنا تو اس نے بھی تھا کہ ہیروئن کا کش لگا کے آدمی بے غم ہو جاتا ہے۔ یہ ایسا نشہ تھا جو سکون دیتا تھا۔ اس نے کسی مشہور سرجن کے بارے میں سنا تھا جو آپریشن سے پہلے ہیروئن پیتا تھا۔ ماں باپ اس کی طرف سے فکر مند تھے مگر ان کے نزدیک غلام حسین کے مسئلے کا واحد حل یہ تھا کہ اس کی شادی کر دی جائے۔

آنے والے دنوں میں اس نے خود کو مصروفیت میں گم کر دیا۔ راجا اس علاقے سے جس پارٹی کے لیے کنویسنگ کر رہا تھا، اس کا جیتنا یقینی تھا۔ اس کے مقابلے میں فیروز داد کا امیدوار تبدیلی کی سوچ کے ساتھ تو جوانوں کا آئیڈیل بنا ہوا تھا اور کافی بڑی تعداد میں پرانے لوگ بھی اس سے متاثر تھے جو اب تک منتخب ہونے والوں سے مایوس ہو چکے تھے۔ ان کے علاقے میں ایک جلسہ عام کے انتظامات نے راجا سے زیادہ غلام حسین کو گھن چکر بنا دیا تھا۔ اب اس کا زیادہ وقت راجا کرم داد کے گھر میں گزرتا تھا۔ سارا دن وہ اِدھر سے اُدھر بھاگتا پھرتا تھا اور فارغ وقت میں عائشہ کے ناز و ادا کی یلغار سہتا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ عدت کے زمانے کا ایک ایک دن گن رہی ہے۔ اس کی غلام حسین کے ساتھ ہر وقت کی وابستگی پر اس کے ماں باپ کا معترض نہ ہونا اس امر کی گواہی دیتا تھا کہ وقت آنے پر وہ ان کے تعلق کو شرعی حیثیت دینے میں ذرا دیر نہیں لگائیں گے۔

جانتے بوجھتے غلام حسین رات کو وہاں ٹھہرتا نہیں تھا حالانکہ گیسٹ بیڈ روم میں رکنے کا اسے راجا کرم داد بھی کہتا تھا اور اس کی بیوی بھی مگر عائشہ کی آنکھوں میں خواب دیکھ کر وہ رات دو بجے بھی گھر چلا جاتا تھا۔ عائشہ کے انتہائی قریب آجانے کے باوجود اس نے کبھی رومینٹک موڈ میں نہ اس کو چوما تھا جو اس کی شدید خواہش تھی، نہ اس کے بدن کی نرمی اور گرمی سے مغلوب ہوا تھا۔ ایسے ہر آزمائشی لمحے میں نہ جانے کہاں سے بلقیس کا تصور اس کے سامنے مجسم ہو جاتا تھا۔ وہ ایسے دیکھتی رہتی... جیسے پوچھ رہی ہو کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ وہ خفت سے پسینا پسینا ہو جاتا اور عائشہ کو دور دھکیل دیتا مگر وہ شکست تسلیم نہ کرنے والی خودسر اور ضدی لڑکی تھی۔ وہ غلام حسین کو فتح کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

الیکشن سے پہلے والا آخری جلسہ ختم ہوا۔ پنڈال خالی ہو گیا۔ سڑکوں کا ازدحام ختم ہو گیا۔ مین روڈ جو ٹریفک کے لیے بند تھی، کھل گئی۔ رات کو وہ ایک تاجر کو یاد دلا رہا تھا کہ صبح کرسیاں اور شامیانے والے کو ادائیگی کر دے جب ایک چمکتی دمکتی مرسیڈیز اس کے قریب سے گزری۔ اس نے ایک جھلک دلہن جیسے لباس اور میک اپ میں بلقیس کی دیکھی۔ اس کے ساتھ سوٹ میں ملبوس ایک ہینڈسم نوجوان بیٹھا تھا اور وہ دونوں کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ صاف نظر آتا تھا کہ وہ نئی نویلی چند دن پرانی دلہن تھی جو شاید کچھ دیر کے لیے میکے آئی تھی۔ وہ بت بنا گاڑی کی ٹیل لائٹس کو دیکھتا رہا پھر کسی نے اسے حقائق کی دنیا میں کھینچ لیا۔ دو دن سے اسے ٹھیک سے سونا نصیب نہیں ہوا تھا۔ لگتا تھا، وہ گرے گا اور بے ہوش ہو جائے گا۔

اس کی زندگی... ایک خالی گھر جیسی ہو گئی تھی جس میں کوئی آباد نہ ہو، وہاں کیسی خوشی کیسا غم، نہ ارمانوں کے رنگ اور نہ امیدوں کے اجالے۔ جس میں نہ پیار کی سرگوشیاں ہوں نہ خواہشوں کے گیت... نہ خواب ہوں نہ ارمان۔ جب اس کو ایک ہو جانے والے دو دل مکان سے گھر بناتے ہیں تو اس کے در و دیوار بولتے ہیں۔ ان کے رنگ اور آرائش میں خوب صورتی نظر آنے لگتی ہے۔

الیکشن کے بعد اس کا کام بہت کم ہو گیا تھا۔ اب راجا کرم داد نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ اس کا آخری الیکشن تھا۔ اب وہ سیاست سے الگ ہو جائے گا۔ زیادہ وقت گھر کو دے گا۔ اپنے نواسوں، نواسیوں کے ساتھ رہے گا اور حج کے لیے جائے گا۔ اس نے داڑھی بھی رکھ لی تھی اور آہستہ آہستہ کوشش کر رہا تھا کہ ناجائز ذرائع سے ہونے والی آمدنی پر انحصار کم کرے۔ اس نے سوسائٹی کے انتظامی اخراجات کا ایمانداری سے استعمال شروع کیا۔ سڑکوں کی مرمت میں اس نے پہلی بار پرانے لوگوں کے بجائے نئے ٹینڈر طلب کیے تو رقم آدھی خرچ ہوئی مگر کام دگنا اور بہتر ہوا۔ جب تمام معاملات میں اس نے ایمانداری رکھی تو سوسائٹی کی حالت بہت بہتر ہو گئی مگر اس کے سارے مددگار آشنا خفا ہو گئے۔ وہ سب ٹھیکے دار جو سمجھتے تھے کہ ملکی انتخابات میں حکمراں جماعت کے امیدوار کو جتا کے راجا کرم داد خان کی پوزیشن مضبوط ہو گئی ہے۔ اب وہ پہلے سے زیادہ ”کھاؤ اور کھانے دو“ کے فارمولے پر عمل کرے گا اور سوسائٹی کے آئندہ انتخاب میں بھی لازمی جیتے گا تو سب کے وارے نیارے ہوں گے۔ وہ سب اس کے مخالف اور دشمن ہو گئے اور انہوں نے آپس میں مل کے اگلے سوسائٹی کے انتخاب میں راجا کرم داد کی ہار کو یقینی بنانے کا ایکا کر لیا۔

راجا پھر بھی ایمان داری سے باز نہ آیا۔ دل کے دوسرے دورے سے جانبر ہونے کے بعد اس پر موت اور

آخرت کا خوف طاری ہو گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ زندگی کی باقی ماندہ فرصت میں سابقہ گناہوں کی بیلنس شیٹ میں زیادہ سے زیادہ ثواب اور نیکی کے کام لکھوا لے۔ ابھی صرف دو مہینے گزرے تھے کہ راجا کرم داد کے دشمنوں نے ایک نوجوان وکیل کو آگے بڑھا دیا جس نے راجا کے خلاف سابقہ دورِ صدارت میں بدعنوانی اور غبن کے الزامات لگا کے کیس احتساب عدالت میں دائر کر دیا۔ اس کو دشمنوں نے سارے ثبوت اور شواہد خود فراہم کیے تھے۔ راجا سب سن اور دیکھ رہا تھا۔ ابھی وہ حفاظتی اور دفاعی اقدامات کا سوچ ہی رہا تھا کہ نیب کا بلاوا آفتِ ناگہانی بن کے نازل ہوا۔ اسے ہتھکڑی تو نہیں لگی مگر دو کارندے اسے جیپ میں بٹھا کے لے گئے۔

عائشہ اور اس کی ماں کی پریشانی برحق تھی اور ان کی ساری امیدیں اب غلام حسین سے وابستہ تھیں لیکن غلام حسین کو اپنی سلامتی بھی خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ مجرم شاہ تھا شاہ کا وزیر کیسے محفوظ رہ سکتا تھا۔ یہ تھانہ نہیں تھا جہاں سے اسے سمجھا بجھا کے واپس بھیج دیا گیا تھا۔ راجا کرم داد پہلی پیشی سے گھر لوٹا تو سخت فکر مند تھا۔ جج کے بجائے اسے سرکاری مہمان بن کے جیل جانا زیادہ یقینی نظر آ رہا تھا۔ اس نے غلام حسین سے مشورہ کیا اور ایک بہت ذہین اور نوجوان بیرسٹر سے ضمانت قبل از گرفتاری حاصل کرنے کی بات کر لی۔

اس دن غلام حسین کی راجا کرم داد سے تلخ کلامی ہوئی۔ ”آپ اپنی فکر کر رہے ہیں۔ پکڑا تو میں بھی جاؤں گا۔“

”تم کو ڈر ہے تو تم بھی ضمانت حاصل کر لو۔“

”یعنی میں اپنا وکیل کروں اور ضمانت ہو تو اپنا مچلکہ داخل کروں؟ آپ کا وکیل ہم دونوں کے لیے ضمانت قبل از گرفتاری کی درخواست نہیں دے سکتا؟“

”ابھی تم پر تو کوئی الزام نہیں؟“

”راجا صاحب، آپ کا مطلب ہے میں گرفتار ہونے کا انتظار کروں۔ اگر میں پکڑا گیا تو میرے ساتھ وہ وی آئی پی سلوک نہیں ہوگا جو آپ کے ساتھ ہوا بلکہ آپ کا وکیل اور آپ کے سیاسی مددگار آپ کو بچانے کے لیے مجھے قربانی کا بکرا بنائیں گے۔“

”ایسی باتیں کیوں سوچتے ہو؟“

”کیوں نہ سوچوں راجا صاحب، دنیا میں میرے آس پاس یہی ہو رہا ہے۔ آپ کی طرح میں لاکھوں دے کر اتنا بڑا وکیل کیسے کروں گا؟ مجھے معلوم ہے آپ میری خاطر قربانی نہیں دیں گے۔ آپ بھی اپنی جان بچانے کے لیے سارا ملبا مجھ پر ڈالیں گے۔ یہ نظام ہی ایسا ہے۔ پھانسی کا پھندا راجا کے گلے میں فٹ نہیں ہوتا کیونکہ اس کی گردن موٹی ہے۔ غریب کی پتلی گردن میں فٹ ہوگا۔ لیکن راجا جی، ایسا وقت آیا تو میں مزید قربانی نہیں دوں گا۔“

”پہلے کون سی قربانی دی ہے تم نے... کام کیا ہے تو معاوضہ لے کر... میرے نوکر تھے تم۔“

”بس تو آج سے یہ تعلق ختم... مجھے خوش فہمی تھی کہ آپ مجھے گھر کے ایک فرد کی طرح سمجھتے ہیں۔ جب میں جا رہا تھا تو آپ نے مجھے زبردستی روک لیا تھا لیکن اب یہ زبردستی نہیں چلے گی۔ خود کو بچانے کے لیے میں وعدہ معاف گواہ بن جاؤں گا، آپ کے خلاف۔“ وہ پیر پٹختا باہر نکل گیا۔

طبلِ جنگ بج گیا تھا۔ وہ گھر گیا تو اس نے ماں باپ کو ساری بات بتا دی۔ ”راجا پر بدعنوانی اور کرپشن کا کیس بن گیا ہے۔ وہ مجھے پھنسائے گا میں جانتا ہوں۔ اس کے پیچھے حکومت ہے۔ اس نے وکیل بھی بڑا کیا ہے۔ وہ بچ جائے گا۔“

عاشق حسین کی حالت غیر ہو گئی۔ ”میں بات کرتا ہوں راجا کرم داد خان سے۔“

”کوئی فائدہ نہیں۔ دیکھ لو کہ آفت تم پر آئی تو کیا کرو گے۔ میں تو آج ہی غائب ہو جاؤں گا۔ روپوش، تم کو فون کرتا رہوں گا۔ فکر مت کرنا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں ملک سے نکل جاؤں۔ بعد میں تمہیں بھی بلا لوں... یہاں رہ کے تو مجھے اپنا ٹھکانا جیل نظر آتا ہے۔“

ان کے روکنے اور رونے دھونے کے باوجود غلام حسین نے ضروری سامان سمیٹا، اپنا شناختی کارڈ، پاسپورٹ اور چیک بکس کے ساتھ سب اے ٹی ایم کارڈ لیے اور نکل گیا۔ باہر نکل کے اس نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے موبائل کی سم بدل دی۔ اس کا ذہن اب تیزی سے کام کر رہا تھا۔ خطرے کو محسوس کرتے ہی ہر جاندار کی حس جاگ اٹھتی ہے۔ اس نے گاڑیوں کی نمبر پلیٹ بنانے والے سے دوسری نمبر پلیٹ بنوائی۔ بہت سے لوگ ایسا کرتے تھے کہ اصل پلیٹ اتار کے گھر میں محفوظ رکھتے تھے اور بازار سے دوسری بنوا کے لگا لیتے تھے۔ پولیس اس پر اعتراض نہیں کرتی تھی۔ غلام حسین پر کون شک کرتا۔ اس نے نمبر ہی غلط بتائے۔ یہ نمبر پلیٹ لگانے کے بعد اس کی گاڑی راولپنڈی رجسٹرڈ نہیں

تھی۔ فیصل آباد کی ہوگی جس کا نمبر چار مختلف اعداد پر مشتمل تھا۔ سفید رنگ کی لاکھوں مہران تھیں جو گزشتہ بیس بائیس سال سے پاکستان کی سڑکوں پر رواں دواں تھیں۔

اگلا سوال اس کے سامنے یہ آیا کہ فوری طور پر وہ کہاں جائے۔ ہوٹل سے ہوسٹل زیادہ محفوظ تھے۔ اس کے کم سے کم تین دوست بھروسے کے قابل تھے مگر وہ اسے اپنے گھر میں چھپانے کا خطرہ مول لیتے تو خود کو بھی مشکل میں ڈالتے اور بیوی بچوں کو بھی... پھر کیا وہ شہر سے نکل جائے؟ گاڑی کا رخ جی ٹی روڈ سے لاہور کی طرف کرے۔ راستے میں پنڈی جیسے نصف درجن شہر تھے اور ایک درجن بڑے قصبے۔ وہ ایک ایک دن بھی ٹھہرتا تو دو تین ہفتے اس کا سراغ نہ ملتا۔ لیکن شہر سے جانا کسی طرح بھی سودمند نہ تھا۔ اسے راجا کرم داد کے کیس سے باخبر رہنا تھا۔ اس کے دماغ میں مستقبل کے لیے بھی ایک پلان تھا۔ کسی چھوٹے شہر سے دوسرا شناختی کارڈ بنوانا، پھر اس کی بنیاد پر دوسرا پاسپورٹ حاصل کرنا اور باہر نکل جانا۔ اس کے ملک سے فرار ہونے کا پروجیکٹ شناختی کارڈ کے حصول سے شروع ہوتا تھا۔ پنڈی، اسلام آباد میں کیپٹل ہونے کی وجہ سے سختی زیادہ تھی تو خرچ بھی زیادہ تھا اور رسک بھی۔ فیصل آباد کی گاڑی تو شناختی کارڈ بھی فیصل آباد کا اور پاسپورٹ بھی... لیکن ابھی وہ اپنا ٹھکانا کہاں رکھے کہ اسے روز کے معاملات کی خبر بھی ملتی رہے۔

فیروز داد خان کا نام اچانک اس کے ذہن میں نیون سائن کی طرح روشن ہوا۔ بے شک غلام حسین اپنا وعدہ ایفا نہ کرسکا لیکن وہ آدمی طبعاً برا نہیں تھا۔ اس کو یاد دلایا جاسکتا تھا کہ نوکری کی جگہ اس نے غلام حسین سے نیکی کا وعدہ کیا تھا۔ آج اسے نوکری کی نہیں نیکی کی ضرورت تھی۔ اس نے اپنی گاڑی کا رخ مری روڈ کی طرف کیا تو اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا رہا۔ اب کس منہ سے جارہے ہو وہاں غلام حسین... وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔ بلقیس گئی۔ اس کے جھوٹے وعدوں اور پُرفریب پیار کے سارے زخم لے کر... اس نے تو بتا دیا تھا کہ وہ تاقیامت انتظار نہیں کرسکتی۔ نہ اس کے ساتھ بھاگ سکتی ہے اور نہ کورٹ میرج کرسکتی ہے۔ وہ چاچاجی کے احسانات کا بدلہ صرف یوں چکاسکتی ہے کہ ان کے فیصلے کے سامنے سر جھکا دے۔ وہ غلط فیصلہ تو نہیں کریں گے میرے حق میں اور اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ نہ اس نے جھوٹے دعوے کیے تھے نہ وعدے۔

کیا فیروز داد خان کو یہ سب معلوم ہوگا کہ بلقیس اس سے ملتی تھی۔ ایسی باتیں کہاں چھپتی ہیں۔ وہ تو کوئی خاص احتیاط بھی نہیں کرتی تھی۔ کسی بھی وقت کہیں بھی آجاتی تھی۔ اس کا چاچاجی پر اعتماد کتنا مضبوط اور جائز تھا۔ اس کا شوہر ہر لحاظ سے غلام حسین سے لاکھ درجہ بہتر تھا۔ اس کی قیمتی مرسیڈیز، اس کا بلیک سوٹ، دلکش شخصیت، سب غلام حسین کی نظر میں تھے۔ شاید یہی اچھی بات تھی کہ وہ بری جگہ نہیں گئی تھی۔ خوش رہے گی تو غلام حسین کی محبت اور بے وفائی کے زخم بھی مندمل ہوجائیں گے۔ زندگی ایسے ہی چلتی ہے۔ فلم کی طرح نہیں۔

اچانک اس نے خود کو فیروز داد خان کے آفس میں پایا۔ اس کی وہی جامے سے باہر ہونے والی سیکریٹری اسی فحش انداز میں براجمان تھی۔ ''آپ؟ آپ پہلے بھی آئے تھے۔'' وہ ٹین ایجرز کی طرح چیونگم چباتے ہوئے بولی۔

''دیکھ لیں۔ آپ کی کشش پھر کھینچ لائی۔'' غلام حسین نے آنکھ مار کے کہا۔

وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ ''اللہ، اتنا جھوٹ، ہم سے ملنا ہوتا تو آپ یہاں آتے؟''

''وہاں بھی آجاتے اگر راستہ معلوم ہوتا ابھی تو ذرا فیروز صاحب سے بات کرلوں۔''

''کیوں نہیں۔'' اس نے بیگ جیسے بلاؤز میں سے کچھ نوٹ اور ایک کارڈ نکالا جو پسینے میں نم تھا اور خوشبو سے مہک رہا تھا۔ ''یہ ہے ہمارا پتا۔''

فیروز داد کی صحت کچھ خراب لگ رہی تھی اور وہ گم صم نظر آتا تھا۔ ''بیٹھو غلام حسین، کیسے ہو؟''

''جی، اچھا ہوں۔ معافی مانگتا ہوں پہلے تو سر... اپنا وعدہ نہ نبھا سکا۔''

''چھوڑو، وہ بات پرانی ہوگئی۔ مجھے پتا ہے کہ تم کو آنے نہیں دیا گیا تھا۔''

''آپ کو معلوم ہے؟'' غلام حسین نے سکون کا سانس لیا۔ ''پھر تو آپ کو یہ بھی علم ہوگا کہ راجا کرم داد پھنس گیا ہے۔''

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''نیب کو اس کے خلاف بدعنوانی اور کرپشن کی شکایات ملی تھیں۔ اس نے ضمانت کرالی مگر کیس بن جائے گا۔''

''فیروز صاحب، گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتے ہیں۔ نزلہ برعضوِ ضعیف... ابا یہ کہتے رہتے ہیں۔ مجھے خطرہ ہے کہ وہ بچ جائے گا۔ قربانی کا بکرا میں بنوں گا۔''

''یہ تو ہے۔'' فیروز نے کہا۔ ''شریکِ جرم تو تم بھی تھے۔ سزا اس کے حصے کی بھی بھگتو گے۔ یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔''

''میں کیا کرتا فیروز صاحب، میں نے تو بتا دیا تھا اسے... مگر اس نے زبردستی کی۔''

''کیا تم اُس وقت میرے پاس نہیں آ سکتے تھے؟ آج بھی تو آئے ہو؟ وہ کیا کرتا تمہیں مجھ سے چھین کر لے جاتا؟ وہ سیر ہے تو میں سواسیر... اسی لیے یہاں محفوظ بیٹھا ہوں۔ میں تمہیں بھی بچا لیتا۔'' وہ غلام حسین کو گھورتا رہا۔ ''اب کیا حق بنتا ہے تمہارا؟''

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا۔ خفت سے غلام حسین کا رنگ زرد پڑ گیا۔ ''اچھا، پھر میں چلتا ہوں۔'' وہ اٹھا اور آہستہ آہستہ باہر جانے والے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کا ہاتھ دروازے کی ناب پر تھا جب فیروز کی آواز آئی۔

''ٹھہرو۔''

اس نے پلٹ کے دیکھا تو وہ انگلی کے اشارے سے اسے واپس بلا رہا تھا۔ وہ واپس آیا اور پھر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''اب نہ تو میں تمہیں نوکری دیتا نہ تمہارے ساتھ نیکی کرتا۔ تم ہرگز اس قابل نہ تھے مگر میں مجبور ہوں۔'' وہ بولا تو اس کے لہجے میں افسردگی تھی۔

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد غلام حسین نے پوچھا۔ ''کیسی مجبوری سر؟''

وہ ایک بال پوائنٹ کو گھماتا رہا اور اس کی آنکھیں جو غلام حسین پر جمی ہوئی تھیں، نہ جانے کہاں دیکھتی رہیں۔ ''مرنے سے پہلے بلقیس نے کہا تھا کہ تمہاری مدد کروں۔ تم آؤ گے ضرور... جب بھی آئے۔''

یہ الفاظ بم کا دھماکا تھے جو غلام حسین کی نظر کے سامنے ہوا۔ ایک شعلہ سا لپکا پھر اندھیرا چھا گیا اور دھماکے نے اس کے حواس شل کر دیے۔ اس نے خود کو پرزہ پرزہ ہو کے فضا میں بکھرتا محسوس کیا۔ نہ جانے کتنی دیر بعد اس نے اپنی آواز سنی۔ ''مرنے سے پہلے؟ بلقیس مر گئی؟''

''ہاں، ابھی چالیسواں بھی نہیں ہوا اس کا... اور دیکھو تم آ گئے مدد مانگنے... کتنا صحیح تھا اس کا اندازہ۔''

غلام حسین نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ چپ چاپ بیٹھا فیروز داد کو دیکھتا رہا۔ اس کا اپنا دل سینے کے اندر پھٹنے کے قریب تھا۔ ہر طرف ایک سوگوار سناٹا تھا جس میں ایک صدا کی بازگشت تھی۔ بلقیس مر گئی۔ بلقیس مر گئی۔ بلقیس مر گئی۔

''اس نے خودکشی کر لی۔'' فیروز نے واش روم سے آ کے کہا جہاں وہ منہ دھونے گیا تھا۔

غلام حسین نے بڑی مشکل سے سوال کیا۔ ''وہ... اس کی تو شاید کر دی تھی آپ نے... میں نے دیکھا تھا اس کے شوہر کو۔''

''ہاں، وہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی کا سی ای او تھا۔ دس لاکھ ماہانہ تنخواہ لیتا تھا۔ گاڑی اور اسلام آباد میں رہائش سب کچھ تھا اس کے پاس... باہر کا کوالیفائڈ تھا وہ... آئی ٹی میں ماسٹر تھا۔''

''پھر... وہ بلقیس پر ظلم کرتا تھا، بدکردار تھا، پہلے سے شادی شدہ تھا؟''

فیروز نفی میں سر ہلاتا رہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں تھی۔''

''پھر کیا بات تھی؟ آپ بتاتے کیوں نہیں۔'' غلام حسین نے چلا کے کہا۔

فیروز نے ایک گہری سانس لی اور میز کی چمکیلی سطح میں اپنے عکس کو گھورنے لگا۔ ''وہ شادی کے قابل نہیں تھا۔ مائی ڈیئر اینجل' میری بٹر فلائی... میں نے مار دیا تمہیں... میرے فیصلے نے جان لی تمہاری۔'' وہ پھر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ ''کتنا اچھا ہوتا وہ انکار کر دیتی۔''

غلام حسین اس کے آنسوؤں میں ڈوب گیا۔ ایک دکھی باپ کے آنسو... اگر اس نے اپنا عہدِ وفا نبھایا ہوتا تو یہ آنسو نہ بہتے... وہ خوش رہتا، ہر گزرتے دن کے ساتھ اسے اور بلقیس کو دیکھ کر خوش ہوتا رہتا۔ ایک دن وہ نانا بن جاتا... بلقیس، بلقیس... یہ تم نے کیا کیا۔ اتنا بڑا قدم اٹھا لیا اور مجھے بھی نہیں بتایا۔ بےشک میں تمہارا مجرم ہوں۔ میں نے اپنا وعدہ نبھایا ہوتا تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ لیکن مجھے تو قید کر لیا تھا اس فاحشہ چڑیل عائشہ نے، میں نے شادی نہیں کی تھی اس سے... اور کرتا بھی نہیں۔

''اس نے ایک خط بھیجا تھا مجھے۔ اس میں سب لکھا تھا۔ سب کیا چند جملے تھے۔ یہ بات وہ مجھ سے کیسے کہتی... میرے پہنچنے تک پولیس اس کی لاش لے جا چکی تھی۔ وہ پنکھے سے لٹک گئی تھی۔ میں نے اس کا خط پولیس کو نہیں دیا۔ اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ اس کے شوہر نے جو وجہ بتائی وہی سچ سمجھ لی گئی۔ اس نے کہا کہ بلقیس کو ڈپریشن کے دورے پڑتے تھے۔ اس کی کمپنی کے ڈاکٹر نے تصدیق کی کہ وہ خودکشی کی بات کر چکی تھی۔ غالباً یہ موروثی مسئلہ تھا۔ اس کی ٹائپ وہی تھی ان جیسی جو بالآخر خودکشی کرتے ہیں۔ کسی وجہ کے بغیر

بھی... خیر، چھوڑو بلقیس کی بات، تم کیوں آئے تھے؟''

وہ رات غلام حسین نے بلقیس کے گھر میں گزاری۔ اپنے احساسِ جرم کی سولی پر تڑپتے، وہ صبح تک کمرے میں پھرتا رہا۔ دو دیواروں کے درمیان اور اس کے ذہن میں یہ خیال جڑ پکڑتا گیا کہ بلقیس کی موت کی ذمے دار عائشہ ہے۔ عائشہ نے اُسے زبردستی روک لیا تھا ورنہ وہ وعدے کے مطابق فیروز داد کے پاس پہنچ جاتا۔ سب کچھ ویسے ہی ہوتا جیسا بلقیس نے اور اس نے سوچا تھا۔ چاہا تھا۔ بلقیس کی قاتل عائشہ ہے۔ صبح ہوتے ہوتے اس کے دل کی ہر دھڑکن پکارنے لگی۔ بلقیس کی قاتل عائشہ ہے۔ عائشہ قاتل ہے۔ عائشہ قاتل ہے۔ اس نے بلقیس کی اور اس کی محبت کا خون کیا ہے۔ ان کے ارمانوں کا خون کیا ہے۔ وہ بے حیا، فاحشہ، جو شوہر کے ساتھ پانچ ماہ کے بچے کو چھوڑ آئی، اس کے نزدیک پیار کیا ہے۔ یہ کھیل وہ کالج کے زمانے سے کھیلتی آئی تھی۔ اس کے نزدیک عہد و پیمان کیا تھے۔ وہ بلقیس کی رقابت میں اتنی پاگل ہوگئی تھی کہ زبردستی مجھے اس سے چھین لیا، بلقیس میری ہوتی تو اسے پنکھے سے نہ لٹکنا پڑتا۔

صبح تک وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ عائشہ کو اس کے جرم کی سزا ضرور ملے گی۔ قاتل کی سزا موت ہے تو بلقیس کی جان لے کر وہ کیسے احساسِ جرم کے بغیر اپنی باقی زندگی خوش و خرم گزار سکتی ہے۔ اس کو مرنا ہوگا۔ دنیا کی عدالت اسے مجرم نہ سمجھے مگر میں جانتا ہوں اور اس سیدھی سادی معصوم اور بے ضرر لڑکی کو پالنے والا جانتا ہے کہ اس کی موت کا ذمے دار کون ہے۔ اس نے تو مرتے مرتے بھی محبت کا بھرم رکھا۔ مرتے وقت بھی اسے میرا خیال تھا اور اس نے وصیت صرف میرے لیے چھوڑی کہ میری مدد کی جائے۔ وہ جانتی تھی کہ میں آؤں گا۔ آج نہیں سہی کل۔

تین دن وہ گھر میں بند رہا۔ فیروز داد نے کہا تھا کہ وہ فی الحال ایک ہفتہ گھر سے نہ نکلے۔ وہ معلوم کرے گا کہ کرم داد اس کیس میں تمہارا نام لیتا ہے یا نہیں۔ پھر غلام حسین نے اپنے گھر فون کیا۔ اس کا باپ بہت اپ سیٹ تھا۔ تم کہاں چلے گئے ہو غلام حسین؟''

''آپ میری فکر نہ کریں، میں بالکل خیریت سے ہوں، یہ بتائیں پولیس تو نہیں آئی تھی؟''

''تھانے سے دو بندے آئے تھے۔ تمہارا پوچھ رہے تھے۔ میں نے کہا کہ وہ تو راجا کرم داد کے پاس سے گھر ہی نہیں آیا۔ راجا صاحب بھی کچھ نہیں بتاتے۔''

''آپ راجا کرم داد کے گھر گئے تھے؟''

''ہاں گیا تھا۔ اس کی بیٹی عائشہ بہت غصے میں تھی۔ اس نے کہا کہ یہ سب تمہارے بیٹے کا کیا دھرا ہے جو میرے ڈیڈی کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ وہ لاکھوں کا غبن کر کے بھاگ گیا ہے مگر وہ جائے گا کہاں... میں اس کے خلاف رپورٹ لکھواؤں گی۔ پولیس اسے پکڑ کے لائے گی۔''

''راجا کرم داد کیا کہتا تھا۔ کیا اس نے رپورٹ لکھوائی ہے؟''

''نہیں الٹا اس نے بیٹی کو روکا۔ یہ کہا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھے۔ یہ میرا معاملہ ہے۔ وہ ٹانگ نہ اڑائے۔ میں نے کہا کہ آخر پولیس غلام حسین کو تلاش کرتی میرے گھر کیوں آئی تھی۔ راجا کرم داد نے کہا کہ اب نہیں آئے گی۔ لیکن عائشہ بہت آپے سے باہر ہو رہی تھی۔ اس نے مجھے بے عزت کیا۔ یہ کہا کہ تمہارا بیٹا نمک حرام اور بے غیرت ہے۔ اگر ڈیڈی کو کچھ ہوا تو میں چھوڑوں گی نہیں۔ تمہاری ماں بہت پریشان ہے۔''

''آپ پریشان نہ ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میرے فون کی بالکل کسی سے بات نہ کریں۔''

اس روز غلام حسین نے پھر سم بدل دی کہ خدانخواستہ پولیس اس کے باپ کو پکڑے تو فون کال کے ریکارڈ سے کچھ معلوم نہ ہو۔ عائشہ جو عدت کا زمانہ پورا کرنے سے پہلے ہی اس کے ساتھ سو چکی تھی۔ اب خود کو بے عزت محسوس کر رہی تھی۔ اس نے تو کچھ اور سوچا تھا۔ وہ غلام حسین سے شادی کر کے اس پر احسان کرنا چاہتی تھی۔ اسے اتنی عزت مل رہی تھی کہ وہ راجا کرم داد کا داماد کہلائے اور وہ اس پر تھوک کے بھاگ گیا تھا۔ ایسے وقت میں جب خاندان کو سہارے کی ضرورت تھی۔ شاید راجا کرم داد کو بھی غلطی کا احساس ہو رہا تھا کہ اس نے غلام حسین کو روکا نہیں۔ ابھی تو کیس شروع بھی نہیں ہوا تھا۔ اسے دبایا جا سکتا تھا۔ اور ایسے کیس تو سالوں چلتے ہیں۔ اگر وہ غلام حسین کو روک لیتا تو اس کے جیل جانے کی صورت میں وہ گھر کا محافظ بنتا۔ عائشہ کا شوہر بن کے وہ گھر کا داماد کہلاتا جو بیٹے کی جگہ ہی ہوتا ہے۔ راجا کو یہ بات اس کی بیوی نے بھی سمجھائی ہوگی۔ عورتیں ان معاملات کو زیادہ سمجھتی ہیں۔ راجا کرم داد یقیناً بعد میں پچھتایا ہوگا۔ عاشق حسین کے ساتھ اس کے رویے سے یہی اندازہ ہوتا تھا۔

یہاں تک آ کے واپس جانے کا سوچنا بھی اب ناممکن تھا ورنہ راجا کرم داد کو بھی اس کی ضرورت تھی۔ مجرم

اب وہ نہیں عائشہ تھی جس نے اس سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ اس کا مستقبل، اس کا گھر، اس کی محبت، اس کے خواب اور بلقیس کی زندگی... وہ نہ آتی تو سب اس کے سوچے ہوئے مستقبل کے نقشے کے مطابق تھا۔ بعد میں بلقیس اپنے خواب لے کر اس کے ساتھ ہولی تھی اور انہوں نے مکمل ذہنی اور جذباتی ہم آہنگی سے ایسے خواب ترتیب دے لیے تھے جو ایک خوش حال خوشیوں سے بھرے گھر اور مستقبل کی ضمانت تھے۔

عائشہ نے بلقیس کے ساتھ غلام حسین کے سارے خواب بھی قتل کر دیے تھے اور اب دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ... دنیا کی کسی عدالت میں وہ مجرم ثابت نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کو سزا صرف وہی دے سکتا تھا جو اب بے خواب صحرا کا تہی دست و تنہا مسافر تھا۔ پانچ دن بعد بھی اس کے خلاف کسی تھانے میں کوئی رپورٹ درج نہیں ہوئی تھی اور پہلے دن ایک چکر لگا کے مفرور غلام حسین کا پوچھنے کے بعد اس کے گھر کوئی نہیں آیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے بالواسطہ طور پر تحفظ کی ضمانت دی جا رہی ہے۔ واپس گھر لوٹ آؤ، تمہیں کچھ بھی نہیں کہا جائے گا۔

چھٹے دن اس نے پھر نئی سم لگا کے عائشہ کو فون کیا۔ اس دعا کے ساتھ کہ کال ریسیو کرتے وقت اس کے قریب کوئی نہ ہو اور وہ اس کا نام یوں نہ لے کہ کسی اور کے کان میں پڑے۔ گھر میں صرف تین افراد تھے۔ راجا کرم داد ظہر کی نماز پڑھ کے کھانا کھاتا تھا۔ پھر دو گھنٹے آرام کرتا تھا۔ یہی معمول اس کی بیوی کا تھا۔ صبح دس گیارہ بجے سو کے اٹھنے والی عائشہ یہ وقت اپنے کمرے میں گزارتی تھی۔

رِنگ ٹون کے دس سیکنڈ بعد اس نے کال ریسیو کی۔

''ہیلو۔'' اس کے لہجے میں سوالیہ اجنبیت تھی۔

''عائشہ...'' اس نے آہستہ سے کہا۔

عائشہ چلائی۔ ''تم...؟ غلام حسین...''

''پلیز عائشہ، اتنا اونچا مت بولو۔ کوئی سن لے گا۔ میرا تم سے بات کرنا ضروری تھا۔'' اس نے لجاجت سے کہا۔

عائشہ سنبھل گئی، اس نے کہا۔ ''کوئی نہیں ہے یہاں... مجھے کیوں فون کیا ہے تم نے؟''

''اس لیے کہ کسی اور سے بات کرنا میرے لیے ضروری نہیں تھا۔ ایسی کوئی مجبوری نہیں مجھے... نہ میرا مقصد اپنا دفاع کرنا ہے اور نہ اپنی صفائی میں کچھ کہنا۔''

''پھر کیا مقصد ہے اور مجھ سے بات کرنا کیوں ضروری تھا؟''

''اس لیے... کہ... نہ مجھے کسی کی پروا ہے نہ خیال... آج پانچ دن ہو گئے۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے خیال آتا ہے تو صرف تمہارا... پانچ دن سے تمہاری صورت دیکھی ہے تو صرف تصور میں...'' اس نے بڑی محبت سے یاد کیے ہوئے ڈائیلاگ دہرائے۔

''بے وقوف مت بناؤ مجھے۔'' عائشہ نے کہا مگر اس کا لہجہ بدل گیا تھا۔

''تمہاری قسم... آج میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا۔ کہاں وہ کہ ہر وقت تم سامنے تھیں۔ تمہارا ساتھ تھا۔ تمہاری باتیں تھیں اور اتنی قربت تھی... میرے خواب سچ ہو سکتے تھے۔''

''کیسے خواب؟'' وہ باتوں کے ٹرانس میں آ گئی۔

''تم جانتی ہو عائشہ... اس غلط فہمی کے باوجود جس نے تمہیں مجھ سے بدظن کیا۔''

''وہ غلط فہمی نہیں لپ اسٹک تھی۔'' وہ تلخ لہجے میں بولی۔

''اس کے بعد تم نے کبھی کچھ دیکھا؟ کچھ سنا؟ کبھی کوئی ایسی بات ہوئی کہ تمہیں شک ہوتا؟ میں تو ہر وقت تمہاری نظر کے سامنے تھا۔ کسی اور کے چکر میں ہوتا تو کیا تم سے چھپا رہ سکتا تھا؟ تم جس کی قسم چاہو اٹھوا لو۔ اب تو میں اور تم بہت قریب آ چکے تھے اور یہ دیکھنے والے بھی دیکھ سکتے تھے۔ تمہارے امی ڈیڈی... انہوں نے کوئی روک ٹوک لگائی میری اور تمہاری بے تکلفی پر... میں تو گھر کے اندر گھر کا ایک فرد بن گیا تھا اور جس رات میں گیسٹ بیڈ میں سویا تھا...''

''ایسا ہی تھا تو جاتے وقت تمہیں میرا خیال کیوں نہیں آیا؟ کمینے آدمی...'' وہ جذباتی ہو گئی۔

''میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے۔ منزل کے اتنا قریب آ کے میں نے تمہیں کھو دیا۔ مجھے یقین تھا کہ وقت آنے پر راجا کرم داد میری درخواست مسترد نہیں کریں گے۔ انہیں مجھ پر اعتماد تھا۔ وہ تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیتے۔''

''اب تم کہاں ہو؟'' وہ سسکی لے کر بولی۔

غلام حسین کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ آ گئی۔ خود کو بڑا آدم خور سمجھنے والی عائشہ پالتو بلی کی طرح اس کے قدموں میں لوٹنے پر تیار تھی۔ عقل کی مضبوط فصیل جذبات کی یلغار میں ریت کی دیوار ثابت ہوئی تھی۔ ''میں... ملنا چاہتا ہوں

تم سے... فون پر سب کچھ نہیں کہہ سکتا اور اتنی ہمت بھی نہیں کہ گھر آجاؤں۔"

"آجاؤ، کوئی کچھ نہیں کہے گا تمہیں... سب پہلے جیسا ہوجائے گا۔" وہ اب باقاعدہ رو رہی تھی۔

"نہیں عاشی! پلیز رونا بند کرو۔ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے۔ سامنے ہوتا تو تمہارے آنسو اپنے ہونٹوں سے پی لیتا۔ دیکھو میں کچھ ضرورت سے زیادہ ڈر گیا تھا اس لیے بھاگ گیا۔ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ تم مجھ سے مل لو۔" اس کے ڈائیلاگ ہی نہیں، جذباتی ادائیگی بھی اچھی تھی۔

"ہوسکتا ہے... مگر تم کو اعتبار کیوں نہیں مجھ پر۔" وہ بولی۔

"تم پر ہے۔ بس ایک مرتبہ پہلے میں تمہارے سامنے اعترافِ جرم کرلوں۔ تمہیں یقین دلا دوں کہ تمہارے سوا میں کسی کا نہیں۔ تم اکیلے میں میری سن لو۔ مجھے معاف کردو پھر تم جو کہو گی میں کروں گا۔"

"اوکے، بتاؤ میں کہاں آؤں... کہاں ہو تم؟"

"میں ایک دوست کے گھر میں چھپا ہوا ہوں۔ وہاں نہیں۔ تم آجاؤ..." اس نے سوچا۔ "راول ڈیم پر... وہاں اس وقت لوگ نہیں ہوتے... یا دامنِ کوہ پر۔"

"میں دامنِ کوہ پر آجاتی ہوں۔ تم کتنی دیر میں آؤ گے؟"

"دیکھو، تین بجے ہیں ابھی۔ ساڑھے تین یا چار کرلو۔ میں دیکھ لوں گا تمہیں جب تم پارکنگ ایریا میں پہنچو گی مگر دیکھو، ابھی کسی کو بھی معلوم نہ ہو۔ یہ بھی نہیں کہ میں نے کال کی تھی۔"

"اچھا اچھا، نہیں بتاؤں گی کسی کو... ڈرپوک آدمی۔" اس کے لہجے میں شوخی لوٹ آئی۔

"آئی لو یو عاشی..." اس نے منہ سے بوسے کی آواز نکالی اور فون بند کردیا۔ عاشی کا پیار بھرا نام اس نے آج ہی ایجاد کیا تھا۔

سوا تین بجے وہ اپنی بدلے ہوئے نمبروں والی کار میں بیٹھا عائشہ کے گھر سے نکلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی گاڑی کے شیشے اب سیاہ تھے اور پچھلے اسکرین پر اور بونٹ پر ایسے اسٹیکر لگے ہوئے تھے جو شہدے قسم کے ٹین ایجر لگائے پھرتے ہیں۔ اس سے گاڑی بالکل ناقابلِ شناخت ہوگئی تھی۔ اس نے اندازہ لگایا تھا کہ لباس بدلنے اور میک اپ کرنے میں عائشہ آدھا گھنٹا ضرور لے گی۔ اسے ڈیٹ پر جانے کا اہتمام کرنا تھا اور اس کا اندازہ بالکل درست تھا۔

وہ ساڑھے تین بجے نکلی۔ اب یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ چار بجے دامنِ کوہ پہنچ سکے۔ دیر کرنا ایک زنانہ مجبوری تھی اور انتظار کرانا ایک ادائے محبوبی... اس نے مزید پانچ منٹ انتظار کیا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ عائشہ کے پیچھے کوئی اور تو نہیں جاتا۔ گو اس کا امکان بہت ہی کم تھا۔ وہ غلام حسین کی باتوں کے جال میں آگئی تھی۔ شاید خود کو فاتح دیکھنا بھی ہر لڑکی ضروری سمجھتی ہے اور اسی سے مار کھاتی ہے۔

پانچ منٹ بعد اس نے گاڑی دوڑائی اور فیض آباد کے پل کے نیچے سے گزرتے ہوئے عائشہ کی کار دیکھ لی جو معمول کے مطابق درمیان میں اور بہت آہستہ چل رہی تھی۔ وہ اس پر ایک نگاہ ڈالتا ہوا گاڑی نکال کے لے گیا۔ ڈارک شیشوں کے پار وہ غلام حسین کو نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ تقریباً دس منٹ پہلے ہی دامنِ کوہ پہنچ گیا۔ گاڑی پارک کر کے وہ ایک کنارے پر کھڑا رہا۔ اس نے عائشہ کو بیس قدم دور گاڑی لگاتے دیکھا۔ غلام حسین کچھ دیر انتظار کرتا رہا کہ اس کے ساتھ دوسری گاڑی آتی ہے یا نہیں۔ پھر ایک دم دروازہ کھول کے اس کے ساتھ جا بیٹھا۔

وہ چونکی اور غلام حسین کو دیکھتی رہی پھر اس سے لپٹ گئی۔ وہ سخت جذباتی ابال میں مبتلا تھی۔ اس نے غلام حسین کو بار بار چوما۔ یہاں تک کہ غلام حسین کو اسے روکنے کے لیے سختی سے جھنجھوڑنا پڑا۔ "پاگل ہوگئی ہو۔ ہم پارک میں ہیں، کیا کہیں گے لوگ۔"

"کون لوگ؟ کون ہے یہاں۔" اس نے دائیں بائیں خالی جگہ کو دیکھا مگر سنبھل کے بیٹھ گئی۔

"میں ڈر رہا تھا کہ کہیں تمہارے پیچھے پولیس نہ آجائے۔"

اس نے پیار کے غصے سے غلام حسین کے تھپڑ رسید کیا۔ "ایسا سمجھتے ہو تم مجھے؟ دھوکے باز۔"

غلام حسین ہنسنے لگا۔ "غصے میں تم زیادہ حسین لگ رہی ہو۔ ایک حسین ناگن... جس کا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔"

"پھر کیا مانگتا ہے؟" وہ ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے بے شرمی سے ہنسی۔

"کیا ہم ساری باتیں یہاں اس گاڑی میں بیٹھ کے کریں گے۔ مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے۔"

"کیا خیال ہے؟ منال چلیں۔" عائشہ نے کہا۔

غلام حسین کے دل میں ٹیس اٹھی۔ "نہیں، مری کے راستے پر چلو۔ وہاں ایک ریسٹورنٹ ہے جس کے دونوں طرف سے سڑک گزرتی ہے۔ آنے والی اور جانے والی...

گارڈن ریسٹورنٹ میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ وہ جھاڑیوں سے ڈھکی میز پر بیٹھ گئے۔ غلام حسین دیکھ رہا تھا کہ عائشہ کے جذبات کتنے برانگیختہ ہیں۔ سنسان راستے پر گاڑی روک کے غلام حسین نے اسے دیوانہ وار چوما تھا اور اپنے ہاتھوں کو بھی اس کے جسم سے کھیلنے کی پوری آزادی دے دی تھی۔ یہ سب اس کے پروگرام کی کامیابی کے لیے ضروری تھا۔

پھولی ہوئی سانسوں اور نشیلی نظروں سے غلام حسین کو دیکھتے ہوئے عائشہ نے کہا۔ ''بتاؤ کیا کہنا تھا جس کے لیے مجھے یہاں لائے... بے صبرے انسان۔''

''صبر کی حد ہوتی ہے عاشی... تمہارے گھر میں، تمہارے ممی ڈیڈی کی وجہ سے میں نے خود کو بہت کنٹرول کیا لیکن اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتا۔ میں شادی کرنا چاہتا ہوں تم سے۔''

وہ دم بخود اور مسحور بیٹھی رہی۔ ''شادی؟... تم سچ کہہ رہے ہو؟''

''اور شادی کے لیے میں مزید انتظار نہیں کر سکتا۔ ایک دن بھی نہیں۔''

وہ ہذیانی انداز میں ہنسی۔ ''ایک دن؟ کیا پاگل ہو گئے ہو؟''

''ہاں، اور مجھے پاگل کیا ہے تم نے... مجھے جواب دو ابھی... ہاں یا نہیں۔''

''ہاں بابا ہاں... لیکن ایک دن میں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ شادی ہے کوئی مذاق نہیں۔''

''دیکھو عاشی، میری بات سنو دھیان سے۔ ہم آج ہی شادی کریں گے پہلے... اس کے بعد میں تمہارے ساتھ گھر جاؤں گا۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''ہم شادی کرنے کے بعد تمہارے گھر جائیں گے۔ مجھے ڈر ہے راجا صاحب انکار کر دیں گے۔ جب ہم بتا دیں گے کہ شادی ہم کر چکے ہیں تو وہ مجبور ہوں گے۔ وہ بعد میں جب چاہیں اس کا اعلان کریں اور جیسے چاہیں تقریب کریں۔''

عائشہ کمزور لہجے میں بولی۔ ''وہ انکار نہیں کریں گے۔ میں ہوں تمہارے ساتھ۔''

''نہیں عاشی، میں نے بات کر لی تھی۔ ایک دوست کے گھر میں نکاح ہو گا۔ پھر میں تمہارے ساتھ چلوں گا تو مجھے کوئی خوف نہیں ہو گا۔ وہ جب چاہیں رخصتی کریں۔ تب تک میں ہاتھ نہیں لگاؤں گا تمہیں۔''

عاشی اس کے لیے تیار نہیں تھی مگر غلام حسین کے اصرار نے اسے قائل کر کے چھوڑا۔ وہ غلام حسین کو پسند کرتی تھی۔ یہ دیکھ چکی تھی کہ وہ کتنا فرمانبردار نمک خوار تھا۔ اس کا کردار بھی بے داغ تھا اور اب اس کی محبت میں بھی کوئی شک نہیں رہا تھا۔ غلام حسین کے دیوانہ وار اصرار کے سامنے اسے سر تسلیم خم کرنا ہی پڑا۔

کہاں ہے تمہارے دوست کا گھر، وہاں اور کون ہو گا؟'' وہ خوابناک لہجے میں بولی۔

''یہاں سے نزدیک ہی... چھتر پارک سے ذرا آگے۔ اسی لیے میں تمہیں یہاں لایا تھا۔ وہاں میرے چار دوست ہوں گے اور نکاح خواں قریب ہی رہتا ہے۔ ایک گھنٹے میں ہم ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔ کم آن...''

اس نے عائشہ کو ہاتھ پکڑ کے اٹھا لیا اور وہ کچے دھاگے سے بندھی اس کے پیچھے چلی آئی۔ راستے میں غلام حسین نے کولڈ ڈرنک کے دو ٹین خریدے۔ عائشہ نے پیاس کی شکایت کی تھی۔ وہ نروس تھی۔ پروگرام کے مطابق غلام حسین نے ٹین کھولا اور عائشہ کی نظر بچا کے اس میں ایک چھوٹی سی شیشی خالی کر دی۔ ''سکونی'' ویسی ہی تھی جیسی ویلیم... اس کے دو سے پانچ قطرے ایک گلاس پانی میں سکون کی نیند کے لیے کافی تھے۔ پوری شیشی میں شاید سو قطرے تھے۔

کولڈ ڈرنک کے شیریں تلخ و تند ذائقے میں عائشہ نے فرق محسوس ہی نہیں کیا۔ وہ سارا ٹن خالی کر گئی اور پُرسکون رہنے کی ناکام کوشش کرتی رہی۔ اس کے جذبات کو بھڑکانے کے لیے غلام حسین نے کہا۔ ''کیا تم کسی بہانے آج رات گھر سے غیر حاضر رہ سکتی ہو؟''

سب سمجھ لینے کے باوجود عائشہ نے پوچھا۔ ''وہ کس لیے؟''

''ہم اپنی شب عروسی مری میں گزار سکتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے تم یہ کر سکتی ہو۔''

وہ عائشہ کے جذبات میں آگ لگا چکا تھا۔ عائشہ نشیلی آنکھوں سے اسے دیکھ کے مسکرائی اور آہستہ سے اقرار میں سر ہلا دیا اور بولی۔ ''کہاں ہے آخر تمہارے دوست کا گھر؟''

''بس دس منٹ... چھتر پارک دیکھا ہے نا تم نے... وہیں پی ٹی ڈی سی کا موٹیل ہے۔ ہم وہیں رک جائیں گے۔ مری سے زیادہ پُرسکون اور اچھی جگہ ہے۔''

اب مغرب کا وقت ہونے کے قریب تھا لیکن پہاڑوں کے درمیان بل کھاتی سڑک پر اندھیرا پہلے ہی اتر آیا تھا۔ اچانک عائشہ پر غنودگی غالب آنے لگی۔ اس نے گاڑی کو ایک

سائڈ میں روک لیا۔ ”پتا نہیں کیا ہو رہا ہے مجھے۔“
”کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ شاید تھکن ہے۔ گاڑی میں چلاتا اگر عام کار ہوتی لیکن یہ آٹو میٹک ہے مجھے...“
عائشہ نے اپنا سر اسٹیئرنگ پر رکھ دیا۔ اتنی نیند کیوں آرہی ہے مجھے؟“
وہ ہنسا۔ ”سو جاؤ عائشہ... اب تمہیں لمبا سونا ہے۔ یوم حساب تک... جب تمہیں معلوم ہوگا کہ تمہارے نامۂ اعمال میں کیا کچھ لکھا ہوا ہے۔ وہ سب جو تم نے شادی سے پہلے کیا۔ اس جرم کے مقابلے میں کچھ نہیں جو تم نے بلقیس کی جان لے کر کیا۔“
لیکن عائشہ اب کچھ نہیں سن رہی تھی۔ وہ سو چکی تھی۔ اسٹیئرنگ پر سر رکھے رکھے۔ گاڑی کے اندر قریب سے گزرنے والوں کو ایک تو جوان جوڑا نظر آتا تھا جو رومانٹک موڈ میں کار کو سائڈ میں پارک کیے بیٹھا تھا۔ کار کے اندر اب کسی کی صورت پہچانی نہیں جاسکتی تھی۔
غلام حسین نے رومال سے ہر اس جگہ کو صاف کیا جہاں اس کے فنگر پرنٹ ملنے کا امکان ہوسکتا تھا۔ وہ وقفے وقفے سے عائشہ کی نبض محسوس کرتا رہا جو کمزور پڑتی جارہی تھی۔ یہ خودکشی کا کیس شمار ہوگا۔ عائشہ طلاق کے بعد ڈپریشن کا شکار بھی اور احساسِ جرم کا۔ وہ پانچ ماہ کا بچہ بھی ساتھ نہیں لا سکی تھی جو بعد میں مرگیا۔ اسے احساسِ جرم بھی تھا کہ وہ اپنے بچے کی قاتل تھی۔
اندھیرا ہوجانے کے بعد غلام حسین گاڑی سے اترا اور مخالف سمت میں پیدل چل پڑا۔ سو قدم کے بعد وہ راولپنڈی کی طرف جانے والی ایک ویگن کو روکنے میں کامیاب ہوگیا۔ ویگن سے اتر کے اس نے دامنِ کوہ کے پارکنگ ایریا میں کھڑی اپنی کار تک کا فاصلہ پیدل طے کیا۔ جب وہ واپس ہوا تو عائشہ کو مرے ایک گھنٹا ہونے کو تھا۔ اسے افسوس تھا کہ وہ پُرسکون طریقے پر مری۔ اس نے بلقیس کی طرح تڑپ تڑپ کے جان نہیں دی اور شاید اسے پتا بھی نہیں چلا کہ اس کی سہاگ رات کا خواب دراصل اس کی سزائے موت کے فیصلے پر عمل درآمد کی رات تھی۔
رات نو بجے وہ پھر اپنی پناہ گاہ میں تھا۔ دو دن بعد فیروز داد نے اسے عائشہ کی خودکشی کی خبر دی۔ یہ خبر ساری تفصیل کے ساتھ اخبار میں بھی تھی۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی فیروز نے کہا۔ ”تم کو محتاط رہنا ہوگا۔ راجا کرم داد بلاوجہ اس کھیل میں تمہیں ملوث کرسکتا ہے بلکہ مجھے یقین ہے کہ وہ ایسا کرے گا۔“
”مجھے؟ فیروز صاحب... میرا کیا تعلق عائشہ کے معاملات سے۔“
”تعلق کون پوچھتا ہے۔ میرا خیال ہے تم باہر چلے جاؤ، یہاں کب تک چھپ کر بیٹھے رہو گے۔“
غلام حسین کے دل کی مراد بر آئی۔ ”چاہتا تو میں بھی یہی تھا۔“
”میں نے سوچا ہے کہ تمہیں ترکی بھیج دوں۔“ فیروز نے کہا۔
”ترکی؟ وہاں کیا ہے؟ آپ کا بزنس تو دبئی میں ہے۔“
”گھر وہاں بھی ہے۔ دراصل وہاں میرا ایک نمائندہ تھا۔ اس کی اور تمہاری صورت میں خاصی مشابہت ہے۔“
”کیا مطلب... میں اس کی دستاویزات پر جاؤں؟“
”نہیں، تم اپنی دستاویزات پر جاؤ اور ترکی کے شہر ازمیر میں پہنچ کے غائب ہوجاؤ۔ وہ نمائندہ تقریباً دو ہفتے پہلے غائب ہوگیا تھا۔ مجھے پتا چلا ہے کہ شہاب الدین... یہ اس نمائندے کا نام تھا وہ یورپ پہنچ گیا ہے، خشکی کے راستے۔ وہ لوٹ کے نہیں آئے گا۔“
”اور... وہ پکڑا گیا اور واپس آگیا پھر؟“
”یار وہ کیوں واپس آئے گا آخر... ترکی یونان کے راستے سب یورپ ہی نکلتے ہیں تم اس کے اپارٹمنٹ پہنچ جاؤ۔ وہاں تمہیں ایک خاتون ملے گی۔ الیشا... وہ تمہاری مدد کرے گی۔ وہ یہی کام کرتی ہے جو لوگ ایران سے ترکی میں داخل ہوں، ان کی یورپ پہنچنے میں مدد کرے۔ چاہو تو تم بھی نکل جانا۔ پیسا کافی ہے تمہارے پاس۔ میں الیشا سے تمہاری سفارش کردوں گا۔“

☆☆☆

یہ بات اتنی پرانی تھی لیکن شہاب کو گزر جانے والے وقت کا ہر لمحہ آج کی بات لگتا تھا۔ وہ پاکستان سے باہر خاکوانی کے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ پر ترکی پہنچا تھا جو پشاور سے حاصل کیے گئے تھے اور ائرپورٹ سے باہر آتے ہی شہاب الدین بن گیا تھا۔ اسے لینے کوئی نہیں آیا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے اس نے ایک پاکٹ گائڈ بک سے ترکی زبان کے اچھے خاصے روزمرہ کی گفتگو میں کام آنے والے جملے رٹ لیے تھے۔ اسے انگلش ڈکشنری بھی مل گئی تھی چنانچہ فوری طور پر اسے کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ اس کا ارادہ تھا کہ یہاں رہ کے ترکی زبان پر مزید عبور حاصل کرے گا فیروز داد کا بزنس ترکی میں بھی تھا۔ وہ دبئی جا کے بھی معاملات دیکھ سکتا تھا اور یہاں رہ کے بھی۔ فوری طور پر وہ غیر قانونی راستے سے

یورپ میں داخل ہونے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا۔
فیروز نے پوری یقین دہانی کرائی تھی کہ اس نے کام کو بطریق احسن سنبھالا تو اسے وہیں کے معیار سے معقول تنخواہ ملتی رہے گی۔

ایک ٹیکسی نے اسے شہاب کی رہائش گاہ پہنچا دیا۔ اس نے گیٹ کے محافظ سے بات بھی نہیں کی تھی کہ وہ بڑے جوشیلے طریقے پر شہاب سے چمٹ گیا۔ وہ بڑی روانی اور بے تکلفی سے نہ جانے کیا کہہ رہا تھا مگر اس میں شک نہیں کہ وہ شہاب کو پہچان گیا تھا۔ شہاب نے بمشکل تمام چند جملے بولے کہ ”سب ٹھیک ہے؟ اللہ کا شکر ہے میں خیریت سے ہوں۔“ اور خود کو چھڑا کے اوپر چلا گیا۔ محافظ کچھ حیران تھا کہ شہاب نے اس کی اتنی باتوں کا مختصر ترین دو جملوں میں جواب کیوں دیا؟ وہ یقیناً پوچھ رہا ہوگا کہ آپ اتنا عرصہ کہاں تھے؟ شہاب نے اوپر جاکے اپنا اپارٹمنٹ بھی خود ہی تلاش کیا۔ اسے ترکی کے حروف اور اعداد سمجھ میں آتے تھے۔

ایک جگہ اس نے بیل بجائی تو چالیس سال کی ایک اسمارٹ خاتون نے دروازہ کھولا جو میک اپ، ہیئر کلر اور لباس سے عمر کے دس سال کم کرنے میں ضرور کامیاب تھی مگر اس کی ادائیں کسی نوجوان لڑکی جیسی تھیں۔ اس کا لباس یورپین ہی تھا مگر بہت کم تھا۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ”شہاب؟ تم شہاب ہو واقعی... اندر آجاؤ... تمہیں کسی نے روکا تو نہیں؟“ وہ انگلش بول رہی تھی۔

شہاب نے کہا۔ ”دروازے پر محافظ نہ جانے کیا کہتا رہا ترکی میں۔“

وہ ہنسی۔ ”حیران ہوا ہوگا اتنے عرصے بعد تمہیں دیکھ کر۔ پوچھ رہا ہوگا کہ کہاں غائب تھے۔ میں بات کرلوں گی اس سے بعد میں۔“

”پریشانی سے زیادہ مجھے اطمینان ہوا کہ میں شہاب کی جگہ لے سکتا ہوں۔“ وہ ایک صوفہ نما کرسی پر بیٹھ گیا۔

وہ ہنسی۔ ”لے سکتے ہو نہیں، لے چکے ہو۔ فیروز کی چوائس کی میں داد دیتی ہوں۔ میرا نام الیشا ہے، کیا پیو گے؟“

الیشا نے تین نام لیے تھے۔ اس نے معذرت کی۔

”ان میں سے کچھ نہیں۔ میں شراب نہیں پیتا۔“

”یہ کہو، ابھی میں شراب نہیں پیتا۔“ وہ ہنسی۔ ”تمہارا سب سامان یہی ہے؟ خیر کوئی بات نہیں۔ شہاب کی چھوڑی ہوئی ہر چیز اب تمہاری ہے۔ نہادھو کے فریش ہوجاؤ۔“

شام کو اس نے ہنستے ہوئے بتایا کہ محافظ اس تھوڑی سی بدلی ہوئی وضع قطع پر حیران تھا اور پوچھ رہا تھا کہ آپ مونچھیں کہاں چھوڑ آئے اور بال بھی اتنے چھوٹے کرالیے۔

جب اس نے شہاب الدین کی تصویر دیکھی تو اسے بس یہی فرق واضح لگا۔ الیشا کے کہنے پر اس نے شہاب ثانی بننے کے لیے مونچھیں چھوڑ دیں اور بال بھی بڑھا لیے۔ اس کا کہنا برحق تھا کہ ایک محافظ کی بات نہیں یہاں جتنے لوگوں سے واسطہ پڑے گا، وہ سب سوال کریں گے کہ اتنے دن سے تم کہاں تھے اور یہ تبدیلی کیسی... تم کس کس کو وضاحت کرتے پھرو گے۔

اگلے دو ماہ میں بہت کچھ ہوا۔ اس نے شہاب الدین بن کے دکھا دیا۔ بالوں اور مونچھوں کے سوا اس میں اور یورپ کی طرف نکل جانے والے شہاب الدین میں کوئی فرق نہ رہا۔ وہ روانی سے ترکی بولنے لگا۔ اس نے شہاب الدین کا سارا کام سمجھ لیا اور اپارٹمنٹ میں موجود اس کی ہر چیز کو اپنی ملکیت بنا لیا۔ ان میں خود الیشا بھی شامل تھی۔ شہاب کو اس کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں تھی کہ وہ کوئی شریف زادی ہے۔ اس کی مصروفیات کا اندازہ بھی اس وقت تک مشکل تھا جب تک وہ اس کے ساتھ نہ ہو۔ شہاب کی گمشدگی اور واپسی پر اس نے اپنے حلقہ شناسائی اور کاروباری لوگوں کے سامنے یہ وضاحت پیش کی کہ وہ ناراض ہو کے چلا گیا تھا اور اِدھر اُدھر آوارہ گردی کر کے لوٹ آیا۔

”آخر کہاں جاتا گھر تو واپس آتا ہی نہ کبھی... میں نے سب سے کہا۔“ اس نے ایک ہفتے بعد ہنستے ہنستے کہا۔

شہاب کا ماتھا ٹھنکا۔ آخر شہاب مستقل اس عورت کے ساتھ کیسے رہتا تھا؟ بے شک ترکی میں آزاد خیالی تھی لیکن الیشا کے طور طریقے آزاد خیالی سے آگے والے تھے۔

شہاب ایک ہفتہ لاؤنج میں صوفے پر سوتا رہا کیونکہ بیڈروم ایک ہی تھا۔ پھر الیشا کے اصرار پر اس کے ساتھ ہی سونے لگا۔ وہ انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا اور اس کا ہر حکم ماننے پر مجبور تھا۔ اس وقت تک جب تک وہ خود اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل نہ ہو اور اپنا کرائے کا اپارٹمنٹ لے سکے۔ الیشا کی مدد کے بغیر وہ بطور شہاب ثانی کہیں بھی ایڈجسٹ نہ ہوتا۔ شہاب کو فی الحال مالی مسائل درپیش نہیں تھے۔ مگر ایک دن الیشا نے کہا کہ اب وہ شہاب کے بینک اکاؤنٹ کو بھی آپریٹ کرے۔

”یہ میں کیسے کرسکتا ہوں؟“

”اس لیے کہ تم شہاب ہو۔ اس کے دستخط کرنا سیکھ لو۔“

شک کون کرے گا میرے ہوتے۔''
''لیکن وہ دنیا میں کہیں بھی ہو، اپنا بینک اکاؤنٹ آپریٹ کرسکتا ہے۔''
''وہ دنیا میں کہیں بھی نہیں ہے۔'' الیشا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔
''یہ... تم کیسے جانتی ہو؟''
''اس لیے کہ میں اس کی بیوی ہوں... قانونی بیوی۔''

شہاب کے دماغ میں بم سا پھٹا اور اس کے ہوش و حواس میں دھواں ہی دھواں پھیل گیا۔ اس میں وہ الیشا کا چہرہ دیکھ سکتا تھا اور اس کی آواز سن سکتا تھا۔ ''میں نے ہی تمہاری گم شدگی کی رپورٹ پولیس میں لکھوائی تھی اور میں نے خود اسے کینسل کرادیا۔ یہ بتا کے کہ میرا شوہر واپس آگیا ہے جو ناراض ہو کے چلا گیا تھا۔ اس نے مجھ سے مقامی قانون کے مطابق شادی کی تھی۔ یہاں کی شہریت مل گئی تھی اسے... لیکن پھر اس کا دماغ پھر گیا۔ وہ لندن گیا تھا کاروبار کے سلسلے میں... وہاں اسے کوئی پاکستانی فیملی مل گئی۔ اس کا ان کی بیٹی کے ساتھ افیئر ہوگیا۔ وہ خاموشی سے بھاگ جاتا تو کچھ نہ ہوتا لیکن اس نے مجھے بتادیا۔ میں اس سے محبت کرتی تھی اتنی کہ اور کوئی نہیں کرسکتی۔ مگر اس نے پروا نہیں کی میرے آنسوؤں کی بھی... پھر میں نے طے کرلیا کہ وہ میرا نہیں تو کسی اور کا بھی نہیں ہوگا۔ تم کو فیروز نے بتایا ہوگا کہ میں انڈیا، پاکستان، بنگلہ دیش یا سیلون سے آنے والوں کو یورپ جانے میں مدد کرتی ہوں۔ میرے تعلقات ہیں ایسے لوگوں سے... غیر قانونی کام کا معاوضہ بہت ملتا ہے مجھے... لیکن یہ کام کرنے والے شریف آدمی تو نہیں ہوتے۔ میرے رونے دھونے پر ایک کو ترس آگیا۔ اس نے میرا کام کردیا۔''
''یعنی؟'' شہاب نے سانس روک کے پوچھا۔
''اس نے وہی کیا جو میں چاہتی تھی... اب تم واحد شہاب ہو۔ دنیا میں میرا کوئی دوسرا شوہر نہیں ہے۔''

آج شہاب کو الیشا کے شوہر کا کردار ادا کرتے کئی مہینے بیت گئے تھے۔ اب اس نے بھی الیشا کے بزنس کو سمجھ لیا تھا اور اس کام میں الیشا کی مدد کررہا تھا۔ وہ بری عورت نہیں تھی۔ شہاب کے حق میں ضرور اچھی تھی لیکن شہاب احساسِ جرم کی دلدل میں اترتا جارہا تھا۔ وہ الیشا سے کیسے چھٹکارا حاصل کرے۔ اس کے ساتھ غیر اخلاقی، غیر قانونی ازدواجی زندگی کے جال سے کیسے نکلے۔ یہ اب ناممکن ہورہا تھا۔ دن رات سوچنے کے باوجود اس مسئلے کا کوئی حل اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ ایک بہت بڑا کاروباری اور ذاتی تعلقات کا حلقہ تھا جو شہاب کو اس کے شوہر کی حیثیت سے جانتا تھا۔ وہی شوہر جو الیشا کے کہنے کے مطابق اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ الیشا اس سے عمر میں دس سال زیادہ بتاتی تھی۔ شاید وہ چالیس سے بھی اوپر کی تھی کیونکہ خواہش کے باوجود وہ ماں بننے کی صلاحیت کھوچکی تھی۔ شہاب سوچتا تھا کہ کہیں وہ باپ بن جاتا تو اس بچے کی قانونی اور اخلاقی پوزیشن کیا ہوتی۔

الیشا اسے کاروباری شریک کے طور پر آمدنی کا ایک حصہ دے رہی تھی جو بہت تھا اور اس کے بینک اکاؤنٹ میں جاتا تھا۔ وہ بینک اکاؤنٹ جو اس نے نہیں کھولا تھا۔ یہاں سے رقم اس کے ماں باپ کو بھی پہنچتی تھی لیکن بینک کے قانونی ذریعے سے نہیں... ہنڈی کا کاروبار کرنے والے یہ کام کرتے تھے۔ وہ ٹھیک تھے مگر اصرار کرتے تھے کہ وہ واپس آجائے۔ وہ چاہتا تھا کہ ممکن ہو تو انہیں بھی بلالے مگر یہ ناممکن تھا۔

الیشا نے اس کا پاکستانی شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بھی غائب کردیے تھے۔ اس نے شیر علی... اس شخص کا اصل نام یاد آتے ہی وہ اٹھ بیٹھا۔ وہ عاشق علی نہیں شیر علی تھا۔ وہی احمد حسین جس نے اس کے حسابات میں لاکھوں کا گھپلا بتا کے اسے تھانے پہنچایا اور پھر غائب ہوگیا تھا۔ شیر علی کی صورت کل شام دوبارہ نظر آئی تھی۔ اسی لیے مانوس نظر آنے کے باوجود وہ اس بلیک میلر کا نام یاد نہیں کرسکا تھا۔ لیکن اس بات کی تصدیق بعد میں ہوگئی تھی کہ وہ محکمہ انکم ٹیکس سے نکالا گیا ایک اسسٹنٹ تھا جو اسی طرح اکاؤنٹس کے آڈٹ سے بلیک میلنگ کرتا تھا۔ تقدیر بھی کیا ستم ظریف ہے۔ آدمی کو کیسے گھیر کر وہاں پہنچاتی ہے جہاں اس کے لیے دنیا میں مکافاتِ عمل کی گھڑی آئے۔

اس نے شیر علی کو ہلا جلا کے دیکھا۔ مرنے کے بعد رات بھر میں اس کا بدن اکڑ کے سخت ہوگیا تھا۔ اس نے شیر علی پر بھی عائشہ والا نسخہ ہی آزمایا تھا۔ یہاں اسے کچھ محنت کرنا پڑی تھی۔ اس نے الیشا کی خواب آور گولیاں پیس کر اس کے حصے کے پیزا میں شامل کردی تھیں۔ الیشا کو بے خوابی کا مرض تھا اور وہ ڈاکٹر کے نسخے پر کیمسٹ سے مہینا بھر کی دوالاتی تھی۔ اس میں سے ابھی الیشا نے دو ہی گولیاں

کھائی تھیں۔ پیزا ابھی شاید اسی نے منگوایا ہوگا کہ پورا فریج میں رکھا تھا۔ شہاب نے اسے مائیکرو ویو میں گرم کیا تھا اور اس کے نصف حصے پر گولیوں کا سفوف چھڑک کے اوپر ٹماٹو کیچپ پھیلا دیا تھا۔ اسے پیزا کے مسالوں میں گولیوں کا ذائقہ خاک محسوس ہوتا۔ شہاب اس کے ساتھ بیٹھ کے کھاتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ شیر علی اپنے سامنے والے چار پیس ہی اٹھائے گا۔

شہاب کا ذہن اب تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ الیشا کی غلامی اور شوہری سے نجات کا وقت آ گیا تھا۔ وہ ایک گروپ کو یورپ کا بارڈر کراس کرانے گئی ہوئی تھی۔ چار میں سے دو کراس کر گئے تھے۔ باقی دو کو دوسروں کے حوالے کر کے وہ شام کو واپس آ رہی تھی۔ شام کو وہ اس کا انتظار کرتا رہا پھر اس کا فون آیا کہ وہ ٹریفک کے کسی حادثے میں ملوث ہو گئی تھی اور پہنچ نہیں پائی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ کل ملیں گے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ راستے میں کہیں رک گئی تھی اور اب کسی بھی وقت پہنچ سکتی تھی۔ کیوں نہ وہ فون کر کے اس سے پوچھ لے۔ مگر ابھی صبح ہوئی تھی۔ وہ عادت کے مطابق دیر سے ہی اٹھے گی۔ اسے کوئی جلدی نہیں ہوگی۔

ہاتھوں پر کچن گلوز پہن کے شہاب نے اپنا کام شروع کیا۔ اس نے شیر علی کی جیبوں میں سے تمام نقد رقم اور پاکستان کی شناختی دستاویزات نکال لیں جو جعلی ہونے کے باوجود اس کی شناخت میں معاون ثابت ہو سکتی تھیں۔ پھر اس نے گزشتہ رات اپارٹمنٹ میں اپنی موجودگی کے ہر سراغ کو مٹایا۔ اس نے پیزا کے خالی ڈبے کو اس وینٹی لیٹر جیسی کھڑکی میں ڈال دیا جس میں سب اپنا کوڑا کچرا ڈالتے تھے۔ وہ نیچے تک جانے والے خلا سے گزر کے بیسمنٹ میں پہنچتا تھا اور جلا دیا جاتا تھا۔ اب اس بات کا نہ ثبوت تھا نہ کوئی گواہ کہ وہ گزشتہ رات اس نامعلوم شخص کو یہاں لایا تھا جس کی لاش بالآخر دریافت ہوگی۔

اس نے پُرسکون رہتے ہوئے اپنے لیے ناشتا تیار کیا۔ کافی کے دو مگ پیے لیکن اس کے بعد سب کچھ صاف کر دیا جیسے وہاں کسی نے نہ ناشتا بنایا نہ کافی... اب وقت آ گیا تھا کہ وہ الیشا کو فون کرے۔ یہ کال اس نے شیر علی کی جیب میں سے برآمد ہونے والے موبائل فون سے کی۔ کچھ دیر بعد الیشا کی نیند میں ڈوبی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو؟“

”گڈ مارننگ جانم، ابھی سو رہی ہو؟“

”ہاں۔“ وہ انگڑائی اور جماہی لیتے ہوئے بولی۔ ”یہ تم ہو؟ کہاں سے کال کر رہے ہو؟“

”ایک دوست ہے میرے ساتھ... میری بیٹری ختم ہو گئی تھی۔ وہ مجھے تمہارے پاس لا رہا ہے۔ کہاں ہو تم اس وقت؟“

”میں تو ایک موٹیل میں ہوں۔ رات ہو گئی تھی اور میں تھک گئی تھی کہ یہاں ٹھہر گئی مگر تم کیوں آ رہے ہو میرے پاس؟“

”یہ ایک کلائنٹ ہے۔ بھاری اسامی ہے۔“ اس نے ترکی زبان میں کہا۔ ”اسے بہت جلدی تھی۔ میں نے سوچا کہ تمہارے پاس لے آؤں تم کو آتے ہی واپس نہ جانا پڑے۔“

”او کے... میں انتظار کر لیتی ہوں یہیں تمہارا.. تم کو اندازہ ہے اس جگہ کا؟“

”ہاں، دو گھنٹے کا تو راستہ ہے۔ مجھے نکلنے میں ایک گھنٹا لگ سکتا ہے لیکن لنچ ہم ساتھ کریں گے۔“

”فائن، میں پھر سو جاتی ہوں۔“ اس نے فون بند کر دیا۔

شہاب نے ایک پاکستانی دوست کو کال کی جو استنبول میں ایک ہوٹل چلا رہا تھا۔ ”قدرت اللہ، ایک کام ہے تم سے... جو صرف تم کر سکتے ہو۔“

”ارے جانی کیا جان چاہیے؟“ وہ عادتاً مسخرے پن سے بولا۔

”تمہارے ہوٹل میں صبح سے اب تک تو کوئی نہیں آیا ہوگا؟“

وہ رونی آواز میں بولا۔ ”صبح سے؟ جانی پرسوں رات ایک جوڑا آیا تھا۔ یہ بزنس کا سیزن نہیں ہے۔“

”سیزن کے بچے... مانتا کیوں نہیں کہ دوسرے اچھے ہوٹل کھل گئے ہیں آس پاس... اچھا ایک کام کر... پرسوں رات جس جوڑے کی بکنگ کی تھی۔ اس کے بعد میری بکنگ لکھ لے۔ دستخط کرنے میں آتا ہوں دوپہر تک... نہیں... شام تک۔“

”بھائی، یہ کیا چکر ہے؟“

”میں آ کے بتاؤں گا۔ فون پر نہیں بتا سکتا۔“

”تیری مرضی... میں ایک انٹری چھوڑ دیتا ہوں۔ کوئی آیا تو... لے وہ آ گیا نام لیتے ہی ایک جوڑا... بڑے وقت پر فون کر دیا تو نے ورنہ تیرا کام نہیں ہو سکتا تھا۔ کیا قتل کر دیا ہے الیشا کو... یا کرا دیا ہے؟“

”بکواس مت کر... کچھ ایسی ہی بات ہے۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ خدا حافظ الیشا۔ ہمارا تمہارا ساتھ یہیں تک تھا۔ بے شک ابھی میں تمہارا شوہر تو ہوں... جیسا

کہ سب جانتے ہیں اور مانتے ہیں لیکن آگے کا کچھ پتا نہیں۔

وہ ظہر کی اذان کی آواز سن کے نکلا۔ اس نے لاک اور چابی کو بھی اپنے فنگر پرنٹس سے پاک کر دیا۔ اس وقت باہر کوئی نہیں تھا۔ سب کام پر گئے ہوئے تھے۔ بچے اسکولوں میں تھے اور ان کی مائیں امورِ خانہ داری نمٹا رہی تھیں۔ وہ گیٹ تک گیا اور مطمئن ہو گیا۔ گارڈ مخالف سمت میں منہ کر کے نماز کی نیت باندھ چکا تھا۔ وہ پھر اس کی نظر میں آئے بغیر نکل گیا۔

دس منٹ بعد اس نے ساتھ والی بلڈنگ کے پارکنگ ایریا سے اپنی گاڑی نکالی اور استنبول کے لیے روانہ ہو گیا۔ یہ چھ گھنٹے کا راستہ تھا مگر وہ رکے بغیر پانچ گھنٹے میں بھی طے کر سکتا تھا۔ جہاں حدرفتار نہ ہو وہاں تیز رفتاری سے وقت بچا کر... شام چھ بجے اس کو پہنچ جانا چاہیے۔ چھ بجے تک الیشا اس کا انتظار کرے گی۔ اسے فون بھی کرے گی، کیوں نہ وہ اس سے خود بات کر لے۔

اس نے اپنے فون سے کال کی۔ ''سوری ڈارلنگ میں لنچ پر نہیں پہنچ سکا، تم کھانا کھالو۔''

''کیا ہو گیا؟ کتنی دیر لگے گی تمہیں؟''

''میں دو گھنٹے دیر سے نکل سکا۔ پھر گاڑی میں پرابلم ہو گئی۔ سروس اسٹیشن پر ہوں۔ آدھا پون گھنٹا اور لگے گا، رائٹ؟''

''چلو میں انتظار کر لیتی ہوں، تم نے کلائنٹ سے رقم کی بات کر لی ہے نا؟''

''اور کیا ایسے ہی لے کر چل پڑا ہوں؟ دگنی رقم پر سودا کیا ہے۔ میں نے سوچا کہ کسی اور کے ہتھے نہ چڑھ جائے، ایسے بے وقوف روز تو نہیں ملتے۔''

فون کر کے شہاب مطمئن ہو گیا۔ اب وہ رات سے پہلے واپس نہیں پہنچ سکتی تھی۔ پروگرام کے مطابق اس نے شیر علی کے فون سے پولیس کو کال کی۔ ''مجھے ایک عورت سے خطرہ ہے اس کا نام الیشا ہے۔''

دوسری طرف سے کسی نے انگریزی میں جواب دیا۔

''کون ہو تم؟ کہاں سے بول رہے ہو؟''

''وہ عورت مجھے اپنے اپارٹمنٹ میں چھوڑ کے گئی تھی۔ اس نے دروازہ مقفل کر دیا ہے۔''

''اپنا نام بتاؤ، اور جہاں تم ہو... وہ پتا۔''

''یہ پتا نہیں کون سی جگہ ہے۔ اس کے سامنے ایک نرسنگ ہوم ہے۔ ساتھ ہی چرچ... یہ پیلے رنگ کی عمارت ہے۔ سرخ کھڑکیوں والی... اپارٹمنٹ فرسٹ فلور پر ہے۔''

اس نے کال ختم کر دی۔ پولیس کے لیے اتنا کافی تھا۔ اس نے موبائل فون سے سم نکالی اور فون کی بیٹری نکال کے اسے ایک پل پر سے نیچے دریا میں پھینک دیا۔ ٹھیک ساڑھے چھ بجے اس نے ہوٹل میں اپنے سارے کوائف اپنے ہاتھ سے لکھے اور دستخط کر کے دو دن پہلے کی تاریخ ڈال دی۔ اپنے دوست کو اس نے بتا دیا تھا کہ بالآخر وہ آزاد ہو گیا ہے۔

گھبرائی ہوئی الیشا کا فون رات نو بجے موصول ہوا۔

''شہاب! تم کہاں ہو؟''

''میں؟ تم جانتی ہو سویٹ ہارٹ... تین دن پہلے میں استنبول آیا تھا۔ یہاں ہوٹل میں ہوں۔''

''استنبول...'' وہ چلائی۔ ''جھوٹے دغاباز، تم نے فون پر کیا کہا تھا دن میں...''

''فون پر؟ آج تو دن میں تم سے بات ہی نہیں ہوئی۔''

''پولیس نے مجھے گرفتار کر لیا ہے۔ اپارٹمنٹ میں کسی نامعلوم شخص کی لاش پڑی تھی۔''

''کیا؟ میں آتا ہوں۔ مجھے تو تین دن سے وہاں کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ میں کیا بتاؤں یہ کیا چکر ہے۔'' اس نے فون بند کر دیا۔

اس رات وہ سکون سے سویا۔ الیشا کے جال میں پھنسنے کے بعد اس نے فیروز داد کو فون کیا تھا کہ آپ نے نوکری کے نام پر نیکی کرنے کی بات کر کے اچھی سزا دی مجھے... تو اس نے کہا تھا کہ میں نے تمہیں قتل کرانے یا پھانسی لگوانے کے بجائے یہ بہتر سمجھا کہ عمر قید ہونی چاہیے۔ تب تک تم بھی سزا بھگتو جب تک میرے دل میں بلقیس کا دکھ ہے... یا جب تک میں ہوں... اس کی موت کے ذمے دار تم تھے، صرف تم...''

اس وقت وہ کیا وضاحت کرتا کہ فیروز صاحب، بلقیس کی موت کا ذمے دار میں نہیں تھا، عائشہ تھی۔ اس کو میں نے خود اپنے ہاتھوں سے سزائے موت دے دی تھی اگر یہ عمر قید تھی تو آج ختم ہو گئی۔ جب الیشا میری قانونی بیوی پر قتل کا مقدمہ چلے گا تو سب سے مستند گواہی تو میری ہی ہو گی جو اس کا شوہر ہے۔ میں اب غلام حسین تو نہیں ہوں نا، شہاب الدین ہوں۔ الیشا کا واحد شوہر۔ کئی سال سے ہر شخص یہ بات جانتا ہے۔ میری عمر قید صرف آٹھ ماہ میں ختم ہو گئی ہے۔